محی الدین نواب

نام کتاب : پہنچی وہیں پہ خاک ....
مصنف : محی الدین نواب
قیمت : -/۳۵ روپیہ
سن اشاعت : ۱۹۹۱ء
مطبوعہ : کلر پرنٹنگ پریس، دہلی ۶
ناشر : کتاب والا ۴۷۹۲ پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶
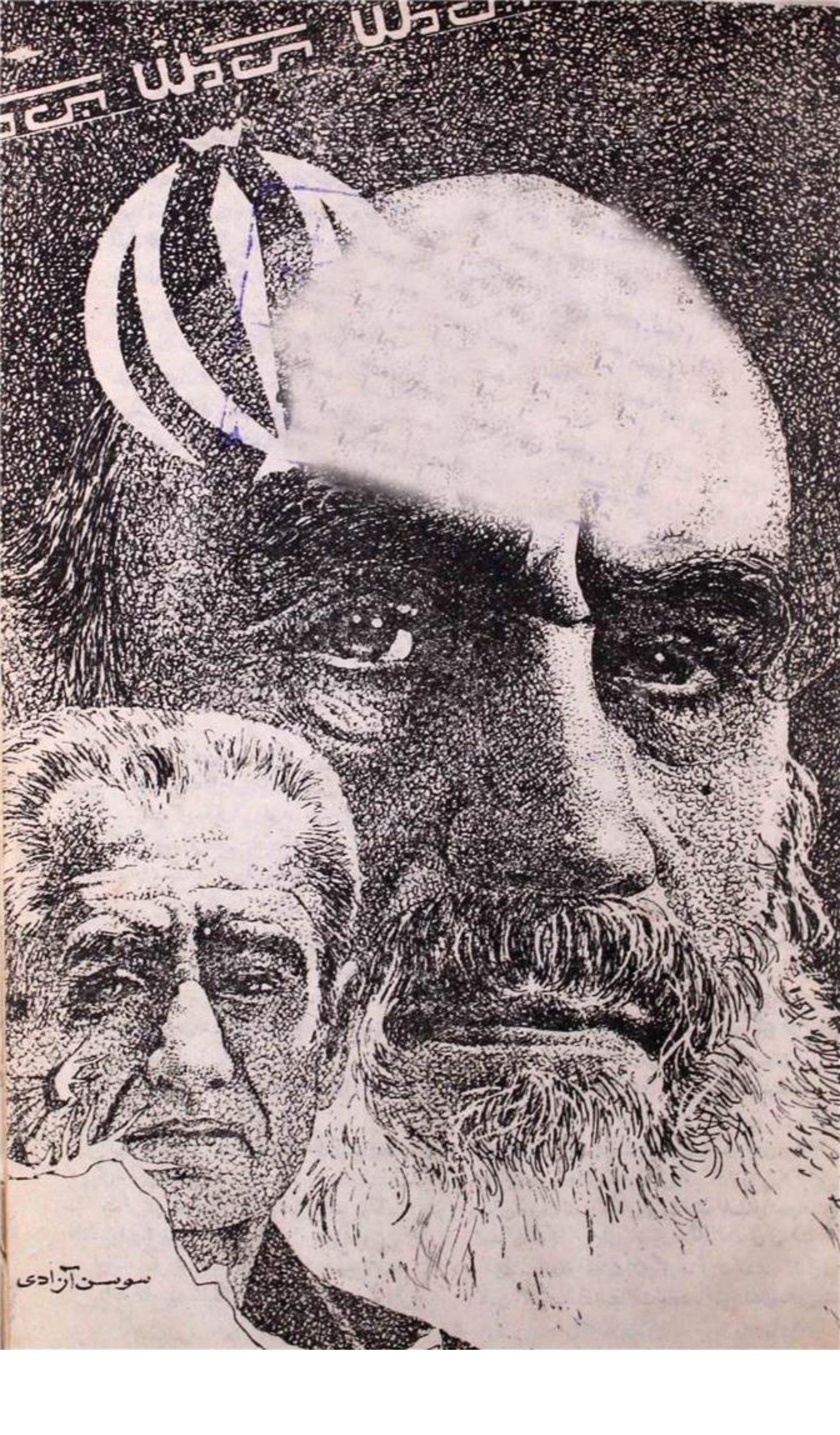
سوسن آزادی

ایران کے ایک دولت مند گھرانے میں جنم لینے والی سوسن آزادی نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا وہ سابق شاہ ایران کا دورِ عروج تھا اور جس ماحول میں پرورش پائی وہ مکمّل طور پر مغربی تہذیب میں رنگا ہوا تھا۔ عیش و نشاط کی وہ زندگی اس کے مزاج میں کچھ اس طرح رچ بس گئی تھی کہ جب اسلامی انقلاب کی گھن گرج ایران کے طول و عرض میں سُنائی دی تو دیگر شاہ پسندوں کی طرح اُسے بھی اپنی سرور و طرب میں ڈوبی ہوئی زندگی خطرے میں نظر آئی۔ اس کی سرگزشت میں اسلامی انقلاب سے بیزاری اور انقلابی رہنماؤں سے نفرت کا جگہ جگہ اظہار اپنی اسی ذاتی خوف کی عکّاسی کرتا ہے۔

سوسن آزادی کا خاندان ایران کے شاہی گھرانے سے قریبی مراسم رکھتا تھا۔ اس تعلّق کی بِنا پر بھی شاہ اور اس کے خاندان سے سوسن کا اظہارِ ہمدردی اور انقلابِ ایران سے نفرت اس کی ذاتی خود غرضانہ سوچ کا مظہر ہے۔ اپنی سرگزشت OUT OF IRAN میں اس نے ایران سے اپنے فرار کی داستان ہی بیان نہیں کی بلکہ ایران کے ماضی، حال و مستقبل کی جھلک بھی اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے پیش کی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایران سے فرار ہونے کے بعد وہ کینیڈا میں مقیم ہو گئی جہاں بہ قولِ خود وہ بہت مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

(محی الدین نواب)

۴ جولائی ۱۹۸۲ء میری زندگی کا خوفناک ترین دن تھا۔ اس روز میں نے ایران چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میری زندگی کی سیاہ اور طویل ترین رات تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہو رہا تھا۔ تہران کا امیر ترین نواحی علاقہ "سلطنت آباد" جہاں رات بھر زندگی کے ہنگامے ہوا کرتے تھے، اس وقت تاریک اور سناٹے میں دبا ہوا تھا۔ صرف سلطنت آبادی پر کیا منحصر پورے ایران میں زندگی کی مانگ اجڑ گئی تھی۔ ہر چہرہ ہونق، ہراساں اور بدحواس نظر آتا تھا۔ خوف اور دہشت کی فضا نے پورے خطّے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر چیز پر خوف کے سائے تھے جیسے جہنم کی بلائیں اس کا پیچھا کر رہی ہوں، وہ ان سے بچنا چاہتا ہو، پناہ ڈھونڈنا چاہتا ہو لیکن اس کے لئے زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ فرار کے تمام راستوں پر موت کا پہرا تھا۔ موت کے ہرکارے ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے۔

اس رات ہم فاریہ کے گھر میں تھے۔ فاریہ میری خالہ زاد بہن تھی۔ جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر رات بھر کے لئے اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس ہولناک رات کا سویرا ابھی نہیں ہوگا ب سی تاریکی میں مبہم سے اجالے کے آثار بھی دکھائی نہیں رہے تھے۔

رات گزارنے کے لئے ہم نے ڈرائنگ روم کے فرش پر بستر بچھا رکھا تھا۔ میرا رخ دیوار کی طرف تھا اور میری نظریں کھڑکی پر مرکوز تھیں جس کی دوسری طرف تاریک فضا تھی۔ اندھے کنوئیں کی طرح جس میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اپنے بیٹے فرہاد کی طرف کروٹ بدل لی جو مجھ سے محض دو فٹ کے فاصلے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ تاریکی میں اس کا صرف ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سر کے نیچے تھا اور دوسرا پہلو پر ٹکا ہوا تھا۔ فرہاد کی عمر اس وقت صرف سات سال تھی اور میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا میں اس معصوم بچے کے ساتھ واقعی انصاف کر رہی ہوں یا کہ اس کی زندگی میری ممتا کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ ایران میں اپنے ددیال میں رہے گا تو اسے زندگی کی ہر سہولت میسر ہوگی۔ مجھ سے نفرت ہونے کے باوجود میرے ساس سسر اپنے پوتے کی پرورش شہزادوں کی طرح کریں گے۔ وہ ناز و نعم میں پلے گا۔ ان کے پاس رہتے ہوئے اس کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اور اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہوگا لیکن میرے ساتھ جانے کی صورت میں اسے کیا ملے گا؟ محرومیاں، مایوسیاں۔ شاید اسے کئی کئی وقت فاقہ کرنا پڑے اور وہ مناسب تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے اسے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس کے

مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی لیکن اس کے باوجود میں اسے اپنے ساتھ لے جارہی تھی۔ یہ ملک چھوڑ کر انجانے راستوں پر جہاں سامنے گمبھیر تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

فرہاد سے آگے کمال سویا ہوا تھا۔ میرا شوہر' اس سے میری شادی صرف دو ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ شوہر ہونے کے باوجود وہ میرے لئے ابھی تک ایک لحاظ سے اجنبی تھا' میں سوچ رہی تھی کہ ہمارا یہ ازدواجی بندھن کب تک قائم رہ سکے گا۔ تاریکی میں بھی مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر فرہاد کی طرح معصومیت تھی۔ وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔

تین سال قبل میرے پہلے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔ فرہاد میرے پاس اس کی نشانی تھی اور میں اس کے سہارے باقی زندگی گزار دینا چاہتی تھی لیکن کمال اس طرح مجھ پر حاوی ہوگیا تھا کہ مجھے اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے' کمال جیت گیا تھا اور میں ہار گئی تھی۔ ہماری اس شادی میں ہنگامی صورت حال کا بڑا دخل تھا' اگر موت کے فرشتے سائے کی طرح ہمارا تعاقب نہ کر رہے ہوتے تو شاید یہ شادی کبھی نہ ہوتی۔ بہرحال' وہ اب میرا شوہر تھا اور ہم دونوں موت کے بھیانک چنگل سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں ایک بار پھر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ بالآخر رات کا اندھیرا دم توڑنے لگا تھا اور اس دن کا نا تواں اجالا اس کی جگہ قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے زمین پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کی طرف دیکھا' اس کی روشن سوئیاں پانچ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں اور ٹھیک اسی لمحے ٹائم پیس کا الارم بج اٹھا۔ الارم کی آواز میرے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر الارم بند کر دیا۔

چند منٹ بعد گھر کے اندر زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے طاری جمود ٹوٹ رہا ہو یہ رات میرے لئے واقعی صدیوں پر بھاری گزری تھی۔ کمال نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے کمرے کی نیم تاریک فضا میں گھورتا رہا پھر اس نے ایک جھٹکے سے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ مکمل طور پر بیدار ہو چکا تھا۔

"مرجانی نے کس وقت آنے کے لئے کہا تھا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا' آواز سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔

"پونے چھ بجے" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

"تمہاری تیاری مکمل ہے۔ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ میرا مطلب ہے رقم اور دوسری قیمتی چیزیں جو تم اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟"

"تیاری مکمل ہے۔ اب صرف مرجانی کا انتظار ہے" میں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

مکان کی بالائی منزل سے بھی نقل و حرکت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرا باپ' فاریہ اور اس کا شوہر بیدار ہوگئے تھے اور اب وہ لوگ بھی نیچے آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ گزشتہ رات تقریباً سب ہی نے جاگ کر گزاری تھی۔ تین بجے تک وہ لوگ بھی ہمارے ہی پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ کچھ دیر نیند لینے کے لئے اوپر چلے گئے۔ فرہاد اور کمال بھی سو گئے تھے لیکن میں نے رات کا باقی حصہ آنکھوں ہی میں بتا دیا تھا۔

سب سے پہلے فاریہ سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں میں نیند کا خمار اور بے چینی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر چند لمحے رک کر میری طرف دیکھتی رہی پھر دبے قدموں چلتی ہوئی کچن میں داخل ہوگئی تاکہ وہ ہمارے لئے ناشتا تیار کر سکے۔ یہ تہران میں ہمارا آخری ناشتا ہوگا۔

کمرے کی فضا اب بھی نیم تاریک تھی۔ میں اٹھ کر جلدی سے لباس تبدیل کرنے لگی۔ نیلے رنگ کی جینز پر میں نے چوڑا بیلٹ باندھ لیا۔ بظاہر عام بیلٹ تھا جو بازار میں تقریباً چند تمن میں دستیاب ہو سکتا تھا لیکن اس وقت اس بیلٹ کی قیمت لاکھوں ڈالر تھی۔ بیلٹ باندھنے سے پہلے میں نے اسے اچھی طرح ٹٹول کر' اطمینان کر لیا کہ اس میں چھپائی جانے والی چیزیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ میں نے قیمتی جواہرات بڑی احتیاط سے اس بیلٹ میں چھپا کر رکھ دیئے تھے۔ ان میں سونے کی بارہ عدد موٹی زنجیریں' ہیرے کی دس انگوٹھیاں' ڈائمنڈ والے کانوں کے آویزوں کے چار سیٹ اور چار ہیرے کے جڑاؤ والے بریس لیٹ یہی میرا اثاثہ تھا جسے میں چھپا کر لے جا رہی تھی۔ ان کی مالیت لاکھوں ڈالر تھی۔ صرف ایک نیکلس ہی کی قیمت بیس ہزار ڈالر تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں تھیں۔

بیلٹ باندھنے کے بعد میں نے لمبی آستین والی قمیص پہن لی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ قمیص خاصی بھاری تھی۔ قمیص کے ایک شولڈر پیڈ میں پچاس قراط سونے کے وہ نیکلس پوشیدہ تھے جو مجھے اپنی والدہ سے ملے تھے۔ قمیص کے دوسرے شولڈر پیڈ میں وہ بھاری بریس لیٹ چھپا ہوا تھا جو میرے پہلے شوہر نے دیا تھا۔ اس میں ایک بڑا ہیرا اور کئی چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ قمیص کے کالر میں سونے کی بھاری زنجیریں سلی ہوئی تھیں۔ قمیص پہننے کے بعد میں نے نیلے رنگ کی میلی سی جیکٹ پہن لی۔ جیکٹ کے بٹن لگانے کے بعد میں نے گہرے رنگ کا حجاب پہن لیا جس سے میرے خوبصورت بال اور پیشانی پوری طرح چھپ گئی تھی۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے سامان چیک کیا' ہم اپنے ساتھ زیادہ سامان نہیں لے جا سکتے تھے۔ ہمارے پاس صرف دو بیگ تھے' نائلون کے ایک بیگ میں ہمارے کپڑے اور دوسرے میں خوراک' جوس کے ڈبے' منرل واٹر کی بوتل' پھل

اور سینڈوچز تھے۔ یہ سب چیزیں احتیاطاً رکھ لیں گئی تھیں کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا کہ راستے میں کہیں کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر میں فرہاد کو جگانے لگی۔ وہ بھی رات تین بجے تک جاگتا رہا تھا اور اس وقت گہری نیند میں تھا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح اٹھا کر باتھ روم میں لے گئی اور ٹھنڈے پانی سے اس کا منہ ہاتھ دھلانے لگی۔

"آپ سب لوگ جاگ رہے ہیں۔ مجھے بھی اتنی جلدی کیوں اٹھا دیا ممی!" فرہاد نے معصومیت سے پوچھا۔ اس وقت میں اس کے کپڑے بدل رہی تھی۔

"میں نے تمہیں رات کو بتایا تو تھا" میں نے اس کی قمیص کے بٹن لگاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ پکنک پر جا رہے ہیں۔"

"لیکن اتنی صبح؟" فرہاد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں دُور اور جانا ہے نا اس لئے جلدی نکل چلیں گے' دیکھو کمال بھی تیار ہو چکا ہے اور میں بھی۔ تمہیں اگر نیند آرہی ہو تو راستے میں کار میں سو جانا" میں نے کہا اور اسے تیار کر کے ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی۔

ہم سب لوگ اس طرح خاموش اور افسردہ بیٹھے تھے جیسے کسی کی موت کا پرسا دینے کے لئے جمع ہوئے ہوں' فاریہ کے چہرے پر بے پناہ اداسی تھی۔ وہ ہمارے جنریشن کی آخری عورت تھی جو میرے جانے کے بعد ایران میں رہ جاتی۔ میرا باپ جو اپنی زمین 'اپنا گھر' اپنا وقار سب کچھ کھو چکا تھا' اب اس ہستی سے بھی محروم ہونے والا تھا جو اسے زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا اور اب میں بھی اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میں تو ایران چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی قوت فاریہ اور میرے والد کو یہ سرزمین چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ ایران اگرچہ بیوی کی مانگ کی طرح اجڑ چکا تھا لیکن یہ اب بھی ان کا وطن تھا اور وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔

مجھے تہران میں وہ آخری ناشتا کبھی نہیں بھولے گا۔ فاریہ نے یہ ناشتا بڑی محبت سے تیار کیا تھا' اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ اس کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا جام' آذربائیجان میں پیدا ہونے والی موٹی موٹی خوبانیوں سے تیار کیا گیا تھا' کوہ ہند کاشد کھمپنی کے ساحل پر پیدا ہونے والے اورنج کا جوس شامل تھا۔ اگر عام حالات ہوتے تو ان میں سے شاید کوئی چیز بھی نہ بچتی لیکن اس وقت ہم... میں سے کسی کو بھوک نہیں تھی۔ ہم نہایت بد دلی سے نوالے منہ میں ٹھونس رہے تھے' ہم سب کی نظریں دیوار اور گیر کلاک پر اور کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ہم سب کو دروازے پر دستک کا انتظار تھا۔

اور بالآخر دروازے پر دستک کی آواز سن کر ہم سب چونک پڑے۔ چند لمحے ایک دوسرے کی طرف سے دیکھتے رہے' پھر فاریہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور دبے قدموں چلتی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ان نازک ترین لمحات میں کوئی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکا وہ مرجانی ہی تھا جس کا انتظار تھا۔

مرجانی چھوٹے قد کا ایک قدرے بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس نے اس وقت جو لباس پہن رکھا تھا وہ اس کے جسم پر خوب جچ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک لمبے قد کا کرد بھی کھڑا تھا اس کے چہرے کی کرختگی سے اس کی سخت گیر فطرت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا تھا' یہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ ہمیں ایران سے فرار ہونا تھا۔ بھاری معاوضے کے عوض اس کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور یہ طے پایا تھا کہ وہ ہمیں باحفاظت سے نکال کر ترکی کی سرحد میں پہنچا دے گا۔

فاریہ نے مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیا۔ ان دونوں کے اندر آتے ہی وہ دروازے سے گردن باہر نکال کر دائیں بائیں گلی میں جھانکنے لگی۔ وہ غالباً یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ کسی نے صبح سویرے ہمارے ان مہمانوں کو دیکھا تو نہیں تھا۔ ان دنوں کے ایران میں صبح سویرے نقل و حرکت شبہے کا باعث بن سکتی تھی اور ہم کسی کو شبہے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ فاریہ کے گھر میں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ ان دنوں دو اہم وجوہات کی بنا پر مستقل ملازم رکھنا ترک کر دیا گیا تھا پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ملازم رکھنے کا مطلب یہ ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بہت دولت مند ہیں اور دولت مند ہونا ان دنوں بہت بڑا جرم تھا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ گھریلو ملازمین نے انعام کے لالچ میں اپنے آقاؤں کے خلاف جاسوسی شروع کر دی تھی۔ بہت سے لوگ ان گھریلو ملازمین کی وجہ سے جیل میں پہنچ چکے تھے۔

"رقم لے کر آئے ہو؟" میں نے مرجانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"رقم تمہیں ترکی لیرے کی صورت میں؟ رات تبریز میں مل جائے گی" مرجانی نے جواب دیا۔

"اور جرمن مارک؟"

"لعنت ہو مجھ پر" مرجانی بڑبڑایا "میں بالکل بھول گیا تھا۔ مارک لینے کے لئے مجھے دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ جانا پڑے گا۔"

میرے خیال میں مرجانی کی یہ بھول کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ صبح سویرے تہران کی سنسان سڑکوں پر گھومنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آیت اللہ خمینی کے قائم کردہ کمیٹی کے ارکان موت کے ہرکاروں کی طرح سڑکوں پر دندناتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے ہمیں روک سکتے تھے۔ اس طرح روکے جانے کا مطلب بہت بڑی مصیبت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خصوصی طور پر قائم کردہ اس کمیٹی میں اگرچہ زیادہ تعداد رضاکاروں کی تھی مگر انہیں بے پناہ اختیارات حاصل تھے' وہ معمولی سے شبہے کی بنا پر کسی کو بھی گولی سے اڑا سکتے تھے اور کوئی ان سے بازپرس کرنے

والا نہیں تھا۔

میں دل ہی دل میں وقت کا حساب لگانے لگی۔ شہر کے زیریں علاقے میں واقع مرجانی کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے کے لئے کم از کم بیس منٹ درکار تھے۔ اتنا ہی وقت شیری کو لے جانے میں لگ جاتا جو شہر کے شمالی علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ اس طرح ہمارے کم از کم چالیس منٹ ضائع ہو جاتے جبکہ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میرے خیال میں اس وقت جرمن مارکس سے بھی زیادہ یہ وقت ہمارے لئے قیمتی تھا لیکن دوسری طرف دس ہزار امریکی ڈالرز کے مساوی جرمن مارکس کی یہ رقم ہمارے لئے بہت اہم تھی کیونکہ یہ ہمارے پاس واحد یورپین کرنسی تھی جو ہم نے نہایت مہنگے داموں بلیک مارکیٹ سے خریدی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ رقم ہمارے لئے ضروری ہے۔ چلو، ہم پہلے رقم لینے کے لئے تمہارے اپارٹمنٹ چلیں گے۔"

وہ آخری لمحات بالآخر آ پہنچے تھے جب مجھے اپنی عزیز ترین ہستی سے جدا ہونا تھا۔ میرے باپ نے مجھے سینے سے لپٹا لیا۔ میں اس کے سینے میں گھٹی ہوئی چیخوں کی آواز سن رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک میری پیشانی پر اپنی شفقت کی مہریں ثبت کرتا رہا۔ باپ کے سینے سے لگ کے مجھے بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ محض لمحوں کی تاخیر ہمارے لئے موت کا باعث بن سکتی تھی۔ باپ سے الگ ہو کر میں فاریہ سے لپٹ گئی۔

اگر ہم پکڑے گئے تو میں کبھی یہ نہیں بتاؤں گی کہ رات ہم نے کہاں گزاری تھی۔ میں نے فاریہ کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "بالفرض اگر کمیٹی کے آدمی اس طرف آئیں گے تو تم یہی کہو گی کہ کئی روز سے ہمیں نہیں دیکھا، میری بات سن رہی ہو کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" فرہاد میرے باپ سے لپٹ گیا، وہ بہت خوش تھا۔ وہ معصوم یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم پکنک منانے جا رہے ہیں۔

"ہمارے جانے کے بعد تم میں سے کوئی بھی گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔" میں نے فاریہ اور اس کے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر کمیٹی کے کسی ممبر نے تمہیں گلی میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا تو وہ لمحہ تم لوگوں کے لئے قیامت سے کم نہیں ہوگا۔"

"مجھے کسی کے دیکھ لئے جانے کی پروا نہیں ہے۔" فاریہ نے بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ "ہم تم لوگوں کو خدا حافظ کہنے کے لئے دروازے تک ضرور آئیں گے۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ دونوں میاں بیوی ہمارے ساتھ ہی مکان سے باہر آ گئے۔ سڑک پر مرجانی کی براؤن رنگ کی رینج روور کھڑی تھی۔ وہ حسرت ناک نگاہوں سے ہمیں گاڑی میں بیٹھتے دیکھتے رہے، ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ فاریہ اور اس کا شوہر سڑک پر کھڑے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے، میں بھی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی رہی۔ بالآخر پہلے ہی موڑ پر گاڑی دائیں طرف ہو گئی اور وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مرجانی نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری اندر کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ میرا روزمرہ کا کام ہے۔ آج آدھی رات سے پہلے پہلے تمہیں ترکی کی سرحد میں پہنچا دیا جائے گا اور اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس طاغوتی چکر سے آزاد ہو جاؤ گی۔"

آزادی... آج رات... ترکی... آزاد فضا... اور شاید کل شام سے پہلے پہلے میں پیرس پہنچ جاؤں، کتنا حسین تصور تھا لیکن میرے دل میں عجیب سے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ ایران کی سرحد سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا، قدم قدم پر موت کا پہرا تھا۔ موت کے فرشتے خصوصی کمیٹی کے ممبران انقلابی گارڈ کی صورت میں شکار کی تلاش میں سڑکوں پر دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کی نظروں سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا۔

ہم نے فرار کے راستے پر پہلا قدم تو رکھ دیا تھا لیکن مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا فرار کے اس منصوبے پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔ ہمارے فرار کے منصوبے کی تفصیلات کو ہم سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ ہم جو اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رہے تھے، ہمیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اس روز ہمیں تہران کے شمالی مغرب میں تقریباً سات سو کلومیٹر پر واقع تبریز پہنچا دیا جائے گا۔ تبریز، کسی زمانے میں منگولوں کا پایہ سلطنت رہا تھا اور آذربائیجان کے قلب میں واقع ہے۔ اسے بہت بڑا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے تاجروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ہمیں مرجانی اور اس کے ساتھی پر انحصار کرنا تھا۔

فاریہ کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد ہم کسی حادثے کے بغیر مرجانی کے اپارٹمنٹ پہنچ گئے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے جبکہ مرجانی کا کرد ساتھی گاڑی سے اتر کر دوڑتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی میں صرف دو منٹ لگے تھے۔ اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا ایک پھولا ہوا لفافہ تھا جسے اس نے مرجانی کے حوالے کر دیا۔

مرجانی اپنی جگہ سے اٹھ گیا، اس نے سیٹ اٹھا کر لفافے کو سیٹ کے نیچے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیا اور سیٹ درست کر کے بیٹھتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم اس اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچ گئے جہاں شیری کی بہن کا اپارٹمنٹ تھا۔ ہم جیسے ہی گلی میں داخل ہوئے میری نگاہیں بے اختیار عمارت کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک عورت اپارٹمنٹ کی بالکونی میں کھڑی گلی کے موڑ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہماری رینج روور بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ مرجانی نے نہ تو ہارن بجایا تھا اور نہ ہی کوئی اور سگنل دیا تھا' لیکن چند سیکنڈ بعد ہی چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت بلڈنگ کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے جسم کا ہر حصہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ صرف آنکھوں اور چہرے کا کچھ حصہ برہنہ تھا۔ چادر کا ایک کونہ اس نے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

قریب پہنچ کر جب اس نے چادر چہرے سے ہٹائی تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا' وہ شیری تھی جس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ شیری کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بوڑھی ہونے کے باوجود وہ نہایت زندہ دل عورت تھی۔ اس عمر کے لوگ عام طور پر گھر میں آرام کرتے ہیں لیکن بے کار بیٹھنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ وہ ایک انتھک محنتی عورت تھی۔ اس نے بہت عرصہ پہلے تہران میں معذور بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا تھا اور اب تہران میں اس اسکول کی کئی برانچوں کے علاوہ ملک کے ہر بڑے شہر میں اس کی شاخیں موجود تھیں۔ شیری معذور بچوں کے ان اسکولوں کی سربراہ تھی اور اسے شاہ کی طرف سے ان اسکولوں کے لئے فنڈ بھی ملتا تھا۔ شاہ کے زوال کے بعد اسلامی ایران میں عورتوں کے لئے چادر لازمی قرار دے دی گئی تھی لیکن شیری نے کبھی اس حکم کی پابندی نہیں کی تھی مگر آج جبکہ وہ سب کچھ چھوڑ کر جارہی تھی اس نے عورتوں کے لئے سرکاری طور پر مقرر کردہ یہ وردی پہن لی تھی تاکہ اپنے آپ کو موت کے فرشتوں کی ناک براہ سے بچا سکے۔

شیری پچھلی سیٹ پر ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد رینج روور حرکت میں آگئی اور شہر کی سنسان سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ مرجانی کوشش کر رہا تھا کہ بڑی سڑکوں پر نہ آنے پائے۔ وہ گاڑی ایسی چھوٹی سڑکوں پر دوڑا رہا تھا جہاں کمیٹی کے آدمیوں کا آمنا سامنا ہونے کا امکان کسی حد تک کم تھا۔

تہران۔ میرے خوابوں کی جنت ہے... زندگی کے ہنگاموں کا شہر... جو اب ویران ہو چکا تھا دیواریں بھی دہشت ناک پوسٹروں سے بھری ہوئی تھیں۔ شاہ محمد رضا پہلوی کو مرے اگرچہ دن بیت چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان پوسٹروں پر ایسے نعرے درج تھے جن کا مطلب تھا شاہ کو قبر سے نکال کر پھانسی پر لٹکایا جائے۔ دیواروں پر جابجا مرگ بر شاہ' اور مرگ بر امریکا کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ پوسٹروں پر سرخ رنگ کے چھینٹوں سے ٹپکتے ہوئے خون کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ بینک سینما اور شہر کے تمام بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز لوٹ کر سر بمہر کردیے گئے تھے' شہر کی سڑکوں پر جابجا گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کبھی سڑکوں پر ایک تنکا تک نظر نہیں آیا تھا لیکن اب اس پر غلاظت کے انبار لگے ہوئے تھے کہیں سڑکوں پر ہمیں انقلابی گارڈز بھی نظر آئے تھے جو کندھوں پر شاٹ گنیں لٹکائے ہوئے سینہ تان کر چل رہے تھے جیسے یہ شہران کی ذاتی جاگیر ہو' مرجانی ان سے بچتا ہوا گاڑی کو نکال رہا تھا' سڑکوں پر اب اکا دکا شہری بھی نظر آنے لگے تھے لیکن ان کے چہرے فرختہ اور سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح سہمے ہوئے تھے جیسے اگر سر اٹھانے کی کوشش کی تو ان کا سر اڑا دیا جائے گا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھی قوت میرے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہی ہو' مجھے اپنے ایرانی ہونے پر فخر تھا میرا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا تھا' کتنی محبت تھی مجھے اپنے وطن کی مٹی سے۔ ہم اس مادر گیتی کی آغوش میں کتنی پرسکون اور خوشگوار زندگی گزار رہے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا' ایران میرا نہیں رہا تھا۔ اس سرزمین سے اب میرا ناطہ ٹوٹ رہا تھا۔

مجھے وہ خوبصورت گھر یاد آرہا تھا جو میرے پہلے شوہر کاشان نے خاص طور میرے لئے بنوایا تھا۔ پہاڑی پر واقع اس مکان سے پورے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اس کے گرد کئی ایکڑ رقبے پر وہ خوبصورت باغ تھا جس میں گلاب اور دیگر خوش رنگ پھولوں کی کہکشاں سجی رہتی تھی۔ لیکن اب وہ سبزہ زار پھولوں کی وہ کہکشاں بھی اجڑ چکی تھی۔ مجھے فرہاد کی وہ اسکریپ بک یاد آگئی جس میں اس نے رنگ برنگی تتلیوں کے پر جمع کر کے رکھے تھے۔ یہ اسکریپ بک اس مکان میں رہ گئی تھی۔ کمروں کی الماریاں میرے قیمتی ملبوسات' خاندانی تصویروں کے البم اور لاتعداد ویڈیو کیسٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ کشادہ بالکونی جہاں میں اور کاشان بیٹھ کر شام کی چائے پیا کرتے تھے۔ مجھے ایک ایک چیز یاد آرہی تھی لیکن اب وہ سب کچھ میرا نہیں رہا تھا۔ مجھے کیسپن جھیل کے ساحل پر وہ خوبصورت ولا بھی یاد آرہا تھا جہاں ہم گرمیوں کے دن گزارا کرتے تھے لیکن اب میں اس طرف کا رخ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ہماری رینج روور شاہ یاد کے اوپر سے گھومتی ہوئی بائیں طرف مڑنے لگی۔ شاہ یاد دراصل وہ یادگار تھی جو ایران میں شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ علامت کے طور پر تعمیر کی گئی تھی۔ تہران کے داخلی راستے پر یہ شاہ یاد اب میرے لئے محض ایک یاد ہی رہ گئی تھی۔

"خدا حافظ میرے تہران!" شیری نے شاہ یاد کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اس کی آواز گلوگیر تھی اور آنکھیں نم تھیں۔ میں نے بھی پیچھے مڑ کر شاہ یاد پر ایک آخری نظر ڈالی۔ رخصتی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھے قمیص کی آستین بوجھل سی محسوس ہوئی۔ مجھے یاد آگیا کہ کف کے اندر کی طرف ایک قیمتی انگوٹھی سلی ہوئی تھی قیمتی فیروزے والی یہ طلائی انگوٹھی میری نانی نے دی تھی۔ اس انگوٹھی سے میری نانی کی وہ یادیں وابستہ تھیں جب تقریباً ستر سال پہلے ایک ایسے ہی خونی انقلاب کے موقع پر وہ جان بچا کر اپنے ملک سے فرار ہوئی تھی۔

میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ یہ انگوٹھی میرے لئے بھی سعد ثابت ہو اور میں کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکوں۔

ایک جھٹکے سے گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور میں اپنے خیالات سے چونک کر تبریز کی طرف جانے والی سنسان شاہراہ کو دیکھنے لگی۔

== ☆☆☆ ==

رجیعہ۔ میری نانی میرے لئے ہمیشہ ایک آئیڈیل خاتون رہی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں جب جنوبی روس کے علاقے کاکیشیا میں جنگل کا قانون رائج تھا تو رجیعہ اس وقت جوان تھی' وہاں بھی ایسا ہی خونی انقلاب آیا تھا۔ رجیعہ اپنے تین نوعمر بچوں کو لے کر کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی۔ ان دونوں نے کاکیشیا سے تبریز تک کا سفر گھوڑوں کی برہنہ پشت پر تقریباً دو ماہ میں طے کیا تھا۔ دو بچے رجیعہ کے پاس تھے۔ ان میں سے ایک اس نے اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا رکھا تھا اور دوسرا جو صرف چھ ماہ کا تھا' اس کی پشت پر گٹھری کی طرح بندھا ہوا تھا۔ تیسرا بچہ اس کی بہن کی تحویل میں تھا۔ فرار ہونے سے پہلے رجیعہ نے اپنی تمام قیمتی چیزیں ساتھ لے لیں تھیں جن میں قیمتی ہیرے جواہرات اور سونے کی زنجیریں شامل تھیں۔ یہ سب چیزیں اس نے ایک تھیلی میں اپنی چادر میں چھپا رکھی تھیں۔ قدم قدم پر مسلح قبائلی پھیلے ہوئے تھے جو لوٹ مار کی وارداتیں کر کے مسافروں کو قتل کر دیتے اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں تھا۔ جب میں چشم تصور سے ان حالات کا جائزہ لیتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ دو خواتین تن تنہا اتنی دولت اور تین بچوں کے ساتھ کس طرح تبریز پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں گی۔

ایک مرتبہ جب میں نے اپنی نانی رجیعہ سے یہی سوال کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اپنے فرار کے اس واقعے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گی جو بھیانک خواب کی طرح آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

کئی روز کی مسافت کے بعد ہم ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ دریا خاصا گہرا تھا اور ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح عبور کیا جائے' ہمارے چاروں طرف روسی فوجی تھے۔ اگر انہیں پتا چل جاتا کہ ہم فرار کی کوشش کر رہے ہیں تو بلادریغ ہمیں گولی مار دیتے۔ روسیوں کے علاوہ آرمنی لٹیروں کا خطرہ الگ تھا۔ اگر انہیں پتا چل جاتا کہ ہم اکیلی سفر کر رہی ہیں تو ہمیں لوٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیتے' ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ پیچھے جانے کا راستہ نہیں تھا اور سامنے گہرا دریا ہمارا راستہ روکے ہوئے تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے۔ دفعتاً ہم نے ایک کسان کو دیکھا جو اپنے مویشیوں کے ساتھ ایک کشتی پر دریا عبور کر رہا تھا۔ دریا پار کرنے کی ترکیب ہمارے ذہن میں آ گئی تھی۔ ہم نے درختوں کی موٹی موٹی شاخیں جمع کر کے انہیں اس طرح باندھ لیا کہ ایک بہت بڑا تختہ تیار ہو گیا۔ ہم اس تختے پر سوار ہو کر اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینچنے لگے ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں گے یا دریا کی لہریں ہمیں اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں گی ....."

میرے آباؤ اجداد آرمینیا کے شہر باکو کے رہنے والے تھے' ان کی زبان ترکی تھی' وہ سچے اور کھرے مسلمان تھے' ان دنوں آرمنی عیسائیوں اور مسلمانوں میں کھٹ پٹ لگی رہتی تھی۔ آرمنی عیسائیوں نے مسلمانوں پر ان کے اپنے ملک میں عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ رجیعہ کا شمار علاقے کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ ان دونوں کی شادی ہوئی تو پورے خاندان میں کئی روز تک خوشیاں منائی جاتی رہیں۔

روسی انقلاب کی حد جب کاکیشیا تک پہنچ گئی تو محمود سلمان کا خاندان بھی اپنے آپ کو خطرات میں محسوس کرنے لگا۔ مقامی عیسائی تو پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف تھے کمیونسٹوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ ان کی جائدادیں ضبط کی جانے لگیں اور انہیں مختلف طریقوں سے ہراساں کیا جانے لگا آرمنی عیسائی تو پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے' موقع ملتے ہی انہوں نے لوٹ مار قتل و غارت کی وارداتیں شروع کر دیں۔ ان کا نشانہ مسلمانوں کے دولت مند گھرانے تھے۔ لوٹ مار کے بعد وہ گھروں کو آگ لگا دیتے۔ انہوں نے سیکڑوں مسلمانوں کو زندہ جلا دیا۔ جس گھر سے دولت نہ ملتی وہاں سے جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے' بعد میں ان لڑکیوں کی بچی کھچی لاشیں کہیں نہ کہیں پڑی ہوئی مل جاتیں۔

صورتِ حال نہایت سنگین ہو گئی تھی۔ بالآخر محمود کے خاندان نے بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ اپنے مکان' زمینیں اور سب کچھ چھوڑ کر ایران چلے جائیں گے جہاں ان جیسے شیعہ مسلمان آباد تھے' انہیں یقین تھا کہ وہ ایران میں ایک نئی اور خوشگوار زندگی شروع کر سکیں گے۔

محمود کاروباری سلسلے میں اکثر تبریز جاتا رہتا تھا' یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہلے رجیعہ اور بچوں کو تبریز بھیج دیا جائے۔ وہ کچھ عرصہ باکو میں رہے گا تاکہ اپنی تھوڑی بہت جائداد فروخت کرنے کی کوشش کر سکے۔ بعد میں وہ بھی ان سے تبریز میں جا ملے گا۔ لیکن اسے آنے میں دو سال لگ گئے۔ میری خالہ طوطی جو ان دنوں پانچ چھ سال کی تھی' بتاتی ہیں کہ محمود روسی کرنسی نوٹوں سے بھرے ہوئے دو ٹرنک لے کر آیا تھا لیکن چند ہی ہفتوں بعد روسی حکومت نے وہ کرنسی منسوخ کر دی اور اس طرح سوٹ کیسوں میں بھرے ہوئے وہ نوٹ ردی کاغذ کے ٹکڑوں میں بدل کر رہ گئے میری نانی نے وہ دونوں سوٹ کیس کھول کر بچوں کے سامنے رکھ دیے۔ بچے طویل عرصے تک ان نوٹوں سے کھیلتے رہے۔

میری نانی رجیعہ۔ جو قیمتی زر و جواہر لے کر آئی تھی اب وہی

اس خاندان کا سہارا تھا اور دراصل یہی جواہرات ایران میں اس خاندان کی بنیاد بنے تھے۔ یکے بعد دیگرے ان چیزوں کو بیچ کر نہ صرف اپنے لئے مکان خرید لیا گیا بلکہ چھوٹے پیمانے پر تعمیراتی کام بھی شروع کر دیا۔

وہ لوگ ۱۹۲۳ تک تبریز میں رہے۔ اس دوران ان کے ہاں مزید پانچ بچے پیدا ہوئے جن میں میری ماں صائمہ بھی شامل تھی جو ۱۹۲۸ میں پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ تہران منتقل ہوئے تو اس وقت تک میرے نانا کا تعمیرات کا کام مستحکم ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ کی دہائی تہران کے لئے اس لحاظ سے بڑی اہم ثابت ہوئی تھی کہ ایران کے آخری تاجدار کا باپ اور پہلوی سلطنت کے بانی رضا خان کے دور حکومت میں تہران بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔ تہران شہر بڑی تیزی سے ملک کا تجارتی مرکز بن رہا تھا رضا خان نے خانہ جنگی کے بعد سلطنت پر قبضہ کرتے ہی ایران کی ترقی کے لئے کام شروع کر دیا تھا۔ وہ خاص طور پر تہران کو جدید بنانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا۔ محمود سلمان بھی ان چند ایرانیوں میں شامل تھا جنھوں نے شاہ رضا خان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ ان دنوں میرے نانا جس حویلی نما مکان میں رہتے تھے اسے بلاشبہ تہران کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت مکان کہا جا سکتا تھا۔ یہ تہران کا واحد مکان تھا جس کے غسل خانوں میں نہانے کے لئے سنگ مرمر کے ٹب لگے ہوئے تھے اور بیرونی گیٹ سے لے کر پورچ تک پختہ سڑک تھی۔

میرے نانا چونکہ روس سے آئے تھے اس لئے وہ ایرانیوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند تھے۔ تعمیرات میں جدت طرازی ان کا خاصہ تھا۔ ایران ان دنوں قبائلی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انھیں خوف تھا کہ غیر ملکی یعنی مغربی ان پر حاوی ہونے کی کوشش نہ کریں۔ اس لئے وہ خود بھی مغربی تہذیب اپنانا چاہتے تھے۔ میرے نانا ان لوگوں کے لئے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے دولت مند ایرانی بھی اپنے بچوں کو یورپی تہذیب سے روشناس کرانے کے لئے فرانسیسی اور انگریز اتالیق رکھ رہے تھے۔ بچوں کی موسیقی کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی کیونکہ ان دنوں ایران میں موسیقی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

۱۹۳۰ کی دہائی کے اختتام پر میرے نانا کو اگرچہ ایران آئے ہوئے بیس سال بھی نہیں ہوئے تھے لیکن انھوں نے پوری طرح یہاں اپنے قدم جما لیے تھے اور ہمارا خاندان بڑے کروفر کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دنوں ایران میں ایک خاص بات یہ تھی کہ بڑے خاندان صرف اپنے تک ہی محدود تھے۔ وہ عام لوگوں کو اپنی خوشیوں میں شامل کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جب میں نے ایران چھوڑا تو اس وقت بھی تقریباً یہی صورتحال برقرار تھی۔

میرے والد اور ماموں تہران کے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ اسکول صرف دولتمند بچوں کے لئے مخصوص تھے۔ درمیانے درجے کا کوئی فرد اپنے بچوں کو ان اسکول میں داخل کرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تعلیم کے دوران میری والدہ نے اپنے ہم جماعتوں کا ایک الگ گروپ بنا لیا تھا جس میں تہران کے چند بڑے خاندانوں کے بچے شامل تھے۔ آخری شاہ کی بہن فاطمہ بھی میری والدہ کی کلاس فیلو تھی اور ان دونوں کی دوستی بڑی گہری تھی۔

محمود اور رجیعہ بھی ایرانیوں کے اس پہلے گروہ میں شامل تھے جنھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجا تھا۔ میرے سب سے بڑے ماموں کو امریکی ریاست مشی گن میں این آربر یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ دوسرا ماموں خروش بھی انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے پیرس چلا گیا تھا جہاں ساربون یونیورسٹی میں اسے داخلہ مل گیا تھا۔ وہاں تعلیم کے دوران ایسی چند ایرانی لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی جنھوں نے بعد میں ایران کی تاریخ میں نہایت اہم رول ادا کیا تھا۔ فروش کے ان دوستوں میں شاہ کے آخری وزیر اعظم شاہ پور بختیار اور خمینی کے دور کے پہلے وزیر اعظم مہدی بازرگان جیسے لوگ شامل تھے۔ ماموں فائن نے بھی جرمنی سے ہی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی جو بعد میں دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر نانا کی قائم کردہ انجینئرنگ کمپنی کو چلاتا رہا۔ میرے ایک اور ماموں اردشیر نے مشی گن یونیورسٹی سے دانتوں کے امراض کی تعلیم حاصل کی اور انھوں نے امریکا ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

نہایت ترقی پسند ہونے کے باوجود رجیعہ اور محمود نے اپنی دونوں بیٹیوں صائمہ اور طوطی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اس طرح وہ ہائی اسکول سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکیں لیکن شادی کے بعد خالہ طوطی نے دندان سازی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور اس طرح انھیں ایران کی پہلی خاتون ڈینٹسٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ خالہ طوطی سے میرے تعلقات کبھی بھی زیادہ خوشگوار نہیں رہے لیکن ایرانی خواتین کی بیداری میں انھوں نے جو مرکزی اور اہم کردار ادا کیا اس کی میں ہمیشہ تعریف کروں گی۔

بیرونی ممالک کے رہنے والے شاید یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ مغرب میں ایران کے دولت مند خاندانوں کے لئے کتنی کشش تھی۔ ۱۹۳۰ کی دہائی تک ایران پر مذہب کی چھاپ بڑی گہری تھی اور لوگ پسماندگی اور جہالت کے اندھیروں سے نکلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ دولت مند طبقہ اس سلسلے میں پیش پیش تھا ایران کی پہلی یونیورسٹی 'تہران یونیورسٹی' ۱۹۳۴ میں قائم ہوئی تھی اور آپ کو حیرت ہوگی کہ ۱۹۵۶ تک تہران میں پانی کی سپلائی کے لئے کوئی پمپنگ اسٹیشن نہیں تھا۔ پورے شہر میں صرف چند کاریں تھیں۔ اور میرے نانا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنھوں نے

تہران میں سب سے پہلے کار خریدی تھی ایران میں برف پر پھسلنے کے کھیل "اسکی انگ" کی روایت بھی میری والدہ اور ماموؤں نے ڈالی تھی۔ اس وقت تک کوئی ایرانی اس کھیل سے واقف نہیں تھا لیکن آج ایران میں یہ کھیل بے حد مقبول ہے۔

مغربی تہذیب اب ایران پر پوری طرح اثر انداز ہو رہی تھی میرے نانا کے خاندان کو تہران میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ شاہی خاندان سے بھی بہت قریبی تعلقات تھے۔ انھیں اب اپنے ایرانی ہونے پر فخر تھا اور یہ لوگ جو کچھ روس میں چھوڑ کر آئے تھے اس کا اب انھیں کوئی افسوس نہیں تھا۔

میرے والد جہانگیر آزادی خالص ایرانی تھے۔ وہ بہت بڑے جاگیردار تھے۔ آزادی فیملی کا ایران میں بڑا دبدبہ تھا۔ شاہ کے خاندان سے بھی ان کی قریبی رشتے داری تھی اور انھیں اپنے خاندانی نسب پر بجا طور پر فخر تھا۔

میرے دادا اسلیم آزادی آذربائیجان کے ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ حکومت کی طرف سے پورے صوبے میں ٹیکس وصول کرنے کی ذمے داری بھی انہی کے سپرد تھی۔ اس اعزاز اور رتبے کی بدولت نہ صرف ان کے وقار میں اضافہ ہوا تھا بلکہ میرے دادا کی جاگیر میں بے شمار گاؤں شامل ہوئے تھے جو سو فیصد ان کی ملکیت تھے۔ ایران کے آخری شہنشاہ محمد رضا پہلوی نے جب فیوڈل سسٹم کے خاتمے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے سفید انقلاب کا اعلان کیا تو ان دنوں میرا باپ نوجوان تھا۔ کسانوں پر میرے باپ اور دادا کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ میرے والد نے نوجوانی کے جوش میں مقامی طور پر سفید انقلاب کی مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن انھیں بہت کچھ کھونا پڑا تھا۔ اس کے باوجود ان کے مزاج کی اکڑفوں نہیں گئی تھی۔

ایران میں زمین کا مالک ہونے کو دولت اور وقار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بھی شروع ہی سے یہی تعلیم دی گئی تھی کہ زمین رکھنے والے خاندان ہر طبقے سے بالاتر ہیں یہاں تک کے وہ اپنے آپ کو حکمران خاندان سے بھی بالاتر سمجھتے تھے جن کا تعلق شمالی ایران کے چھوٹے سے غیر معروف کسان خاندان سے تھا۔

میرا باپ اکثر مجھ سے یہ کہا کرتا تھا "یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ تم ایک خان کی بیٹی ہو اور خان کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔"

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میرے دادا اسلیم آزادی آذربائیجان کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ قاجار کے شاہی خاندان سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اس خاندان نے ۱۷۸۶ء سے ۱۹۲۵ تک ایرن پر حکومت کی تھی، سلیم آزادی کی شادی اسی شاہی خاندان کی عاشی نامی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ عاشی کا باپ پرنس رضا علی مرزا آذربائیجان کا حکمران تھا۔ شادی کے وقت عاشی کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ اگرچہ پورے صوبے میں لاتعداد مکان موجود تھے لیکن انہوں نے ملک کے شمال مشرقی کونے میں رضایہ جھیل کے کنارے رضایہ شہر میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ شہر انہیں اس لئے بھی زیادہ پسند آیا تھا کہ دوسرے بڑے شہروں کے برعکس یہاں انہیں زیادہ معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ اس شہر میں آرمنی عیسائی بھی بڑی تعداد میں آباد تھے جنہیں اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ اس شہر کی پسندیدگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ باقی ایران کی طرح یہاں اسلامی قوانین کی زیادہ پروا نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں کے لوگ یورپی تہذیب سے زیادہ متاثر تھے، حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر یورپ کے کسی شہر کا گمان ہوتا تھا، شام کا اندھیرا پھیلتے ہی لوگ اپنے گھروں سے نکل آتے۔ ریسٹورنٹ آباد ہو جاتے، شراب خانوں کے دروازے کھل جاتے اور رقص گاہوں میں زندگی کے ہنگامے شروع ہو جاتے جو صبح تک جاری رہتے۔ ایران کا پہلا سینما گھر بھی رضایہ ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ رضایہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مکمل یورپی شہر تھا جہاں کے رہنے والوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی، عورتیں بھی بلا خوف و خطر چادر کے بغیر گھومتی تھیں۔ ان دنوں بھی عورتوں کے لئے چادر لوڑھنے کی پابندی تھی لیکن رضایہ میں رہنے والی عورتیں اس پر کم ہی عمل کرتی تھیں۔

مجھے میری دادی عاشی کے بارے میں ایک واقعہ بتایا گیا تھا جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے "ایک قومی تہوار کے موقع پر رضایہ کے گورنر کی طرف سے شہر کے معززین کے اعزاز" میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہال میں بے شمار لوگ موجود تھے، دفعتاً اس کی نظریں ہال کے مرکزی دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں عاشی اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گورنر ہاؤس کی طرف اس نے آتے ہوئے راستے میں سن لیا تھا کہ شاہ رضا خان نے ایک حکم کے ذریعے چادر پر سے پابندی فوری طور پر ختم کر دی تھی۔ یہ سنتے ہی عاشی نے چادر راستے ہی میں پھینک دی تھی اور اب وہ چادر کے بغیر یورپین لباس میں لوگوں کے سامنے کھڑی تھی۔ مخصوص تراش کے لباس میں اس کے نسوانی خدوخال نمایاں ہو رہے تھے، قریبی رشتے داروں کے علاوہ کسی نے بھی عاشی کو نہیں دیکھا تھا لیکن آج وہ ان سب کے سامنے تھی۔ اس کے حسن نے لوگوں کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ ان میں سے بعض لوگ تو کچھ دیر کے لئے سانس تک لینا بھول گئے تھے۔

گزشتہ نصف صدی سے چادر ایران کی سیاست کا بیرومیٹر رہی ہے۔ لیکن رضا شاہ نے ہر عمر اور ہر طبقے کی عورتوں سے چادر کی پابندی ختم کرنے کا جو قدم اٹھایا تھا وہ نہایت جرأت مندانہ تھا۔ بیک جنبش قلم صدیوں پرانی روایت کو ختم کرنے کا حکم جاری کر کے اس نے مخالفین کو ایک بہت بڑا چیلنج دیا تھا۔ اس سال پہلی مرتبہ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں پردے کے بغیر عوام کے سامنے آئیں۔

رجیعہ' جو مذہبی عقائد پر سختی سے کاربند ہونے کی وجہ سے چادر اوڑھا کرتی تھی' اس نے بھی چادر ترک کر کے صرف حجاب استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جو صرف سر اور چہرے کے کچھ حصے کو ڈھکنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بہت سی عورتیں صرف اس لیے چادر لپیٹتی رہیں کہ اس کے ہٹانے سے ان کی غربت عیاں ہو جائے گی۔ بعض عورتیں محض اس لئے چادر استعمال کرتی رہیں کہ عام لباس میں ان کے جسم کے خدوخال اور حسن کو دیکھ کر جنس مخالف کے جذبات برانگیختہ ہوتے تھے' چادر کے استعمال کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ عورت اپنے جسم کو دوسروں سے چھپائے رہے' اور اس کی بڑی سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی۔

لیکن شاہ رضا خان کے دور میں چادر اوڑھنا جرم قرار دے دیا گیا۔ پولیس کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ جس عورت کو بھی چادر میں لپٹا ہوا دیکھیں بلا حیل و حجت اس کی چادر اتار پھینکیں۔ بہت سی عورتوں نے محض اس لئے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا کہ سڑکوں پر چادر نوچ کر انہیں بے آبرو نہ کیا جائے' لیکن رضا خان کے بیٹے ایران کے آخری شہنشاہ نے جب عنان حکومت سنبھالی تو اس نے اپنے باپ کا حکم واپس لے کر چادر کو اختیاری قرار دے دیا۔

ایران سے چادر کو ختم کرنے کی شاہ رضا خان کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ سڑکوں پر ہر طرف چادریں لہراتی نظر آنے لگیں' تہران کی کسی بھی سڑک اور گلی کو دیکھ کر اسے کسی بھی جدید ترین یورپی شہر کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حکمران وقت کی کوشش کے باوجود یہ ملک چادر سے نجات حاصل نہیں کر سکا تھا۔

میں بچپن میں چادر استعمال کیا کرتی تھی لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد میں نے اسے اتار پھینکا تھا' بچپن میں بھی میں چادر اس لئے استعمال کیا کرتی تھی کہ یہ میرے بعض کھیلوں کا ایک حصہ بن گئی تھی لیکن اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کسی وقت یہ کھلونا خوفناک ہتھیار کے طور پر میرے خلاف استعمال کیا جائے گا۔

میرے دادا سلیم آزادی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے دوسری شادی کر لی۔ اس دوسری بیوی کا تعلق نچلے طبقے سے تھا' اس کے بطن سے سلیم کے دو بچے بھی ہوئے' دوسری شادی کے باوجود گھر پر حکمرانی عاشی ہی کی تھی۔ دوسری بیوی باورچی خانے تک محدود رہ گئی تھی' گھر کے ملازمین اور بچوں کی نگرانی بھی اس کے ذمے تھی' اس طرح میرا باپ اور دونوں پھوپیاں بھی اس کی نگرانی میں آ گئیں' عاشی بالکل آزاد تھی۔ دادا کو کہیں آنا جانا ہوتا تو اس کے ساتھ عاشی ہی ہوتی۔ دوسری بیوی کو گھر میں لانے کے بعد سلیم آزادی نے اسے اس طرح فراموش کر دیا تھا جیسے اس کا وجود بھی نہ رہا ہو۔

میں بچپن میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھی' ان دنوں دوسری شادی کا رواج بہت عام تھا' لیکن جب میں بڑی ہوئی تو اس وقت تک اس ریت میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی' دوسری شادی دراصل دولت مندوں کی عیاشی کا ایک جائز ذریعہ ہے' متوسط طبقے کا آدمی تو دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

لیکن جب معاشرے میں دل و رسم بڑھانے کی آزادی میسر ہو تو دوسری شادی کا پھندا ڈالنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا' تہران ان دنوں مکمل طور پر مغربی تہذیب میں رنگا جا چکا تھا' اونچے طبقے میں عورتوں اور مردوں کا آزادانہ میل ملاپ تھا' ان کی "ضرورت" ایک دوسرے سے پوری ہو رہی تھی' اور ظاہر ہے اس طرح بغیر کسی رکاوٹ کے ضرورت پوری ہو رہی ہو تو پیروں میں زنجیریں ڈالنا کون پسند کرتا ہے۔

سلیم آزادی نے بڑی شاندار زندگی گزاری تھی' رضائیہ میں ان کا گھر محل سے کم نہیں تھا' وہاں عیش و عشرت کا جو سامان جمع تھا اس کے بارے میں نچلے یا متوسط طبقے کے ایرانی سوچ بھی نہیں سکتے تھے' گھر ہر وقت مہمانوں سے بھرا رہتا' کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب بیس پچیس مہمان کھانے کی میز پر نہ ہوں۔

شب نشین یا شام کی دعوتیں ایران کی صدیوں پرانی رسم ہے۔ طبقہ امرا میں اسے زیادہ اہمیت حاصل تھی' جس امیر کے گھر میں کھانے پر بیس پچیس مہمان جمع نہ ہوں اسے دولت مند نہیں سمجھا جاتا تھا۔

سلیم آزادی کا شمار چونکہ اعلیٰ ترین طبقے میں ہوتا تھا اس لئے اس کی مہمان نوازی کے قصے بھی زیادہ مشہور تھے۔ اس دوران نہایت دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا' ایک اجنبی مہمان بن کر اس گھر میں آیا۔ وہ تقریباً چھ ماہ تک مہمان نوازی کا لطف اٹھاتا رہا لیکن کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے' سب لوگ اسے خاندان ہی کا ایک فرد سمجھ رہے تھے

بالآخر چھ ماہ بعد خاندان کی ایک لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی اور اس کے چند روز بعد یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اس شخص کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا' وہ سلیم آزادی کی جاگیر کا ایک معمولی سا کسان تھا ایک معاملے میں مدد لینے کے لئے سلیم آزادی کے گھر آیا تھا۔

سلیم آزادی رضائیہ کا واحد شخص تھا جس کے پاس ریڈیو موجود تھا' وہ دن بھر ریڈیو پر دنیا بھر کے حالات سنتا رہتا اور شام کو دلچسپ انداز میں اپنے مہمانوں کو دنیا بھر کے قصے سناتا۔

دوسری جنگِ عظیم اپنے دامن میں بہت سی بربادیاں لے کر آئی تھی' ایک رات میرے دادا سلیم کو بھی کسی نے قتل کر دیا' جنگ شروع ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد ایران کے بادشاہ رضا خان نے نازیوں سے ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا جس کی سزا اسے اس طرح بھگتنی پڑی کہ برطانیہ اور روس نے ایران پر حملہ کر دیا اور رضا خان کو ایران سے فرار ہو کر کچھ عرصے کے لئے جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں رضاخان نے اپنے بیٹے محمد خان پہلوی کو ایران کا نیا حکمران بنادیا لیکن اس وقت تک روسی آذربائیجان پر اپنا قبضہ مستحکم کرچکے تھے' میرے دادا سلیم آزادی کو آذربائیجان میں روسیوں کی موجودگی کا بڑا دکھ تھا۔ اس کا شمار اس وقت بھی علاقے کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ نئے سال کی آمد کے موقع پر ایک روسی افسر' سلیم آزادی کو نئے سال کی مبارک باد دینے آیا تو سلیم آزادی نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے نئے سال کی خوشی اس وقت ہوگی جب تم لوگ اپنے ناپاک گندے وجود لے کر اس سرزمین سے چلے جاؤ گے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ سلیم آزادی نڈر اور بے باک آدمی تھا یہ دلیری اسے بہت مہنگی پڑی' اس کے دوست رشتے دار یہاں تک کہ ماشی بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اپنا یہ رویہ ترک کردے لیکن سلیم کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' سلیم کی عادت تھی کہ وہ رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کے لئے نکل جایا کرتا تھا اسے انجانے خطروں کا احساس دلا کر یہ عادت چھڑانے کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آرہا تھا اس رات بھی وہ چہل قدمی کے لئے گھر سے نکلا تھا لیکن ابھی وہ گھر سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ تاریکی سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ اس نے سلیم آزادی کا جسم گولیوں سے چھلنی کردیا اور جس طرح تاریکی سے برآمد ہوا تھا اسی طرح غائب بھی ہوگیا۔ یہ سلیم آزادی کی بے باکی اور دلیری کی سزا تھی جو اسے بھگتنا پڑی تھی۔

۱۹۴۶ء میں روسی' ایرانی سرزمین سے نکل گئے لیکن اب امریکی صدر ہیری ٹرومین نے ایران کو دھمکانا شروع کردیا کیونکہ اس وقت امریکا نے بھی ایران میں قدم جمانا شروع کردئے تھے۔

سلیم آزادی کی موت کے ساتھ ہی خاندان کی اقدار بھی بدلنے لگیں۔ انہی دنوں یہ افواہ بھی سننے میں آئی تھی کہ سلیم آزادی نے مرنے سے کچھ عرصے پہلے روسیوں کے خوف سے زروجواہرات پر مشتمل بہت بڑا خزانہ رضائیہ والے مکان کے باغ میں کسی جگہ دفن کردیا تھا' اس کی تلاش میں میرے باپ نے باغ کی کھدائی شروع کردی۔ اس نے پورے باغ کو تہ وبالا کردیا لیکن خزانے کا سراغ نہیں ملا۔

دادا کی موت کے کچھ عرصے بعد میری دادی نے سلیم کلوہ حویلی نما مکان فروخت کردیا' ملازمین کی فوج کو رخصت کردیا گیا اور صرف ایک قلیل التعداد ملازمہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہوگئی' اور اس طرح وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹھ ختم ہوگیا۔

۱۹۵۰ء میں تہران کا ایک امیر کچھ عرصے کے لئے رضائیہ میں آکر رہا تھا' اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی' صائمہ کا شمار بلاشبہ حسین ترین خواتین میں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف بائیس سال تھی ملکوتی حسن اور چہرے پر ہر وقت ایک دلفریب سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ ایک تقریب میں میرے باپ جہانگیر سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ میں یہاں یہ بتاتی چلوں کہ نوجوانی میں میرا باپ ایک دل پھینک قسم کا آدمی تھا' دن بھر بھونروں کی طرح خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے منڈلانا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا' کوئی بھی لڑکی چند روز سے زیادہ اس کے ساتھ نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایک لڑکی سے دل بھر جاتا تو وہ دوسری تلاش کرلیتا لیکن صائمہ سے ملاقات کے بعد وہ ساری چوکھڑی بھول گیا وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے پورے شہر میں ان کے چرچے ہورہے تھے لیکن انہیں غالباً کسی کی پروا نہیں تھی۔

میرا باپ صائمہ کے لئے پاگل ہوا جارہا تھا اور بالآخر ایک سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ رضائیہ اور تہران میں بہت بڑے پیمانے پر شادی کا جشن منایا گیا۔ میری والدہ صائمہ کا شادی کا لباس پیرس سے منگوایا گیا تھا اور یہ خوبصورت لباس اب بھی تہران میں میرے اس مکان کے وارڈروب میں ٹنگا ہوا ہوگا جو میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ اس شادی کی ایک یادگار بات یہ بھی تھی کہ اس تقریب کی مکمل فلم بنائی گئی تھی' ایرانیوں نے پہلی مرتبہ مووی کیمرہ دیکھا تھا۔ یہ کیمرا میرا ماموں خروش پیرس سے لے کر آیا تھا' جب مہمانوں کو فلم دکھائی گئی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے تھے' یہ فلم آخری دن تک میرے پاس موجود تھی لیکن میرے تہران سے فرار سے چند روز پہلے آیت اللہ خمینی کی کمیٹی کے ایجنٹ ہمارے خاندان کی لاتعداد تصویروں اور دوسری یادگار چیزوں کے ساتھ یہ فلم بھی لے گئے تھے جو اب تہران کی منکرات جیل میں کہیں پڑی ہوگی۔

شادی کے بعد جہانگیر اور صائمہ مستقل طور پر تہران آگئے تھے۔ میرے والد جہانگیر نے تہران یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں فرسٹ کلاس گریجویشن کیا تھا۔ اس نے دو دوستوں کی شراکت سے تہران میں کنسٹرکشن کمپنی قائم کرلی۔ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام منیجر کے سپرد کردیا تھا' جہانگیر کی تمام تر توجہ کنسٹرکشن کی طرف تھی۔ زمینوں پر عدم توجہ کے باعث پیداوار متاثر ہونے لگی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ ایران شہروں کو ترقی دے رہا تھا اور دیہی علاقوں کے رہنے والے لوگ شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے تھے۔ اس طرح زمینیں اجڑنے لگیں' ہماری اراضی ہماری خاندانی قوت کا مظہر تھی۔ جہانگیر نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے لہلہاتے کھیت اور پھلوں سے لدے رہنے والے باغات ویرانے میں تبدیل ہونے لگے ہیں' وہ ہفتے میں ایک مرتبہ زمینوں کا چکر لگانے لگا۔ بارہ گھنٹے کا سفر اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ بالآخر اس نے تعمیراتی کمپنی کو ختم کرکے ایک بار پھر آذربائیجان منتقل ہوجانے کا فیصلہ کرلیا۔ شہر میں اگرچہ دولت جمع کرنے کے زیادہ مواقع تھے لیکن وہ اپنی خاندانی وراثت سے بھی منہ نہیں موڑنا چاہتا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب شاہ نے سفید انقلاب کا اعلان کیا تو میرے باپ کو بھی جاگیر کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے پاس صرف ایک گاؤں اور چند ایکڑ زمین رہ

گئی تھی لیکن کچھ عرصے بعد یہ بھی چھن گئی۔

میں ۱۷ ستمبر ۱۹۵۴ء کو تہران میں پیدا ہوئی تھی۔ میری پیدائش کے بعد میرا باپ ہمیں ایک بار پھر گاؤں لے گیا تھا لیکن جب میں تین سال کی ہوئی تو انہیں ایک بار پھر تہران منتقل ہونا پڑا کیونکہ اب میری تعلیم کا مسئلہ تھا۔ گاؤں میں وہ سہولتیں نہیں تھیں جو شہر میں ہو سکتی تھیں۔ گاؤں اور شہر کی زندگی میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں سوشل زندگی کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا جبکہ شہر میں ہر طرف زندگی کی گہما گہمی تھی' میرے والد کو شہری زندگی سے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی وہ ہمیں چھوڑ کر ایک بار پھر گاؤں چلا گیا تھا جہاں وہ بیچی کچی زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

میں تہران کے ایک اطالوی اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ میری زندگی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ کبھی شہر میں اور کبھی گاؤں میں' میرے والد کے پاس صیبالون نام کا صرف ایک گاؤں رہ گیا اور وہ اپنی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز کیے ہوئے تھا اس گاؤں کی زیادہ آبادی اساریئن عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مرد امریکا کا رخ کرنے لگے۔ وہ وہاں سے اپنے خاندان والوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں بھیجتے رہتے جو صیبالون کی ترقی پر خرچ ہونے لگیں۔ اس طرح ہمارا گاؤں بہت جلد ترقی یافتہ اور مثالی قصبہ بن گیا۔

اب جب میں اپنے اس گھر کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل میں بے اختیار ہوک سی اٹھتی ہے' رضاییہ جھیل کے کنارے ایک پہاڑی پر اٹھارہ کمروں پر مشتمل یہ مکان میرے باپ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ اس کے چاروں طرف کئی ایکڑ پر سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ میرے باپ کو پھولوں سے عشق تھا اور مرغزار میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے جن کی مہک سے فضا معطر رہتی۔

اپنے باپ کی طرح مجھے بھی اپنے گاؤں سے عشق تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے جب بھی طبیعت اکتاتی میں گاؤں چلی آتی جہاں میں دن بھر گھومتی رہتی۔ گاؤں کے لوگ میرا بڑا احترام کرتے تھے وہ اس بات کو کبھی نہیں بھولے تھے کہ میں خان کی بیٹی ہوں۔ شہری زندگی میں آقا اور ملازم کے درمیان نمایاں فرق رکھا جاتا ہے لیکن گاؤں آنے کے بعد میں سب کچھ بھول جاتی۔ میں ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ضرور کھاتی۔

صیبالون کی ترقی میں میرے باپ نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے' اس نے اپنے باپ کے تاریخی سکوں' جواہرات اور ڈاک کے ٹکٹوں کے ذخیرے فروخت کر کے ان سے حاصل ہونے والی رقم بھی گاؤں کی ترقی پر لگا دی۔ میری والدہ نے بھی اپنے والدین سے ملنے والی ہر چیز اس کے حوالے کر دی تھی۔

یوں تو ایرانیوں کی تاریخ کشت و خون سے بھری ہوئی ہے لیکن یہاں کے لوگوں کو شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ رہا ہے' حافظ سعدی' خیام اور رومی جیسے شاعروں نے اس سرزمین پر جنم لیا۔ شام کے وقت ہر گھر میں شعر و شاعری کا تذکرہ ہوتا اور ان شعرا کا کلام پڑھ کر لطف اندوز ہوا جاتا۔

جدید ایران میں ۱۹۵۰ء کی دہائی یہاں کے لوگوں کے لئے بڑی بھاری ثابت ہوئی تھی' انہی دنوں ایرانیوں میں قوم پرستوں کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جسے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی حمایت حاصل تھی' ایک طرف ایران تیل کے کنوؤں پر برطانیہ کی عملداری ختم کرنے اور ملکی سیاست پر غیر ملکی دباؤ کم کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور دوسری طرف اسے قوم پرستوں کی اس اندرونی تحریک کا سامنا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر مصدق نے ۱۹۳۵ میں کمیونسٹ پارٹی کی مدد سے شاہ کا تختہ الٹ دیا۔ کمیونسٹ پارٹی کو روس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ پہلے عام تاثر یہ تھا کہ روس کی پشت پناہی کی وجہ سے ڈاکٹر مصدق اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مختصر سے عرصے کی جلاوطنی کے بعد شاہ نے امریکی سی' آئی' اے اور برطانوی انٹیلجنس کی مدد سے مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ کو اس حقیقت کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ اگر اسے اس ملک پر اپنی حکمرانی قائم رکھنی ہے تو اسے طاقتور بن کر رہنا ہو گا۔ اس کے بعد ہی شاہ نے ملک میں اسلحہ کے ڈھیر لگانا شروع کر دیے تھے۔

میری ماں کا شمار ان خواتین میں کیا جا سکتا ہے جو ہر حال میں خوش رہتی ہیں' جب کبھی وہ گاؤں جاتی تو شوہر کے کام میں ہاتھ بٹاتی۔ فرانسیسی' انگریزی' ایرانی' ترکی زبانوں پر اسے عبور حاصل تھا' دوسرے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اسے اس کی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ فیشن ایبل لباس پہنتی تھی' وہ میرے والد کے ساتھ اکثر یورپی ممالک کی سیر و تفریح کے لئے جایا کرتی تھی اور جب وہ واپس آتی' نئے فیشن ایبل ملبوسات اور زیورات سے لدی پھندی ہوتی۔ میں نے ماں کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا' وہ روشن خیال اور ترقی پسند عورت تھی اور میں بھی بڑی ہو کر اس جیسی بننا چاہتی تھی۔

انہی دنوں میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ ملک میں جیسے جیسے جدیت آ رہی تھی ویسے ویسے ہی عورتوں میں نمایاں تبدیلیاں آ رہی تھیں' بڑے گھرانوں کی عورتیں اس قدر بدل چکی تھیں کہ عام ایرانی عورتوں اور ان میں زمین آسمان کا فرق نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا' بڑے گھرانوں کی فیشن ایبل عورتوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن میری ماں کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ مذہبی علماء مغربیت کی کھلم کھلا مخالفت کر رہے تھے لیکن میری ماں جیسی عورتوں کو ان کی بھی پروا نہیں تھی۔ انہیں شاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور شاہ مذہب کے ٹھیکیداروں کے خلاف اس جنگ میں ان کے ساتھ تھا۔

شہر کے دوسرے دولت مندوں کی طرح میرے نانا نے بھی شہران میں ایک خوبصورت ولا بنا رکھا تھا' اس کے چاروں

طرف وسیع رقبے پر باغ تھا جسے اونچی چار دیواری نے گھیر رکھا تھا' شمران کے ہر سمر ہاؤس کے گرد اس قسم کی فصیل موجود تھی تاکہ بیرونی مداخلت سے بچا جا سکے۔ شمران' تہران کے شمال میں ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے' پہلے یہ علاقہ ویران اور بیابان ہوا کرتا تھا' لیکن یہ طبقہ امراء کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بیشتر لوگوں نے یہاں عیاشی کے لئے سمر ہاؤس بنا رکھے تھے۔ دوسروں کی طرح ہم بھی گرمیوں کا موسم شمر ہاؤس ہی میں گزارتے تھے جہاں شام کو رنگین محفلیں جمنا شروع ہو جاتیں جو رات گئے تک جاری رہتیں ہم جب تک سمر ہاؤس میں رہتے' مہمانوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا۔

ہمارے خاندان میں نانی کے علاوہ کسی کو مذہب سے لگاؤ نہیں تھا' نانی رجیعہ نماز پڑھنے مسجد میں بھی جایا کرتی تھی اور ملاؤں سے اس کی راہ و رسم بھی تھی' لیکن خاندان کی باقی افراد نے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں کچھ باشر بھی تھے' ایک مخصوص طبقے پر ان کا دباؤ بھی تھا لیکن بیشتر کی حالت بھکاریوں سے بھی بدتر تھی' وہ روٹی گھروں سے مانگ کر کھاتے ان کا میلا کچیلا لباس دیکھ کر عجیب سی کراہیت محسوس ہوتی' ہم نے کبھی کسی ملا کو اپنے گھر میں مدعو نہیں کیا تھا۔ ان کے ساتھ یہ نفرت انگیز طرز عمل صرف نچلے طبقے تک محدود تھا جبکہ درمیانے اور اونچے طبقے میں انہیں بڑی پذیرائی حاصل تھی۔

میرے ماموں نے بھی شمران میں اپنے سمر ہاؤس بنوا رکھے تھے' بڑے ماموں کا سمر ہاؤس تو نانا کے سمر ہاؤس سے ملحق تھا۔ ہم اکثر شام کو نانی رجیعہ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے وہاں چلے جاتے۔

یہ اپریل ۱۹۹۰ء کی بات ہے' ہم حسب معمول سمر ہاؤس میں تھے' مہمانوں میں میرے علاوہ چند اور بچے بھی شامل تھے شعروشاعری کی محفل جاری تھی کہ نانی رجیعہ نماز پڑھنے کے لئے اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہم بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے' کیونکہ نانی سونے سے پہلے ہمیں بڑی اچھی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ ہمارا انتظار طویل ہو رہا تھا ہماری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ نانی نے آج نماز میں خلاف معمول کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ہم تین چار بچے انہیں لینے کے لئے اوپر چلے گئے۔

نانی جائے نماز پر سجدے میں تھیں۔ ہم چند منٹ قریب کھڑے انتظار کرتے رہے لیکن جب دیر تک نانی نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا تو ہم نے انہیں آوازیں دیں۔ تین چار مرتبہ پکارنے پر بھی نانی نے حرکت نہیں کی تو ہم نے نیچے جا کر اطلاع دی۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

نانی رجیعہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھی۔ گھر والوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کیا ہوا ہوگا۔ میرے ایک ماموں دوڑ کر تہران سے ڈاکٹرز کو بلا لائے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ نانی کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے اور وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ہم سے جدا ہو گئی تھی۔

نانی کے انتقال کے دو سال بعد میرے نانا محمود سلمان کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا خاندان بکھرنے لگا۔ میرے تمام ماموں الگ ہو گئے۔ نانی کے حویلی نما مکان میں ہم صرف چار افراد ہی رہ گئے' میں اور میرا چھوٹا بھائی' سائرس' میرا ماموں فائق اور میری والدہ۔ اتنا بڑا مکان اب ہمیں کاٹنے کو دوڑ رہا تھا کچھ عرصے بعد ہم نے وہ مکان فروخت کر دیا اور ایک کشادہ اپارٹمنٹ خرید لیا جو ہماری ضرورت کے لئے کافی تھا۔

میں گیارہ سال کی ہو چکی تھی اور ایک اطالوی اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ یہاں عیسائیت کا درس تو دیا جاتا تھا لیکن اسلامی تعلیمات کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنے آبائی دین کے بارے میں بالکل لاعلم رہی' گھر کا ماحول بھی مغربی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور غالباً گھر والوں کو بھی میری مذہبی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک روز جب میں اسکول سے واپس آ رہی تھی تو یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میری ماں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی لیکن اس کی صحت دن بدن گر رہی تھی' اسے پیٹ میں اکثر درد کی شکایت رہتی تھی۔ بعض اوقات تو یہ درد اس قدر شدت اختیار کر جاتا تھا کہ وہ تڑپنے لگتی۔ ایک ڈاکٹر نے اسے السر بتایا لیکن جب ایک اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا تو اس نے یہ خوفناک انکشاف کیا کہ کینسر ہے۔ میری والدہ اور ماموں فائق اسے یورپ لے گئے' لیکن مغرب کی ترقی یافتہ میڈیکل سائنس بھی اس کی کوئی مدد نہ کر سکی اور دو مہینے سوئیزرلینڈ میں رہنے کے بعد اسے واپس لے آئے۔

مارچ میں والدہ کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ والد نے ان کی دن رات دیکھ بھال کے لئے دو نرسوں کا انتظام کر دیا تھا۔ قریب دور کے رشتے دار والدہ کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ ہمارا اپارٹمنٹ ایک بار پھر خاندان کا مرکز بن گیا تھا' والدہ کی حالت بعض اوقات اس قدر بگڑ جاتی کہ وہ کسی کو پہچان بھی نہ پاتی۔ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی سائرس کو خالہ طوطی کے گھر منتقل کر دیا گیا تھا تاکہ بعض مہمانوں کے رونے دھونے سے ہم کوئی منفی اثر قبول نہ کریں۔

اپریل شروع ہو گیا تھا' بہار کی آمد کے ساتھ ہی فضا مسکرا اٹھی تھی لیکن فضا کی یہ مسکراہٹ اور بہار کی رنگینیاں ہمارے لئے نہیں تھیں' ہمارے مقدر میں تو کچھ اور تھا۔ میں اس روز بیلے کی کلاس اٹنڈ کرنے کے بعد خالہ طوطی کے گھر واپس پہنچی تو بہت خوش تھی' اس روز مجھے والدہ کے پاس جانا تھا اور میرا خیال تھا کہ شوفر ہمیں لینے کے لئے پہنچ چکا ہوگا

لیکن جب بہت دیر تک وہ نہیں آیا تو میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی مجھے ریسیور پر کسی مولوی کی آواز سنائی دی جو قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا میں قرآنی آیات کا مفہوم تو نہیں سمجھی لیکن صورتحال کا اندازہ لگانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ سائرس میرے قریب ہی کھڑا تھا' وہ چند لمحے تو متوحش نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھی رونے لگا۔

میری پھوپھی اشرف جب مجھے لینے کے لے آئی تو وہ سیاہ لباس میں تھی۔ میں بری طرح بے حال ہو رہی تھی' میں نے پھوپھی کا سیاہ لباس نوچنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ مجھے کسی نہ کسی طرح گاڑی میں ٹھونس کر گھر لے آئے۔ بلڈنگ کے سامنے گاڑی رکتے ہی میں چھلانگ لگا کر اتری اور دوڑتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ اپنے والد اور دوسرے رشتہ داروں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں والدہ کی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ مسہری پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں تکیے میں چہرہ چھپا کر رونے لگی پھر اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر اکثر ممی بیٹھا کرتی تھی میں پاگلوں کی طرح روتے ہوئے مختلف چیزوں کو اٹھا اٹھا کر چوم رہی تھی جیسے ہر چیز سے ممتا کی خوشبو آرہی ہو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک پاگلوں کی سی حرکتیں کرتی رہی۔ پھر میرے والد نے مجھے کندھوں سے پکڑ لیا اور بری طرح جھنجوڑنے لگے لیکن میں کسی طرح قابو میں نہیں آرہی تھی بالآخر مجھے نیند کا انجکشن دے دیا گیا۔ ماں کی جدائی کا یہ المناک حادثہ اپریل ۱۹۶۶ء میں پیش آیا تھا۔

والدہ کے انتقال کے بعد میرا باپ ہمارے بارے میں پریشان رہنے لگا۔ سائرس صرف چھ سال کا تھا اور میں بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھنے والی تھی۔ ممکن ہے یورپ میں اس صورت حال کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی ہو لیکن مشرق میں جب لڑکی جوان ہو رہی ہو اور ماں کا سایہ بھی نہ ہو تو باپ کے لئے یہ صورت حال کتنی سنگین ہوتی ہے۔

ہمیں صیہالون بھی نہیں لے جایا جا سکتا تھا کیونکہ وہاں تعلیم کا مناسب انتظام نہیں تھا۔ خالہ طوطی نے ہمیں اپنے گھر لے جانے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اس کی سرد مہری پسند نہیں تھی۔ اس کے ہاں چند روز رہنے ہی سے میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے بچوں سے تو بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن ہماری اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

میرے والد نے میرے سامنے دو تجویزیں رکھی تھیں۔
پہلی تو یہ کہ میں فرانس کے بورڈنگ اسکول میں داخلہ لے لوں دوسری یہ کہ میں شمالی امریکا میں اپنے ماموؤں میں سے کسی ایک کے پاس چلی جاؤں۔ میرے ماموں اردشیر' امیر اور داریوس مستقل طور پر امریکا ہی میں آباد تھے اور میری والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔

میں بری طرح بوکھلا کر رہ گئی تھی' یہ تو میں نے سوچا تھا کہ اپنی دوستوں اور کزنز کی طرح میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک سے باہر جاؤں گی لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح جلا وطن ہونا پڑے گا' امریکا کے بارے میں' میں نے پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کیونکہ وہ فرانس سے بھی بہت دور تھا' والدین کے ساتھ سیرو تفریح کے لئے ایک مرتبہ وہاں جا چکی تھی اور اب تو میں اس کی یاد بھی بھول گئی تھی لیکن اس کے برعکس فرانس میرے لئے قطعی اجنبی تھا' امریکا میں میرے .... کم از کم کچھ رشتے دار تو موجود تھے جو میرا سہارا بن سکتے تھے بالآخر میں نے ریاست مشی گن کے شہر این آربر جانے کا فیصلہ کر لیا یہاں ماموں امیر رہائش پذیر تھا وہ ایک ماہر دندان ساز تھا۔

۱۵ جولائی ۱۹۶۶ کی صبح میں تہران ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ میرے والد' خالہ طوطی' ماموں فائق اور بعض دوسرے عزیز مجھے رخصت کرنے آئے تھے' اس سے ایک رات پہلے جب میں اپنا سامان پیک کر رہی تھی میرے والد نے میرے کمرے میں آکر ایک خوبصورت تحفہ دیا تھا۔ یہ سونے کی چین تھی جس میں گول طلائی سکہ آویزاں تھا اور اس سکے پر اللہ لکھا ہوا تھا۔

"اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔" والد نے چین میرے گلے میں پہناتے ہوئے کہا" تم ایک ایسے ملک میں جا رہی ہو جو ہر لحاظ سے ایران سے بہت مختلف ہے' وہ مسلمان ملک نہیں ہے لیکن یہ زنجیر تمہیں ہمیشہ اپنے مسلمان ہونے کا احساس دلاتی رہے گی۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا اور اگر وہاں تمہارا دل نہ لگے تو بے شک واپس چلی آنا۔"

جہاز میں بیٹھنے کے بعد ہی میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کب واپس آؤں گی۔ امریکا کے بارے میں میرے خیالات بڑے عجیب تھے۔ یہی وہ ملک تھا جس نے میرے ماموں کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں' وہ تعلیم حاصل کرنے گئے تھے اور وہیں کے ہو رہے تھے۔ یہی وہ ملک تھا جہاں ہر چیز میں جدیدیت تھی یہاں کا انسان سائنس کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔

جہاز بہت بڑے پرندے کی طرح فضا کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔

یہ بالکل نیا جہاز تھا جس کی دم پر ہما کا نشان بنا ہوا تھا' ایرانی ایئرلائن کا امتیازی نشان' مجھے خوشی تھی کہ یہ خوبصورت جہاز ایران کی ملکیت تھا۔

میں ایک بار پھر امریکا کے بارے میں سوچنے لگی جس کی تہذیب پہلے ہی ہماری سرزمین پر قدم جما چکی تھی اور اب میں خود وہاں جا رہی تھی۔ تہذیب سے آشنا ہونے کے باوجود وہ

سرزمین میرے لئے اجنبی تھی۔

○☆○

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ این آربر میں مکانوں کے گرد چار دیواری کا رواج نہیں تھا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر کسی بھی مکان کے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔ آپ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سامنے والے گھر میں ٹی وی پر آنے والے پروگرام دیکھ سکتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کو کسی سے کوئی چیز چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اس کے برعکس، ایران میں صدیوں کی قتل غارت گری کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ وہاں ہر چیز دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے ایران میں بدشمنن قبائل بکھرے ہوئے تھے، ان قبایل کی تاریخ قتل و غارت سے بھری پڑی تھی آخر کار بارہ سالہ سائرس اعظم نے انہیں متحد کر کے ایک باقاعدہ حکومت کی بنیاد رکھی، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سائرس اعظم ایران کا پہلا بادشاہ تھا، ۳۳۰ قبل مسیح میں مقدونیا کے سکندر اعظم نے جب ایران پر حملہ کیا تو یہ سائرس اعظم ہی تھا جس نے یونانیوں کو مار بھگایا تھا۔ اس کے بعد تو کئی صدیوں تک ایران غیر ملکی حملہ آوروں کا تختہ مشق بنا رہا، یہاں ترکوں نے بھی حکومت کی اور خونخوار منگول بھی برسرِ اقتدار رہے۔

اور غالباً ان حملہ آوروں کی وجہ سے ایران میں مکانوں کے گرد چار دیواری کی تاریخ بھی صدیوں پرانی ہے۔ مکانوں کے گرد چار دیواری اس لئے بنائی جاتی تھی کہ مکان اور اس کے اندر موجود چیزوں کو دوسروں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھا جائے۔ یہاں تک کے ایرانی اپنے باغات کو بھی دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے چار دیواری تعمیر کراتے تھے اور یہ رواج آج بھی موجود ہے لیکن امریکا کے اس قصبے این آربر میں صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔

ایران میں امریکا کے بارے میں جو کچھ سوچا جاتا تھا وہ اس کے عین مطابق تھا، میرے دو ماموں امیر اور اردشیر این آربر میں رہائش پذیر تھے جبکہ ماموں داریوس لاس انجلس میں تھا، یہ لوگ اگرچہ امریکی معاشرے کا ایک حصہ بن چکے تھے لیکن انہوں نے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی تھی، ماموں امیر جس کے ساتھ مجھے رہنا تھا، ایک دندان ساز تھا، اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا، اس کا وسیع و عریض مکان ایک سرسبز پہاڑی پر تھا۔ مکان کے ہر کمرے میں ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز کا شمار بھی ایرانی آرٹ کے شہ پاروں میں ہوتا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز سے ایرانی تہذیب کی جھلک نظر آتی تھی، ماموں امیر کے امریکی دوست اس مکان کو ایرانی محل کہا کرتے تھے۔

امریکا کے بارے میں، میں بالکل ہی ناآشنا نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ہر چیز میرے لئے حیرت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ایک بٹن دبانے میں پورے گھر میں موسیقی کی مدھر دھنیں بکھر جاتیں۔ میں اپنے بیڈ روم میں بیٹھی کچن میں موجود ممانی ثریا سے باتیں کر سکتی تھی، سردیوں میں چوبیس گھنٹے گرم پانی دستیاب تھا، اور بجلی کی تو غالباً کسی کو پرواہ نہیں تھی، بعض بتیاں دن رات جلتی رہتی تھیں جبکہ تہران کے دولت مند گھرانوں میں بھی فالتو بتیاں بجھادی جاتی تھیں۔ یہاں سردیوں میں مکان کا ہر کمرا گرم رہتا۔ گھر میں رہتے ہوئے کوئی گرم کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ تہران میں ہم گھر کے اندر بھی بھاری سوئیٹر پہنے رہتے تھے، دولت مندوں کے گھروں میں تو پھر بھی کمروں کو گرم رکھنے کا انتظام موجود تھا لیکن غریب لوگ رات رات بھر سردی میں ٹھٹھرتے رہتے تھے۔

تہران میں ہمیں شاپنگ کے لئے کئی دکانوں پر گھومنا پڑتا تھا لیکن یہاں ایک ہی سپر مارکیٹ میں ہر چیز دستیاب تھی، ہر چیز دستیاب ہونے کے باوجود میرے ماموں اکثر لوگوں کے ہاتھ ایرانی چیزیں منگواتے رہتے تھے۔

چند روز تک تو میں خوب سیر و تفریح کرتی رہی لیکن پھر ماموں نے مجھے اسکول میں داخل کرادیا تھا، ماموں امیر کے دو بیٹے اینڈی اور الیکس امریکا ہی میں پیدا ہوئے تھے اور وہ فارسی زبان سے قطعی نابلد تھے، شروع میں تو مجھے بڑی الجھن ہوئی لیکن بعد میں اس کی عادی ہو گئی۔ امریکا میں میرے لئے اجنبیت کا احساس بہت زیادہ تھا، میرے ایران میں جب دو اجنبی بھی ملتے ہیں تو ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ ضرور دیتے ہیں جس سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک سال بعد میرے بھائی سائرس کو بھی امریکا بھیج دیا گیا، اس کی عمر اس وقت سات سال تھی، وہ چند روز ہمارے پاس رہا پھر اسے ماموں داریوس کے پاس لاس انجلس بھیج دیا گیا۔

میری زندگی بڑے عجیب راستے پر چل رہی تھی، میں ایران اور امریکی تہذیب کا مکسچر بن کر رہ گئی تھی، ان طویل برسوں میں ایک لمحے کو بھی ایران کو نہیں بھول سکی تھی بالآخر جب میں سولہ سال کی ہوئی تو ماموں امیر نے بتایا کہ اب میں چھٹیاں گزارنے کے لئے جا سکتی ہوں۔

واپس ایران آکے مجھے عجیب سا لگا، میں سیدھی صبالون آئی تھی، میرے رشتے دار مجھ سے ملنے کے لئے دور دور سے آرہے تھے۔ تہران میں میری ایک دوست ثمن، جو ایک جنرل کی بیٹی تھی، اس کو جب پتا چلا کہ میں یہاں آئی ہوئی ہوں تو وہ دوسرے ہی روز صبالون پہنچ گئی۔

تہران ہی میں نہیں میں نے صبالون اور رضائیہ میں بھی بعض تبدیلیاں نمایاں طور پر محسوس کی تھیں۔ صرف تین

سال پہلے جہاں بے پردگی کو سنگین جرم سمجھا جاتا تھا اب وہاں چادر کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا' جوان لڑکیاں منی بلاؤز اور منی اسکرٹ پہننے لگی تھیں' شراب خانوں کی مقدار پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور لاتعداد نائٹ کلب وجود میں آچکے تھے جہاں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی زندگی کے ہنگامے شروع ہو جاتے اور صبح تک جاری رہتے۔

میرے لئے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا لیکن مجھے زیادہ دن رہنے کا موقع نہیں مل سکا اور چھٹیاں ختم ہوتے ہی میں واپس امریکا آگئی۔ مزید دو سال بعد مجھے لاس اینجلس بھیج دیا گیا جہاں میں نے ورڈبیری کے کالج میں ڈیزائننگ کی کلاس میں داخلہ لے لیا' لاس اینجلس آنے کے بعد پہلی مرتبہ پتا چلا کہ آزاد زندگی کیا ہوتی ہے' ماموں داریوس کے گھر میں مجھے زیادہ آزادی حاصل تھی' دوستوں سے ملنے ملانے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی' میرے دوستوں میں زیادہ تعداد ایرانی اسٹوڈنٹس کی تھی۔ بہت سے ایرانی شاہ کی طرف سے فراہم کردہ وظائف سے بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

لاس اینجلس کی آب و ہوا بڑی حد تک تہران سے ملتی جلتی تھی۔ جس سے میری صحت بھی ٹھیک ہو گئی' یہاں رہتے ہوئے میں زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو رہی تھی' میں ایرانی اسٹوڈنٹس کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔

ایک دن میں ایک امریکی پروفیسر کا لیکچر سننے چلی گئی' جو حال ہی میں ایران کا تفصیلی دورہ کر کے آیا تھا' اس کے لیکچر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ پہلی مرتبہ اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عام ایرانی بھکاری سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ملک کی دولت صرف دو سو خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ دو سو خاندان عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے جبکہ عام آدمی نان و شبینہ تک کو محتاج تھا۔ ایران کی ستر فیصد آبادی تعلیم سے محروم تھی۔

ان دولت مند خاندانوں میں میرے ننھیال اور ددھیال کے خاندان بھی شامل تھے لیکن ان کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ہمیشہ یہ دیکھا تھا کہ انہوں نے کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ کسانوں کو ان کا حصہ دیا جاتا اور ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔ لیکن آج اس امریکی پروفیسر سے جو کچھ سنا تھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے اور میں سوچنے لگی تھی کہ ان کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ جن کی حق تلفی ہو رہی تھی۔

لیکچر سننے کے بعد میں چند ایرانی دوستوں کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھ گئی۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس رخ پر سوچ رہے ہیں۔ شاہ ایران کے بارے میں ان کے خیالات اچھے نہیں تھے۔

"وہ بدعنوان ہے' وہ اپنی رعایا کا حق غصب کر کے ان پر ظلم کر رہا ہے' اس نے پریس پر پابندی عائد کر رکھی ہے تاکہ اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی جا سکے۔" ایک نوعمر ایرانی لڑکے نے کہا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ یہ لوگ شاہ کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن اسے برا کہہ رہے تھے صرف اس ایک لڑکے پر کیا منحصر میں نے جس ایرانی لڑکے سے بھی بات کی اس نے شاہ کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

"ہم شاہ کی مخالفین کی لسٹ میں آچکے ہیں۔" ایک اور لڑکے نے انکشاف کیا۔

"اس قسم کی پارٹیوں میں جو آتا ہے ساوک کے ایجنٹ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔"

"میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ جب شاہ کی سیکرٹ پولیس ساوک کا ذکر آتا یہ ایرانی اسٹوڈنٹ بری طرح بدحواس ہو جاتے۔ ایک افواہ یہ تھی بھی کہ امریکا میں تعلیم کے دوران شاہ کے خلاف سرگرمیوں ملوث کوئی طالب علم جب اپنے وطن واپس جاتا تو ایران کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے گرفتار کر لیا جاتا' بعض لڑکوں کے گھروں کو تو یہ بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں گیا اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا' مزید براں اس کے گھر والوں کو بھی طرح طرح سے ہراساں کیا جاتا' اگرچہ ان کہانیوں میں کچھ مبالغہ آرائی بھی تھی لیکن نہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید اس لئے میرے گھر والے بھی میرے لئے پریشان تھے زیادہ پریشانی میرے ننھیال والوں کو تھی جنہوں نے لمبی چوڑی جائدادیں بنا رکھی تھیں اور سرکاری ٹھیکے بھی لیتے تھے۔

لاس اینجلس میں ان ایرانی اسٹوڈنٹس نے مجھے سیدھا سادہ سمجھ کر مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں' وہ مجھے شاہ کے خلاف بھڑکاتے رہتے اور مجھے مشورہ دیتے کہ واپس ایران جانے کے بعد میں ان کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر شاہ کے خلاف ایک لابی تیار کروں اور عوام کے حقوق پریس کی آزادی اور ساوک جو شاہ کی طاقتور ہتھیار تھی' کے خاتمہ کا مطالبہ کیا جائے۔

شاہ ۱۹۰۶۔۱۹۰۷ء کے چارٹر کے تحت ایران کا آئینی بادشاہ تھا جسے بے پناہ اختیارات حاصل تھے' وہ کابینہ میں رد و بدل کے علاوہ اسے برطرف بھی کر سکتا تھا اور اسے کسی بھی بڑے سے بڑے فوجی یا سول آفیسر کو وجہ بتائے بغیر برطرف کر دینے کے اختیارات حاصل تھے' وہ چشم زدن میں پارلیمنٹ یا ہر اس قانون کو ختم کر سکتا تھا جس سے اسے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتا۔

مجھے ان ایرانی اسٹوڈنٹ سے اختلاف تھا۔ میرے قریبی رشتہ داروں کے چونکہ شاہی خاندان سے قریبی تعلقات تھے اس لئے میں سمجھتی تھی کہ شاہ اتنا ظالم نہیں تھا جتنا

اسٹوڈنٹس بیان کررہے تھے' میں تھوڑا بہت سیاست کو سمجھنے لگی تھی' اور میرا خیال تھا کہ بعض غیر ملکی طاقتیں شاہ پر اپنا کنٹرول رکھنے کے لئے اسے اپنے عوام سے دور رکھے ہوئے تھیں' میں زیادہ عرصے تک ایرانی طالب علموں کے ان جلسوں میں شامل نہیں ہو سکی کیونکہ میرے ماموؤں کو بھی پتا چل گیا تھا اور انہوں نے مجھے سختی سے منع کردیا تھا۔

میں ایک بات کا ذکر کرنا تو بھول ہی گئی۔ مجھے لاس اینجلس آئے ہوئے ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے' ان دنوں ماموں کے ایک دوست کا گھر میں بڑا آنا جانا تھا' چند ہی روز بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کی آمدورفت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ جب بھی آتا زیادہ تر' میرے گرد ہی منڈلاتا رہتا' مردوں سے میل ملاقات کا میرا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن میں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ مجھ میں اس کی دلچسپی بلاوجہ نہیں تھی۔ ایک روز اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اظہار محبت بھی کردیا لیکن میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے چند ہی روز بعد انکشاف ہوا کہ اس نے کسی اور لڑکی سے شادی کرلی تھی' کیونکہ وہ لڑکی اس کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی اور اسے دباؤ کے تحت اسی لڑکی سے شادی کرنا پڑی تھی۔

ایک روز جبکہ میں گھر میں اکیلی ہی تھی وہ آگیا۔ وہ عام طور پر ایسے موقعوں کی تلاش میں رہا کرتا تھا' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی تمہید کے بغیر بولا "سوسن! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی یہ عجیب وغریب فرمائش سن کر میں ایک لمحے کو سکتے میں رہ گئی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی' میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن میں تو تمہیں اپنے بھائی کی طرح سمجھتی ہوں اور پھر تم شادی شدہ ہو۔"

"تم اس کی پروا مت کرو۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ میں تو تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں" کہنے کے ساتھ ہی اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے گرفت میں لے لیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی مرد نے مجھے اس طرح پکڑا تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ میرا بوسہ لینا چاہتا تھا لیکن میں ایک دم جیسے ہوش میں آگئی اور میں نے اسے پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔

"اچھی طرح سوچ لو سوسن! میں پھر واپس آؤں گا' اور یہ بات جان لو کہ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

میں اس قدر خوفزدہ تھی کہ میں نے اس واقع کا ذکر اپنے ماموں سے بھی نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص مجھے تنہا پاکر جذبات میں آگیا تھا۔ شاید اس کا یہ خیال تھا کہ میں پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں گر جاؤں گی لیکن میں نے جو سخت رویہ اختیار کیا تھا اس سے میرا خیال تھا کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا وہ بہت ڈھیٹ اور بے غیرت آدمی تھا وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب وہ سمجھ گیا کہ میں اس کے ہاتھ آنے والی نہیں تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لو سوسن! کہ میں تمہیں حاصل کرکے ہی رہوں گا" ایک روز اس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا "اور اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہارے ماموں کو ایسی ایسی باتیں تمہارے بارے میں بتادوں گا کہ تم ایک لمحے کو بھی یہاں نہیں رہ سکو گی۔"

پہلے تو میں نے اس کی دھمکی کا زیادہ اثر نہیں لیا۔ وہ میرے ماموں کو میرے بارے میں کیا بتائے گا؟ میرے اندر کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا راز کھل جانے کا خوف ہوتا جس کی بنا پر مجھے بلیک میل کیا جاسکتا ہو لیکن یہ بات ضرور تھی کہ میں تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی اور کسی سمسٹر میں بھی اچھا گریڈ حاصل نہیں کیا تھا جبکہ ماموں امیر کو میری تعلیم کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ یہ ضرور ہوسکتا تھا کہ اس صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد ماموں مجھے دوبارہ این آربر بلوالیتا۔

لیکن میں نے اس عاشق کا مقابلہ جاری رکھا۔ یہ صورت

کتنی دفعہ

ایک صاحب اپنی بیوی کے لئے ساڑی خریدنے گئے۔ وہ اسے اس کی سالگرہ پر تحفہ دینا چاہتے تھے۔ ساڑی خریدنے کے بعد انھوں نے دکاندار سے خجالت آمیز انداز میں کہا "معاف کیجئے گا اگر میری بیوی کو یہ ساڑی پسند نہ آئی تو کیا آپ اسے تبدیل کردیں گے؟"

دکاندار بولا "بڑی خوشی سے جناب مگر کتنی دفعہ؟"

جاوید احسن کاظمی۔ امریکا

حال میرے لئے خاصی سنگین تھی ۔ میں کسی کو اس سلسلے میں
کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی ۔ اور یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ وہ
کم بخت میرے ماموں کو میرے بارے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ
ڈالے ۔ اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا' اس روز صبح سویرے
ہی این آربر سے ماموں کا فون آگیا ۔

"سوسن! تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے' تعلیم میں
تمہاری عدم دلچسپی میرے لئے بے حد پریشان کن ہے' اور
اب مزید سننے میں آرہا ہے کہ تم ایسی سرگرمیوں میں حصہ لے
رہی ہو جو نہ صرف تمہارے لئے بلکہ ہمارے لئے بھی
نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں' اس سمسٹر میں اگر تم نے اے یا بی
لیول حاصل نہ کیا تو تمہیں ایران بھیج دیا جائے گا' ہم تمہارے
لئے جو کچھ کر سکتے ہیں اس میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی
لیکن تم ہمیں اس کا کیا صلہ دے رہی ہو؟"

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ
میرے خلاف ماموں امیر کو یہ رپورٹ کس نے دی ہو گی' لیکن
اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ میں اس خبیث
کے بارے میں کسی کو بتا سکوں ۔ کوئی بھی میری بات کا یقین نہ
کرتا دوسرے سمسٹر کے لئے میں نے محنت شروع کر دی لیکن
پچھلے دنوں کی کلاسیں اٹنڈ نہ کرنے کے باعث میں اپنا کورس
کور نہ کر سکی اور پھر پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میں ایران
واپس جانا نہیں چاہتی کیونکہ یہاں جو کچھ تھا ایران میں نہیں
تھا' ایران میں رہتے ہوئے میں ڈیزائننگ کی پریکٹس بھی
جاری نہیں رکھ سکتی تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ
ایران میں رہوں گی کہاں؟ والد کے پاس گاؤں میں رہتے
ہوئے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی ۔ وہاں تو شام کا اندھیرا
پھیلتے ہی زندگی اونگھنے لگتی تھی ۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ
امریکا میں رہتے ہوئے میں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ ضائع
ہونے والا ہے ۔

جب رزلٹ سامنے آیا تو میں کانپ کر رہ گئی ۔ میں
بمشکل سی گریڈ حاصل کر سکی تھی ۔ رزلٹ کے ساتھ ہی مجھے
لاس اینجلس سے این آربر بھیجنے کی تیاری ہونے لگی' رخصت
ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میرا عاشق بھی پہنچ گیا ۔

"اگر اب بھی تم مجھ سے شادی کا وعدہ کر لو تو تمہیں روک
لیا جائے گا" اس نے کہا "یہ تو تم دیکھ ہی چکی ہو کہ میں جو کچھ
کہتا ہوں اسے کر دکھانے کی قوت بھی رکھتا ہوں ۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی ۔ پھر بے اختیار
میرا ہاتھ حرکت میں آیا اس کے منہ پر پڑنے والا طمانچہ خاصا
زوردار تھا ۔

این آربر آنے کے ایک ہفتے بعد مجھے ایران واپس بھیجے
جانے کی باتیں ہونے لگیں ۔ ماموں امیر کا خیال تھا کہ اب میرا
یہاں رہنا بے کار ہو گا اور ایک روز موقع پا کر جب میں نے اس
شخص کے بارے میں بتایا تو توقع کے عین مطابق کسی نے
میری بات کا یقین نہیں کیا یا پھر یہ بات تھی کہ وہ لوگ چونکہ
مجھ سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے میری کوئی بات سننے کو تیار
نہیں تھے ۔ اگر میں نے سمسٹر میں اچھے نمبر حاصل کئے
ہوتے تو شاید مجھے معاف کر دیا جاتا ۔ یہ بات تو مجھے بعد میں
معلوم ہوئی تھی کہ ماموں اور ماں کا پروگرام یہ تھا کہ مجھے
تھوڑے عرصے کے لئے ایران بھیج دیا جائے اور پھر واپس بلا لیا
جائے لیکن بعد میں کسی وجہ سے وہ اپنے اس پروگرام پر عمل
نہیں کر سکے ۔ اور اگر وہ مجھے بلاتے تو بھی میں واپس نہ جاتی
کیونکہ اپنی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میری آنکھ حیرت کی زیادتی
سے کھلی کی کھلی رہ گئیں' تیل کی دولت سے مالا مال ایران اب
بہت بدل چکا تھا اور مجھے خوشی تھی کہ میرا ملک کسی بھی ترقی
یافتہ ملک کا مقابلہ کر سکتا تھا اب یہاں بھی وہ سب کچھ موجود تھا
جس کی خواہش کی جا سکتی تھی ۔

○☆○

وہ جولائی کی ایک روشن اور چمکتی ہوئی صبح تھی جب میں نہ
نے تہران ایئرپورٹ پر لینڈ کیا ۔ اس وقت میں اٹھارہ سال کی
ہو چکی تھی ۔ جب میں یہاں سے گئی تھی تو میں بچی تھی ۔ بیچ
میں چند... روز کے لئے ایک مرتبہ آنے کا موقع ملا تھا لیکن
میں صرف صبیالون تک محدود رہی تھی' اور اب ایئرپورٹ
سے باہر آتے ہی میں نے بہت سی خوشگوار تبدیلیوں کو
محسوس کر لیا تھا ۔ شہر کے داخلی راستے پر ایک بلند و بالا ٹاور دیکھ
کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکی' اس کی خوبصورت محرابوں پر لگی
ہوئی ٹائلیں دھوپ میں چمک رہی تھیں ۔

"ارے! یہ کیا ہے؟" میں نے کار میں اپنے ساتھ بیٹھے
ہوئے باپ سے پوچھا ۔ باپ کے علاوہ اور بھی قریبی عزیز مجھے
لینے کے لئے ایئرپورٹ پہنچے ہوئے تھے ۔

"وہ شاہ یاد ہے" باپ نے جواب دیا "شہنشاہیت کی یہ
یادگار شاہ نے تعمیر کروائی ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارا ملک
اس قسم کی عیاشیوں کا متحمل ہو سکتا ہے ۔"

خوزستان میں تیل کے کنوؤں کی بدولت ۱۹۷۳ء میں
ایران کا شمار دنیا کے دولت مند ممالک میں ہونے لگا تھا لیکن
اس سال عرب اسرائیل جنگ نے تو ایران پر دولت کی بارش
کر دی تھی ہر طرف ہن برسنے لگا تھا ۔ شاہ نے مصر کی بھرپور
حمایت کا اعلان کر دیا تھا اور دوسرے عرب ممالک کی طرح
اسرائیل کے اتحادیوں کے خلاف تیل کو ہتھیار کے طور پر
استعمال کرنا شروع کر دیا تھا ۔ جس کے نتیجے میں تیل کی قیمتیں
ڈرامائی انداز میں آسمان تک پہنچ گئی تھیں ۔ تیل سے ایران کی
آمدنی پانچ بلین سے بیس بلین ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی ۔ ایران
جو صدیوں سے غربت اور جہالت کے اندھیروں میں پھنسا ہوا
تھا اب ایک دولت مند ملک تھا ۔ ۱۹۵۰ء تک ایران کے تیل

کے کنوؤں پر غیر ملکی طاقتوں کا قبضہ تھا اس وقت ایران کی عوام
نانِ شبینہ کے محتاج تھے لیکن اب یہ ساری دولت ان کی تھی۔
تاریکی کے سائے چھٹ گئے تھے اور اب ہر طرف روشنی
پھیلنے لگی تھی۔

میں جس طرح امریکا سے واپس بھیجی گئی تھی اس کا مجھے
پوری طرح احساس تھا لیکن یہاں آنے کے بعد یہ سنسنی خیز
انکشاف ہوا کہ میرے بارے میں بعض خوفناک افواہیں مجھ
سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھیں' ایک افواہ تو یہ تھی کہ میں شاہ
کے مخالفین پارٹی میں شامل ہوگئی ہوں اور امریکا میں قیام کے
دوران خلاف شاہ سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتی رہی ہوں
ایک افواہ یہ تھی کہ میں نے منشیات کا استعمال شروع کردیا تھا اور یہ
کہ بعض لوگوں سے میرے ناجائز تعلقات بھی تھے اور میں کم
از کم دو مرتبہ اسقاط کرواچکی ہوں۔ کسی مشرقی عورت کے لئے
اس قسم کی افواہیں زندگی برباد کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں وہ
جہاں بھی جاتی ہیں اس کی داستانیں اس سے پہلے وہاں پہنچ جاتی
ہیں۔

میرے والد کو اگرچہ مجھ سے پہلے ہی کی طرح محبت تھی'
اس کے طرز عمل میں' میں نے کوئی معمولی سا فرق بھی
محسوس نہیں کیا تھا لیکن خاندان کے لوگ مجھ سے کچھ کھنچے
کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ ایران آنے کے بعد ایک اور مسئلہ
پیدا ہوگیا تھا کہ میں کہاں رہوں گی' تہران میں کوئی ننھیالی رشتے
دار بھی رکھنے کو تیار نہ تھا اور گاؤں میں رہنا میرے لئے کسی سزا
سے کم نہیں تھا' بالآخر والد نے میری پھوپھی اشرف کو آمادہ
کرلیا وہ بیوہ تھی اور پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوچکی تھی
تہران میں اس کا مکان خاصا بڑا تھا۔

لیکن بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں پھوپھی اشرف
کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ میرے ساتھ اس کا رویہ قابلِ
ستائش نہیں تھا۔ میرے لباس' میرے انداز اور میری ہر بات
پر کڑی تنقید اس کی عادت بن گئی تھی۔ صرف تین مہینے بعد
میں نے والد سے اجازت لے کر ایک انگلش لینگویج کالج
میں داخلہ لے لیا اور ہوسٹل میں منتقل ہوگئی' اس کے ساتھ
ہی ایک بار پھر مجھے دھمکی کا سامنا کرنا پڑا کہ میں اس سمسٹر میں
اچھے نمبر حاصل کروں ناکامی کی صورت میں مجھے مستقل طور
پر گاؤں بلالیا جائے گا۔ دولت کی ریل پیل اور مغربی تہذیب
اپنانے کے باوجود ایرانیوں میں ابھی پوری طرح روشن خیالی
نہیں آئی تھی لوگ جوان لڑکیوں کا اکیلے رہنا اچھا نہیں سمجھتے
تھے' میرے خاندان والوں کے خیال میں گاؤں میرے لئے
بہترین جگہ تھی' لیکن میں گاؤں جانے کو تیار نہیں تھی بالآخر
ایک اور راستہ تلاش کرلیا گیا۔ اور وہ راستہ تھا میری شادی' میں
نہیں جانتی کہ یہ تجویز کس نے پیش کی تھی لیکن بہر حال یہ
طے کرلیا گیا تھا کہ جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ ملے' میری شادی
کرکے میرے بوجھ سے نجات حاصل کرلی جائے۔

ہاں' میں واقعی اپنے خاندان والوں کے لئے بوجھ بن گئی
تھی۔ تہران میں تمام ننھیالی رشتے دار کروڑپتی تھے۔ وہ محل نما
مکانوں میں رہتے تھے لیکن میرے لئے کسی کے گھر میں جگہ
نہیں تھی۔ میرے اکثر رشتے داروں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا
کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ مجھے جب کسی گھریلو تقریب میں بلایا
جاتا میں چلی جاتی لیکن مجھے اس طرح نظر انداز کیا جاتا جیسے میرا
کسی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جب کسی کو پتا چل جاتا کہ میں
ہوسٹل میں رہائش پذیر ہوں تو وہ لوگ مجھ سے اور بھی دور
رہنے کی کوشش کرتے۔ میری ایک کزن کو جب پتا چلا کہ
فلاں ہوسٹل میں میں رہ رہی ہوں تو وہ حیرت کا اظہار کرتے
ہوئے بولی۔

"تمہیں شاید اس ہوسٹل کے بارے میں معلوم نہیں
ہے۔ ارے وہ تو طوائفوں کا اڈا ہے وہاں جتنی بھی لڑکیاں رہتی
ہیں سب طوائفیں ہیں' اگر وہ واقعی اسٹوڈنٹ ہوتیں یا ان کا
تعلق شریف گھرانوں سے ہوتا تو وہ ہوسٹل میں کیوں رہتیں؟"

اس قسم کی باتیں مجھے احساس کمتری میں مبتلا کردیتیں لیکن
ظاہر ہے میرے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسی
باتوں سے بچنے کے لئے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں
ان رشتہ داروں کے ہاں آنا جانا کم کردوں۔

تہران بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کررہا تھا' ہر
طرف بلند وبالا جدید عمارتیں نظر آرہی تھیں اس وقت تہران
میں سب سے زیادہ کامیاب اور منافع بخش کاروبار کنسٹرکشن
تھا۔ ۱۹۳۰ء کا تہران صرف ۳۵ ہزار افراد پر مشتمل تھا لیکن اب
یہ آبادی ساڑھے چار لاکھ سے بھی تجاوز کرچکی تھی کوہ البرز کے
قدموں میں واقع یہ شہر اپنی جون بدل رہا تھا۔

دولت مند طبقہ پہاڑی کی ڈھلوان پر آباد تھا جہاں جدید
طرز کے ولاز تعمیر ہورہے تھے۔ درمیانی طبقہ شہر کے وسطی
علاقے میں آباد تھا اور غریبوں کے لئے بہشت زہرہ قبرستان
کے قریب ریلوے لائن کے دوسرے طرف کا علاقہ مخصوص
ہوگیا تھا یہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں اب بھی میسر نہیں
تھیں۔

میرے پاس وقت اور پیسے کی کمی نہیں تھی' میں اپنی
دوستوں ثمن اور ریوی کے ساتھ گھومتی رہتی۔ یہاں ایسے
ریسٹورنٹ اور نائٹ کلب معرض وجود میں آچکے تھے جہاں
خوشگوار وقت گزارا جاسکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہوٹلوں
اور نائٹ کلبوں نے تہران کے باشندوں میں مغربی تہذیب کو
روشناس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا یوں تو شہر میں بے شمار
چھوٹے چھوٹے نائٹ کلب تھے لیکن کی کلب شمعن کلب
کا شمار ان ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ میں ہوتا تھا جہاں عام آدمی
داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رائل کلب کی

' تو بات ہی کچھ اور تھی سوئمنگ پول 'گولف کورس 'ٹینس کورٹ کے علاوہ اس کلب میں بہت بڑا جوا خانہ بھی تھا سوئمنگ پول کے کنارے ایک بہت بڑا اوپن ریسٹورنٹ بھی تھا 'رات کو یہاں کا نظارہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ ننھے ننھے چراغ اور مہکتے ہوئے پھول پانی کی سطح پر تیرتے رہتے اور کنارے پر بیٹھے ہوئے لوگ محظوظ ہوتے۔

ان کلبوں کا مقابلہ کسی بھی یورپی ملک کے بڑے بڑے کلب سے کیا جاسکتا تھا۔ یہاں داخل ہونے کے بعد کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی اسلامی ملک میں ہے۔ نئی نئی دولت نے ایرانیوں کے لئے عیش و نشاط کے دروازے کھول دیے تھے۔

ایسی جگہوں پر آتے جاتے مجھے اخراجات کے لئے کبھی پریشان نہیں ہونا پڑا تھا 'ہم جہاں بھی جاتے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور ہمارے تمام بل وہ مرد ادا کرتے جو کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھ کر آنکھیں سینک لیا کرتے تھے۔

میں نے ایرانیوں میں کچھ اور تبدیلیوں کو بھی محسوس کیا تھا 'بعض بڑے خوفناک حقائق سامنے آئے تھے اور میرے خیال میں یہ مستقبل کے لئے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ میں جہاں بھی جاتی کوئی سرکاری یا غیر سرکاری عمارت ایسی نہیں تھی جہاں شاہ اور اس کی بیوی شاہ باز فرح دیبا اور اس کے بچوں کے قد آور پوسٹر نظر نہ آتے ہوں 'گویا قدم قدم پر رعایا کو احساس دلایا جارہا تھا کہ اس ملک میں خدا اور شاہ ایک ہی طاقت کے دو نام ہیں مجھے یہ جان کر بھی بڑی حیرت ہوئی کہ شاہ پرست طبقے میں بھی شاہ کے خلاف باتیں ہو رہی ہیں ' ایک وقت وہ بھی تھا جب شاہ کی پرستش کی جاتی تھی لیکن اب تو شاہ پرستوں کو بھی اس کی مطلق العنانی کے شکوے تھے۔ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آنے والے ایرانی طلبہ تو کھل کر شاہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

شاہ کے بیسیوں قریبی رشتہ دار اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر دولت سمیٹ رہے تھے ' میرے ماموں سمیت دوسری بڑی بڑی کمپنیوں نے بھی شاہ کے ان قریبی رشتے داروں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان کے نام کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز یا سرپرستوں کی فہرست بھی شامل تھے۔ اور وہ سلیپنگ پارٹنر کی حیثیت سے کچھ کئے بغیر اپنے اپنے حصے وصول کر رہے تھے 'ان کا کام صرف یہ تھا کہ ان کمپنیوں کو سرکاری آفیسروں سے متعارف کرادیا جائے تاکہ انہیں بڑے بڑے ٹھیکے ملتے رہیں اور جو لوگ ان سے تعاون کرنے کو تیار نہیں تھے انہیں بھاری نقصان اٹھانے پڑ رہے تھے ایسے لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو دبے لفظوں میں شکوے شکایت بھی کرتے لیکن شاہ کے قریبی رشتے داروں سے کھل کر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی کیونکہ ان کے ذہنوں پر ساوک کا خوف سوار تھا۔ ساوک ایک آسیب کا نام تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چار آدمیوں میں کون ساوک کا ایجنٹ ہو سکتا ہے۔

ایک روز میں کی کلب میں یوسی کی سالگرہ پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ پھوپھی اشرف کا فون آگیا۔

"سوسن! آج رات تمہیں ہلٹن میں ایک تقریب میں جانا ہے 'لیکن یہ خیال رکھنا کہ تم اپنا بہترین لباس پہن کر وہاں جاؤ گی۔"

"لیکن 'رات تو میں یوسی کی برتھ ڈے پارٹی میں جارہی ہوں۔" میں نے احتجاج کیا۔ لیکن میرا احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا۔ مجھے پھوپھی اشرف کا حکم ماننا ہی پڑا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے ایک نوجوان سے متعارف کرانے کے لئے زبردستی اس تقریب میں بھیجا گیا تھا۔

ہلٹن کی یہ تقریب میری توقع کے عین مطابق بڑی بور ثابت ہوئی تھی۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ میں یوسی کی سالگرہ پارٹی میں کیوں نہیں چلی گئی۔ ہلٹن کی تقریب میں تمام مرد تقریباً ادھیڑ عمر تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک عدد بیوی بھی نظر آرہی تھی اور ظاہر ہے مجھے ایسی زندگی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے تاہم ایک آدمی ایسا تھا جو غیر شادی شدہ تھا اس کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ خاصا خوبرو اور پُر وقار شخصیت کا مالک تھا اور میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ مجھ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا لیکن میں نے اسے بھی دوسروں کی طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ پارٹی سے آنے کے بعد میں نے سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔

ایک ہفتے بعد پھوپھی نے بتایا کہ ہلٹن میں ملنے والا وہی شخص مجھ سے دوبارہ ملنا چاہتا ہے۔ اشرف نے لگی لپٹی رکھے بغیر بتادیا تھا کہ وہ شخص مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے لیکن بات آگے بڑھانے سے پہلے میرے بارے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتا ہے۔ پھوپھی اشرف نے مجھے یہ بھی تنبیہہ کردی تھی کہ جس جوڑے کے ساتھ میں ہلٹن گئی تھی ان کے سامنے بھی کوئی ایسی ویسی غیر شائستہ حرکت نہ کروں کیونکہ وہی دونوں میاں بیوی میرے لئے یہ رشتہ تلاش کر کے لائے تھے۔

اس آدمی کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ تہران میں ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا۔ اور گزشتہ چار پانچ سال سے کسی مناسب لڑکی کی تلاش میں تھا۔ اگرچہ اونچے طبقے کی بہت سی لڑکیوں نے اسے اپنے حسن کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ یہ انکشاف بھی میرے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا تھا کہ پھوپھی اشرف اپنی دونوں بیٹوں ثمینہ اور سعدیہ کو بھی اس سے متعارف کرا چکی تھی لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا

تھا اور اب میری باری آئی تھی۔ پھوپھی اشرف کسی صورت میں بھی اس دولت مند شخص کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

کئی روز بعد اس جوڑے کے گھر میں ہماری ملاقات طے ہوئی جو یہ رشتہ طے کروا رہے تھے۔ میرے ساتھ پھوپھی اشرف اور دادی عاشی بھی تھی جو اتفاق سے ان دنوں تہران آئی ہوئی تھی۔

اس شخص کو پہلی مرتبہ غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ اس کی عمر میرے اندازے سے زیادہ تھی کنپٹیوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ زیادہ تر پھوپھی اشرف اور دادی سے باتیں کرتا رہا کبھی کبھار نظر اٹھا کر میری طرف بھی دیکھ لیتا تھا لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ میں نے بھی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا عمر زیادہ ہونے کے باوجود وہ بڑا وجیہہ و شکیل تھا۔ اس کا نام کاشان امین تھا اور اس کی عمر اکتالیس سال تھی۔

ہماری یہ ملاقات آدھے گھنٹے بعد ختم ہو گئی وہیں پر دادی اور پھوپھی اس کے بارے میں تبصرے کرتی رہیں دادی کو بھی وہ پسند آ گیا تھا پھوپھی اشرف اس کے بارے میں تفصیل سے بتا رہی تھیں کہ وہ تہران کے سب سے بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ہے۔ اور دادی نے اپنے طور پر گویا یہ رشتہ طے کر لیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کاشان امین مجھے پسند بھی کرتا ہے یا دوسری بے شمار لڑکیوں کی طرح مجھے بھی مسترد کر دے گا۔

پندرہ روز بعد ایک اور ملاقات طے ہوئی۔ اس مرتبہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی مجھے اپنے ساتھ ڈنر پر لے جائیں گے جہاں کاشان امین بھی ہو گا۔ پھوپھی ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں کہ میں کسی ہوسٹل میں رہ رہی ہوں۔ اس لئے مجھے گھر بلا لیا گیا۔ میری تیاری کے کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ بھی مجھے لینے پہنچ گئے۔

ڈنر کے لئے بستروپوپ ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا گیا تھا جو ان دنوں اونچے طبقے میں بڑا مقبول ہو رہا تھا۔ کاشان اس روز خاصا نروس نظر آ رہا تھا' وہ جب بھی مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا ایک دو جملوں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتا۔

اس کے بعد ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں' وہ دونوں میاں بیوی بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ کاشان نے مجھ سے کبھی بھی کوئی ذاتی نوعیت کا سوال نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی میں نے ایسی کوئی کوشش کی تھی کیونکہ مجھے سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ میں اس کے بارے میں زیادہ تجسس کا اظہار نہ کروں۔

میں اس ہوسٹل سے پھوپھی اشرف کے گھر منتقل ہو گئی تھی کیونکہ ہوسٹل میں رہ کر ہم کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ پھوپھی کا طرز عمل بھی اب کسی حد تک بدل گیا تھا کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ کاشان جیسا دولت مند شخص مجھے پسند کرنے لگا ہے۔

کاشان یوں تو بڑی لمبی چوڑی جائداد کا مالک تھا لیکن نیاوارن میں شاہی محل سے کچھ فاصلے پر شمران میں وہ ایک بہت بڑی کوٹھی بھی بنوا رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کوٹھی مکمل ہو جائے گی تو اس کے لئے فرنیچر کا انتخاب مجھے ہی کرنا ہو گا۔ وہ آئے دن یورپ کے دورے کرتا رہتا تھا' اس نے مجھ سے بھی کہہ دیا تھا کہ شادی کے بعد میں اپنا ایک سوٹ کیس سفر کے لئے تیار رکھا کروں کیونکہ ہم کسی بھی لمحے کہیں بھی جا سکتے ہیں' اس کی ان باتوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کے لئے تیار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اسے پسند کر چکی تھی' مجھے اس کی احتیاط پسندی بہت پسند آئی تھی میں یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا چاہتا تھا۔

"میں نے زندگی میں بہت کمایا ہے بہت دولت بنائی ہے اب میں چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد میں کاروبار سے ریٹائر ہو جاؤں۔ زندگی کا باقی حصہ اپنی بیوی بچوں کے سات گزارنا چاہتا ہوں۔"

اب کاشان اور میں اکثر اکیلے ہی ملا کرتے تھے ہم اکثر لمبی ڈرائیو کے لئے نکل جاتے وہ میرے دل کی گہرائیوں میں بس گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ دولت مند نہ بھی ہوتا تو میں اس سے شادی کر لیتی۔

"تجربے کی بات"

"آپ کسی بھی سینڈیکیٹ میں چلے جائیں' یونیورسٹی کی سینیٹ کی میٹنگ میں چلے جائیں۔ دیکھیں یہ لوگ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اسمبلی میں چلے جائیں اور دیکھیں کیسی باتیں ہو رہی ہیں' گفتگو کا معیار کیا ہے' بے وقوفوں والا ماحول ہوتا ہے۔ آپ کابینہ کی میٹنگ میں چلے جائیں' اس وقت اس کمرے میں جس معیار کی ڈسکشن ہو رہی ہے اس معیار کی گفتگو کابینہ کی میٹنگ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ میں اپنے تجربے کی بات کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر مبشر حسن

یہ دسمبر ۱۹۷۳ کی بات ہے، عرب اسرائیل کی جنگ کو دو مہینے اور کاشان سے میری پہلی ملاقات کو تین مہینے ہو چکے تھے، وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ میں کاشان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی بل کھاتی ہوئی سڑک پر دوڑتی ہوئی کوہ البرز کی بلندیوں کی طرف جا رہی تھی بالآخر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ ہم نے ایک شاندار اوپن ائر ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور نشیب میں دور تک پھیلے ہوئے تہران کا نظارہ کرنے لگے۔ رات کے وقت کوہ البرز سے تہران کا نظارہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، روشنیوں کا یہ شہر کسی بھی یورپی ملک کے کسی شہر سے کم نہیں تھا۔ روشنیوں کے اس پار ریگستانی علاقے میں وہ بستیاں تھیں جہاں غربت و افلاس کے کیڑے کلبلاتے تھے لیکن شکر ہے رات کے وقت شہر کی جگمگاتی ہوئی تیز روشنیوں کے پس منظر میں تاریکی میں لپٹی ہوئی وہ بستیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

اسی رات کاشان نے پہلی مرتبہ میرا بوسہ لیا اور شادی کی باقاعدہ درخواست کی اس کے دو تین دن بعد میرے والد اور پھوپھی سے بھی باقاعدہ درخواست کر دی گئی۔ مارچ میں شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ تاریخ طے ہو جانے کے بعد کاشان یورپ چلا گیا، وہ ہفتوں بعد واپس آیا تو میرے لئے بہت سے قیمتی تحائف بھی لایا تھا۔ جن میں گھڑ سواری کا لباس بھی شامل تھا۔ کاشان نے عربی نسل کے چند گھوڑے بھی رکھے ہوئے تھے جن کے لئے رائل کلب کے گولف کورس کے ساتھ ایک اصطبل مخصوص تھا، یورپ کے دورے سے آنے کے بعد کاشان نے مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانے کا پروگرام بنایا، کاشان کے گھر والوں کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ بھی میرے گھر والوں کی طرح ماڈرن اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ کاشان کے گھر والے بڑی حد تک مذہبی لوگ تھے۔ اس صورتحال نے میرے والد کو کسی حد تک پریشان تو کر دیا تھا لیکن وہ تنقید کر کے کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ کاشان کے گھر والے یوسف آباد میں ایک تین منزلہ عالیشان مکان میں رہائش پذیر تھے۔ کاشان کی والدہ سارج اور دو کنواری بہنیں پروا ہند اور فاطمہ پہلی منزل پر، اس کا بھائی علی جو ڈاکٹر تھا، بیوی بچوں کے ساتھ دوسری منزل پر اس کی بہن نسرین اپنے شوہر پرویز جو ایک ماہر نفسیات تھا، کے ساتھ تیسری منزل پر قابض تھا۔ ہر کمرے میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ فرنیچر اگرچہ زیادہ قیمتی نہیں تھا لیکن بعض ایسے نوادرات بھی نظر آئے تھے جن کے بارے میں پتا چلا کہ یہ چیزیں کاشان ہی باہر سے لایا تھا۔ گھر کی خواتین لمبی آستینوں کی قمیصیں پہنے ہوئے تھیں۔ اس کی والدہ تو گھر کے اندر بھی اسکارف باندھے رہتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز میں نے بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔

میرے سنہری بال بھی شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ہم جیسی آزاد منش اور مغرب زدہ خواتین کو پسند نہیں کرتے لیکن اس روز یہ لوگ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکے تھے کیونکہ کاشان مجھ سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کاشان کے والدین سے اسی ملاقات میں منگنی کی رسم بھی ادا ہو گئی اور ۱۲ اپریل ۱۹۷۴ء کو ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ کاشان نے مجھے شادی پر جو تحائف دیے تھے ان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عروسی جوڑے کی قیمت پانچ ہزار ڈالر تھی اور چار قیراط کے ہیرے والی انگوٹھی اتنی قیمتی تھی کہ کئی سال بعد جب میں ایران سے فرار ہوئی تو یہ انگوٹھی میں نے پچاس ہزار ڈالر میں فروخت کی تھی اور اس کا ایک ایک پیسہ میں نے آزادی خریدنے پر خرچ کر دیا تھا۔ میرے مہر کی رقم ایک لاکھ ستر ہزار ڈالر مقرر ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے حالات کے پیش نظر میں یہ رقم معاف کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

○☆○
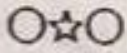
کاشان سے شادی کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسے اگر سنہری دور کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ پلک جھپکنے میں میری ہر خواہش پوری ہو رہی تھی۔ بعض خواہشات تو اظہار کے بغیر بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھیں۔

تیل کی آمدنی نے زندگی کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ ایک دن اگر کسی کے پاس نئی کار نظر آ جاتی تو اگلے مہینے وہ اس سے زیادہ قیمتی کار خرید لیتا۔ اس سے اگلے مہینے اس کے پاس دو کاریں نظر آتیں اور اس سے اگلے مہینے وہ ایک عالی شان کوٹھی کا مالک بن جاتا۔ اس کی بیوی قیمتی لباس اور زر و جواہر سے لدی پھندی نظر آنے لگتی۔

صرف اونچا طبقہ ہی نہیں، درمیانہ طبقہ بھی دولت سمیٹنے میں مصروف تھا۔ بعض لوگوں کے پاس تو راتوں رات دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ رائل کلب جو صرف طبقہ امرا کے لئے مخصوص تھا، اب وہاں نئے چہروں کا اضافہ ہونے لگا تھا۔ ہر شخص نئی نئی چیزیں خریدنے میں مصروف تھا۔ ایران پر دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ تہران میں جدید طرز کی بلند و بالا عمارتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

شاہ کے خلاف باتیں کرنے والوں میں اب صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جنہیں تیل کے سیلاب سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد مذہبی رہنماؤں کی تھی جو دولت کی اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور انہیں شاہ کی ماڈرنائزیشن کی پالیسی سے شدید اختلاف تھا اور وہ اسے مذہب کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھتے رہے تھے۔

اونچے طبقے میں اب صرف شاہ کے ان قریبی رشتہ داروں کے خلاف شکایات سننے میں آتی تھیں جو شاہ کے نام پر دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے تھے۔

میرے شوہر کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنی کمپنی میں شاہ کے رشتے داروں کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں وقتاً فوقتاً پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا

ہم جیسے لوگ سمجھتے تھے کہ زندگی کا یہ سنہری دور کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ان کے نزدیک شاہ، سلطنت اور خدا ایک ہی طاقت کے تین روپ تھے۔ ایران میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسے شاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور اس کی حفاظت کے لئے چار لاکھ کی فوج موجود تھی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ کے مخالفین کی تعداد اب بہت کم رہ گئی تھی۔ کسی حکومت کے لئے مسائل عام طور پر درمیانہ طبقہ ہی کھڑے کرتا ہے لیکن ایران میں یہ طبقہ بھی اپنا معیار زندگی بڑھا رہا تھا۔ ہر شخص حصولِ زر کی دوڑ میں شامل تھا۔ ایسے میں شاہ کے خلاف باتیں کرنے کی فرصت کسے تھی اور ہمارے طبقے میں شاہ کے خلاف باتیں کرنے کی کسی کو ضرورت ہی نہیں تھی۔

اب جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود ایران تیسری دنیا کا ملک تھا اور اس کے بیشتر حصوں میں غربت اور جہالت کے سائے اب بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ہم جیسے دولت مند لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ہم بھول گئے تھے کہ ہماری خوشیوں اور شادمانیوں کے یہ پھول صحرا میں کھل رہے تھے۔

شادی کے روز ہم ہلٹن ہوٹل منتقل ہو گئے جہاں کاشان نے ایک مہینے کے لئے رائل سوئٹ بک کروا رکھا تھا۔

"مکان ابھی پوری طرح آراستہ نہیں ہوا۔" کاشان نے کہا "اور میں تمہیں اس وقت تک مکان میں نہیں لے جاؤں گا جب تک ہر چیز مکمل نہ ہو۔ اس وقت تک ہم ہوٹل ہی میں رہیں گے۔"

ہلٹن کے بعد ہم نے ایک مہینہ انٹر کانٹی نینٹل میں گزارا اور اس کے بعد ایک ماہ کے لئے شیرٹن میں منتقل ہو گئے۔ کاشان صبح کے دو تین گھنٹے کام میں گزارتا اور پھر دن بھر ہم شاپنگ میں مصروف رہتے۔ لگتا تھا جیسے ہماری خواہشات کی کوئی انتہا نہ رہی ہو۔ شام کو ہمارے دوست آجاتے اور کھانے کے بعد رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ ویک اینڈ پر کسپئن چلے جاتے جہاں کاشان نے ایک خوبصورت مکان بنا رکھا تھا۔ پہلی مرتبہ اس مکان کو دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ جھیل کے کنارے پہاڑی چوٹی پر درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا یہ مکان کسی محل سے کم نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف پچیس ہزار مربع میٹر پر خوبصورت لان پھیلا ہوا تھا۔ سوئمنگ پول، ٹینس کورٹ اور موٹر بوٹ ڈیک کے علاوہ ان ڈور گیمز کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ مکان کی دیکھ بھال کے لئے ایک میاں بیوی کو ملازم رکھا گیا تھا۔

تہران کے بہت سے دولتمندوں نے یہاں کاشان کی طرح عالی شان مکان بنا رکھے تھے لیکن وہ لوگ مزید دولت سمیٹنے میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں یہاں آکر رہنے کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس طرح یہ خوبصورت اور عالی شان مکان زیادہ تر خالی رہتے تھے۔

کاشان ہر روز میرے لئے ایک نئی حیرت کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ اس روز ہم ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے تھے۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک کئی منزلہ عمارت نظر آرہی تھی جو ابھی تکمیل کے مراحل میں تھی۔ کاشان اس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ بلڈنگ کیسی ہے؟"

"بہت خوبصورت۔" میں نے جواب دیا۔

"اس میں ہمارا بھی ایک اپارٹمنٹ ہے۔"

اس انکشاف سے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کبھی ہم کار پر تہران کے کسی نواح میں سفر کر رہے ہوتے تو وہ اچانک انکشاف کرتا کہ یہ ساری زمین اسی کی ملکیت ہے۔ بالآخر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ کاشان کی بیوی ہونے کے باوجود میں اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ وہ بھی دوسرے ایرانی مردوں کی طرح اپنے کاروباری معاملات، راز میں رکھتا تھا۔ بہت سی ایرانی عورتیں تو یہ بھی نہیں جانتیں کہ ان کے شوہروں کی اصل مالی حیثیت کیا ہے۔ میں بھی کاشان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہی تھی اور میری ہر خواہش پوری ہو رہی تھی۔

جون میں ہم شیزان میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ تہران کے شمال میں پہاڑی کی یہ ڈھلان ایک وسیع و عریض مرغزار تھی جہاں اس قسم کے بہت سے مکان بن چکے تھے۔

ہمارا یہ مکان شاہ کے نیاوران والے محل کے بالکل قریب تھا۔ ہر وقت ہیلی کاپٹر کی آواز فضا میں گونجتی رہتی۔ شاہ اور اس کے اہل خانہ آمدورفت کے لئے سڑکیں استعمال کرنے کے بجائے ہیلی کاپٹر استعمال کرتے تھے۔ ہیلی کاپٹروں کے شور سے بچنے کے لئے کاشان نے اپنے مکان کو مکمل طور پر ساؤنڈ پروف بنوایا تھا۔ اسی طرح ہم باہر کی آوازوں سے محفوظ ہو گئے تھے۔

نومبر میں ہم یورپ کے دورے پر چلے گئے۔ اسی دورے کے دوران یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ لندن، پیرس، اسپین اور دیگر کئی ممالک میں اس کے وسیع و عریض اپارٹمنٹ اور خوبصورت ولاز موجود تھے۔ یورپ کے تین مہینے کے دورے

کے بعد ہم ایران واپس آ گئے۔ ۷ ار جولائی کو میرا بیٹا فرہاد پیدا ہوا بیٹے کی پیدائش پر جس قدر خوشیاں منائی گئیں' اسے بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

ہمارے بہت سے دوست امریکا اور یورپی ممالک میں جائدادیں خرید رہے تھے۔ بچوں کو تعلیم کے لئے یورپی ممالک بھیجا جا رہا تھا اور سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں اکاؤنٹ کھلوائے جا رہے تھے۔ پیرس میں ایرانیوں کی زیادہ آمد و رفت تھی۔ پیرس کے بہت سے دکانداروں نے تو اپنی دکانوں پر "ہم فارسی بولتے ہیں" کے بورڈ لگا رکھے تھے۔ میں جب بھی پیرس جاتی' واپسی پر میرے ساتھ آٹھ دس سوٹ کیس ضرور ہوتے جن میں طرح طرح کے ملبوسات اور دوسری قیمتی چیزیں بھی ہوتیں۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اب ہمیں شاپنگ کے لئے لندن یا پیرس جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تہران کے شاہ عباس بلیوارڈ کی دکانوں پر ہر وہ چیز دستیاب تھی جو کسی بھی یورپی ملک میں مل سکتی تھی۔

لوگوں کی دولت مندی کا یہ حال تھا کہ عام گھریلو تقریبات پر دس بیس ہزار ڈالر خرچ کر دینا معمولی بات تھی۔ اونچے طبقے کی خواتین جب شام کو گھروں سے نکلتیں تو زر و جواہر سے اس طرح لدی ہوتیں جیسے کسی خاص تقریب میں جا رہی ہوں۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ ڈالر کے زیورات پہننا عام سی بات ہو کر رہ گئی تھی بعض تقریبات میں تو پھول ہالینڈ سے اور خورد و نوش کی اشیا اور پانی وغیرہ بھی پیرس سے منگوائے جاتے۔

خود شاہ ایران کا یہ حال تھا کہ سردیوں میں وہ سوئٹزر لینڈ چلا جاتا۔ اسے اسکی انگ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ پوری سردیوں میں میں سرکاری احکامات سوئٹزر لینڈ کی برفانی ڈھلوانوں سے جاری ہوتے۔

۱۹۶۷ء میں شاہ نے اپنی تاج پوشی کا اعلان کیا۔ اس کے سرخ مخملی تاج میں تین ہزار تین سو اسی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس تاج پوشی کے ساتھ ہی شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ یاد کے جشن کا بھی اعلان کیا گیا۔ یہ جشن پرسپولس نامی اس قدیم شہر میں منایا گیا تھا جسے ڈھائی ہزار سال پہلے سائرس اعظم نے آباد کیا تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں جن سے اس کی عظمت رفتہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ملکہ فرح دیبا اپنے جیٹ پر پیرس سے واپس آئی تو اس کے فوراً ہی بعد ایک بوئنگ ۷۰۷ نے بھی تہران ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تھا جس میں فرانسیسی ماربل لدا ہوا تھا۔ یہ ماربل نیاوران کے شاہی محل کے سوئمنگ پول میں لگایا گیا تھا۔ محل کے باتھ روم میں بھی فرانسیسی ماربل لگا ہوا تھا۔ ماربل کے یہ ٹکڑے ڈولفن مچھلی کی شکل کے تھے جن کی آنکھوں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ شاہ کے بارے میں ایک اور مختصر سا واقعہ بیان کرتی چلوں۔

۱۹۵۳ء میں جب ڈاکٹر مصدق نے شاہ کا تختہ الٹ دیا تھا تو شاہ کو کچھ عرصہ کے لئے روم میں جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تھی۔ اس جلاوطنی کے دوران ایک ٹرک ڈرائیور نے ایک موقع پر شاہ کی کچھ مدد کی تھی۔ دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد شاہ نے اس ٹرک ڈرائیور کو پیپسی کولا کی امپورٹ کا لائسنس دے دیا۔ وہی ٹرک ڈرائیور آج تہران کے معززین میں شمار ہوتا ہے اس کی دولت مندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے تہران میں جو مکان بنایا ہے' اس کی مالیت پندرہ ملین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر مجھے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ٹھاٹھ باٹھ زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکیں گے اور میرا یہ اندازہ کسی حد تک درست نکلا۔ ۷۰ کی دہائی میں تیل کی پیداوار اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہنرمندوں اور میٹریل کی کمی پیدا ہو گئی۔

کسی ہسپتال کی تعمیر محض اس لئے رک جاتی کہ سیمنٹ دستیاب نہیں تھا۔ کوئی اسکول محض اس لئے خالی پڑا تھا کہ اساتذہ دستیاب نہیں تھے۔ جب دوسرے شعبوں میں لاکھوں کی آمدنی ہو رہی تھی تو اس طرف کون توجہ دیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی مہنگائی اور کرپشن بھی بڑھ رہی تھی کسی سرکاری دفتر سے رشوت کے بغیر کوئی کام کروا لینا ممکن نہیں تھا۔ دیہی آبادی شہروں کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ جس سے زراعت پر بہت برا اثر پڑا۔ صرف بیس سال پہلے ایران اناج برآمد کیا کرتا تھا اور آج وہی ملک اناج کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج تھا۔

ایران کے باشندے صدیوں سے ایک ہی معاشرتی بندھن سے بندھے ہوئے تھے۔ امیر اور غریب کا فرق پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن دولت مندوں کو غریبوں سے ہمدردی تھی یہاں میں اپنے والد کی مثال دوں گی۔ اس کے گاؤں کے لوگ ہر معاملے میں اس سے رجوع کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے خاندانی جھگڑوں کا فیصلہ بھی اسی سے کراتے تھے لیکن اب امیر اور غریب میں جو فرق پیدا ہوا تھا وہ پہلے سے بہت مختلف تھا۔ دولت مند اپنے ہی ملک کے رہنے والے غریب طبقے کے لئے بالکل اجنبی بن گئے تھے۔ بالکل غیر ملکیوں کی طرح جنہیں مقامی باشندوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو ہم اپنے ہی لوگوں کے لئے اجنبی تھے۔ ہم زبانی طور پر تو اسلام کے نام لیوا تھے لیکن کبھی مسجد میں جانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہم مغربی تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہو چکے تھے کہ اس کی تقلید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

میری ذاتی زندگی میں بھی بہار کی رنگینیاں پھیکی پڑنے لگی تھیں۔ میں نے ایک ایسے شخص سے شادی کی تھی جو میری

محبت کا دعویدار تھا۔ جو چاہتا تھا کہ میں اس کے شانہ بہ شانہ چلوں۔ اس کے ساتھ ہوٹلوں اور کلبوں میں جاؤں' ڈانس کروں اور زندگی کی رنگینیوں میں بھرپور حصہ لوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ میری شخصی آزادی کا احترام کرتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں واضح طور پر محسوس کرنے لگی تھی کہ مجھے سونے کے پنجرے میں قید کردیا گیا ہے۔ بیشتر دعوے کھوکھلے تھے۔ ان تلخ حقائق کا احساس بہت آہستہ آہستہ ہوا تھا۔ میں گھر کی مالکہ تھی۔ نوکروں کی فوج کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کاشان کا ایک ایک لمحہ میرے ساتھ گزرتا تھا۔ میں کبھی اکیلی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کبھی ڈاکٹر کی طرف جانا ہوتا تو بھی وہ میرے ساتھ ہوتا۔ اگر وہ خود نہ ہوتا تو اس کی کوئی بہن سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی۔ گھر کے تمام اخراجات بھی کاشان ہی کے ہاتھ میں تھے۔ میرے پاس نہ تو کوئی کریڈٹ کارڈ تھا' نہ ہی میرا کوئی بینک اکاؤنٹ تھا۔ کوئی چیز خریدنے کے لئے مجھے کبھی کوئی بل بھی ادا نہیں کرنا پڑا تھا۔ مجھے صرف اتنی رقم ملتی تھی جس سے میں اپنی بہت معمولی ضروریات پوری کرسکتی تھی۔ شادی کے بعد مجھے کبھی اکیلے گھر سے باہر نکلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد کاشان کی زندگی کا ایک اور پہلو سامنے آنے لگا۔ اس نے اپنی بیوہ ماں' دو بھائیوں اور تین بہنوں کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی اٹھا رکھا تھا۔ اس کی دونوں غیر شادی شدہ بہنیں ہر معاملے میں اس کی رائے لینا ضروری سمجھتی تھیں۔ دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد یا دوپہر کے کھانے پر وہ اکثر ان کے ہاں چلا جاتا اور میں اس کے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہتی۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کاشان میرے خاندان کی تقریبات میں شمولیت سے گریز کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بعض اوقات شاہی تقریبات میں جانے سے بھی انکار کردیتا۔ شاہ کی بہن شمس پہلوی میری ماموں زاد بہن کی گہری دوست تھی۔ مجھ سے بھی اس کے قریبی تعلقات تھے۔ شاہی محل میں ہونے والی ہر تقریب کا دعوت نامہ مجھے بھی ملتا لیکن کاشان ٹال جاتا۔ اس کے برعکس وہ اپنے خاندان کی تقریبات میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیتا۔ اس نے مجھ پر یہ پابندی بھی لگادی تھی کہ اس کے مشورے کے بغیر میں اپنے خاندان یا شاہی محل کی کسی تقریب کا کوئی دعوت نامہ قبول نہ کروں۔

کاشان نے کلبوں میں بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے اب ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے ایک مرتبہ کہا تھا "تمہیں ناچتے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا سرور محسوس ہوتا ہے۔" لیکن اب اس کا یہ نظریہ بدل گیا تھا۔ ایک روز جب میں نے کلب چلنے کو کہا تو اس نے ناگوار سے لہجے میں جواب دیا۔

"تم ایک شادی شدہ عورت ہو۔ کلب کیوں جانا چاہتی ہو؟ وہ جگہ تمہارے لئے مناسب نہیں۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا' مجھے اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

یہ خوبصورت گھر میرے لئے زندان بن گیا تھا اور میں اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھے یہاں تک پابند کردیا تھا کہ میں اپنی کزنز کے ساتھ کہیں اور جانے کے بجائے انہیں یہیں بلوالیا کروں۔ اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔ جب کبھی مجھے درزی کے ہاں جانا ہوتا تو اس کی کوئی نہ کوئی بہن میرے ساتھ ضرور ہوتی۔ میں اسے اپنی دوست نہیں' محافظ سمجھتی تھی۔

کاشان نے مجھے واضح طور پر یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ میں اس کے بغیر کبھی رائل کلب نہ جاؤں۔ اس نے اپنے گھر ہی کو کلب میں تبدیل کردیا تھا جس میں سوئمنگ پول' ٹینس کورٹ' جوا خانہ اور ہر وہ تفریح موجود تھی جو کسی کلب میں ہوسکتی ہے۔ لیکن میں باہر نکلنا چاہتی تھی۔ آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی تھی کیونکہ یہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

ایک مرتبہ کاشان کو کام کے سلسلے میں تبریز جانا پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"مجھے واپس آنے کے بعد یہ پتا نہ چلے کہ میری عدم

اسکاٹ لینڈ کے باشندے رقم کے معاملے میں کنجوس ہی نہیں بیوقوف بھی ہوتے ہیں۔ سینڈی اور میکفرسن نے شرط لگائی کہ دیکھیں سمندر میں غوطہ لگا کر دونوں میں سے کون زیادہ دیر تک پانی کے نیچے رہتا ہے۔

تین روز بعد دونوں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔

موجودگی میں تم گھر سے باہر کہیں گئی تھیں۔ اگر تم چاہو تو اپنی دوستوں کو یہاں بلا سکتی ہو۔"

یہ سن کر میری پریشانی کی انتہا نہیں رہی تھی لیکن میں نے اس پابندی کی زیادہ پروا نہیں کی۔ اس کے جانے کے دوسرے ہی روز میری کزنز اور کاشان کا چھوٹا بھائی آگیا۔ رائل کلب میں دوپہر کے کھانے کی تجویز کاشان کے چھوٹے بھائی نے ہی پیش کی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ پروگرام کے مطابق کاشان کو اس سے اگلے دن واپس آنا تھا اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ رائل کلب میں لنچ کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔ لیکن جب ہم لوگ کھانے کے بعد گھر واپس آئے تو باہر کھڑے ہوئے ایک ملازم نے یہ اطلاع دی کہ کاشان واپس آچکا ہے۔

"انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا کہ میں کس کے ساتھ کہاں گئی ہوں؟ اور جب میں نے بتایا کہ آپ کہاں گئی ہیں تو وہ بیڈ روم میں چلے گئے۔ ان کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کا سامنا کرتے ہوئے مجھے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ میں اپنے شوہر سے اتنی خوفزدہ کیوں ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ گھر سے باہر گئی تھی تو اس کا بھائی بھی میرے ساتھ تھا۔ لیکن اسکے باوجود میرے ذہن پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ جب میں بیڈ روم میں داخل ہوئی تو وہ بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

"کہاں گئی تھیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"رائل کلب! تمہارا بھائی بھی ہمارے ساتھ تھا" میں نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ میرے بغیر وہاں نہیں جاؤ گی۔" اس نے خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے آج تک اسے کبھی جواب نہیں دیا، لیکن شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے بھی زبان کھولنا پڑی "میں تمہاری زر خرید غلام نہیں ہوں۔" میں نے بھی غصے میں جواب دیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ شادی کر کے تم نے مجھے خرید لیا ہے میں بھی انسان ہوں اور میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔"

"میری موجودگی میں تم جو چاہو، کر سکتی ہو، جہاں چاہو، جا سکتی ہو... لیکن میں تمہیں ناپسندیدہ لڑکیوں کے ساتھ آوارہ گردی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خاص طور پر رائل کلب جانے کی اجازت تو کبھی نہیں دوں گا۔" کاشان نے چیختے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ اسے میرا رائل کلب جانا کیوں پسند نہیں تھا۔ دوسرے کلبوں کے برعکس رائل کلب کی فضا میں کچھ زیادہ بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ یہاں شاہی خاندان کے افراد کا بھی آنا جانا تھا مرد کسی بھی عورت کے ساتھ گپ شپ کر سکتے تھے یا ڈانس کر سکتے تھے اور جب شاہی خاندان کا کوئی مرد کسی عورت کے پاس بیٹھنا چاہے تو اسے منع نہیں کیا جا سکتا تھا میرے خیال میں کسی مرد سے بات کر لینا کوئی جرم نہیں تھا لیکن کاشان اس چیز کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سب کچھ گناہ تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ مغربی تہذیب کا دلدادہ کوئی شخص ایسی سوچ بھی رکھ سکتا ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اسے ان لوگوں پر اعتبار نہیں تھا جن سے میں اس کی عدم موجودگی میں مل سکتی تھی۔ میں جس شخص کو دیوتا سمجھتی تھی، وہ ایک عام سا آدمی نکلا تھا۔

شادی سے پہلے کاشان کے خیالات مختلف تھے۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو ماڈرن ہو، مغربی تہذیب کی دلدادہ ہو، اسے میرے اندر وہ تمام صفات نظر آئی تھیں جو وہ چاہتا تھا لیکن شادی کے بعد وہ ایک دم روایتی شوہر بن گیا تھا۔

اس روز کے بعد میں اس کے بغیر بہت کم گھر سے باہر نکلی تھی۔ کاشان نے بھی دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے خیالات نہیں بدلے گا۔ اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آگیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

۔ کاشان سے شادی سے پہلے میں ایک اور نوجوان سے ملتی رہی تھی۔ پھر یکایک وہ کہیں غائب ہو گیا۔ کاشان سے شادی اور پھر فرہاد کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے بعض دوستوں کے ذریعے مجھے پیغام بھیجنا شروع کر دیے کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اگر میں کاشان سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لوں تو وہ میرے بیٹے کو بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھے گا۔ میں اس کی حوصلہ شکنی کرتی رہی لیکن اس کے پیغامات مسلسل آتے رہے اور بالآخر میں نے اس سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا تاکہ اسے سمجھا سکوں کہ یہ شادی میری مرضی سے ہوئی تھی۔ میں اس زندگی سے بہت خوش ہوں وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔

اتفاق سے چند روز بعد پھوپھی اشرف کی بیٹی فیروزہ اپنے دوستوں کے اعزاز میں ایک بہت بڑی پارٹی دینے والی تھی۔ میں نے فیروزہ کو اس نوجوان کو بھی مدعو کرنے پر آمادہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس پارٹی میں مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ شادی کے بعد میں نے کاشان کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اسے ہماری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اب مجھے یقین تھا کہ وہ میرا اس سے ملنا پسند نہیں کرے گا۔ اس لئے میں نے اسے اس سلسلے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا اور ہر بات راز میں رکھی تھی لیکن پارٹی والی رات کاشان بھی میرے ساتھ تھا۔ مجھے بہرحال چند منٹ کے لئے تنہائی میں اس لڑکے سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ بعد میں، میں نے اسے کاشان سے بھی متعارف کرایا اور اس نے

کاشان کو شاہی محل میں ہونے والی ایک پارٹی کا دعوت نامہ دینے کی کوشش بھی کی لیکن کاشان نے دعوت نامہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس پارٹی کے بعد میں سب کچھ بھول گئی تھی لیکن اس کے چند روز بعد جب میں ٹیلی فون پر فیروزہ سے بات کر رہی تھی کہ اچانک اسی لائن پر دو اور آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرا خیال تھا فون پر کوئی اور لائن بھی مل گئی تھی۔ میں فون بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ یکایک چونک گئی۔ وہ میری اور فیروزہ کی آوازیں تھیں۔ چند روز پہلے ہم نے فون پر ایک نوکر کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی اور اب وہی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرا شوہر میرا فون ٹیپ کرتا رہا ہے اور کسی فنی خرابی کے باعث ٹیپ چل گیا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گئی کہ کئی روز پہلے میں نے اپنے پرانے بوائے فرینڈ سے ملاقات کا جو پروگرام فیروزہ سے طے کیا تھا وہ بھی کاشان سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔

اس روز کاشان جب گھر آیا تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم میرا فون ٹیپ کرتے ہو؟ آخر تمہیں کیا شبہ ہے مجھ پر؟"

کاشان پہلے تو ہنس کر بات کو ٹالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر اس کے لہجے میں بھی سختی آ گئی۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اپنی بیوی کی نگرانی رکھنا اس کا حق ہے اور کوئی اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ جب بات بڑھ گئی تو میں نے اپنے ماموں اردشیر کو بلا لیا۔ وہ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں اپنی بیوی گیتی کے ساتھ این آربر سے واپس آ گئے تھے اور انہوں نے تہران میں لا۔ ریزرو کے نام سے ایک خوبصورت ریسٹورنٹ کھول رکھا تھا۔

"مسٹر امینی! اگر تم اسی طرح اپنی بیوی پر شک کرتے رہے تو تم دونوں کے لئے زندگی مشکل ہو جائے گی" ماموں اردشیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میری بیوی میری عدم موجودگی میں غیر مردوں سے ملے" کاشان نے سرد لہجے میں جواب دیا "اگر آئندہ اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے کی کوشش کی تو معاملہ طلاق پر ختم ہو جائے گا۔"

شادی کے دوسرے سال تو ہمارے تعلقات مزید بگڑ گئے اس وقت تک میں بھی اس حقیقت کو سمجھ گئی تھی کہ ایرانی مرد کم عمر لڑکیوں سے شادی ہی اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں موم کی گڑیا کی طرح اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکیں۔ میرا شوہر بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بظاہر تو ماڈرن اور مغربی تہذیب میں رنگی ہوئی نظر آؤں لیکن اندرونی طور پر مجھے روایتی ایرانی بیوی ہونا چاہئے۔

تعلقات میں کشیدگی کم کرنے کے لئے ہم نے چند روز کے لئے یورپ کی سیر و تفریح کا پروگرام بنا لیا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ اس مرتبہ فرہاد کو ساتھ لے جانے کے بجائے اسے دادی اور پھوپھیوں کے ہاں چھوڑ دیا گیا۔ حسب معمول ہمارا پہلا اسٹاپ سوئٹزرلینڈ تھا جہاں کاشان کو جنیوا میں اپنا میڈیکل چیک اپ کرانا تھا کیونکہ وہ کئی روز سے معدے میں تکلیف کی شکایت کر رہا تھا۔ جنیوا میں ہمارا صرف دو دن کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد ہم پیرس روانہ ہو جاتے لیکن کاشان کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹروں نے ہمیں روک لیا کیونکہ ان کے خیال میں معدے کا آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔

میں بدحواس سی ہو گئی۔ میں اپنی زندگی میں کبھی اکیلی کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہری تھی اور شادی کے بعد تو میں نے کاشان کے بغیر اکیلے کبھی گھر سے قدم بھی نہیں نکالا تھا۔ ظاہر ہے "آپریشن کے بعد کاشان جب تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جاتا" مجھے اکیلے ہی ہوٹل میں رہنا تھا۔

جنیوا میں ہمارا قیام جھیل کے کنارے پر واقع پریذیڈنٹ ہوٹل کے ٹاپ فلور پر تھا۔ یہ کمرا ہم نے سات سو ڈالر روزانہ پر بک کرایا تھا۔ اسپتال کے کمرے کا کرایہ بھی سات سو ڈالر یومیہ تھا۔ جس فلور پر کاشان کا کمرا تھا وہ غیر ملکی مریضوں کے لئے مخصوص تھا اور مجھے سب کے سب ایرانی ہی نظر آئے تھے۔ دولت کی فراوانی نے ایرانیوں کے دماغ خراب کر دیئے تھے۔

"آخر تم کشن کے نیچے اخبار رکھنا کب چھوڑو گی؟"

لاپتا

یونیورسٹی سے متعلق شعبۂ عمرانیات کا ایک طالب علم فون کے ذریعے مختلف طبقے کے والدین سے تحقیق کے سلسلے میں معلوم کر رہا تھا کہ رات کے تقریباً نو بجے ان کے بچے کہاں ہوتے ہیں۔

"میری پہلی پانچ کالوں کے جواب میں مجھے بچوں نے بتایا کہ انھیں نہیں معلوم کہ ان کے والدین اس وقت کہاں ہوتے ہیں"

انہیں نزلہ بھی ہوجاتا تو علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ بھاگے آتے۔ شاہ ایران کے قریبی رشتے دار بھی علاج معالجے کے لئے اسی اسپتال میں آتے تھے۔

کاشان کے آپریشن والے دن میں آدھی رات تک اسپتال میں رہی۔ کاشان کے بزنس پارٹنر جمشید کا چھوٹا بھائی بھی اسپتال میں موجود تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور شہر میں اس کا کلینک بھی تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل تک چھوڑ دینے کی پیشکش کی تو میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ یہ کرسمس سے چند روز پہلے کی بات ہے۔ اس روز صبح ہی سے بارش ہو رہی تھی۔ جلد گھر پہنچنے کی کوشش میں ہماری کار چوراہے پر ایک اور کار سے ٹکرا گئی اور سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے کھڈ میں جاگری۔ یہ غنیمت تھا کہ کار سیدھے رخ سے گری تھی کار کی ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر میرے اوپر گرا تھا۔ ڈاکٹر کسی نہ کسی طرح کار سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور مجھے بھی کھینچ تان کر باہر نکال لیا۔

"تمہاری دائیں آنکھ پر چوٹ آئی ہے۔ پہلے میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں گا۔ گھر کے ساتھ ہی کلینک ہے۔ میری بیوی ڈریسنگ کردے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

گھر جانے سے پہلے ڈاکٹر نے پولیس کو اس حادثے کی اطلاع دینا ضروری سمجھی تھی۔ اس طرح آدھا گھنٹہ ضائع ہوگیا گھر پہنچ کر گرم پانی سے غسل کے لئے باتھ روم میں گھس گئی لباس اتارنے کے بعد میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ شیشے کی وجہ سے میرے جسم کی کئی جگہ خراشیں آچکی تھیں۔

وہ رات میں نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح اسپتال پہنچی تو پتا چلا کہ کاشان کو ایک بار پھر آپریشن روم لے جایا گیا تھا یہ سنتے ہی میں بدحال سی ہوگئی۔ پانچ گھنٹے بعد ڈاکٹر آپریشن روم سے نکلا تو وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔

"مجھے افسوس ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کے شوہر کو معدے کا کینسر ہے۔ ہم نے اگرچہ معدے کا بیشتر حصہ نکال دیا ہے لیکن ایسے پیچیدہ کینسر میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ ہمیں کم از کم دس دن تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس دوران اگر زخم سے خون رسنا شروع ہوگیا تو پھر ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین سرک رہی ہو۔ مجھے چکر سا آگیا اور میں لڑکھڑا گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے سہارا دے کر کرسی پر بٹھادیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر مجھے تسلی دے کر چلا گیا۔ میں اکیلی بیٹھی روتی رہی۔

میری عمر اس وقت بیس سال تھی۔ اختلافات کے باوجود مجھے اپنے شوہر سے محبت تھی۔ میں نے بڑے سہانے خواب دیکھے تھے لیکن اب سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرے روز صبح سویرے ہی میں نے تہران میں اپنے ماموؤں اور صباؤن میں اپنے والد کو اس صورت حال کی اطلاع دے دی لیکن میں نے انہیں جنیوا آنے سے منع کردیا تھا۔ ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ میں ہوش میں آنے کے بعد کاشان کو کینسر کے بارے میں بتادوں یا دس دن تک انتظار کیا جائے لیکن میں نے کاشان کو فوری طور پر کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

تہران میں ماموں اردشیر نے کاشان کے گھر والوں کو آپریشن کی اطلاع دے دی تھی۔ کاشان کا چھوٹا بھائی علی تیسرے دن جنیوا پہنچ گیا۔ میں چوبیس گھنٹے کاشان کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ دس دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کاشان کو بھی بتادیا تھا کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ تین مہینے تک باقاعدگی سے چیک اپ کرنا پڑے گا۔ ہم اسپتال سے پریذیڈنٹ ہوٹل منتقل ہوگئے۔ اور تین مہینوں کے دوران صرف دو تین مرتبہ چہل قدمی کے لئے ہوٹل سے باہر نکلے تھے اور بالآخر ڈاکٹر نے ہمیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ہوٹل اور اسپتال کا خرچ تین لاکھ ڈالر تھا اور یہ رقم کاشان نے ایک سوئس بینک سے نکلوائی تھی۔ مجھے اس اکاؤنٹ کے بارے میں آج پہلی مرتبہ پتا چلا تھا۔

ایران واپس آنے کے دو ماہ بعد کاشان کو ایک بار پھر تکلیف شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ یہ تکلیف اپنڈکس کے قریب شروع ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر بدحواس ہوگئی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاشان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میرے لئے اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی ہولناک تھا۔ میں جنیوا میں اسپیشل میڈیکل سروس سینٹر کو اطلاع دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ ایمرجنسی سنٹر محض دولت مند ایرانیوں کے لئے قائم ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے نوٹس پر ایک جیٹ طیارہ جس میں ڈاکٹروں، نرسوں کی پوری ٹیم کے علاوہ ایمرجنسی صورت حال سے نمٹنے کا سارا سامان موجود تھا، تہران پہنچ سکتا تھا۔ یہ جہاز مریض کو لے کر فوراً ہی جنیوا کی طرف پرواز کر جاتا مریض کی حالت زیادہ خراب ہوتی تو جہاز میں بھی آپریشن کیا جاسکتا تھا۔ مریض کے ساتھ آنے والے لواحقین کی رہائش وغیرہ کا انتظام بھی یہ ایمرجنسی سینٹر کرتا تھا۔

کاشان کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو اسے ایک مقامی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ میں اور علی بھی ساتھ ہی تھے۔ ڈاکٹر نے کاشان کے معائنے کے بعد بتایا کہ اسے فوری طور پر آپریشن کی ضرورت ہے۔ اتنا وقت بھی نہیں کہ اسے جنیوا لے جایا جاسکے۔ علی نے ڈاکٹر کو اس کے پہلے آپریشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی۔ جب

ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کاشان کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ اس نے ایک ٹیومر نکال دیا۔ اور بالآخر یہ انکشاف بھی کر دیا کہ کاشان کینسر میں مبتلا ہے۔ کاشان کی حالت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے ہم نے اسے جنیوا لے جانے کا خیال بھی ذہن سے نکال دیا۔

لیکن چند ہفتوں بعد کاشان کی حالت سنبھل گئی۔ اس مرتبہ کاشان نے امریکا کے میو اسپتال میں چیک اپ کرانے کا فیصلہ کیا۔ ہم چند ہی روز میں امریکا روانہ ہو گئے۔ جہاں ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ اب اسے کینسر نہیں ہے۔ اس اطلاع پر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ چند روز بعد ہم این آربر اور لاس اینجلس میں اپنے ماموؤں سے ملنے کے لئے چلے گئے اور اس کے بعد ہم ایران واپس آ گئے۔ ایک ہفتے بعد ہمیں پھر جنیوا جانا پڑا کیونکہ کاشان کے ریگولر چیک اپ کی تاریخ آ گئی تھی۔ اس مرتبہ ہم فرہاد کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان دنوں کاشان کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔

"تمہارے شوہر کی بہت کم زندگی باقی رہ گئی ہے۔" اس ڈاکٹر نے بتایا جس نے کاشان کے کینسر کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ "میرا مشورہ ہے کہ اسے گھر واپس لے جاؤ۔ علاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

اس دوران کاشان کی بہن پرواہند اور علی بھی جنیوا پہنچ گئے اور ہم اسپتال کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ ان دونوں بہن بھائیوں نے گھر کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مجھے ان کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں میرا باپ اپنے بھتیجے سے ملنے کے لئے برنے آیا ہوا تھا۔ وہ میرے چوتھے دن میرے پاس آ جاتا اور اس طرح مجھے کچھ دیر گھر سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا۔

کاشان کے گھر والوں کا خیال تھا کہ چونکہ میرا شوہر بیمار ہے اس لئے مجھے کسی خوشی کا حق نہیں تھا۔ یہاں تک کہ تازہ ہوا میں سانس لینے کا حق بھی مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔

اس دوران ڈاکٹر مسلسل دباؤ ڈالتا رہا کہ ہم کاشان کو گھر واپس لے جائیں جبکہ کاشان جنیوا ہی میں رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہاں بہترین طبی سہولتیں موجود تھیں لیکن ڈاکٹر شاید ہم سے زیادہ بہتر جانتا تھا اور غالباً وہ چاہتا تھا کہ ہم کاشان کے آخری وقت میں اپنے گھر پہنچ جائیں۔

دو ماہ جنیوا میں رہنے کے بعد ہم تہران واپس آ گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اب میں پہلے سے زیادہ قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنی فیملی نے مجھے یرغمال بنا لیا تھا۔ کاشان کی ماں اور بہنیں مستقل طور پر ہمارے گھر آ گئی تھیں اور خاندان کے دیگر افراد بھی دن میں کئی کئی بار چکر لگاتے رہتے مجھے کاشان کے کمرے میں سونے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک صاحب دوستوں کی محفل سے بہت رات گئے اٹھے۔ اگلے دن ایک دوست نے ان سے پوچھا "بھئی کل رات گھر پہنچنے پر تمہاری بیوی نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں تو" وہ صاحب بولے "سامنے کے دانت تو میں یوں بھی نکلوانے والا تھا۔"

مجھے تو اس کے پاس چند منٹ کے لئے تنہائی میں بیٹھنے کا موقع بھی فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ ان ماں بیٹیوں نے گھر کا پورا انتظام سنبھال لیا تھا اور میں مکمل... طور پر بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

اگلے چند مہینوں میں ہنگامی ضروریات کے تحت میں صرف تین مرتبہ گھر سے باہر نکلی تھی۔ ہر مرتبہ میرے ساتھ گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہوتا۔ مجھ سے میرا ہر حق چھین لیا گیا تھا۔ ۲۵ جون ۱۹۷۷ء کا دن میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس روز میرا باپ بھی آذربائیجان سے آیا ہوا تھا۔ اس نے صبح پانچ بجے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس روز میرے ماموں اردشیر اور ممانی گیتی بھی پہنچ گئے لیکن ان کے ساتھ کاشان کے گھر والوں کا رویہ بہت ہی غیر مناسب تھا۔ انہوں نے میرے رشتے داروں سے بات تک کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کاشان کی موت کے ذمے دار میرے ہی رشتے دار ہیں۔ کاشان کا بہنوئی پرویز تو میرے والد سے لڑنے کو تیار تھا کہ اس نے ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلایا تھا۔ میں خوف اور غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میرے والد نے پرویز کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے پکڑ کر نچلی منزل پر لے آیا۔ مجھے اپنی پوزیشن کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میرا ماموں اور والد موجود نہ ہوتے تو وہ لوگ مجھے بھی مار کر ادھ موا کر دیتے۔ اس سے میں یہ بھی اندازہ لگا سکتی تھی کہ مستقبل میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

کاشان کی موت کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر گھر رشتے داروں اور دوستوں سے بھر گیا۔ سب سے پہلے کاشان کے بزنس پارٹنر جمشید اور عبداللہ تسلیمی آئے تھے۔ وہ دونوں فوراً ہی اوپر چلے گئے۔ چند منٹ بعد جمشید مجھے اور میرے والد کو بھی اوپر لے گیا۔ کاشان کے گھر والے بڑے خطرناک موڈ میں تھے۔ کاشان کے بیڈ کے قریب ہی اس کا بریف کیس کھلا پڑا تھا جس میں چند دستاویزات کے علاوہ اس کا وصیت نامہ بھی موجود تھا۔ میرے خیال میں اس بریف کیس میں کاشان کا پرس بھی ہونا چاہئے تھا جس میں تیس ہزار ڈالر غیر ملکی کرنسی کی صورت میں اور پچاس ہزار ایرانی قن کی رقم؛ وقت موجود رہتی تھی۔ کاشان یہ رقم ہنگامی صورت حال کے لئے اپنے

بریف کیس میں رکھا کرتا تھا لیکن اب بریف کیس میں اس کا پرس موجود نہیں تھا۔

"رقم کہاں ہے؟" علی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ اس کا لہجہ بڑا گستاخانہ تھا۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظریں کمرے میں موجود اس کے دوسرے رشتے داروں کا جائزہ لینے لگی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ رقم سے بھرا ہوا پرس گزشتہ رات بریف کیس میں موجود تھا لیکن اب نہ صرف وہ پرس بلکہ چمڑے کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں میرے قیمتی جواہرات رکھے ہوئے تھے۔

"یہ اقرار کرلو کہ یہ رقم تم نے اور تمہارے باپ نے چرائی ہے" پرویز نے خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کاشان کے پاس دولت آنے سے پہلے ان کا تعلق متوسط طبقے سے رہا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں سے کسی نے کبھی کوئی اچھی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت ان کے پاس جو کچھ تھا' وہ کاشان کی وجہ سے تھا لیکن اب وہ اپنی اوقات بھول چکے تھے۔

پرویز کے اس الزام پر ماموں اور والد بھونچکا سے رہ گئے لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے سکے اور بہرحال' رقم اور جواہرات سے بھرے ہوئے بیگ کا کبھی پتا نہیں چل سکا۔

کاشان کی تدفین کے وقت یہ لوگ اپنی زبانوں پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ علی اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔

"کاشان کو سوسن نے مارا ہے۔ اس کی ماں کو کینسر تھا جو میرے بھائی کو بھی لگ گیا۔"

یہ اس ڈاکٹر کا نظریہ تھا جس نے ایران میں میڈیکل کی تربیت حاصل کی تھی۔ کاشان کی میت جس قیمتی قالین میں لپیٹ کرلے جائی گئی تھی وہ رول کرکے علی نے اپنے ماموں کی کار میں رکھ دیا تھا اور علی نے اسے قالین اپنے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ قریب کھڑے ہوئے میرے والد نے یہ بات سن لی۔ انہوں نے علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"صبح سے اب تک جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے' میں اسے برداشت کرتا رہا ہوں۔" میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ والد کو اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔ "اب تک میں نے سب کچھ نظر انداز کردیا ہے' لیکن اب میری قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔ اگر یہ قالین گھر واپس نہ پہنچا تو جو کچھ بھی ہوگا' اسے تم لوگ عرصے تک فراموش نہیں کرسکو گے۔"

میرے والد کے تیور دیکھ کر علی کے ماموں نے وہ قالین خاموشی سے ہماری کار میں رکھ دیا۔

تدفین کے بعد طویل عرصے تک سوگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گھر میں ہروقت کاشان کا خاندان بھرا رہتا تھا۔ میرے چند رشتے دار بھی ہروقت موجود رہتے تھے۔ کاشان کے رشتے دار اب اگرچہ کچھ کہنے سے گریز کررہے تھے لیکن ان کی آنکھوں سے ہروقت نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی رہتی تھیں۔

کاشان کے انتقال کے چند روز بعد میرے والد اور ماموں کی موجودگی میں کاشان کی وصیت پڑھ کر سنائی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین میرے پیروں کے نیچے سے سرک رہی ہو۔ میرے شوہر نے اپنی کنسٹرکشن کمپنی کے تمام حصے اپنے بہن بھائیوں کے نام چھوڑے تھے۔ ایک خطیر رقم اور زمین اس کی ماں اور دو کنواری بہنوں کے لئے تھی۔ اندرونی وبیرون ملک تمام جائداد جس کی مالیت کروڑوں ڈالر تھی' میرے بیٹے فرہاد کے نام تھی۔ میرے لئے... میرے محبت کرنے والے شوہر نے صرف اور صرف ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم چھوڑی تھی۔ کاشان کی اصلیت اس کی موت کے بعد کھلی تھی۔ مجھے اس نے دل بہلانے کا ایک کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ ستم کی انتہا تو یہ تھی کہ اس نے فرہاد کے گارجین کی فہرست میں بھی میرا نام شامل نہیں کیا تھا۔ کاشان کے دونوں برادر جمشید' عبداللہ' تسلیمی اور علی کو فرہاد اور اس کی جائداد کا نگراں مقرر کیا گیا تھا یعنی میری حیثیت محض ایک آیا کی رہ گئی تھی۔ کاشان نے وصیت میں اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ میں اس کی بخشی ہوئی رقم کسی اور آدمی کے ساتھ خرچ نہ کرسکوں۔

وصیت میں اس بات کی وضاحت بھی کردی گئی تھی کہ اگر میں دوسری شادی نہ کروں تو شمران والے اس مکان میں رہ سکتی ہوں اور اس کی کاریں بھی استعمال کرسکتی ہوں۔ گھر کے اخراجات کے لئے ایک معمولی سی رقم بھی مختص کردی گئی تھی لیکن شادی کی صورت میں مجھے ہر چیز سے محروم کردیا جاتا یہاں تک کہ میرا بیٹا بھی مجھ سے چھین لیا جاتا۔

لیکن مرنے سے پہلے وہ شاید یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ ایران کی تقدیر بھی بدل رہی تھی۔ سڑکوں پر شاہ کے خلاف مظاہرے اب روز کا معمول بن چکے تھے۔ فوج اور مظاہرین کے درمیان خونریز تصادم کی خبریں اخبارات کی سرخیاں بن رہی تھیں۔ وصیت تیار کرتے ہوئے کاشان نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ وقت بہت جلدی آنے والا ہے جب ایران میں دولت مند ہونا ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا اور اس کا بیٹا فرہاد کبھی اس دولت پر دعویٰ نہیں کرسکے گا جو وہ اس کے لئے چھوڑ کر جا رہا تھا۔

===O===
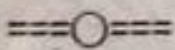
۱۹۷۷ء کے وسط میں' جب میرے شوہر کا انتقال ہوا تھا' ایران کے سیاسی افق پر ابتری کے آثار نظر آنے لگے تھے کوئی

دن ایسا نہیں جاتا تھا جب شاہ کے خلاف مظاہرے نہ ہوتے ہوں۔ ہم شمران کو تہران کا محفوظ ترین علاقہ سمجھتے تھے لیکن ہنگاموں کی لہر تہران کی سڑکوں سے نکل کر یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ کاشان کے انتقال سے صرف ایک مہینہ پہلے یعنی مئی میں ۵۳ ممتاز قانون دانوں نے شاہ کے نام ایک کھلے خط میں عدلیہ کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ ممتاز دانشوروں نے بھی وزیراعظم کے نام کھلے خطوط میں سنسرشپ کے خاتمے اور پریس کی آزادی کا مطالبہ کر ڈالا۔ جبکہ صرف دو سال پہلے وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کر سکتے تھے لیکن اب صورتحال بہت بدل گئی تھی۔ شاہ کے خلاف پورے ملک میں بے چینی کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔ میں کسی ریسٹورنٹ میں' بازار میں شاپنگ کے دوران یا کسی کاک ٹیل پارٹی میں جس سے بھی ملتی صرف ایک ہی بات سننے میں آتی کہ سب لوگ لیڈر شپ میں تبدیلی چاہتے تھے۔ میرے رشتہ دار' دوست اور یہاں تک کہ خود مجھے بھی کوئی متبادل راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اپوزیشن بائیں بازو کے طلباء اور انتہا پسند مذہبی رہنماؤں پر مشتمل تھی۔ جس میں نیشنل فرنٹ کی باقیات بھی شامل تھی۔ یہ وہی پارٹی تھی جس نے ۱۹۵۳ء میں شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔

"ایک بار پھر ۱۹۵۳ء کی تاریخ دہرائی جائے گی۔" میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔ "دیکھتے رہو اگر صورتحال یہی رہی تو سی آئی اے کو مداخلت کا موقع مل جائے گا اور پھر ہمیں فوج کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ کیا یہ لڑکے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فوج کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

فوج کے بارے میں ہم نے ایک عجیب سا تصور قائم کر رکھا تھا۔ شاہ نے فوج پر دولت پانی کی طرح بہائی تھی۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء کے دوران شاہ نے دس بلین ڈالر مالیت کا امریکی اسلحہ خریدا تھا۔ ایف ۱۴، جرمن نام کیٹ جیٹ فائٹر بھی خریدے گئے تھے جن میں فونکس میزائل نصب تھے۔ راک ویل انٹرنیشنل سے آٹھ سو پچاس بلین ڈالر کی مالیت کا الیکٹرانک کا دفاعی نظام خریدا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں ٹینک خریدے گئے تھے جن پر اربوں ڈالر کی رقم خرچ کی گئی تھی۔ شاہ کی ریگولر فوج کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تھی جبکہ چار لاکھ فوجی ریزرو میں تھے جنہیں چند گھنٹوں کے نوٹس پر طلب کیا جاسکتا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ کی مخالفت کرنے والوں نے صرف پولیس کے بارے میں سوچ رکھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ وہ پولیس پر قابو پانے کی ہمت رکھتے ہیں جبکہ فوج کے بارے میں بہت کم لوگوں نے سوچا تھا اور اصل خطرہ فوج ہی کی طرف سے تھا جو ہر تحریک کو کچلنے کی طاقت رکھتی تھی۔

امریکی خاتون صحافی کونی چنگ ایک مرتبہ صدر امریکا نکسن کے ہمراہ روس کے دورے پر گئی۔ ایک مقام پر وہ رفع حاجت کے لئے ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ باہر نکلی تو ایک روسی خاتون صحافی نے اسے روک لیا۔

"تمہیں روسی زبان کے ساتھ کچھ دقت پیش آرہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"قطعاً نہیں" کونی نے اپنی بڑائی جتانے کے لئے فخر سے کہا۔

"تو تم مردانہ ٹوائلٹ میں کیوں گئی تھیں؟" روسی صحافی خاتون نے کہا۔

نیویارک ٹائمز کا ایک لطیفہ

صدر بش آدھی رات کو نیند سے اٹھ کر وائٹ ہاؤس کے کچن میں مشروب پینے گئے تو ان کا سر ریفریجریٹر سے ٹکرا گیا اور وہ ساڑھے تین سال تک بے ہوش رہے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ وائٹ ہاؤس کا چیف آف اسٹاف جان سنونو ان پر جھکا ہوا تھا۔

"ملکی حالات کیسے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"سب کچھ بہت اچھا ہے۔ امن و امان ہے' خوشحالی ہے' افراط زر نہیں ہے' واچ ڈاگ ملی کی پوتی نے بچے دیئے ہیں اور ڈاک خانے ٹھیک کام کر رہے ہیں۔"

"ایک لفافے پر ڈاک خرچ کیا آرہا ہے؟" صدر بش نے پوچھا۔

"تین سو ین (جاپانی کرنسی)" جواب ملا۔

اس وقت تک آیت اللہ خمینی کی قوت کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا تھا۔ یہ آتش مزاج مذہبی رہنما ان دنوں عراق میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں آیت اللہ خمینی نے شاہ کے خلاف ایک خونی انقلاب کی قیادت کی تھی جس کے نتیجے میں انہیں ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

ایک طرف تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دس دن سوگ کے بعد کاشان کے رشتے دار رخصت ہو گئے تھے لیکن اس کے دونوں بزنس پارٹنر اور فیملی ڈاکٹر اب بھی ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔ بالآخر ایک روز میرے والد نے جب ان سے بھی رخصت ہونے کو کہا تو پہلے تو وہ آگ بگولہ ہو گئے

لیکن بالآخر انہیں میرے والد کے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی تھی اس طرح میں زندگی میں پہلی مرتبہ گھر کے معاملات میں خود مختار ہوئی تھی۔ مالی وسائل میں کمی آجانے کی وجہ سے میں نے فوری طور پر شوفر' ایک مالی اور دو دیگر ملازمین کی چھٹی کردی اب میرے پاس صرف ایک گھریلو ملازم اور دو مالی تھے جن میں ایک کل وقتی اور دوسرا جز وقتی تھا۔

کاشان کی زندگی میں گھر میں مہمانوں کی بھرمار رہتی تھی۔ آئے دن پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ گھر کا ماہانہ خرچ بارہ ہزار ڈالر سے بھی زیادہ تھا۔ میں نے فوری طور پر پارٹیوں کا سلسلہ ختم کردیا۔ دیگر غیر ضروری اخراجات بھی ختم کردیے۔ اس طرح گھر کا خرچ صرف تین ہزار ڈالر تک رہ گیا۔ اسے پورا کرنے کے لئے بھی میرے گھر والے میری مدد کرتے رہتے تھے۔

ایران اور میری زندگی میں تقریباً ایک ہی وقت میں بحران شروع ہوا تھا۔ شاہ نے ایران کو راتوں رات صنعتی قوت بنانے کا جو سہانا خواب دیکھا تھا' وہ ۱۹۷۷ء میں ایک بھیانک خواب میں بدل گیا تھا۔ تیل سے ہونے والی تمام آمدنی ترقیاتی اسکیموں پر خرچ ہورہی تھی۔ شاہ کے ذاتی اخراجات کی مد سے بھی ایک بڑی رقم سامان کی خریداری اور اس کی چہیتی فوج پر خرچ ہورہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ مجھے اپنے گھر کے پانی اور بجلی وغیرہ کے بل ملے تو میں بدحواس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ بلوں کی ادائیگی کس طرح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ماموں اردشیر نے میری رہنمائی کی تھی۔ اس مہینے میں نے پہلی مرتبہ نوکروں کو اپنے ہاتھ سے تنخواہوں کی ادائیگی کی۔ اس سے پہلے یہ سارے کام میرا شوہر کیا کرتا تھا۔

گھر کے معمولات کی دیکھ بھال کے علاوہ میری سب سے اہم ذمے داری فرہاد کی نگہداشت تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں کاشان 'فرہاد کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لئے اپنے پاس رکھا کرتا تھا لیکن جب اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا تو اس نے فرہاد کو اپنے سے دور ہٹادیا۔ فرہاد کو کچھ عرصے کے لئے ایک دوست کے گھر بھیج دیا گیا تھا اور جب اسے واپس لایا گیا تو اس نے گھر میں ہونے والی تبدیلیوں کو فوراً ہی محسوس کرلیا۔ میری سوجی ہوئی آنکھوں نے اسے بہت کچھ بتادیا تھا لیکن وہ ایک ذہین بچہ تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اسے ابھی باپ کی موت کا نہیں بتانا چاہتی تھی۔ پہلے میں نے اسے بتایا کہ کاشان سوئٹزرلینڈ گیا ہوا ہے۔ اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ وہ جب بھی سلور رنگ کی کوئی مرسیڈیز دیکھتا' اچھل کر کھڑا ہوجاتا۔ وہ سمجھتا' اس کا باپ آگیا ہے۔ کبھی بازار میں اپنے باپ کے حلیے سے ملتے جلتے کسی آدمی کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا لیکن اس شخص کی صورت دیکھ کر اس کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی۔ بالآخر میں نے اسے بتا ہی دیا کہ اس کا باپ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کے بعد اسے ایک چپ سی لگ گئی میں فرہاد کے لئے وہ سب کرنا چاہتی تھی جو اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا لیکن کاشان کے بغیر یہ میرے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا جسے میں نے قبول کرلیا تھا۔

فرہاد کی موت کے بعد شروع میں تو میں اپنے گھر تک ہی محدود رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ میں نے گھر سے باہر نکلنا شروع کردیا۔ چند روز بعد میں اپنی کزن فیروزہ کو لے کر کیمپنن والے ولا میں چلی گئی۔ فیروزہ کا شوہر بھی ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا۔ وہ کاروباری سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس طرح فیروزہ کا زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ فرہاد اور فیروزہ کے دو بچے بھی ہمارے ساتھ تھے۔

اس رات کیمپنن والے ولا میں بچوں کو سلانے کے بعد میں اور فیروزہ کھانا کھانے کے لئے حیات ہوٹل چلے گئے۔ ایران میں اونچے طبقے کی خواتین کا بھی اکیلے آنا جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا' اس لئے ہم دونوں فوراً ہی دوسروں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ دبلی پتلی فیروزہ خاصی حسین تھی۔ اس کے سنہری بال کمر تک جھول رہے تھے اور سبز آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور جھیل جیسی گہرائی تھی۔ اس نے دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا جبکہ میں اس وقت بھی ماتمی سیاہ لباس میں تھی۔

فیروزہ کے دو تین دوست بھی اس وقت ہوٹل میں موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی ہماری میز پر آگئے۔ ان میں حامد بھی تھا۔ وہ ایک صنعتکار باپ کا کھلنڈرا بیٹا تھا جسے عام طور پر پلے بوائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی والدہ ایک سوشل خاتون تھی اور تہران میں بڑی بڑی پارٹیوں کے لئے بڑی شہرت رکھتی تھی۔ حامد بھی اونچے طبقے کی خواتین میں بے حد مقبول تھا۔ شاہ کی بہن فاطمہ سے تو اس کے بہت قریبی تعلقات تھے اس کی عمر اگرچہ اکتالیس سال تھی لیکن وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتا تھا۔ جنس مخالف کے لئے اس میں بے پناہ کشش پائی جاتی تھی۔ شاہی محل میں ہونے والی کوئی پارٹی ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں حامد موجود نہ ہو۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ پیرس کے چکر بھی ضرور لگاتا تھا۔ تہران میں رہتے ہوئے وہ ہر وقت حسیناؤں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا تھا۔ ہر لڑکی اسے اپنے حسن کے جال میں جکڑنے کو بے چین تھی لیکن حامد کسی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس رات حیات ہوٹل میں پہلی ملاقات کے بعد حامد اکثر مجھ سے ملتا رہا۔ اس طرح ہمارے تعلقات مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔

حامد بڑا اعلیٰ قسم کا آدمی تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اسے

اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ حامد کے حلقے میں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ہر لڑکی اسے حاصل کرنے کی کوشش میں تھی اور اسی کوشش میں وہ اپنا بہت کچھ لٹا بھی چکی تھیں۔

لیکن میں اس معاملے میں بڑی محتاط واقع ہوئی تھی۔ میں اب بھی اس نظریے پر کاربند تھی کہ عورت کا جسم اس کے شوہر کی امانت ہوتا ہے۔ خواہ وہ زندہ ہو یا مر چکا ہو لیکن اس معاملے میں حامد کا مذہب کچھ اور کہتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت اور مرد میں دوستی برقرار رکھنے کے لئے جنسی تعلقات بہت ضروری ہیں۔ اس کے بغیر دوستی کا رشتہ استوار نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ہر صورت میں حامد کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لئے مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا جو حامد چاہتا تھا۔

اس وقت تک میں یہ بھی جان چکی تھی کہ تہران کی اعلیٰ سوسائٹی میں عورت کی عزت اور آبرو جیسے الفاظ کے معنی ختم ہو چکے تھے۔ غیر شادی شدہ عورتیں بڑے آدمیوں سے تعلقات رکھنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھیں۔ یہ سب کچھ عیاشی کے نظریے کے تحت کیا جا رہا تھا لیکن میرا تو ایک خاص مقصد تھا۔ مجھے ایک سہارے کی ضرورت تھی اور حامد میرے لئے بہت اچھا سہارا ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور پھر اونچی سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لئے میں نے کچھ بارسوخ لوگوں سے تعلقات بڑھائے۔ اور اس طرح میری زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس کا کاشان کی زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

۱۹۷۸ء کے اوائل تک تہران کی اونچی سوسائٹی میں میرے نام کی شہرت تھی۔ میں بڑی بڑی پارٹیوں کے حوالے سے بھی پہچانی جاتی تھی۔ میری کسی بھی پارٹی میں مدعوئین کی تعداد پانچ چھ سو سے کم نہیں ہوتی تھی۔ ان دعوتوں میں کھانے فرانسیسی شیف تیار کرتے۔ فرانسیسی باورچیوں سے کھانا تیار کرانا بھی دولت مندی کی ایک علامت سمجھا جاتا تھا۔

ادھر میں اونچی سوسائٹی میں اپنی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھی' ادھر ملک کے سیاسی افق پر سیاہ بادل روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

آیت اللہ خمینی کا شمار شاہ کے بدترین دشمنوں میں ہوتا تھا جنوری میں سرکاری اخبار "اطلاعات" میں امام خمینی کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا جس میں امام خمینی کی ذات پر رکیک حملے کئے گئے تھے۔ اس مضمون کے خلاف احتجاج کے لئے ہزاروں طلباء نے قم کی سڑکوں پر مظاہرہ کیا۔

شاہ کے دشمنوں نے عراق کے شہر نجف کو اپنا مرکز بنا لیا تھا وہاں سے پہلوی خاندان کے خلاف لٹریچر کے علاوہ امام خمینی کی تقاریر کے کیسٹ بھی اسمگل ہو کر ایران پہنچتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خمینی ایک شعلہ بیاں خطیب تھے۔ شاہ کے خلاف ان کی تقریروں کے یہ کیسٹ چوری چھپے سنے جاتے۔ ہر تقریر میں شاہ کو شیطان کا لقب دینا ایک معمولی بات تھی۔

وہ جنوری کا سرد ترین دن تھا۔ اطلاعات میں شائع ہونے والے مضمون کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہزاروں طلباء قم کی سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ پہلے تو پولیس انہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بعد میں پولیس کی جگہ فوج نے لے لی۔ فوج سے تصادم میں سیکڑوں طلباء زخمی اور کئی ہلاک ہوئے۔ ایران میں اس قسم کے ہنگاموں میں ہلاک

ہونے والوں کی صحیح تعداد کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ دوسرے دن سنسر شدہ اخبارات میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی لیکن سینہ گزٹ کے مطابق یہ تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اخبارات میں یہ خبر اس طرح شائع ہوئی تھی جیسے یہ واقعہ ایران میں نہیں، کسی اور ملک میں پیش آیا ہو قم کے ہنگامے میں ہلاک ہونے والوں کے چہلم کے موقع پر ایران کے ہر بڑے شہر میں احتجاجی مظاہرے کئے گئے ان مظاہروں میں بھی ہنگامے ہوئے اور کچھ اور لوگ مارے گئے۔ اس طرح ہنگاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ ہم جیسے دولت مند ایرانیوں کے لئے بھی عام ایرانیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ ہم مغربی لباس پہنتے تھے، مغربی فلمیں دیکھتے، ہماری راتیں نائٹ کلبوں میں بسر ہوتیں، موسیقی، شراب، جوا اور دیگر رنگ رلیاں ہماری زندگی کا واحد مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ جبکہ اسلام نے ان خرافات کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ ہم نے ان ایرانی عورتوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا جو دو وقت کی روٹی کے لئے دوسروں کے گھروں میں کام کرتی تھیں ان مزدوروں کا خیال کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا جو چلچلاتی دھوپ اور شدید برف باری میں مشقت کرتے تھے

لیکن اب ملک بھر میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس سے ہم خوفزدہ ہو رہے تھے اور پھر اگست میں ایک اور ہولناک خبر سننے میں آئی۔ ابادان کے ایک سینما گھر کو آگ لگا دی گئی۔ اس وقت سینما کا شو جاری تھا۔ آگ چاروں طرف اس طرح لگائی گئی تھی کہ پوری عمارت آناً فاناً شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ بہت کم لوگوں کو باہر نکلنے کا موقع مل سکا۔ ۴۷۷ افراد خاکستر ہو کر رہ گئے سینما گھر میں یہ آگ مذہبی رہنماؤں کے اشارے پر لگائی گئی تھی۔ اپنا دامن بچانے کے لئے انہوں نے حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا جبکہ حکومت اپنے مخالفین کو اس سانحے کا ذمے دار ٹھہرا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کی بات کا یقین کیا جائے۔ لیکن بہرحال، شاہ نے اپنے مخالفین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بے شمار رعایتوں اور مراعات کا اعلان کر دیا۔

لیکن اب صورتِ حال ایسی نہیں تھی جسے مراعات سے کنٹرول کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ ہماری طرح شاہ بھی مذہبی قوتوں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ابادان میں سینما گھر کی آتشزدگی کے بعد شاہ نے نہ صرف وزیر اعظم کو برطرف کر دیا بلکہ کاسینو، نائٹ کلبوں جوئے خانوں اور سینما گھروں پر پابندی عائد کر دی۔ مزید برآں مذہبی رہنماؤں کی ناراضگی مول لے کر اس نے خواتین کے لئے جو وزارت قائم کی تھی، اسے ختم کر کے اس کی جگہ مذہبی امور کی وزارت قائم کر دی اور پریس کی آزادی کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن ان اقدامات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ستمبر میں ایک لاکھ افراد نے شاہ یاد اسکوائر پر زبردست مظاہرہ کیا اس کے تین دن بعد تہران کے گلی کوچوں میں مظاہرے ہونے لگے۔ مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ امام خمینی کی قیادت میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مظاہرین کی قوت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر سات ستمبر کو مارشل لاء لگا دیا گیا۔ لیکن مارشل لاء کے نفاذ کے اگلے ہی روز تہران کے متوسط علاقے جالہ اسکوائر پر ایک اور زبردست مظاہرہ ہوا۔ فوج نے مظاہرین کو منتشر کرنے کی کوشش کی لیکن جب مظاہرین شدت پر اتر آئے تو فوج نے گولی چلا دی اور اس طرح لاتعداد بے گناہ لوگ سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اکتوبر میں پہلی مرتبہ پبلک سیکٹر میں عام ہڑتال کی گئی اس وقت جو صورتِ حال سامنے آئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ امام خمینی کے علاوہ دنیا کی کوئی طاقت ان خونریز ہنگاموں پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ اس موسم خزاں میں شاہ نے عراق کے صدر صدام حسین سے درخواست کی کہ امام خمینی کو عراق سے نکال دیا جائے اور یہ شاہ کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی کیونکہ امام خمینی عراق سے نکل کر پیرس چلے گئے تھے جہاں دنیا بھر کے اخباری رپورٹر ان سے آسانی سے رابطہ قائم کر سکتے تھے جبکہ عراق میں کوئی اخباری رپورٹر عراقی حکومت کے خوف سے امام خمینی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ امام خمینی کے پیرس آنے کے بعد شاہ کے خلاف اٹھنے والی آواز دنیا بھر میں سنائی دینے لگی۔

اس صورتِ حال نے ایران کے دولت مند طبقے کے ہر فرد کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ خصوصاً میری طرح کے وہ لوگ جن کے شب و روز رنگ رلیوں میں گزرتے تھے، ان کی تو گویا جان پر بنی ہوئی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح میرے ماموؤں نے بھی قدامت پرستی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے پارٹیوں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ بڑی اور قیمتی کاروں پر سفر کرنے کے بجائے وہ چھوٹی اور پرانی کاریں استعمال کرنے لگے۔ محفلوں میں اپنی دولت مندی کی ڈینگیں ہانکنے کے بجائے انہوں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا لیکن مجھ جیسی نوجوانوں کو یا تو صورتِ حال کی سنگینی کا پوری طرح احساس نہیں تھا یا جان بوجھ کر اس طرف توجہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ہم آخری لمحوں تک زندگی کی رنگینیوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

میرا اپنا دوست حامد اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا۔

"تمہارے خیال میں اگر انقلاب آگیا تو ہمارے ساتھ کیا

سلوک ہوگا؟ میرے خیال میں یہ تمام مظاہرے اور ہنگامے حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ آخر لوگ ان ہنگاموں سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ لوگ ہمارے اس خوبصورت ملک کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔"

میرے ایک اور دوست نے صورتِ حال پر یوں تبصرہ کیا

"یہ لوگ آخر کیا کریں گے؟ ہماری زمین اور دولت چھین لیں گے؟ کیوں نہ وہ وقت آنے سے پہلے ہم اس دولت کو عیاشی میں اڑا دیں۔"

احتجاجی مظاہرے اور ہنگامے روز مرہ کا معمول بن چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حامد نے ہمیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ہمیں خبردار کر دیا کہ ہم درآمد شدہ شراب خریدنے، انگلش موسیقی سننے یا یورپ میں شاپنگ کے پروگرام بنانے سے گریز کریں۔

"اگر ہم اپنی دولت چھوڑ کر جانیں بچا لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ انقلابیوں کے خلاف باتیں کر کے ہم خود اپنے لئے عرصہ حیات تنگ کر رہے ہیں۔"

نومبر ۱۹۷۸ء میں ہمیں جو سگنل ملا، اس سے ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہماری آزادی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر شاہ کی تقریر گویا تابوت کی آخری کیل تھی۔

"میں آپ لوگوں کا انقلابی پیغام سمجھ گیا ہوں۔" شاہ نے قوم کے نام خطاب کے دوران کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسی تبدیلی ضرور آئے گی۔"

یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایران کا شہنشاہ بول رہا تھا۔ وہ شخص جو سائرس اعظم کا جانشین ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، اب اپنی رعایا کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں نے جب اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ دولت مند طبقے کے افراد بوریا بستر سمیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ متبادل منصوبے تیار ہو رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنے اثاثے بیرون ملک منتقل کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس وقت تک بڑی بڑی رقوم ملک سے باہر بھیجنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ۱۹۷۸ء اگرچہ سیاسی لحاظ سے ایران کی تاریخ کا بدترین دور تھا لیکن تھوڑی بہت رشوت دے کر قیمتی قالین، زر و جواہر اور دیگر قیمتی اشیا کو بیرون ملک اسمگل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

دولت مند لوگ اگرچہ اپنے اثاثے بیرون ملک منتقل کر رہے تھے لیکن کسی سے بھی کھلے عام یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ ملک چھوڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے بڑے بڑے بزنس مینوں، سیاستدانوں، صنعتکاروں اور اپنے بیشتر دوستوں کو یہ کہہ کر ملک سے رخصت ہوتے دیکھا تھا کہ وہ دس دن کی چھٹیاں منانے کے لئے جا رہے ہیں۔ ایک روز میں اپنی ایک دوست کے ہاں گئی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی کہ اس کا باپ اپنا قیمتی فرنیچر فروخت کر رہا تھا۔ مجھے یاد ہے، یہ فرنیچر صرف تین سال پہلے اس نے پیرس سے منگوایا تھا۔ میرے پوچھنے پر میری دوست نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں گھر میں سامان کے انبار لگ گئے تھے۔ اس لئے تھوڑا بہت بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔"

اس واقعے کے صرف دو ہفتے بعد میری وہ دوست اپنے والدین کے ساتھ ایران سے چلی گئی۔ ان دنوں وہ لوگ جنیوا میں ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اگست میں میری کزن فیروزہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے یورپ چلی گئی۔ وہ لوگ اپنے ساتھ صرف استعمال کے کپڑے لے کر گئے تھے۔

"گھبراؤ مت! ہم واپس آ جائیں گے۔" رخصت ہوتے وقت فیروزہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلملا رہے تھے۔

لیکن وہ لوگ واپس نہیں آئے اور انقلاب کے فوراً ہی بعد نئی حکومت نے اس کے شوہر کی کنسٹرکشن کمپنی، شاہی محل کے قریب شاندار فرنیچر اور ہر چیز سے بھرا ہوا ان کا عالی شان مکان اور زمینیں ضبط کر لیں۔

لوگ مرحلہ وار ملک سے فرار ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے شاہ کے قریبی رشتے دار رخصت ہوئے پھر ان کے دوست، پھر ان لوگوں کی باری آئی جن کا شاہ کی حکومت یا اس کے خاندان سے کوئی تعلق تھا۔ اس کے بعد بینکرز، صنعتکار اور زمیندار رخصت ہونے لگے۔ یہ لوگ اپنا کاروبار، زمینیں اور سب کچھ اپنے ماتحتوں کے حوالے کر کے جا رہے تھے۔

حامد کا خاندان دوسرے مرحلے میں شاہ کے رشتے داروں کے ساتھ ملک سے نکل گیا تھا لیکن وہ خود رہ گیا تھا تاکہ آخری لمحوں تک اپنی جائداد اور کاروبار کی دیکھ بھال کر سکے۔

میری ایک کزن نونو، جو شاہی محل میں ایک شہزادی کی فیملی ڈاکٹر تھی، کا صبح ہی صبح شاہی محل سے فون آ گیا۔ شہزادی نے اسے فوری طور پر محل میں طلب کیا تھا۔ بعد میں نونو کو بتایا گیا کہ شاہی دربار کے ایک آفیسر نے شہزادی اور شاہی خاندان کے دیگر افراد سے کہا تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ملک چھوڑ دیں۔ انہیں سامان وغیرہ پیک کرنے کے لئے صرف چند گھنٹے ملے تھے اور جب وہ لوگ ملک سے فرار ہوئے تو میری کزن نونو بھی ان کے ساتھ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو شاہ کے زوال کے بعد اسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

ہم جیسے وہ لوگ جو ابھی تک فرار نہیں ہو سکے تھے، انہیں یا تو یہ خوش فہمی تھی کہ انقلاب نہیں آئے گا یا اپنے

"مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پشاور کے صوبیدار سردار محمد خان کے پاس ایک خوبصورت گھوڑی لیلیٰ موجود تھی جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھی جب مہاراجہ رنجیت سنگھ تک اس گھوڑی کا چرچا پہنچا تو اس نے یہ گھوڑی حاصل کرنے کا پیغام بھیجا۔ سردار محمد خان کے انکار پر اس نے اپنے جرنیل سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ کو گھوڑی چھین کر لانے کے لئے روانہ کیا۔ ایک خونریز معرکہ کے بعد 'سردار بدھ سنگھ کو علم ہوا کہ یہ گھوڑی جنگ میں کام آچکی ہے۔ اس نے لاہور پہنچ کر یہ اطلاع رنجیت سنگھ کو پہنچائی تو پتا چلا کہ یہ اطلاع غلط ہے اور لیلیٰ زندہ ہے۔ اب رنجیت سنگھ نے اپنے شہزادے کھڑک سنگھ کی سرکردگی میں ایک اور لشکر پشاور روانہ کیا اور یار محمد خان کو معزول کردینے کے احکام جاری کئے۔ یار محمد نے یہ صورت حال دیکھی تو گھوڑی کو لے کر پہاڑوں میں غائب ہو گیا اور اپنے بھائی سردار سلطان محمد خان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اسی دوران سید احمد شہید کا سکھوں اور انگریزوں سے جہاد شروع ہو گیا۔ سکھوں کی فوج کا ایک فور جرنیل جرنل دینتورا نے اس جہاد میں بھرپور کردار ادا کیا اور سید احمد اور ان کے ساتھیوں کو شکست دینے کے ساتھ ساتھ سلطان محمد اور یار محمد کو بھی شکست دے دی اور ان سے لیلیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ گھوڑی لاہور پہنچائی گئی اور رنجیت سنگھ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ مہاراجہ نے اس کے ملنے کی بڑی خوشی منائی۔ اس کا بیان تھا کہ اس گھوڑی کے حصول میں اس کو ساٹھ لاکھ روپیہ اور بارہ ہزار جانوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس حوالے سے لیلیٰ تاریخ عالم کی سب سے قیمتی گھوڑے قرار دی جا سکتی ہے۔ اس گھوڑی کا حنوط شدہ جسم آج بھی لاہور کی شاہی قلعہ کے سکھ دور کے نوادرات کے عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔"

سر لیپل گرفن کی مشہور کتاب "رنجیت سنگھ" کا ایک ورق / عقیل عباس جعفری کی تلاش

☆☆ لاہور ☆☆

لاہور میں بھی کئی مقامات دیکھنے کی ہیں۔ مغلیہ خاندان کے دور اندیش حکمرانوں نے کیمرے اور دوربینیں لے کر یورش کرنے والے سیاحوں کی ضرورت کا اندازہ پہلے سے کر لیا تھا۔ ایک بادشاہ قلعہ بنا گئے اور اس کے در و دیوار پر شیشے کانچ وغیرہ لگا گئے کہ دیکھو اور حیرت کرو۔ ایک اور بادشاہ نے اونچی سی مسجد بنادی جس کو مسجدیں دیکھنے کا شوق ہو لال رنگ کی مسجد دیکھ لے۔ کچھ سیاحوں کو فاتحہ پڑھنے اور شاعروں وغیرہ کے مزار دیکھنے شوق ہوتا ہے ان کی سہولت کے لئے قوم نے علامہ اقبال نام کے بڑے شاعر کو مار کر میں مسجد اور قلعے کے درمیان دفن کر دیا مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ملکہ نورجہاں نے بھی یہیں انتقال کرنا اور مزار بنوانا پسند کیا۔ ادھر باغبان پورے کی طرف جگہ خالی تھی جھیلیں وغیرہ ابھی نہیں پڑی تھیں نہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے بورڈ لگایا تھا۔ وہاں ایک باغ بنا دیا گیا اور بیچ میں کچھ درخت لگا کر چوبچے وغیرہ بنا دیئے۔ یہ شالامار باغ ہو گیا۔

طور پر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ چونکہ انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا' اس لئے انہیں کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خوش فہمیاں دور ہو رہی تھیں اور زندگی ان کے لئے مشکل تر ہو کر رہ گئی تھی۔

ہم اپنے مخصوص دوستوں میں بیٹھ کر بھی اس انقلاب کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتے تھے جو ہمارے سروں پر تلوار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اگر ہم میں اس موضوع پر کوئی بات ہوتی بھی تو اس قدر جذباتی رنگ اختیار کر جاتی کہ ہم آپس ہی میں دست و گریباں ہو جاتے۔ اگرچہ یہ سب کچھ کسی آسیب کی طرح ہمارے ذہنوں پر مسلط تھا لیکن ہم نے کئی مرتبہ ہی گھریلو محفلوں میں اس موضوع پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی۔ کسی نہ کسی طرح بات چھڑ ہی جاتی۔ جس کا نتیجہ وہی نکلتا۔ آپس کی ناراضگیاں۔ کوئی غصے میں پیر پٹختا ہوا باہر نکل جاتا اور کوئی کونے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگتا۔

میرے ننھیال 'سلمان فیملی نے ایران کو بہت کچھ دیا تھا۔

میرے ماموں فائق نے محض اس لئے شادی نہیں کی تھی کہ اس کا زیادہ وقت خدمت خلق میں گزرتا تھا۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اب رفاہی اداروں کی نذر کر دیتا جو خدمت خلق میں مصروف تھیں۔ فائق ایک بہترین انسان تھا۔ دوسرے ماموؤں کی نسبت وہ مجھ سے بہت زیادہ قریب تھا۔ اسے میری ماں سے بھی بہت محبت تھی۔ ماموں خروش کو میرے ننھیال میں روشنی کے مینار کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا اور اس نے ملک کے لئے بڑے بڑے تعمیراتی منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچائے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں ہمیشہ ایک موٹا سا سگار دبا رہتا تھا۔ وہ سائٹ پر جاتا تو بھی اس کے جسم پر قیمتی لباس ہوتا۔ اسے ایران کی خدمت پر فخر تھا۔

میرے اس خاندان میں صرف ماموں اردشیر اور اس کی بیوی گیتی ہی ایسی تھی جن کے خیال میں شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ ہی جانا چاہئے۔

"کیا آپ کو اس بات کو خوف نہیں کہ شاہ کے بعد آپ سے بھی یہ سب کچھ چھن جائے گا؟" ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا۔

"ہمیں اتنا خود غرض نہیں ہونا چاہئے۔" گیتی نے جواب دیا۔ "ہمیں اپنی ذات سے ہٹ کر مجموعی طور پر پورے ملک کے لئے سوچنا چاہئے۔ یہ انقلاب عوام کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ تم نے شاید کبھی سوچا نہیں کہ یہاں کتنے لوگ نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ کتنے تعلیم سے محروم جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جب تک شاہ موجود ہے، ان لوگوں کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں سمجھتی ہوں کہ ماموں اردشیر اور اس کی بیوی کا شمار خاندان کے ایسے لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جن میں خوف خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گیتی نے امریکا میں تعلیم حاصل کی تھی۔ رضاکارانہ طور پر معذور بچوں کی خدمت کر کے اسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ اس کا باپ اور بھائی گھریلو ایندھن فراہم کرنے والی ملک کی سب سے بڑی کمپنی کے مالک تھے لیکن دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود ان میں مذہبی رجحان زیادہ تھا۔ گیتی کو اس خاندان کی سب سے حسین خاتون کہا جا سکتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں جب وہ امریکا سے واپس آئی تھی تو مجھے سب سے زیادہ محبت اسی سے ملی تھی۔ ماموں اردشیر بھی وجیہہ اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ امریکا سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تہران میں "لا ریزرو" کے نام سے ایک ریسٹورنٹ کھول لیا تھا جس کا شمار شہر کے چند بہترین ریسٹورنٹس میں ہوتا تھا۔ ان کے پاس بھی اگرچہ دولت کی کمی نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتے اور ان کے پاس کار بھی پرانی سی تھی حالانکہ وہ نئی اور بڑی کار بھی خرید سکتے تھے۔

"یہ ایک غریب ملک ہے۔" وہ اکثر کہا کرتے۔ "ہم اپنی دولت کی بے جا نمائش کر کے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس کیوں پہنچائیں۔"

مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں اور میرے دوست اپنی عیاشیوں میں اس قدر مست تھے کہ ہمیں دوسروں کے بارے میں سوچنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اور شاید ہم ان کے بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ ہماری زندگیاں ان سے بہت مختلف تھیں۔

ایک روز شہرانی اسکوائر پر ایک بہت بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔ ماموں اردشیر اور گیتی بھی اس مظاہرے میں حصہ لینے جا رہے تھے۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ تہران کی سڑکوں اور گلیوں میں مظاہرے روز کا معمول بن چکے تھے اور میں مظاہرین سے بچ بچا کر نکل جانے میں بڑی مہارت حاصل کر چکی تھی لیکن اس روز شہران بلیوارڈ پر ہزاروں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، جیسے چاروں طرف سے لوگوں کا سیلاب امڈا چلا آ رہا ہو۔ مظاہرین فضا میں گھونسے لہرا لہرا کر شاہ کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ مظاہرین کو قریب سے دیکھا۔ شہنشاہیت کے خلاف ان کے چہروں پر کتنی نفرت تھی۔ مظاہرین میں زیادہ تعداد نچلے اور درمیانے طبقے کی تھی۔ اکا دکا چہرے ایسے بھی دکھائی دے رہے جن کا شمار دولت مندوں میں کیا جا سکتا تھا۔ مظاہرین میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی اور عورتیں بھی۔ عورتوں نے سیاہ چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ وہ سب یک زبان ہو کر "مرگ بر شاہ" اور "مرگ بر امریکا" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں میں امام خمینی کی واپسی کے نعرے بھی شامل تھے۔

ان کے چہرے پر وہ سب کچھ لکھا ہوا نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا جو وہ چاہتے تھے۔ دانشوروں کا بھی خیال تھا کہ شاہ کے جانے کے بعد یہ لوگ اپنے معاملات میں آزاد ہوں گے۔ ساوک جیسی تنظیموں کا خاتمہ ہو جائے گا اور اخبارات ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو جائیں گے۔ غریبوں نے امام خمینی سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ امام خمینی نے وعدہ کیا تھا کہ بے گھروں کو گھر اور روزگاروں کو روزگار ملے گا۔ کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ غریب کسان لمبی چوڑی زمینوں کے مالک ہونے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تاجروں نے یہ خوشگوار امیدیں باندھ لی تھیں کہ شاہ کے جانے اور امام خمینی کے آنے سے وہ شاہی دربار کے بدعنوان اور رشوت خور افسروں کے عتاب کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے۔ قوم پرست یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ انہیں امریکا کے تسلط سے نجات مل جائے

☆☆ ابن انشاء کے سفرنامے دنیا گول ہے سے اقتباس ☆☆

برصغیر کے نامور حکیم عبدالوہاب انصاری جو حکیم نابینا کے نام سے معروف تھے ' کا نام بڑے عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ فن طبابت پر ان کی دسترس کے بارے میں خواجہ حسن نظامی اپنے ۱۳ ر ستمبر ۱۹۲۲ء کے روزنامچہ میں رقم طراز ہیں۔

" حکیم نابینا صاحب مہاراج سرکشن پرشار کے بچوں کے نبض دیکھنے کو ہمی تشریف لے گئے میں حیران رہ گیا کہ رانیوں اور بیگمات اور بچوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا' خود ہی ہر بیمار کی مفصل کیفیت نبض دیکھ کر بتادی اور ہر بیمار نے تصدیق کی کہ بیشک یہی حال ہے۔ اس وقت مہاراجا نے ایک قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ حیدر آباد میں ان حکیم صاحب کو میں نے اپنے گھر بلایا۔ رانی صاحبہ کی نبض دکھانی تھی مگر بجائے رانی صاحبہ کے میں نے نبض دکھادی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا " یہ نبض تو مہاراج کی ہے " میں نے اپنی زندگی میں ایسا کمال کسی طبیب میں نہیں دیکھا۔ "

ہندوستان کے نامور اطباء سے عقیل عباس جعفری کا انتخاب

☆☆ ساحر اور فراق ☆☆

امرتسر کے ایک ہوٹل میں فراق چند شاعر دوستوں کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ ہوٹل کا منیجر ایک رجسٹر لے آیا اور ساحر ہوشیار پوری کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا " براہ کرم نام و پتا لکھ دیجئے۔ "

ساحر نے اپنا نام اور پتا لکھ دیا لیکن جب پیشے کے خانے پر نگاہ پہنچی تو الجھ گئے اور فراق صاحب سے پوچھنے لگے۔

" کیوں صاحب میں اپنا پیشہ کیا لکھوں۔ "

" معشوق لکھ دو " فراق بولے۔

" ارے میاں اس عمر میں " ساحر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" آگے پنشن یافتہ بھی لکھ دینا " فراق نے نہایت سادگی سے کہا۔

گی اور وہ کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنی حکومت قائم رکھیں گے۔

۱۹۷۸ء کے موسم سرما میں جب ملک کے طول و عرض میں ہڑتالوں اور پرتشدد مظاہروں کے باعث زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے بیٹے فرہاد کو یورپ لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ انہی دنوں ' دسمبر میں شاہ نے اپنا اقتدار بچانے کی آخری امید کے طور پر نیشنل فرنٹ کے رہنما شاہ پور بختیار کو وزیر اعظم مقرر کردیا۔ لیکن شاہ کے اقتدار کی بنیادیں ہل چکی تھیں قرائن بتا رہے تھے کہ حکومت اب تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہے۔

میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ میرے بیٹے کا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں لے جاؤں۔ ایران میں کسی کا مستقبل محفوظ نہیں تھا۔ میں اس الجھن کا شکار تھی کہ کیا فرہاد کو اس کے دوستوں ' رشتے داروں سے دور کسی اجنبی سرزمین پر لے جانا مناسب ہوگا؟ ایران میں رہتے ہوئے وہ ایک دولت مند آدمی بن سکتا تھا۔ باپ نے اس کے لئے کروڑوں کی جائداد چھوڑی تھی۔ جبکہ جلاوطنی کی صورت میں اسے زندگی گزارنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی لیکن سوال تو یہ تھا کہ ایک ایسے ملک میں جس کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا کیا فرہاد زندہ رہ سکے گا:

فرہاد کے ددیال والوں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے فرہاد کو مستقل طور پر ملک سے باہر لے جانے کی کوشش کی تو وہ اس کی بھرپور مزاحمت کریں گے۔ ان کے خیال میں فرہاد کے لئے ایران سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایران کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی خطہ اس کے لئے محفوظ نہیں ہوگا۔ علی نے ماموں فائق سے بحث کرتے ہوئے اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

" ایران میں جو بچے مر رہے ہیں وہ لاوارث نہیں ہیں۔ فرہاد کوئی آسمان سے اتری ہوئی مخلوق نہیں ہے۔ اسے بھی دوسرے بچوں کے ساتھ یہیں جینا اور مرنا ہوگا۔ "

حقیقت یہ تھی کہ وہ لوگ فرہاد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر فرہاد ان کی گرفت سے نکل گیا تو کروڑوں کی وہ جائیداد بھی ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گی جو فرہاد کے نام منسوب تھی۔ انہوں نے کاشان کے دونوں بزنس پارٹنرز اور فرہاد ٹرسٹ کے نگراں جمشید اور عبداللہ تسلیمی پر بھی یہ دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ مجھے اتنی رقم ہرگز نہ دی جائے کہ میں بیرون ملک سفر کا پروگرام بنا سکوں۔ لیکن میرے پاس اتنی رقم تو موجود تھی کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ چند روز کے لئے یورپ کا دورہ کرسکوں۔

میرے ماموں فائق نے فرہاد کے ددیال والوں کو یہ تحریری ضمانت دی تھی کہ میں فرہاد کو لے کر واپس آجاؤں گی۔ ایک بانڈ پر دستخط کرنے کے علاوہ ماموں فائق نے ایک بڑی رقم بھی ضمانت کے طور پر ان کے حوالے کردی تھی۔

اس سال دسمبر میں جب میں تہران سے رخصت ہوئی تو مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ واپسی پر یہاں کون برسر اقتدار ہوگا۔

میرے شوہر کی دولت کو میرے لئے شجر ممنوعہ قرار دے دیا گیا تھا۔ میرے یورپ کے اس دورے کے زیادہ تر اخراجات میرے ماموؤں ہی نے برداشت کئے تھے۔ یورپ میں میرے لئے رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسپین کے خوبصورت شہر ویلنشیا' پیرس' لندن اور دیگر کئی شہروں میں کاشان کے مکان اور اپارٹمنٹس موجود تھے۔ ہم نے انہی میں قیام کیا۔ دیگر اخراجات کے معاملے میں بھی میں بہت محتاط رہی تھی۔ ان شہروں میں قیام کے دوران میں اپنے رشتے داروں سے بھی ملتی رہی تھی۔ انہی دنوں یہ ہولناک خبر سننے میں آئی کہ امام خمینی نے ایرانیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ شاہ کو ایران سے نکال دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی ایران واپسی کے منصوبے بنا رہے تھے۔

امام خمینی اس وقت تک ایرانیوں کے لئے ایک نجات دہندہ کی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔ ان دنوں میں پیرس میں تھی اور امام خمینی بھی پیرس کے نواح نیوفل' لی چیٹو کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ ایک روز میری ایک دوست نے کہا۔

"پیرس میں موجود ہر ایرانی امام خمینی کے دیدار کے لئے ان کے آستانے کا رخ کر رہا ہے۔ دور دراز سے لوگ ان سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ تم بھی جاکر ان سے عقیدت کا اظہار کرو۔ وہ ایک بہت عظیم انسان ہیں۔"

لیکن میں نے اپنی دوست کو ٹال دیا۔ میں امام خمینی سے عقیدت کا اظہار کس طرح کرسکتی تھی۔ ان کی وجہ سے ملک میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

یہ ۱۶ر جنوری ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں لندن میں تھی اور اس روز ومبلڈن میں اپنی کزن فیروزہ کے ہاں گئی ہوئی تھی کہ اس کا شوہر منوچہر دوڑا دوڑا آیا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی تھی اور سانس اس طرح پھولا ہوا تھا جیسے میلوں کی مسافت دوڑتے ہوئے طے کرکے آیا ہو۔ حالانکہ وہ ڈرائننگ روم سے اٹھ کر آیا تھا۔

"جلدی آؤ۔" وہ ہمارے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی چیخا۔ "جلدی آؤ۔ ٹی وی پر.... وہ دیکھو.... شاہ جارہا ہے... وہ اپنا ملک چھوڑ رہا ہے..."

ہم اس وقت چائے پی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ چھلک گیا۔ میں نے کپ میز پر رکھا اور اٹھ کر ٹی وی والے کمرے کی طرف دوڑی۔ فیروزہ بھی میرے پیچھے ہی تھی

ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر بڑا ہی رقت آمیز تھا۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی اپنی سرزمین سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس کی جیب میں ایران کی مٹی بھری ہوئی تھی جو وہ اس سرزمین سے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ وہ سفید اور نیلے رنگ کے بوئنگ ۷۰۷ پر سوار ہونے کی تیاری کر رہا تھا

فیروزہ اور میں یہ منظر دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اگرچہ ہم نے کبھی بھی شاہ کی بدعنوانیوں کی حمایت نہیں کی تھی لیکن جس طرح وہ اپنی بادشاہت اور سرزمین چھوڑ کر ایک مجبور اور بے بس انسان کی طرح رخصت ہو رہا تھا' اس سے ہمارے جذبات بے قابو ہوگئے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ایک اشارے پر بڑے بڑے طرم خان سجدہ ریز ہوجایا کرتے تھے اور آج اس کے چہرے پر خوف کے سائے اور آنکھوں میں نمی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کی جنبش ابرو سے بساط عالم پر بازیوں کے نقشے بدل جاتے تھے' آج اپنی زندگی کی بساط پر زچ نظر آتا تھا۔

"سب کچھ ختم ہوگیا۔" منوچہر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ اب ایران کے حالات معمول پر آجائیں گے۔ شاہ کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔" فیروزہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس آج بھی جو کچھ ہے' وہ شاہ کی بدولت ہے۔ اگر شاہ نہ ہوتا تو آج تمہارے پاس اتنی دولت نہ ہوتی۔"

میں اور فیروزہ جذبات کی شدت سے بے قابو ہو رہے تھے۔ ہم دونوں گویا پنجے جھاڑ کر منوچہر کے پیچھے پڑ گئے۔

"خمینی کیا ہیں۔" فیروزہ چیخی۔ "وہ سیاستدان نہیں ہیں' ایک مذہبی رہنما ہیں۔ وہ ملک کو کیسے چلا سکتے ہیں؟"

میں فیروزہ کے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہر طرف قیمتی سامان کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ ڈرائیو وے میں ایک نئی رولس رائز اور ایک مرسیڈیز کار کھڑی تھی۔ لندن میں ان کی اور بھی جائداد تھی۔ ایک کئی منزلہ پرانی عمارت خرید کر اسے رینوویٹ کرنے کے بعد دوگنی قیمت پر فروخت کردیا گیا تھا۔ گنجان آبادی والے علاقے میں ایک اور کئی منزلہ عمارت ان کی

ملکیت تھی جس کے تمام اپارٹمنٹ کرائے پر اٹھے ہوئے تھے جن سے ہزاروں پونڈ ماہانہ کرایہ وصول ہوتا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر منوچہر ایران میں رہتا تو کیا نئے آقاؤں کی حکومت میں اس کے پاس یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

لیکن جس ملک میں اس قسم کی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہوں، وہاں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے کے باوجود ہر شخص بہتری کی امید رکھتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ وہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے نئے آقاؤں کے انتقام کا شکار ہو سکتے ہیں۔ میں اس وقت بھی یقین سے کہہ سکتی تھی کہ جو لوگ شاہ کے رخصت ہونے پر اس سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے وہ مستقبل میں امام خمینی کے خوفناک انتقام کا نشانہ بننے سے نہیں بچ سکیں گے۔ مجھ جیسے لوگوں کو بہتر مستقبل کی امید نہیں تھی بلکہ ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ امام خمینی ایران کو ایک بار پھر صدیوں پہلے والے پسماندگی کے اندھیروں میں لے جائیں گے۔

دو ہفتے بعد میں ایک بار پھر پیرس میں اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھی اور وطن واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔ میرے پاس ایران واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ ماموں فائق نے فرہاد کی واپسی کی نقد اور تحریری ضمانت دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ میں ایران کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر باہر رہ سکوں۔

شاہ پور بختیار نے ایران کے تمام ایئرپورٹ بند کر رکھے تھے تاکہ امام خمینی واپس نہ آسکیں لیکن کئی روز بعد عوام کے دباؤ کے سامنے اسے بھی گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور ایئرپورٹ کھول دیے گئے۔

میں نے نصف شب کو روانہ ہونے والی ایئر فرانس کی ایک پرواز پر سیٹ بک کروا رکھی تھی لیکن اس روز ٹی وی پر خبر سن کر میں دہشت زدہ سی ہو کر رہ گئی۔ امام خمینی بھی اسی رات اور اسی پرواز سے تہران جا رہے تھے جس پر میری سیٹ بک تھی۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مضطرب قوم ان کا پرجوش استقبال کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

یہ سوچ سوچ کر میری روح فنا ہوئی جا رہی تھی کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ ایک ہی جہاز میں سفر کرنے والی تھی جسے میں پسند نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس وقت ایئر فرانس کے دفتر ٹیلی فون کیا تاکہ اپنی سیٹ کسی اور پرواز کے لئے تبدیل کرا سکوں لیکن مجھے بتایا گیا کہ امام خمینی کے سفر کی وجہ سے اس پرواز سے میری سیٹ پہلے ہی کینسل کر دی گئی تھی۔ اس جہاز کے دیگر تمام مسافروں کے لئے ایک اور پرواز تیار کی گئی تھی جو اس کے دو گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ امام خمینی کے جہاز میں گنجائش سے آدھے مسافروں کو سفر کرنے کی اجازت دی گئی تھی کیونکہ جہاز میں زیادہ سے زیادہ ایندھن بھرا گیا تھا تاکہ اگر جہاز کو ایران کے کسی ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت نہ دی جائے تو وہ کسی دشواری کے بغیر واپسی کا سفر اختیار کر سکے۔ اس جہاز میں امام خمینی کے ساتھ ان کے چند قریبی مشیر اور چند اخبار نویس تھے۔ عورتوں اور دوسرے لوگوں کو دوسرے جہاز میں آنے کے لئے پیچھے چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ امام خمینی کے جہاز کو تخریب کا نشانہ بنا دیا جائے۔

جب میں ایئرپورٹ پہنچی تو لاتعداد پولیس والے بدحواسی کی کیفیت میں ویٹنگ رومز اور ڈیپارچر لاؤنجز میں گھوم رہے تھے۔ ایئرپورٹ پر ہر طرف پگڑیوں والے ایرانی مولوی اور سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں نظر آرہی تھیں۔ یہ امام خمینی کی ٹیم کے لوگ تھے جنہیں ان کے جہاز پر جگہ نہیں ملی تھی اور یہ لوگ غالباً اب میرے جہاز پر سفر کرنے والے تھے۔ میں نے اتنے ملاؤں اور چادروں میں لپٹی ہوئی عورتوں کو کبھی ایک جگہ نہیں دیکھا تھا۔ عورتوں کی چادریں اور ملاؤں کے جبے فرش پر گھسٹ رہے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، فرانسیسی پولیس کا عملہ زیادہ سے زیادہ مستعدی دکھا رہا تھا۔ انہیں شاید ان ملاؤں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کی سلامتی خطرے میں نظر آرہی تھی۔

میرے علاوہ صرف ایک اور ایرانی عورت نے یورپی لباس پہن رکھا تھا۔ ہمارے دلوں پر ایک انجانا سا خوف طاری تھا ننھا فرہاد بھی سہما ہوا میری ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ عام طور پر وہ سوالات کی بھرمار سے میرا ناطقہ بند کر دیا کرتا تھا لیکن اس وقت اسے چپ سی لگ گئی تھی اور وہ وحشت زدہ سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

پہلے جب میں پیرس سے تہران واپس جایا کرتی تھی تو جہاز پر سفر کرنے والے ایرانی مردوں اور عورتوں کے لباس فیشن ایبل ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ تعیش کا سامان بھی لدا ہوا ہوتا تھا لیکن آج کی پرواز پہلی پروازوں سے بہت مختلف تھی۔ جہاز پر مسافروں کے قہقہوں کے بجائے اعصاب شکن سناٹا طاری تھا۔ میں آج ان لوگوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی جو چند گھنٹوں بعد ایران کی تقدیر کے مالک بننے والے تھے۔ وہ سب مذہب کے شیدائی تھے اور مجھ جیسی عورت کی ان کی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں اس جہاز کی ناپسندیدہ مسافر تھی۔

▽▲▽

"جنتِ ارضی پر واپسی مبارک ہو!"

مہر آباد ائرپورٹ پر یہ الفاظ ایک پورٹر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے' اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ یہاں میں آپ کو یہ یاد دلاتی چلوں کہ پیرس سے میری واپسی اسی جہاز پر ہوئی تھی جس پر امام خمینی کے خاص خاص پیروکار سوار تھے۔ پورٹر شاید یہ سمجھا تھا کہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ اس نے میرا سامان اٹھالیا اور میں نے اسے اس طرف چلنے کا اشارہ کیا جہاں میرے رشتے دار میرے منتظر تھے۔

ائرپورٹ پر کام کرنے والے سب ہی لوگ وہ نغمہ گا رہے تھے جو امام خمینی کی واپسی کے سلسلے میں خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ مہر آباد ائرپورٹ کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ شاہ کی تصویریں غائب ہو چکی تھیں۔ ان کی جگہ دیواروں پر آیت اللہ خمینی کی بڑی بڑی رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔

شہر کی طرف جانے والی سڑک پر جگہ جگہ 'واپسی مبارک ہو' کے بڑے بڑے بینر آویزاں تھے۔ مجھ سے صرف تین گھنٹے پہلے ۷۷ سالہ امام کی سواری ان سڑکوں پر سے گزری تھی اور سڑکوں پر گلاب اور گل داؤدی کی پتیوں کا ایک فرش سا بچھا ہوا تھا۔ سڑکوں کے دونوں طرف اب بھی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔

"دیکھا تم نے!" میرے والد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر عجیب سی وحشت طاری تھی۔ "لوگوں میں ایسا جنون میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانے یہ خوفناک صورتِ حال کب تک برقرار رہے گی۔"

لیکن ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند ہفتوں بعد ہی آیت اللہ خمینی سے لوگوں کی محبت و عقیدت کے جنون کا نتیجہ سامنے آنے لگا۔ لوگوں کے چہروں پر بکھری ہوئی خوشیاں رفتہ رفتہ شکوک و شبہات اور خوف میں بدلنے لگیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ پر یاسیت غلبہ پا رہی تھی۔ شاہ کو ایران سے نکالنے میں ایرانیوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا اور اس جوش و خروش میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے تھے کہ شاہ ان کے مسائل اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔

ایران واپس آتے ہی امام خمینی سب سے پہلے قبرستان گئے تھے جہاں شاہ کے خلاف مظاہروں میں ہلاک ہونے والوں کی قبریں تھیں۔ اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے حکم جاری کیا کہ یہاں خونی فوارہ بنایا جائے' اس فوارے میں سرخ رنگ کا پانی استعمال کیا جائے جو یہاں آنے والے زائرین کو یہ یاد دلاتا رہے گا کہ یہ ان لوگوں کا خون ہے جنہوں نے شاہ کے جور و استبداد کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے لیکن ایران کے لوگ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ابھی اور بھی قربانیاں دینی ہوں گی۔ اس سرزمین پر مزید لاکھوں انسانوں کا خون بہے گا۔

طاغوتی.... شیطان کے چیلے... یہ وہ خطاب تھا جو امام خمینی نے ہم جیسے لوگوں کو دیا تھا جنہوں نے شاہ کے خلاف انقلاب کی حمایت نہیں کی تھی' جو شاہی خاندان کے قریب تھے' جو وسیع و عریض کاروبار اور جائداد کے مالک تھے' جو مغربی لباس پہنتے تھے یا جنہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک بھیجا ہوا تھا' جو دولت مند تھے اور اونچے طبقے میں شمار ہوتے تھے' جو سینماؤں میں جاکر فلمیں دیکھتے تھے یا شراب پیتے تھے اور ہم جیسے وہ لوگ جو اس کی پیروی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ امام خمینی نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ حکم دیا تھا کہ ہم جیسے "بے دین" لوگوں کو تلاش کیا جائے۔ ان کی تقریروں سے ان کے پیروکاروں کے دلوں میں ہم جیسے لوگوں کے لئے اس قدر شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی کہ ہمارے لئے دن کے وقت بھی گھروں سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ہم جس قسم کا لباس پہنتے تھے یا جس قسم کی قیمتی کاریں استعمال کرتے تھے ان کی وجہ سے ہمیں طاغوتی کی حیثیت سے شناخت کرنا مشکل نہیں تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز امام خمینی واپس آئے تھے۔ اسی روز تہران ٹیلی ویژن نے ان کا انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔

"کئی سال بعد وطن واپس آنے پر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟" ایک صحافی نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔" امام خمینی کا صرف چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی سپاٹ تھا۔

شاہ نے ایران چھوڑنے سے پہلے حکومت کے سرکردہ ۱۳۲ لیڈروں کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا جن میں سابق وزیر اعظم امیر عباس ہویدا اور ساوک کا سربراہ جنرل نعمت اللہ ناصری بھی شامل تھا۔ شاہ کا خیال تھا کہ ان کی گرفتاری سے صورت حال کو سنبھالنے میں مدد ملے گی لیکن مذہبی طبقہ کسی قیمت پر بھی شاہ کو معاف کرنے پر تیار نہیں تھا اور اب جبکہ امام خمینی واپس آ چکے تھے' جیل میں بند ان لوگوں کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ ۱۱ فروری ۷۹ء کو شاہ پور بختیار کی حکومت ختم ہو گئی اور امام خمینی نے ایران میں اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس صورتِ حال میں کسی طاغوتی کو انصاف کی توقع نہیں تھی۔

اس کے چند ہی روز بعد انتقامی کارروائیوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نیک کام کی ابتدا فوجی جنرلوں سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے ساوک کے سربراہ جنرل ناصری اور امیر عباس ہویدا کو فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز ہم فیروزہ کی بہن ازی کے گھر پر جمع تھے۔ اس روز ان بدقسمت قیدیوں کے انٹرویو ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ کئے جا رہے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جیل میں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جن کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس انٹرویو کے دوران مختلف طریقوں سے انہیں شاہ کی وفاداری سے تائب ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد انہیں فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا اور جب گولیوں سے چھلنی ان کی لاشیں ٹی وی اسکرین پر دکھائی گئیں تو مجھ پر گویا سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کئی منٹ تک تو مجھ میں گویائی کی قوت تک نہیں رہی تھی۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ ہویدا کو بھی اس طرح موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔" ماموں خروش نے کہا۔ "میرے خیال میں وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق تھا' سمجھتا تھا کہ اپنا کیس عوام کے سامنے پیش کر کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر لے گا اور سزا سے بچ جائے گا لیکن انتقام کے جنون کی اس لہر کی زد میں آنے سے کون بچ سکتا ہے۔ انہوں نے یہ دکھا دیا ہے کہ ہویدا جیسا آدمی بھی ان کے انتقام سے نہیں بچ سکا تو دوسروں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔"

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ملک پر امام خمینی کے پیرو کاروں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہماری پریشانیوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ انقلاب کے پہلے سال کے دوران ملک کے پانچ سو سے زائد سرکردہ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ اس دوران ہم نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اپنی پناہ گاہوں تک محدود رکھا تھا کیونکہ گھروں سے باہر نکلنا ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہمارا شمار تہران کے خواص میں ہوتا تھا اور میں سمجھتی تھی کہ ہم گھروں میں بھی محفوظ نہیں تھے۔ ہمیں ہر لمحے اپنی گرفتاری کا خدشہ تھا۔ دروازے پر دستک ہوتی تو ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ جاتے اور ہم سمجھتے کہ شاید ہمارا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ موت کے فرشتوں کے قدموں کی چاپ ہر لمحے ہماری سماعت سے ٹکراتی رہتی تھی۔ موت کے یہ فرشتے تہران کی گلیوں اور سڑکوں پر دندناتے پھر رہے تھے۔

فوج کو نہتا کرنے کے علاوہ پولیس سے بھی تمام اختیارات چھین لئے گئے تھے۔ ملاؤں نے اپنی مسلح سیکیورٹی فورس قائم کر لی تھی۔ اس انقلابی فورس کو کمیٹی کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کا ہر ممبر آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان لوگوں کو اسلحہ ڈپوؤں سے اپنی پسند کا اسلحہ لینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ شہر کے تمام دولت مندوں کی رینج روور اور مرسیڈیز گاڑیاں ضبط کر کے ان لوگوں کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ یہ لوگ جنہوں نے کبھی سائیکل کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا' ان قیمتی گاڑیوں میں شہر کی سڑکوں پر دندناتے پھرتے اور کسی بھی مشتبہ چیز پر بے دریغ فائر کھول دیتے۔ شہر کی فضا ہر وقت فائرنگ کی آواز سے گونجتی رہتی۔ شاہ کے دور میں گرفتار ہونے والے دانشوروں کے ساتھ سنگین جرائم میں ملوث لوگوں کو بھی جیلوں سے رہا کر دیا گیا تھا۔

امام خمینی کی انقلابی حکومت کا سب سے زیادہ سخت آدمی حجت الاسلام صادق خلخالی تھا۔ خلخالی ایک درمیانے درجے کا مولوی ہوا کرتا تھا اور شروع ہی سے امام خمینی کے عقیدت مندوں اور حمایتیوں میں شامل تھا۔ انقلابی حکومت میں خلخالی کے پہلے چند مہینے ملک کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے گزرے تھے۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گھوم پھر کر ان لوگوں کو تلاش کر رہا تھا جو دولت مند تھے یا جن کا حکومت سے کسی نہ کسی طرح کوئی تعلق رہا تھا۔ خلخالی کو ایسے لوگوں کی تلاش میں کبھی بھی کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لینڈ لارڈز' زمیندار' صنعتکار اور سابق سیاستدان اسے اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لئے آسانی سے مل جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے منشیات کے عادی سات آدمیوں کو تہران کی ایک بارونق سڑک پر عوام کے سامنے فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک ایسے اسلامی جج کی بھرپور حمایت کی تھی جس نے ایک کیس میں خالص اسلامی سزا کا حکم سنایا تھا۔ اس جج کے حکم کے مطابق چار زانیوں کو' جن میں دو مرد اور دو عورتیں شامل تھیں گردن تک زمین میں گاڑ کر سنگسار کر دیا گیا تھا۔

میرے کچھ رشتے دار کئی نسلوں سے صوبہ مثاندراجی میں آباد تھے۔ وہ اس علاقے کے بہت بڑے جاگیردار سمجھے جاتے تھے۔ علاقے کی بیشتر زمینیں اور کئی گاڑیاں ان کی ملکیت میں تھیں۔ درحقیقت یہ جاگیر کئی بہن بھائیوں کی ملکیت تھی جس کی دیکھ بھال سب سے بڑے بھائی کے سپرد تھی۔

ایک روز خلخالی جاگیر کے مرکزی گاؤں پہنچ گیا جہاں سب سے بڑے بھائی کی رہائش تھی۔ وہ ان دنوں شدید بیمار تھا۔ کسی سہارے کے بغیر اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ خلخالی نے حکم دیا کہ اسے اسٹریچر پر ڈال کر لایا جائے۔ خلخالی نے گاؤں کے مرکزی چوراہے پر عدالت قائم کرلی اور گاؤں والوں کے سامنے اس پر دولت کے بے جا اسراف اور اپنے کارکنوں پر زیادتیوں کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اپنے مکان میں امریکی طرز کا غسلخانہ کیوں بنوایا ہے؟ اور یہ شاندار سوئمنگ پول، کیا تم نے گاؤں والوں کو بھی کبھی اس میں نہانے کی اجازت دی ہے؟" خلخالی نے اس کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کا یہی جرم خاصا سنگین تھا کہ اس نے اپنے گھر میں امریکی طرز کا غسلخانہ بنوا رکھا تھا۔ خلخالی کے حکم پر اس بیمار آدمی کو گاؤں کے مرکزی چوراہے پر لوگوں کے سامنے گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس سے نمٹنے کے بعد خلخالی نے اس کے دوسرے بھائیوں اور دیگر رشتے داروں کو حاضر کرنے کا حکم دیا لیکن بھلا موت کے فرشتے کا سامنا کرنے کو کون تیار ہو سکتا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد سب کچھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو ملک سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ کو ان کے دوستوں نے پناہ دے دی۔ ان میں میری ایک کزن شلوع کسی طرح مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ کئی مہینوں تک میرے گھر میں چھپی رہی اور بالآخر ایک روز اسے بھی ملک سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

ایران میں غیر ملکی ہونا بھی خطرے کی علامت بن گیا تھا۔ امام خمینی کی واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد فروری میں غیر ملکیوں کی ایران میں موجودگی کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ تخت جمشید ایونیو پر واقع امریکی سفارت خانے کے سامنے تو ان مظاہروں نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سرکاری مشینری ان مظاہروں کے سامنے بے بس ہو یا جان بوجھ کر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا چاہتی ہو۔ فروری ہی میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہاپسندوں کے ایک گروپ نے امریکی سفارتخانے پر حملہ کر کے محافظوں کو بے بس کر دیا اور سفارت خانے کے ایک ایرانی ملازم کو قتل کرنے کے بعد سفارت خانے کے عملے کے ستر افراد، جن میں امریکی سفیر بھی شامل تھا، کو یرغمال بنا لیا۔

مظاہرین سے کئی گھنٹوں کے مذاکرات کے بعد امام خمینی کی سیکیورٹی فورسز نے امریکی سفیر ولیم سلوان اور اس کے عملے کو رہا کرا لیا اور سفارتخانہ دوبارہ کھولنے کی اجازت دے دی لیکن امریکی سفارتخانے پر حملے کی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اس صورت حال نے شہر میں موجود تمام غیر ملکیوں پر دہشت سی طاری کر دی تھی۔ بہت سے ممالک جن میں کینیڈا، برطانیہ اور امریکا بھی شامل تھے، نے اپنے شہریوں کو خصوصی پروازوں کے ذریعے تہران سے نکالنا شروع کر دیا۔

لیکن غیر ملکی شیطانوں کے خلاف اصل کارروائی ۴ نومبر کے بعد شروع ہوئی تھی۔ ایک روز صبح سویرے میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے یہ خبر سننے کو ملی کہ انتہاپسند طلبا کے ایک گروپ نے دوبارہ امریکی سفارتخانے پر حملہ کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ قدرے شدید قسم کا مظاہرہ ہو گا جو گھنٹے دو گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔ میں اپنی ایک دوست لادان سے ملنے چلی گئی جس کا مکان میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازے پر دستک کی تیز آواز سنائی دی۔ لگتا تھا جیسے آنے والا بہت عجلت میں ہو، لادان نے دروازہ کھولا تو اپنے پڑوسیوں کو دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔ وہ دونوں امریکی تھے جو تہران میں ایک امریکی انجینئرنگ کمپنی کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ بہت عرصے سے لادان کے پڑوس میں رہ رہے تھے۔ لادان اور اس کے شوہر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے لادان نے انہیں اندر بلا لیا اور میں انہیں دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہی تھی۔ خوف و دہشت سے ان دونوں کے چہرے پیلے ہو رہے تھے۔

اندر آنے کے چند منٹ بعد جب ان کے حواس بحال ہوئے تو لمبے قد اور سنہری بالوں والے کارل نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ ہماری تلاش میں ہیں۔ سفارتخانے کی طرف سے تمام امریکی باشندوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ روپوش ہو جائیں۔ کیا آپ ہمیں چند گھنٹوں کے لئے اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہیں۔ چند گھنٹوں بعد ہم ایک ہیلی پیڈ پر چلے جائیں گے۔ یہاں ایک ہیلی کاپٹر ہمیں لینے کے لئے آنے والا ہے۔ یہ وقت ہم اپنے گھروں میں نہیں گزار سکتے۔ علاقے کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ یہاں امریکی رہتے ہیں۔ آپ ہمارے مالک مکان کو بھی جانتی ہیں۔ وہ ملاؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ان کے حوالے کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ پلیز! اگر آپ اس نازک وقت میں ہماری

مدد کر سکیں تو یہ بہت بڑا احسان ہو گا؟"
لادان نے انہیں تسلّی دی اور کہا کہ وہ جب تک چاہیں یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ فی الحال انہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہمیں امریکیوں سے کوئی شکایت نہیں تھی... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے بہت سے عزیز امریکا کی مختلف ریاستوں میں آباد تھے اور ہم نے بھی امریکا ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان دونوں امریکیوں کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ انہیں وقتی طور پر اس گھر میں پناہ مل گئی ہے، وہ اپنی ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے ساتھ والے گھر میں چلے گئے۔

ان کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اپنے ضروری سامان کے ساتھ وہ وھسکی اور واڈکا کی دو بوتلیں بھی لے آئے تھے اور اس مرتبہ دونوں کے کوٹ کے نیچے شولڈر ہولسٹر بھی نظر آئے تھے جن سے ریوالوروں کے دستے جھانک رہے تھے۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی۔ میں نے لادان کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ ان دونوں امریکیوں کے پاس ریوالوروں کی موجودگی نے ہمیں بے چین سا کر دیا تھا۔ گھر میں ہم دونوں عورتوں اور دو بچوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ہماری بے چینی ایک فطری بات تھی۔

ابھی دن کے دس ہی بجے تھے۔ ہماری بے چینی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ان دونوں امریکیوں نے شراب کی بوتلیں کھول لی تھیں اور شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے لئے ایک منٹ کو بھی ٹک کر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ لادان اگرچہ اکثر ان لوگوں سے ملتی رہتی تھی لیکن ان میں ایسا اضطراب اور بے چینی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دہشت کے باعث ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر لادان پر بھی خوف سا طاری ہو رہا تھا۔ بالآخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ اپنے دونوں بچوں کو لپٹا کر رونے لگی۔

"ڈرو نہیں!" پیٹرک نامی دوسرے امریکی نے تسلی دیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "ہم تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہم تو تمہارے احسان مند ہیں۔ اپنے محسنوں کو کس طرح نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہم کسی قدر بدحواس ضرور ہو رہے ہیں لیکن پاگل نہیں ہیں۔ آج ہمارے کچھ دوستوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہے کہ ان پر کیا بیت رہی ہو گی۔ ہماری پریشانیوں سے کوئی غلط مطلب مت لو۔"

"ہمارے فریزر میں کھانے پینے کی چیزیں بھری ہوئی ہیں۔" کارل نے کہا۔ "تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ فریزر سے سب کچھ نکال لاؤ ورنہ بعد میں وہ سب چیزیں خراب ہو جائیں گی۔"

لادان اور میں نے اس کے مشورے پر فوراً ہی عمل کر ڈالا، کچھ ہی دیر بعد ہم ان کے فریزر سے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اور گوشت وغیرہ نکال لائے اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگے۔

کارل اور پیٹرک دن بھر ٹیلی فون پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ان کے دوستوں پر کیا بیتی تھی۔ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی، میں یا لادان ریسیور اٹھا لیتیں۔ ہمیں آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر ان کے چہروں کے تاثرات بدل جاتے اور وہ مشتبہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگتے بالآخر انہوں نے ہمیں یہ حکم دے دیا کہ آئندہ ہم ٹیلی فون سے دور ہی رہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے حواس بھی بحال ہو چکے تھے۔ انہیں نارمل پا کر ہمیں بھی اطمینان سا ہوا تھا۔

دوپہر کے قریب ان دونوں امریکیوں نے مشورہ دیا کہ ہم ان کے گھر سے اپنی پسند کی جو چیز چاہیں اٹھا لائیں۔

"اس صورت حال میں ہم اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جا سکتے۔ سب کچھ یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ امریکی حکومت ہمارے نقصان کی تلافی کر دے گی۔" کارل نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے ہمارے جانے کے بعد ہماری ہر چیز ہمارے مالک مکان کے قبضے میں چلی جائے گی اور میں نہیں چاہتا کہ وہ لالچی انسان ہماری چیزوں پر عیش کرتا رہے اس لئے تم لوگ اپنی پسند کی جو چیز چاہو اٹھا کر لا سکتی ہو۔"

اس کی یہ پیشکش واقعی بڑی پُرکشش تھی۔ تہران میں رہنے والے امریکی بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہے تھے۔

"مکان کے ڈرائیو وے میں ہماری دو کاریں بھی کھڑی ہیں۔" اس مرتبہ پیٹرک نے کہا۔ "ان میں ایک رینج روور ہے اور دوسری فائر برڈ، تم لوگ وہ دونوں کاریں بھی لے سکتی ہو۔"

"ہم یہ سب کچھ تم سے نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ ہمارے جاننے والوں میں سے کچھ لوگ تمہاری چیزیں خرید لیں۔ ادائیگی تمن میں ہو گی اور میرا خیال ہے کہ یہ رقم تمہارے کام آ جائے گی۔"

اس طرح میں نے اگرچہ ان خوفزدہ امریکیوں کی مدد کی کوشش کی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ بعد میں یہی ہمدردی مجھے امریکی سفارت خانے کے معاملے میں بھی ملوث کر دے گی۔ بہرحال اس روز ہم ان کا بیشتر فرنیچر فروخت کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ کچھ فرنیچر میں نے بھی خرید لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ اونے پونے میں ہی بکا تھا لیکن کارل اور پیٹرک خوش ہو گئے کیونکہ انہیں اتنی رقم ملنے کی بھی امید نہیں تھی، میرا ایک دوست، جس نے زیادہ فرنیچر خریدا تھا، سامان لے جانے

کے لئے ٹرک لے آیا۔ میں نے اپنا فرنیچر بھی اسی ٹرک پر اپنے گھر روانہ کردیا۔ اس دوران لادان کے شوہر کا ٹیلی فون آگیا اور جب اسے پتہ چلا کہ ہم کیا کر رہے ہیں تو وہ بھڑک اٹھا۔

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم کیا کر رہی ہو؟ تم نے شاید خطرے کا اندازہ نہیں لگایا اور تمہیں شاید ابھی تک یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ انتہا پسند طلبا کے ایک گروہ نے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ امام خمینی کے ہرکارے غیر ملکیوں کو گرفتار کر رہے ہیں۔ ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ان دونوں امریکیوں کو گھر سے نکال دو۔"

ہم دونوں پریشان تھے کہ ان امریکیوں کو گھر سے کیسے نکالا جائے لیکن خوش قسمتی سے ہمیں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور سہ پہر کے قریب وہ دونوں خود ہی چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی باقی سامان ٹرک پر لدوا کر اپنے گھر آگئی۔ بعد میں جب میں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو اس واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ لوگ مجھے اس طرح گھورنے لگے جیسے میرا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ امام خمینی کی کمیٹی کے ہرکارے سڑکوں پر ہر گاڑی کو چیک کر رہے تھے۔ خصوصاً ٹرکوں وغیرہ کی اس طرح تلاشی لیتے تھے جیسے ان میں اسمگلنگ کا سامان بھرا ہوا ہو اور اگر وہ میرا ٹرک بھی روک کر چیک کر لیتے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں نے دو امریکیوں کو روپوش اور فرار ہونے میں مدد دی ہے تو میرے ساتھ غداروں جیسا سلوک کیا جاتا۔ ممکن ہے مجھے اس سنگین جرم میں اسی وقت گولی سے اڑا دیا جاتا لیکن خوش قسمتی سے لادان کے گھر سے اپنے گھر تک آتے ہوئے میں کسی کی نظروں میں نہیں آئی تھی۔

کئی دن گزر گئے، امام خمینی کی طرف سے امریکی سفارت خانے کو آزاد کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ایران اس خونی انقلاب کے ایک اور خطرناک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ حکومت غیر ملکی یرغمالیوں کے معاملے سے چشم پوشی کرتے ہوئے کسی قسم کا سیاسی تاوان وصول کرنا چاہتی تھی۔ صورتِ حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا ایسا کر کے امام خمینی امریکا کو ایران پر حملے کی دعوت نہیں دے رہے؟ نئے حکمران شاید اس حقیقت کو بھی نظرانداز کئے ہوئے تھے کہ امریکا کو اشتعال دلانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ امریکا، ایران کو تباہ کر سکتا تھا کیا ایران کے ملا دنیا کو تیسری جنگ کی طرف دھکیل رہے تھے۔۔۔؟

باون امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنائے ہوئے ۴۴ دن گزر چکے تھے۔ ہر نئی صبح کو ہم یہ امید لے کر بیدار ہوتے تھے کہ شاید آج ان یرغمالیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن شام ہوتے ہوتے ہماری امیدیں مایوسی میں بدل جاتیں۔

ایک روز میری ایک کزن، جس نے کینیڈین سفارت خانے میں ویزے کے لئے درخواست دے رکھی تھی کو سفارت خانے کے ایک آدمی نے فون کر کے بتایا کہ وہ صبح سفارت خانے آکر اپنا ویزا وصول کر لے حالانکہ درخواست دیتے وقت اسے بتایا گیا تھا کہ ویزا ایک ہفتے بعد ملے گا۔ بہرحال نئی ہدایات کے مطابق وہ صبح سویرے کینیڈین سفارت خانے پہنچ گئی یہاں بے پناہ ہجوم تھا۔ ایک عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ اس سے اگلے دن جب وہ کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے دوبارہ سفارت خانے گئی تو سفارت خانہ بند تھا، اس روز انکشاف ہوا کہ امریکی سفارت خانے پر طلبا کے حملے کے دوران چھ امریکی سفارت کار کسی طرح سفارت خانے کی عمارت سے نکل گئے تھے جو بعد میں کینیڈین سفارت خانے کی طرف سے فراہم کردہ جعلی پاسپورٹوں کے ذریعے ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ امریکی سفارت کاروں کو کئی ماہ تک اپنے سفارت خانے میں پناہ دے کر کینیڈا کے سفارتی افسروں نے اپنی زندگیوں کو بھی داؤ پر لگا رکھا تھا۔

وہ دو امریکی جنہیں ہم نے لادان کے گھر میں پناہ دی تھی، وہ بھی اس وقت تک ایران سے نہیں جا سکتے تھے جب تک امریکی سفارت کاروں کا معاملہ امریکی اور ایرانی حکومت کے مابین بات چیت سے طے نہیں ہو جاتا۔ یہ معاملہ طے ہونے سے صرف دو دن پہلے ان دونوں کو ہلٹن ہوٹل کی لابی میں دیکھا گیا تھا۔ اب مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ انجینئر یا بزنس مین نہیں سی آئی اے کے ایجنٹ تھے۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں اتنے عرصے تک یہاں چھپنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ہر ذی ہوش امریکی اس جہنم سے فرار کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔

○☆○

یہ حقیقت بتدریج عیاں ہو رہی تھی کہ آیت اللہ خمینی ایران کے لئے کس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے۔ انقلاب میں ان کا ساتھ دینے والے عام لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ کے بعد انہیں آزادی مل جائے گی اور وہ سکھ کا سانس لے سکیں گے لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ جس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے۔ اس کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے اور ایرانی ابھی سے گھٹن محسوس کرنے لگے تھے۔

میں نے جس مخصوص ماحول میں پرورش اور تعلیم پائی تھی وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انقلاب سے پہلے ملک میں ہر قسم کی سیاسی یا دیگر سرگرمیوں کو نظرانداز کر دیا کرتی تھی، لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ ہر طرف سے ہولناک باتیں سننے میں آرہی تھیں، ملازم پیشہ یا کاروباری خواتین پر ملاؤں کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ کاروبار ترک کردیں اور نوکریاں چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جائیں۔ اس قسم کی خبریں سن

سن کر مجھ پر عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی۔ میں نے
کبھی اخبار نہیں پڑھا تھا لیکن اب اخبارات کا باقاعدگی سے
مطالعہ کرنے لگی تھی۔ ٹی وی پر خبریں بھی بڑی توجہ سے سنتی
تھی تاکہ ہر لحہ بدلتی ہوئی صورتِ حال سے آگاہی ہو سکے۔
طاغوتی ہر روز ملاؤں کے انتقام کا شکار ہو رہے تھے۔
حکومت کی قائم کردہ کمیٹی کے ممبران ان لوگوں کی جائدادوں
پر قبضہ کر رہے تھے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف جان بچا کر
لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی جائدادوں پر
بھی زبردستی قبضہ کیا جا رہا تھا جو ان کی نگاہوں میں ناپسندیدہ تھے
کمیٹی کے یہ لوگ جنہیں اچھے برے کی تمیز تک نہیں تھی
نوادرات کو محفوظ کرنے کے بجائے انہیں بیدردی سے ضائع کر
رہے تھے حالانکہ ایسی چیزوں کو بعد میں غیر ممالک میں
فروخت کر کے کروڑوں ڈالر کی رقم حاصل کی جا سکتی تھی۔
غربت میں پرورش پانے والے کمیٹی کے ان ممبروں نے محض
نفرت اور حسد کی بنا پر لاتعداد عالیشان مکان بلڈوز کر دیئے تھے۔
ہم اپنے لباس کے بارے میں خاصے محتاط ہو گئے تھے۔
پہلے کی طرح نیم عریاں یورپی لباس پہننا اب ممکن نہیں رہا تھا۔
کوشش کی جاتی کہ جب گھر سے باہر نکلیں تو ہمارے جسموں پر
سادہ لباس ہو لیکن ہمارے پاس جو سادہ لباس تھے وہ بھی
دوسروں کے لئے قابل اعتراض تھے کیونکہ ان سے بھی جسم
کے بعض حصوں کی نمائش ہوتی تھی۔ جب ہمیں شہر کے
ایک حصے سے کسی دوسرے حصے میں جانا ہوتا تو گاڑی سے
اترنے میں اجتناب برتتے۔ ٹریفک کے ہجوم یا کسی فنی خرابی
کی وجہ سے سڑک پر گاڑی کا رک جانا بھی خطرناک تھا۔ ایسی
گاڑیوں کو لوگ فوراً ہی گھیرے میں لے لیتے اور طرح طرح
کے سوالات کئے جاتے۔

"یہ کون ہے جو اتنی بڑی کار چلا رہا ہے؟ اتنی قیمتی کار رکھنے
کا اسے کیا حق ہے؟ یہ کار کسی ایک شخص کی نہیں عوام کی
ملکیت ہے۔"

مذہبی حکمرانوں نے ہم جیسے لوگوں کو طاغوتی 'شیطان کے
چیلے' قرار دیا تھا اور ایسے لوگوں کو دنیا کا حقیر ترین انسان سمجھا جا
رہا تھا' ایسے موقع پر لوگوں کے ہاتھوں ایک آدھ ہڈی تڑوانے
اور کار گنوا کر بچ آنے والوں کو خوش قسمت ہی کہا جا سکتا تھا اور
ایسے خوش قسمت لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بھیڑیوں کے
ہتھے چڑھ جانے کے بعد کسی کا بچنا ممکن نہیں تھا۔
ایران کے نئے آقاؤں نے گویا یہ طے کر لیا تھا کہ اس
سرزمین پر ہر اس روایت کا خاتمہ کر دیا جائے گا جس سے دولت
مندی کا اظہار ہوتا ہو' ذرائع ابلاغ مکمل طور پر ان کے قبضے میں
تھے۔ ایک روز ریڈیو پر اعلان نشر ہوا کہ آج سے پیٹرول
پمپوں پر ہر شخص کو خود اپنی گاڑی میں پیٹرول بھرنا ہو گا۔
پیٹرول پمپوں پر انہیں کسی قسم کی خدمات فراہم نہیں کی
جائیں گی۔ اناؤنسر کے الفاظ کچھ یوں تھے "سوال تو یہ پیدا ہوتا
ہے کہ دوسرے آپ کی خدمت کیوں کریں؟ ہر شخص ہر
معاملے میں اپنی مدد آپ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسروں سے
خدمت لینا صرف دولت مندوں کے چونچلے ہیں اور اب
ایران سے اس طبقے کو ختم کر دیا گیا ہے۔"
ریڈیو پر ہر چند منٹ بعد ایسے اعلانات بھی نشر ہوتے
رہتے جن میں لوگوں کو سادگی سے اسلامی طرز پر زندگی
گزارنے لور ہر معاملے میں "امام" کی پیروی کی تلقین کی جاتی۔
ایران کے ہر شہر میں افراتفری کی سی کیفیت تھی۔ نظم و
نسق نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ کس کو کس شعبے کی نگہبانی
کرنی ہے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی
بھینس والا معاملہ تھا۔ اس صورت حال کو جنگل کا قانون کہنا
زیادہ مناسب ہو گا لیکن ایسے میں بھی ملاؤں کو یہ فکر کھائے
جا رہی تھی کہ عورتوں کو کس قسم کا لباس پہننا چاہئے۔ ۱۹۷۰ء
کے اوائل میں شہر کے تعلیم یافتہ حلقوں میں مغربی لباس کو
معاشرے کا معیار سمجھا جاتا تھا لیکن اس دہائی کے اواخر میں
بعض لوگ مغربی لباس ترک کرنے لگے تھے۔ شاہ کے زوال
کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ مذہبی رہنماؤں کے دباؤ کے
باعث عورتوں نے ایک بار پھر چادر کا استعمال شروع کر دیا تھا۔
امام خمینی کے برسر اقتدار آتے ہی ریڈیو پر بار بار اعلانات
نشر ہونے لگے کہ عورتیں 'حجاب' پہنا کریں۔ شروع میں تو
درمیانے طبقے کی عورتوں نے اس حکم کی مزاحمت کی لیکن
خلاف ورزی کرنے والی عورتوں کا حشر دیکھ کر زیادہ سے زیادہ
عورتوں نے اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔ امام خمینی اکثر کہا
کرتے تھے کہ عورتیں معاشرے کا اہم حصہ ہیں انہوں نے
انقلاب میں عورتوں کے کردار کو بھی بیحد سراہا تھا لیکن اب امام
خمینی ہی کے حکم پر ملک بھر کے مذہبی رہنما عورتوں پر دباؤ ڈال
رہے تھے کہ وہ کاروبار لور ملازمتیں چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ
جائیں۔ سرکاری محکموں میں کام کرنے والی خواتین کو افسروں
کی طرف سے بے جا تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ان کے کام میں
سو سو کیڑے نکالے جا رہے تھے اور انہیں حجاب پہننے پر مجبور
کیا جا رہا تھا۔ بہت سی عورتوں نے روز روز کے ان جھگڑوں سے
بچنے کے لئے ملازمتیں چھوڑ دیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں وہ
ادارے جن میں خواتین ملازم تھیں یکایک یہ محسوس کرنے
لگے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی حکومت
کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔
ملازم پیشہ خواتین کی تنخواہوں میں پچاس ساٹھ فیصد
تک کمی کر دی گئی۔ دفتروں میں آنے جانے والی عورتوں کو
سڑک پر چلتے ہوئے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجانے کب

ملّاؤں کی کمیٹی والے انہیں گرفتار کرلیں۔ کمیٹی کے ہر کاروں کی شناخت بھی مشکل تھی کیونکہ ان کے لئے کوئی یونیفارم یا شناختی نشان مخصوص نہیں تھا۔

اس کمیٹی کا ایک شعبہ 'منکرات' کے نام سے اپنی من مانی کارروائیاں کر رہا تھا۔ اس شعبے کے ذمّے انقلاب کے نئے معاشرتی قوانین کے نفاذ کو یقینی بنانا تھا۔ یہ لوگ راہ چلتی عورتوں کو محض اس لئے اٹھا کرلے جاتے کہ انہوں نے حجاب یا چادر نہیں پہنی ہوئی تھی یا وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں جس کا اس سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ ایسی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا اور انہیں "امام" کی تعلیمات پر مبنی لیکچر سنائے جاتے۔ اس طرح لاپتا ہونے والی عورتوں کے رشتے دار انہیں شہر بھر میں ڈھونڈتے رہتے اور جب انہیں پتا چلتا کہ ان کی عزیزہ جیل میں ہے تو وہ اس کی رہائی کے لئے کسی نہ کسی ملّا تک رسائی کی کوششیں شروع کردیتے۔ اس کے لئے انہیں بڑے بڑے نذرانے ان مذہبی رہنماؤں کی خدمت میں پیش کرنے پڑتے تھے۔

ایران کے نئے آقاؤں کو یہ بہر حال یقین تھا کہ عورتیں ان کے خلاف کسی قسم کا مظاہرہ نہیں کریں گی۔ ایک دو مرتبہ چند جرأت مند عورتوں نے احتجاجی مظاہرہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن انہیں سڑکوں پر اس طرح مارا پیٹا گیا تھا کہ دوبارہ انہوں نے گھروں سے نکلنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ ان مظاہروں کے بعد مزید سخت قوانین نافذ کردیئے گئے تھے جن میں عورتوں کے لئے چادر پہننا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔

میری ایک کزن مانی کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ ایک کمپیوٹر کمپنی میں ملازم تھی اور دس سال کی جدوجہد کے بعد وہ منیجر کے عہدے پر پہنچی تھی لیکن بدقسمتی سے ایران کی تاریخ ہی بدل گئی۔ مذہبی رہنماؤں کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد کسی وضاحت کے بغیر مانی کی تنخواہ میں پچاس فیصد کمی کردی گئی۔ اس کے ساتھ اسے یہ الٹی میٹم بھی دے دیا گیا تھا کہ یا تو وہ رضاکارانہ طور پر ملازمت چھوڑ دے یا اس کے لئے اتنی مشکلات پیدا کردی جائیں گی کہ وہ نوکری چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جائے گی۔ عورتوں سے ملازمت چھڑوانے کے لئے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن پر آپ یقین بھی نہیں کریں گے۔ مانی کو بھی بالآخر کمپیوٹر کمپنی کی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ کچھ عرصہ بیکار رہنے کے بعد اس نے میرے ماموں کے ریسٹورنٹ 'لا۔ ریزرو' میں منیجر کی حیثیت سے ملازمت کرلی لیکن مذہبی رہنماؤں نے اسے وہاں بھی نہیں ٹکنے دیا۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک واقعہ شیری کی بھانجی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ شیری اور اس کے گھر والے معذور افراد کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ شیری نے تو بچوں کی تعلیم کے لئے کئی اسکول بھی کھول رکھے تھے۔ تہران کے بعض دوسرے دولتمند خاندانوں کی طرح سلمان فیملی والے صرف مالی طور پر بلکہ رضاکارانہ طور پر خدمات کے ذریعے بھی شیری کی مدد کرتے رہتے تھے۔ شیری کی ان بے لوث خدمات اور محنت نے اسے عام لوگوں میں بھی بیحد مقبول بنادیا تھا اور میں تو کسی دیوی کی طرح اس کی پرستش کرتی تھی۔

شیری کی بھانجی بھی بڑی سرگرم خاتون تھی لیکن اس کی سرگرمیاں سیاسی میدان میں تھیں۔ اسے بھی ایک مظاہرے میں شرکت کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ پچیس سالہ اس خاتون کا تعلق فدائین مارکسٹ پارٹی سے تھا۔ شاہ کا تختہ الٹنے کے لئے فدائین نے مذہبی رہنماؤں سے تعاون کیا تھا لیکن اب امام خمینی ایک ایک کرکے ان سب کو اپنے راستے سے ہٹا رہے تھے تاکہ ان کے اقتدار کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ لاتعداد فدائین کو چھوٹے چھوٹے الزامات میں پکڑ کر گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ شیری کی بھانجی کو حکومت کے خلاف مظاہرے میں حصّہ لینے کے لئے تین سال تک جیل کی عقوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں جبکہ اس کے شوہر کو چار سال کے لئے جیل میں بند کیا گیا تھا۔ ان کے والدین کو ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور ان پر کیا بیت رہی ہے۔ شیری اور اس کی بہن اپنی بیٹی کی طرف سے بیحد پریشان تھیں کیونکہ اس کے ساتھ گرفتار ہونے والی بعض دوسری لڑکیوں کے والدین نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ان کی بیٹیوں کو جیل میں بار بار ہوس کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ بالآخر شیری کی بھانجی جیل سے رہا ہوئی تو اس نے کسی کو کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے کہ جیل میں اس پر کیا بیتی تھی۔ ایک روز وہ لباس بدل رہی تھی کہ ماں نے اس کے جسم پر لاتعداد نشان دیکھ لئے۔ ماں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ جیل میں اس کی بیٹی کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی شیری کی بھانجی اور اس کے شوہر کی نگرانی کی جاتی رہی۔ انہوں نے کئی جگہوں پر ملازمت کی کوشش کی مگر ان کے لئے ہر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

امام خمینی نے عورتوں سے ان کے وہ تمام حقوق بھی چھین لئے تھے جو شاہ کے دور میں دیئے گئے تھے۔ اس انقلاب کے جن افسوسناک پہلوؤں کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورتوں کے حقوق کو بڑی دیدہ دلیری سے سلب کیا جارہا تھا۔ اقتدار حاصل کرنے کے چند مہینوں بعد ہی امام خمینی نے فیملی پروٹیکشن ایکٹ منسوخ کردیا۔ یہ قانون ۱۹۶۷ء میں نافذ کیا گیا تھا اور اس کے تحت عورتوں کو ایران کی

تاریخ میں پہلی مرتبہ چھان بین کے بغیر طلاق سے تحفظ اور بچوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس قانون کے تحت پہلی بیوی کی موجودگی میں مرد کو دوسری شادی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ عورت کی شادی کے لئے عمر کی حد بھی مقرر کر دی گئی تھی لیکن آج کے ایران میں مرد جب چاہے کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ بارہ سال کی لڑکی کو اس کی رضامندی کے بغیر شادی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مرد قرآنی احکامات کے مطابق بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے چار سو تک عارضی شادیوں جسے متعہ کہا جاتا ہے کا بھی قانونی حق حاصل ہے۔ بیوی کو طلاق کی صورت میں عورت کو بچوں کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ طلاق کے بعد بچے قانونی طور پر مرد کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔

آج کے ایران میں عورت پر پابندی کی فہرست بہت طویل ہے۔ کوئی عورت نہ تو پاسپورٹ رکھ سکتی ہے اور نہ ہی وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر ملک چھوڑ سکتی ہے۔ وہ میک اپ نہیں کر سکتی۔ بھائی، باپ یا شوہر کے علاوہ وہ کسی مرد سے بات نہیں کر سکتی۔ کسی عورت کو ماموں یا چچا کے ساتھ بھی گھر سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایران میں اب کوئی عورت کوئی قانونی پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ ایران میں عورت کا صرف ایک حق برقرار رکھا گیا ہے جو اسے ۱۹۶۲ میں دیا گیا تھا اور وہ ہے ووٹ کا حق۔ اس سرزمین پر عورت کی حیثیت اب یرغمال سے زیادہ نہیں رہی اور مجھے افسوس تو اس بات کا ہوتا ہے کہ اس استحصال کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہیں رہا۔ گویا گردن جھکا کر سب کچھ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

○☆○
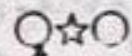
بچوں کے اسکول بھی امام خمینی کے انتقام سے نہیں بچ سکے تھے۔ دینی مدرسوں میں تعلیم پانے والے اس مذہبی رہنما کو یورپی طرز تعلیم سے شدید نفرت تھی۔ یورپی طرز پر تعلیم دینے والے پرائیویٹ اسکول فوری طور پر بند کر دیئے گئے۔ (میرا بیٹا فرہاد بھی ایک پرائیویٹ کنڈر گارٹن اسکول میں زیر تعلیم تھا) بیشتر ٹیچروں کو یا تو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا یا انہیں شہر کے گھٹیا ترین نواحی علاقوں میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ اگر وہ دولت مند طبقے کے بچوں کو تعلیم دے سکتی ہیں تو انہیں شہر کے پسماندہ علاقوں کے رہنے والے بچوں کو تعلیم دینے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے جبکہ ہمارے علاقے کے اسکولوں میں ایسی ٹیچروں کو تعینات کیا گیا تھا جنہیں ہم جیسے شیطان کے چیلوں سے شدید نفرت تھی۔ ان اسکولوں میں ان بچوں کو بھی داخلہ دیا گیا تھا جن کے والدین انہیں تعلیم دلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسکول بھی ہم جیسے دولت مندوں کی عظمت کا نشان ہوا کرتے تھے لیکن اب بھیڑ بکریوں کے باڑے بن کر رہ گئے تھے۔

میں اپنے بیٹے فرہاد کو شمران کے اس اسکول میں رکھنے پر مجبور تھی جہاں وہ پہلے ہی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء سے پہلے تک یہ اسکول صرف طبقہ امرا کے بچوں تک مخصوص تھا لیکن اب اسے ایک عام پبلک اسکول بنا دیا گیا تھا۔ اسکول کی تمام ٹیچرز بھی تبدیل کر دی گئی تھیں۔ فرہاد کے لئے ہر چہرہ اجنبی تھا۔ احساس کمتری میں مبتلا دولت سے نفرت کرنے والی ان ٹیچروں نے شروع ہی سے ان بچوں کو اپنی نفرت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جن کا تعلق دولت مند گھرانوں سے تھا۔ مذہبی رہنما اسکولوں کو اپنے ذاتی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ تمام اسکولوں میں صرف مذہبی تعلیم رائج کر دی گئی تھی۔ انگریزی، فرانسیسی اور دوسری غیر ملکی زبانیں، جو ہمارے طبقے کے بچوں کا ذریعہ تعلیم تھیں، ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔ ذریعہ تعلیم اب صرف فارسی اور عربی زبان تھا۔

دولتمندوں سے ان ٹیچروں کی نفرت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم پر توجہ دینے کے بجائے ان کے والدین کے خلاف ان سے جاسوسی کرا رہی تھیں۔ اس کے لئے وہ مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھیں۔ فرہاد کے اسکول کی ایک ٹیچر ایک روز وسکی اور واڈکا کی خالی بوتلیں لے آئی اور انہیں بچوں کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"جو بچہ یہ بتائے گا کہ اس کے گھر میں اس قسم کی بوتلیں موجود ہیں اسے انعام دیا جائے گا۔"

امام خمینی کی حکومت میں مغربی موسیقی سننے، جوا کھیلنے اور شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن ہم جیسے بیشتر گھروں میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ جو بچہ یہ بتا دیتا کہ اس نے گھر میں یہ بوتلیں دیکھی ہیں تو اسے کچھ عرصے کے لئے اپنے والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہو جانا پڑتا، اسکول بند ہونے سے پہلے پہلے کمیٹی کے ہرکارے ان بچوں کے گھروں پر چھاپے مارتے اور ان کے والدین کو گرفتار کر لیا جاتا۔ ان کی سزا کی مدت کا انحصار ان کے کیس کا فیصلہ کرنے والے مذہبی رہنما کے موڈ پر ہوتا تھا۔

میں نے فرہاد کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ گھر کی باتیں گھر سے باہر کسی کو نہ بتایا کرے اگر کوئی ٹیچر یا کوئی اور اس سے یہ پوچھے کہ اس کے گھر میں فلاں چیز موجود ہے تو وہ انکار کر دیا کرے۔ ایک روز جب وہ اسکول سے واپس آیا تو اس نے بڑے فخر سے کہا۔

"ممی! آج میں نے ایک بہت اچھا کام کیا ہے۔ ٹیچر نے مجھے قرآن دکھا کر پوچھا تھا کہ تمہارے گھر میں یہ چیز موجود ہے

یا نہیں میں نے کہہ دیا تھا نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ظاہر ہے میں اسے کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی البتہ میں نے ایک الماری میں کتابوں کے نیچے رکھا ہوا وہ قرآن دکھا دیا جو مجھے جہیز میں ملا تھا اور اسے یہ سمجھانے لگی کہ وہ لوگوں سے کبھی یہ نہ کہے کہ ہمارے گھر میں قرآن نہیں ہے۔

"جب لوگ تم سے کچھ پوچھیں تو ہمیشہ یہ کہا کرو کہ ہمارے گھر میں روزانہ باقاعدگی سے قرآن پڑھا جاتا ہے۔"

مجھے احساس ہے کہ میں جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کم عمری میں اپنے بیٹے کو جھوٹ کی تعلیم دیتے ہوئے مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ مجھے ان عورتوں پر بھی رحم آتا تھا جن کی بیٹیاں تھیں۔ ہر لڑکی کے لئے چھ سال کی عمر میں حجاب پہننا لازمی تھا۔ (حجاب... مخصوص انداز میں سلا ہوا وہ کپڑا جس کے اوڑھنے سے سر اور چہرے کا بیشتر حصہ چھپ جاتا ہے) اگر کوئی لڑکی یہ عذر پیش کرتی کہ کھیلتے ہوئے اس کا حجاب کہیں گر گیا تھا تو ٹیچرز اس کا یہ عذر قبول کرنے کے بجائے اسے سخت سزا دیتیں۔ ایسی ناخوشگوار صورت حال سے بچنے کے لئے ماؤں نے اپنی بچیوں کے حجاب کے کناروں پر الاسٹک سینا شروع کر دیئے تھے تاکہ سر پر اس کی گرفت مضبوط رہے۔

فرہاد سات سال کا ہو چکا تھا۔ اس اسکول میں پڑھتے ہوئے اسے دو سال بیت گئے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ بڑا ہو کر کیا بنے گا۔ اسکولوں میں بچوں کی جس طرح برین واشنگ کی جا رہی تھی وہ مجھ جیسی ماؤں کے لئے یقیناً خوفناک تھی۔ مجھے فرہاد کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

فرہاد کی ٹیچرز میرے ذہن پر آسیب کی طرح مسلط تھیں۔ ایک دو مرتبہ فرہاد کو محض اس لئے کڑی سزا دی گئی تھی کہ وہ کسی سوال کا جواب دینے کے لئے اپنی باری سے پہلے بول پڑا تھا ایک مرتبہ ٹیچر نے اس کے سر پر اس زور کا ڈنڈا مارا تھا کہ اس کی پیشانی سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں شکایت لے کر پرنسپل کے پاس پہنچی تو اس نے نہایت سرد مہری سے جواب دیا۔

"ٹیچر نے اگر تمہارے بیٹے کو سزا دی ہے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ تمہارا بیٹا کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہے کہ اسے سزا سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔"

وہ ٹیچر بھی اس وقت قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹتے دیکھ کر میں دہل کر رہ گئی۔

ایک اور موقع پر مجھے اس ٹیچر کی نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس نئی حکومت میں ہر قسم کی تفریح ختم ہو کر رہ گئی تھی مڈل کلاس اور دولت مند طبقے کے لئے اسکی اِنگ کا ایک کھیل ہی باقی رہ گیا تھا۔ عورتوں کے ٹینس کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی تھی کیونکہ اس سے برہنہ بازوؤں اور ٹانگوں کی نمائش ہوتی تھی۔ رائل کلب کو ایک رات پُراسرار طور پر نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ سوئمنگ پول کے کنارے ایک ریسٹورنٹ بچ گیا تھا۔ اس کے قریب ہی کھلی جگہ پر لوگ کھیل کود سے محظوظ ہو لیا کرتے تھے لیکن نئی حکومت نے کھیلوں کے لئے بھی نئے قوانین نافذ کر دیئے تھے۔ واٹر اسکی اِنگ کی خواہش مند خواتین کے لئے حجاب اور مکمل ویٹ سوٹ لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ اس قانون کے نفاذ سے بازار میں مکمل ویٹ سوٹ کی قلت پیدا ہو گئی۔ مختصر ویٹ سوٹ استعمال کرنے والی خواتین نے پتلون بھی پہننا شروع کر دی۔

ہمارے ذہنوں پر اگرچہ ہر وقت ایک عجیب سا خوف مسلط رہتا تھا لیکن سر سے پیر تک کپڑوں میں لپٹی ہوئی کسی عورت کو واٹر اسکی اِنگ کرتے دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جاتی اور اگر کوئی بدقسمت عورت پانی میں گر جاتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے اسکیز کو سنبھالے یا حجاب کو۔

برفانی ڈھلوانوں پر تو صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔ چھوٹے درجے کے مذہبی رہنما پہاڑوں پر گشت کرتے رہتے تھے۔ برف پوش ڈھلوانوں پر اسکی اِنگ کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ علاقے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ گھر کے افراد اگر تفریح کے لئے جاتے تو باپ بیٹا ایک طرف اور ماں بیٹی دوسری طرف چلی جاتیں۔ ان کی ملاقات شام کو واپسی کے وقت ہی ہوتی تھی۔

عورتوں کو یہ بھی حکم تھا کہ برف پر اسکی اِنگ کے دوران وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کریں کیونکہ مذہبی رہنماؤں کے خیال میں چست لباس مردوں کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتا تھا اسکی اِنگ پر مزید پابندیوں کے باعث عورتوں کے لئے اس کھیل میں حصہ لینا عملی طور پر ناممکن ہو گیا۔

امام خمینی کے برسرِاقتدار آنے کے بعد یہ دوسری سردیاں تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے البرز میں ویک اینڈ منانے کا پروگرام بنایا اور بدھ کے روز فرہاد کو اسکول نہیں جانے دیا تاکہ ہم صبح سویرے گھر سے روانہ ہو سکیں۔ البرز میں ابھی ایسے دو چار ہوٹل باقی تھے جہاں کسی حد تک تفریح سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ ان ہوٹلوں میں اگرچہ شراب نوشی پر پابندی تھی لیکن تفریح کے لئے تہران سے آنے والے لوگ اپنی گاڑیوں میں وھسکی یا واڈکا کی ایک دو بوتلیں چھپا کر لے آتے اور ہوٹلوں میں اپنے کمروں میں چھپ کر شراب کی چسکیوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے، شراب پینے کے کئی گھنٹے بعد بھی وہ ہوٹل کی لابی یا کسی ایسی جگہ پر آنے کی جرأت نہیں

کر سکتے تھے جہاں لوگوں کا ہجوم ہو کیونکہ ہر چار میں سے ایک آدمی حکومت کا جاسوس تھا۔ منہ سے شراب کی بو محسوس ہوتے ہی اس شخص کے خلاف کمیٹی کو اطلاع دے دی جاتی تھی۔

ویک اینڈ سے واپسی پر اگرچہ میں نے فرہاد کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر ٹیچرز بدھ کی غیر حاضری کے بارے میں دریافت کریں تو وہ بخار ہونے کا بہانہ بنا دے لیکن اس کی ٹیچر نے فرہاد سے یہ معلوم کر ہی لیا کہ یہ ویک اینڈ کہاں گزارا تھا' دوسرے ہی دن مجھے پرنسپل نے اسکول میں طلب کر لیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم البرز کی برف پوش ڈھلانوں پر اسکی انگ کے لئے گئی ہوئی تھیں" پرنسپل نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس پیٹرول خریدنے کے لئے رقم کہاں سے آئی تھی؟ تم جانتی ہو کہ ملک میں تیل کی کمی ہے تو پھر تم نے تفریح کے لئے اتنا قیمتی پیٹرول ضائع کیوں کیا؟ تمہیں شاید اس کی پروا نہیں کہ ملک کس سنگین بحران سے گزر رہا ہے یا دوسروں کو پیٹرول کی کس قدر ضرورت ہے اور پھر ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ بیٹے کو جھوٹ سکھایا جا رہا ہے۔ تم کیسی مسلمان عورت ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہئے"

میں اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ آج بھی جب مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں مسلمان ہوں لیکن مذہب کے بارے میں میری معلومات زیادہ وسیع نہیں ہیں نہ ہی میں نے کبھی مذہبی پابندیوں کو قبول کیا ہے لیکن اس کے باوجود میرے عقیدے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ میں دوسری عورتوں کی طرح کبھی مسجد میں نہیں گئی کیونکہ مولویوں کی شکل دیکھتے ہی مجھ پر وحشت سی طاری ہونے لگتی ہے۔ مجھے بچپن میں مناسب مذہبی تعلیم نہیں دی گئی اور یہی وجہ ہے کہ میں مذہب سے بہت دور رہی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے نماز پڑھنا بھی نہیں آتی۔

اس روز اسکول میں پرنسپل کی کڑوی کسیلی باتیں سنتے ہوئے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میں اس کی تمام باتوں کے جواب دے سکتی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اس کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔ اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ایک وقت کا کھانا کھا لینے کے بعد دوسرے وقت کی فکر رہتی ہے۔ وہ مجھ جیسی دولت مند عورتوں کو نہیں سمجھ سکی تھی جنہوں نے ساری زندگی آزادی اور عیش و عشرت میں گزاری ہو اور نہ ہی میں اسے اچھی طرح سمجھ سکتی تھی کیونکہ مجھے اس طبقے کی عورتوں سے زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

امام خمینی کے دور میں' میں جب تک ایران میں رہی' مجھ پر عجیب سا خوف طاری رہا۔ میں اور میرے طبقے کے دوسرے لوگوں کے لئے کسی بات کا پابند ہونا ممکن نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمیں ایک بار پھر پتھر کے زمانے کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ ہم قدم قدم پر قانون شکنی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ ہم جب بھی بلیک مارکیٹ سے شراب کی بوتل خریدتے (جو کم سے کم دو سو ڈالر میں ملتی) جب بھی چوری چھپے وڈیو فلم کرائے پر حاصل کرتے (سنسر شدہ فلمیں دیکھنے کا مزہ بھی نہیں رہا تھا کیونکہ فلموں میں وہ حصے بھی کاٹ دئے جاتے تھے جن میں عورتوں کے بازو برہنہ نظر آتے) جب بھی غیر قانونی طور پر پیٹرول کے کوپن خریدتے (جسے اپنی فائر برڈ کی ٹنکی بھروانے کے لئے پچاس ڈالر خرچ کرنے پڑتے تھے) یا حجاب کے بغیر گھر سے نکلتے یا کسی مرد دوست سے باتیں کرتے تو گویا ہم قانون شکنی کا ارتکاب کر رہے ہوتے۔ غیر ملکی موسیقی سننا بھی سنگین جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ ریڈیو پر بار بار نشر ہونے والے اعلانات میں ہمیں "امام" کے احکامات کی پیروی کا حکم دیا جاتا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

مذہبی رہنماؤں کے کنٹرول میں مسجدوں کو نہایت طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس انقلاب کے بعد ملک میں ہر چیز کی قلت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے راشننگ کرنی پڑتی تھی۔ ضروری چیزوں کے خریدنے کے لئے بھی کوپن حاصل کرنا پڑتے تھے اور ان کوپنوں کے حصول کے لئے مسجدوں کے سامنے چوبیس گھنٹے لمبی لمبی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ دکانوں پر بھی ہر وقت لمبی لمبی قطاریں لگی رہتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا کہ جب آپ کی باری آتی تو پتا چلا کہ اسٹاک ختم ہو چکا ہے اگر آپ میری طرح دولت مند ہیں تو ضرورت کی کوئی بھی چیز بلیک مارکیٹ میں کئی گنا زیادہ قیمت پر خرید سکتے ہیں۔ مسجد سے جاری ہونے والے کوپن سے مرغی چار ڈالر میں ملتی تھی جبکہ بلیک مارکیٹ میں یہی مرغی کم سے کم پندرہ ڈالر میں ملتی تھی۔ پیٹرول کے لئے بھی مسجد سے کوپن حاصل کرنا پڑتے تھے۔ ان کوپنوں کے حصول میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن میں پیٹرول کے کوپن ہمیشہ بلیک میں خریدا کرتی تھی۔ ایران میں دو قسم کی ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں پبلک ٹیکسی کہا جاتا ہے۔ ان میں آپ کے علاوہ دوسری سواریاں بھی بٹھائی جا سکتی ہیں۔ دوسری زرد رنگ کی ٹیکسیاں ہیں جنہیں آپ فون کر کے گھر پر بھی بلا سکتے ہیں اور یہ ٹیکسیاں صرف آپ کے لئے مخصوص ہوں گی۔ میں ہمیشہ اسی پرائیویٹ کمپنی سے ٹیکسی منگوایا کرتی تھی جس کی وجہ سے اس کمپنی کے بیشتر ڈرائیوروں سے جان پہچان

ہوگئی تھی۔ میں انہی ڈرائیوروں سے غیر قانونی طور پر پیٹرول کے کوپن خرید لیا کرتی تھی۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میری یہ تمام حرکتیں قانون شکنی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

میرا ایک کزن تہران کے زیر زمین علاقے میں ویڈیو فلموں اور موسیقی کے ریکارڈز کے ایک بہت بڑے اسٹور کا مالک تھا۔ اس قسم کے دوسرے بہت سے اسٹورز کی طرح میرے اس کزن کا زیادہ کاروبار بھی غیر قانونی تھا۔ وہ چوری چھپے غیر سنسر شدہ فلمیں کرائے پر دیا کرتا تھا۔ یہ فلمیں عام طور پر اسمگل ہو کر آیا کرتی تھیں۔ میں نئی فلموں کے لئے اکثر اس کی دکان پر جاتی رہتی تھی۔

ایک روز جب میں اس کی دکان پر پہنچی تو یہ دیکھ کر دہشت زدہ سی رہ گئی کہ دکان کے تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہزاروں ڈالر مالیت کی ویڈیو فلمیں' موسیقی کے ریکارڈز اور ویڈیو ریکارڈنگ کے قیمتی آلات راکھ کی صورت میں بکھرے پڑے تھے۔ میرے کزن کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ وہ منکرات کا ایک اور شکار تھا۔

میرے بیشتر ادھیڑ عمر رشتے دار' جو کاروباری لوگ تھے' معاشرتی اور قانونی پابندیوں کے باعث وقت سے بہت پہلے عملی زندگی سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ انہوں نے پارٹیوں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر سے نکلتے وقت وہ سستا اور عام سا لباس پہن لیتے اور آمدورفت کے لئے چھوٹی کاریں استعمال کرتے۔ ہر اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا جو کمیٹی کے ہرکاروں کی توجہ کا باعث بن سکتی تھی۔ کمیٹی کے یہ ہرکارے شکار کی تلاش میں چوبیس گھنٹے سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے لیکن ہم جیسے لوگوں نے بھی گویا طے کر رکھا تھا کہ آخری لمحوں تک زندگی کی بچی کچی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

امام خمینی کے تہران آنے کے چند ہفتوں بعد میں نے اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیا تھا۔ میرے ساتھ چند ایسی لڑکیاں بھی تھیں جن کے والدین ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ہم نے گھر کی چار دیواری میں ایک نئی دنیا بسالی تھی اور ہم اس محدود فضا میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی جا رہی تھی کہ مذہبی رہنما اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈا استعمال کر رہے تھے۔ نہایت معمولی باتوں پر لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا لیکن ملک کی اس بدترین صورت حال کے باوجود میری سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میرے گھر میں ہر ہفتے پارٹیاں ہوتی رہتیں جن میں کم از کم پچاس ساٹھ افراد شریک ہوتے ان پارٹیوں میں "لا ریزرو ریسٹورنٹ" سے فرانسیسی شیف اور ویٹروں کی خدمات حاصل کی جاتیں اور بلیک مارکیٹ سے خریدی ہوئی شراب بھی پانی کی طرح بہائی جاتی۔

سسرال والوں سے میرے تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں تھے لیکن فرہاد اپنا ویک اینڈ اپنی دادی کے ہاں گزارا کرتا تھا۔ میں نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ اپنی دادی کے یہاں ہمارے گھر میں ہونے والی پارٹیوں کا کبھی ذکر نہ کرے اور یہ کہ میرے دوست حامد کو بھی وہ میرے خاندان کا ایک فرد ہی سمجھے فرہاد ویک اینڈ پر اپنی دادی کے ہاں چلا جاتا اور مجھے بھی ایک رات حامد کے ہاں گزارنے کا موقع مل جاتا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ حامد' فرہاد کو پسند کرنے لگا تھا۔ فرہاد کی سالگرہ پر اس نے فرہاد کو الیکٹرک ٹرین کا قیمتی تحفہ لا کر دیا تھا۔ یہ قیمتی کھلونا ان دنوں تہران میں بھی دستیاب نہیں تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد حامد ہی وہ شخص تھا جو فرہاد کو پسند آیا تھا۔ وہ اس سے اس طرح بے تکلف ہو گیا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔

میرے خاندان کے صرف چند ہی افراد تھے جو حامد سے میرے قریبی تعلقات کے بارے میں جانتے تھے۔ باقی لوگوں سے میں نے ان تعلقات کو پوشیدہ ہی رکھا تھا کیونکہ میں کسی کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

گرمیوں میں ہر ویک اینڈ پر میں اپنے بہت سے دوستوں کو اپنے کیسپین والے ولا لے جاتی۔ وہاں اگرچہ ملازمین موجود تھے جو کھانا پکانا بھی جانتے تھے لیکن میں ضرورت کی ہر چیز تہران ہی سے لے جاتی تھی تاکہ کسی چیز کے لئے ہمیں باہر نہ جانا پڑے۔ اس عالیشان اور وسیع و عریض ولا میں رہتے ہوئے محسوس ہوتا تھا جیسے اس ملک میں کوئی انقلاب آیا ہی نہ ہو۔ جھیل کیسپین کے ساحل کا ایک لمبا چوڑا حصہ بھی ولا کی حدود میں شامل تھا۔ لڑکیاں بکنی پہنے دن بھر پیراکی کرتیں یا ساحل کے ساتھ ساتھ موٹر سائیکلوں پر گھومتی رہتیں۔ یہاں کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ شام کو شراب کی چسکیوں کے ساتھ ہم دیر تک وی سی آر پر غیر سنسر شدہ مغربی فلمیں دیکھتے رہتے۔ رات کا منظر ہی کچھ اور ہوتا۔ مرد اور عورتیں اپنے ساتھی کے انتخاب کے معاملے میں آزاد تھے۔ غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی اپنی پسند کے مردوں کے ساتھ الگ کمروں میں رات گزارتیں۔۔۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

بعض اوقات مجھے حیرت بھی ہوتی کہ میرے پسماندہ ملازمین یہ سب کچھ کس طرح برداشت کر رہے تھے۔ وہ روزانہ ریڈیو پر احکامات سنتے رہتے تھے لیکن ہر ویک اینڈ پر وہ نہ صرف ہماری خدمت کرتے بلکہ ہمیں شراب پیتے اور نیم عریاں عورتوں کو سوئمنگ پول میں پیراکی کرتے اور باغ میں

اچھل کود کرتے ہوئے بھی دیکھتے۔

حامد بھی اکثر میرے ساتھ ہوتا تھا۔ یہاں سے واپس جاتے ہوئے وہ ملازمین کو کم سے کم دو سو ڈالر کی رقم بخشش کے طور پر دے دیتا تھا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ ولا کے اندر ہماری سرگرمیوں کے بارے میں اپنی زبان بند رکھیں۔ ایک مرتبہ میں نے حامد کی اس سخاوت پر اعتراض بھی کیا تھا۔ جس پر اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"تم نہیں سمجھتیں سوسن! اگر گھر کے ملازمین کو خوش رکھا جائے تو وہ گھر والوں کے خلاف جاسوسی نہیں کریں گے۔"

ہر ویک اینڈ پر میرے ملازمین کو مہمانوں سے بخشش کی صورت میں تقریباً چھ سو ڈالر کی آمدنی ہو جاتی تھی جو ان کی ماہانہ تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی لیکن حامد کا خیال درست تھا۔ ایران میں گھریلو ملازمین بے حد خطرناک ہو گئے تھے۔ وہ لوگ اپنے آقاؤں کے خلاف جاسوسی کرتے رہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مالکان کی گرفتاری کے بعد ان کی جائداد کا تھوڑا بہت حصہ انہیں انعام میں مل جائے گا۔ اسکول میں بچوں سے تو والدین کے خلاف جاسوسی کرائی ہی جاتی تھی لیکن گھریلو ملازمین سب سے زیادہ خطرناک تھے۔ ان کی وجہ سے بہت سے لوگ گھروں میں شراب نوشی اور غیر اخلاقی حرکات کے جرم میں جیلوں میں پہنچ چکے تھے۔ بہت سے لوگ تو گھروں میں رہنے والے ملازمین سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی معقول وجہ کے بغیر انہیں نکالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کسی ملازم کو نکال دینا کمیٹی کو مداخلت کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔

انہی گرمیوں میں میرے دو دوستوں کے ساتھ انہی ملازمین کی وجہ سے ایک نہایت ناخوش گوار واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ ہم حسب معمول ویک اینڈ منانے کے لئے کیسپئن والے ولا گئے تھے۔ ابھی ہم نے اپنا سامان بھی پوری طرح سیٹ نہیں کیا تھا کہ تہران سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ وہ میرے ایک دوست کی کال تھی جس کا بھائی رضا اپنے ایک مرد دوست اور دو عورتوں کے ساتھ یہاں آیا ہوا تھا۔ اس کا ولا ہمارے ولا سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے دوست نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے کمیٹی نے رضا اور اس کے دوستوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ انہیں کہاں لے جایا گیا تھا یا انہیں گرفتار کیوں کیا گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ رضا کے ساتھ مرد اور دونوں عورتیں غیر شادی شدہ تھیں اور اس کے مکان میں شراب، تاش اور دوسری ممنوعہ چیزیں بھی موجود تھیں۔

دراصل رضا اور اس کے دوستوں کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اگلے روز ہمارے ولا میں آجائیں گے لیکن رضا کے بھائی کی فون کال نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔

"میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں" حامد کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ ساحل پر تلاش کے علاوہ حامد نے ایک اور خطرناک حرکت یہ کی کہ کمیٹی کے مقامی دفتر سے بھی ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی اس حرکت پر اسے بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا کیونکہ پکڑے جانے والے لوگوں کے خلاف کچھ معلوم کرنا بھی جرم تھا لیکن چند گھنٹوں بعد حامد واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ رضا اور اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔

حامد کے واپس آنے کے کچھ دیر بعد دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو رضا لڑکھڑاتا ہوا اندر آن گرا۔ اس کے پیچھے اس کا دوست بھی موجود تھا اس کا چہرہ بھی کرب و اذیت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان دونوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

"ہمیں کوڑوں سے بری طرح پیٹا گیا ہے" رضا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا کوٹ اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم نے ان دونوں کی قمیصیں اتار دیں۔ مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ کوڑوں کی سزا کیا ہوتی ہے۔ ان دونوں کی پشت پر کئی جگہوں سے کھال ادھڑی ہوئی تھی۔ بعض زخم خاصے گہرے تھے۔ جب ان پر دوا لگائی جانے لگی تو وہ دونوں بری طرح چیخنے لگے۔

ہمارے گروپ میں شامل عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ حامد اور دوسرے مرد زخمی شیروں کی طرح ٹہل رہے تھے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں انہیں کس قدر دشواری پیش آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب رضا کی حالت سنبھلی تو وہ ہمیں اس واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہمیں تہران سے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ ہمارے ساتھ ہماری دو گرل فرینڈز بھی تھیں۔ ابھی ہم نے اپنا سامان بھی پوری طرح نہیں کھولا تھا کہ کمیٹی کے آدمیوں نے چھاپہ مار دیا۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح زبردستی اندر گھس آئے تھے۔ انہوں نے مکان کے کونے کونے کی تلاشی لے ڈالی اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا لیکن غنیمت ہوا کہ دونوں لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور دو چار تھپڑ لگانے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نے ہمارے خلاف جاسوسی کی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ صرف ملازموں ہی کو معلوم تھا کہ آج ہم یہاں آ رہے ہیں لیکن وہ کئی برسوں سے ہمارے خاندان کے نمک خوار ہیں۔ کیا وہ ہمارے خلاف جاسوسی کر سکتے ہیں؟"

میں کئی گھنٹوں تک حامد کے ساتھ ساحل پر ٹہلتی رہی۔

کبھی میں رونے لگتی اور کبھی مذہبی رہنماؤں کی اس حکومت کو گالیاں دینے لگتی جس نے ہمارا جینا حرام کردیا تھا لیکن لگتا ہے میری یہ باتیں ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی مذہبی رہنماؤں کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں کیونکہ اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔

میں بہت سے ایسے گھریلو ملازمین کو بھی جانتی ہوں جو اپنے مالکان کو دھوکا دے کر ان کی جائدادوں کے وارث بن گئے تھے۔ بہت سے دولت مند ایرانی پکڑے جانے کے خوف سے ملک سے فرار ہوگئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی جائدادیں تو حکومت نے ضبط کرلی تھیں اور فرار ہونے والے ایرانیوں کی کچھ جائدادیں ایسی بھی تھیں جو ابھی تک حکومت کی نظروں میں نہیں آئی تھیں اور ان جائدادوں پر گھریلو ملازمین کا قبضہ تھا۔ میرا ایک مالی بھی اسی فطرت کا تھا۔ وہ بہت عرصے سے ہمارے ہاں کام کررہا تھا اور اب اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ باغ کے کم سے کم آدھے حصّے کا مالک ہے۔ وہ ہفتے میں کام بھی صرف دو یا تین دن کرتا تھا۔ میں اسے نکال بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے برعکس باقاعدگی سے اسے تنخواہ دیتی رہی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے خلاف کمیٹی کو کسی قسم کی رپورٹ نہ کردے۔

اس انقلاب سے ملک کے بڑے بڑے زمیندار بھی حسد و رقابت کا شکار ہورہے تھے۔ شروع میں اکثر ایسا ہوتا کہ ملازمین کام پر آنے سے انکار کردیتے اور زمینداروں کو کام کرنا پڑتا اور پھر کمیٹی کے ممبران موت کے فرشتوں کی طرح دندناتے ہوئے فارموں پر پہنچ جاتے اور ان کے حساب کتاب کے سلسلے میں انہیں پریشان کرتے رہتے۔ میرے والد کو بھی ان کے ہاتھوں اکثر پریشانی اٹھانا پڑتی۔ ایک سال بعد، جبکہ سیاسی مخالفین اور عورتوں کو تسخیر کرلیا گیا تھا، مذہبی حکومت نے زمینداروں کی طرف بھی زیادہ توجہ دینا شروع کردی۔

ایک دن مقامی کمیٹی کے ممبروں کا ایک گروہ میرے والد کے فارم پر پہنچ گیا۔ وہ لوگ پہلے تو مختلف طریقوں سے میرے والد کو ہراساں کرتے رہے پھر انہوں نے نئے باغ میں سیبوں کے وہ ہزاروں پودے جڑوں سے اکھاڑ پھینکے جو میرے والد نے چند مہینے پہلے لمبی رقم خرچ کرکے بڑی محنت سے اگائے تھے۔ یہ باغ لگانے کے سلسلے میں میرے والد نے بینک سے بھی قرض لیا تھا لیکن کمیٹی کے دہشت گردوں نے ایک ایک پودا جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مجھے وہ سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ میرے والد کا چہرہ رودینے والا ہورہا تھا۔ کمیٹی کے دہشت گردوں کی اس ٹیم کا سربراہ کہہ رہا تھا۔

"سیب کھانا بہت بڑی عیاشی ہے۔ ہمارے لوگوں کو سیبوں کی نہیں گندم کی ضرورت ہے۔ سیب صرف طاغوتی لوگ ہی کھاسکتے ہیں اور ایران میں اب اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

اس واقعے نے میرے والد کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ باغ لگانے کے لئے انہوں نے بینک سے ہزاروں ڈالر قرض لئے تھے جن کی واپسی کی اب کوئی امید نہیں رہی تھی۔ بینک نے قرضے کی واپسی کے لئے کمیٹی سے مدد مانگی۔ کمیٹی کے دہشت گرد ایک بار پھر صباون پہنچ گئے اور میرے والد کی اراضی کا بیشتر حصّہ بحق سرکار ضبط کرلیا گیا۔

میرے والد انتہائی دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ وہ چند روز کے لئے رضائیہ میں اپنی والدہ والے مکان میں چلے گئے لیکن دوسرے ہی روز انہیں یہ اطلاع ملی کہ بعض نامعلوم لوگوں نے صباون میں ان کا مکان لوٹ لیا ہے۔ وہ فوراً واپس آگئے انہیں بتایا گیا کہ ان کا مکان قریبی دیہاتوں میں رہنے والے کُردوں نے لوٹا تھا۔ مکان کی حالت دیکھ کر میرے والد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ مکان چالیس سال پہلے انہوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا اور اب یہ کسی اُجڑے دیار کا منظر پیش کررہا تھا۔ لٹیرے قالین، زیورات، نقدی اور دوسری چیزیں اپنے ساتھ لے گئے تھے جبکہ قیمتی صوفے، میز کرسیاں، پینٹنگز اور اس قسم کی چیزیں توڑ پھوڑ دی گئی تھیں۔ بستروں کے میٹریس اور صوفوں کے کشن پھاڑ دیئے گئے تھے۔ اگرچہ بتایا یہ گیا تھا کہ یہ لوٹ مار قریبی دیہاتوں میں رہنے والے کُردوں نے کی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ سب کچھ کمیٹی کے دہشت گردوں کا کیا دھرا تھا۔

اس کے بعد کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے تھے جن میں واقعی گاؤں والوں کا ہاتھ تھا۔ ان واقعات میں بھی میرے والد کو خاصا مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ جو لوگ کئی نسلوں سے ہمارے خاندان کے نمک خوار تھے وہ یکایک مخالفت اور نمک حرامی پر کیوں اتر آئے تھے۔ میرے والد تو ہمیشہ ان کے کام آئے تھے۔ وہ جب آپس کے لڑائی جھگڑوں میں گرفتار ہوجاتے تو والد انہیں ضمانت پر رہا کروالاتے۔ انہیں قرضے دیتے، ان کی مالی امداد کرتے رہتے اور ان کے مسائل کا حل تلاش کرتے رہتے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے خلاف ہوگئے تھے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا اگرچہ آسان نہیں تھا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ امام خمینی کے آنے کے بعد ایران کے لوگ، خصوصاً نچلے طبقے کے لوگ، اب کسی کی ماتحتی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک ایسی طاقت بن گئے تھے جس سے وہ پہلے آشنا نہیں تھے۔ انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔

میرے والد اب مستقل طور پر رضائیہ میں رہائش پذیر تھے۔ صباون میں اب ان کی جان بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔

وہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے کبھی کبھار دن میں وہاں کا چکر لگایا کرتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کو شاہ کے آہنی پنجے سے نجات مل گئی تھی لیکن اس آزادی کا فائدہ صرف موقع پرست اٹھا رہے تھے، حکومت میں شامل لوگوں کو اپنے فرائض تک کا علم نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ حکومت کے کس شعبے سے منسلک ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک آیت اللہ اور کمپنی کے مقامی سربراہ نے میرے والد کو کلیرنس سرٹیفکیٹ دے دیا کہ وہ اپنی زمینوں پر کاشت جاری رکھ سکتا ہے جبکہ دوسرے آیت اللہ نے اسے تحریری طور پر یہ حکم دے دیا کہ وہ زمینوں پر کسی قسم کی کاشت نہیں کرسکتا۔ میرے والد سب کچھ چھوڑ کر بیٹھے رہے۔ گاؤں کے چند وفاشعار ملازمین نے بھی ان سے درخواست کی کہ وہ زمینوں پر کاشت جاری رکھیں لیکن دوسرے آیت اللہ کے تحریری حکم کی خلاف ورزی کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ اس طرح نکلا کہ صیبالون کا وہ خوب صورت قصبہ اب بھوتوں کا مسکن نظر آتا تھا۔

میں نے اپنے والد، ماموؤں اور دیگر رشتے داروں کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ان مذہبی رہنماؤں کی حکومت میں کس قسم کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ خود اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے اور میں ان کے لئے مزید مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جہاں تک میری سسرال والوں کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد خوش حال زندگی گزار رہی ہوں تو ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے اور میں انہیں یہ سب کچھ دکھانا چاہتی تھی اور میرا خیال ہے کہ میں اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہی تھی۔

انقلاب کے بعد میری ننھیال سلمان فیلی کی کنسٹرکشن کمپنی بہت شدید قسم کے مالی بحران میں مبتلا ہوچکی تھی۔ وہ انقلاب سے چند مہینے پہلے چند بڑے تعمیراتی منصوبوں پر کام کر رہی تھی لیکن جیسے جیسے ملک کے سیاسی حالات بگڑتے گئے کمپنی کے کاروباری امور بھی متاثر ہونے لگے۔ شاہ کے دور میں کمپنی کے لئے بینکوں سے بڑے بڑے قرضے منظور ہوئے تھے لیکن بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے باعث بینکوں نے قرضوں کی قسطیں ادا کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں کمپنی مقروض ہوگئی اور تمام تعمیراتی منصوبوں پر کام روک دیا گیا۔

نئی حکومت ان تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے کمپنی پر دباؤ تو ڈال رہی تھی لیکن انہوں نے فنڈز مہیا کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ ہماری کنسٹرکشن کمپنی کو بعض غیر ملکی کمپنیوں کا بھی تعاون حاصل تھا لیکن اب انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اپنے قرضوں کی واپسی کا تقاضا شروع کردیا تھا۔ امریکی ڈالر کے مقابلے میں تمن کی قیمت بھی گر گئی تھی۔ اس طرح کمپنی نے غیر ممالک میں مشینوں کا جو آرڈر دے رکھا تھا اس کے لئے کئی گناہ زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔

میرے ماموں اگر چاہتے تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح بچا کھچا سرمایہ لے کر ملک سے فرار ہوجاتے لیکن انہوں نے ایسا سوچا بھی نہیں۔ کمپنی کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لئے انہوں نے اپنے بعض قریبی دوستوں سے بھی کروڑوں ڈالرز کے قرضے لے رکھے تھے اور وہ اپنے دوستوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس دوران اگرچہ انہیں کچھ رقوم وصول بھی ہوئی تھیں لیکن وہ کمپنی کو سہارا دینے میں زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوسکی تھیں۔

بہت سی دوسری کمپنیاں بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھیں۔ انہوں نے اپنے تعمیراتی منصوبوں میں استعمال کے لئے بیرونی ممالک میں مشینری کے بڑے بڑے آرڈر دے رکھے تھے۔ اس وقت ڈالر کی قیمت صرف سات تمن تھی لیکن انقلاب کے بعد ڈالر کی قیمت چودہ تمن ہوچکی تھی۔ (۱۹۸۲ء میں جب میں ایران سے فرار ہوئی تھی تو اس وقت ڈالر کی قیمت ستر تمن تک پہنچ چکی تھی) اس سنگین صورت حال کے باوجود نئی حکومت نہ تو ان کمپنیوں کو فنڈز مہیا کرنے کو تیار تھی اور نہ ہی انہیں یہ بڑے بڑے پروجیکٹ ادھورے چھوڑنے کی اجازت دی جارہی تھی۔

کئی ماہ تک ایران میں ہر قسم کا کاروبار بند رہا۔ اس کے اثرات میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ شاہ کے آخری دور میں تیل کے کارکنوں اور سرکاری ملازموں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ شاہ کی معزولی میں بھی ان لوگوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا۔ انقلاب کے بعد تمام ہڑتالیں ختم ہوگئیں۔ لوگ خوش خوش اپنے کاموں پر واپس آگئے۔ ان کا خیال تھا کہ نئی انقلابی حکومت میں ان کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا لیکن ان کے سارے خواب بکھر گئے۔ انقلابی حکومت نے سب سے پہلے عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا پھر ٹیچرز، آرمی آفیسروں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دانشوروں سے نجات حاصل کی۔ ہزاروں سول سرونٹس کو یا تو ملازمت سے نکال دیا گیا یا حالات سے تنگ آکر انہوں نے خود ہی ملازمتیں چھوڑ دیں۔ صرف وزارت خارجہ میں، جہاں میرے بہت سے دوست کام کرتے تھے، آدھے سے زیادہ ملازمین اپنے روزگار سے محروم کردیئے گئے۔

ایران کی معیشت بری طرح تباہ ہوچکی تھی۔ امام خمینی

کے حکم پر ہر محکمے کے کلیدی عہدوں پر ان کے وفاداروں کو تعینات کردیا گیا۔ یہ تقرریاں انہیں وفاداری کے صلے میں ملی تھیں جبکہ متعلقہ کام کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے لیکن بہت جلد یہ خوفناک حقیقت مکمل کر سامنے آگئی کہ جن کو بوتل میں بند کرنا اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔

پرائیویٹ سیکٹر میں ملازمین کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ اب وہ کسی طاغوتی کے تابع نہیں رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹے درجے کے ملازمین بھی اپنی مرضی سے کام پر آنے جانے لگے۔ وقت کی پابندی کا تصور ہی ختم ہوگیا تھا بعض اوقات لوگ کئی کئی روز تک دفتر سے غائب رہتے لیکن پہلی تاریخ کو تنخواہ وصول کرنے کے لئے صبح سویرے ہی دفتر پہنچ جاتے۔ کسی ادارے کا سپروائزر یا منیجر ان ملازمین سے کسی قسم کی بازپرس نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کے گلے پر کمیٹی کی تلوار لٹک رہی تھی۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال اس طرح دوں گی کہ میرے ماموں خروش اور فائق کے دفتر میں ایک بہت پرانا ملازم تھا۔ اس کی حیثیت ایک چپراسی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ دفتر میں آنے والے مہمانوں کو چائے پیش کرتا رہے۔ انقلاب سے پہلے اس ملازم نے کبھی کسی کے سامنے نظر بھی اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی لیکن انقلاب کے بعد وہ بے حد گستاخ ہوگیا تھا۔ اسے مہمانوں کے لئے چائے لانے کو کہا جاتا تو گھنٹوں لگا دیتا اور کبھی تو کہنا ماننے سے انکار کردیتا۔

اس صورتِ حال کے باوجود میرے ماموں اسے ملازمت سے برطرف کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ بات صرف اس چپراسی تک ہی محدود نہیں تھی۔ کمپنی کے بیشتر ملازمین بھی گستاخانہ طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے تھے۔

پرائیویٹ اداروں میں سرکار کی مداخلت بڑھتی جارہی تھی لیکن کوئی احتجاج نہیں کرسکتا تھا۔ روز نئے نئے احکامات جاری ہورہے تھے اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اگر آج کوئی حکم جاری ہوتا تو کل اسے منسوخ کرکے کوئی نیا حکم جاری کردیا جاتا۔

کلیدی عہدوں پر فائز ہر افسر اپنے آپ کو بلاشرکت غیرے ایران کی قسمت کا مالک سمجھ بیٹھا تھا۔ فیکٹریوں کے کارکن یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ فیکٹریوں کے مالک یا حصے دار بن جائیں گے۔ مزارعین کو یہ امید تھی کہ وہ اپنے آقاؤں کو گرفتار کرانے کے بعد اراضی پر قابض ہوجائیں گے۔ دوسری طرف حکومت اس کوشش میں تھی کہ بچے کھچے لوگوں کے ذریعے کسی طرح صورتِ حال پر قابو پالیا جائے لیکن چھوٹے درجے کے مذہبی رہنما ان کی ہر کوشش پر پانی پھیر رہے تھے۔

سلمان فیملی پر انقلابی آقاؤں کا پہلا عتاب امام خمینی کی واپسی کے تین ماہ بعد نازل ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں ماموں کامل کے انتقال کے بعد ماموں خروش خاندان کے سربراہ بن گئے تھے۔

ایک روز وہ پروفیشنز ہیڈ کوارٹر میں انجینئروں کی ایک کانفرنس میں شریک تھے کہ کمیٹی کے مسلح افراد کا ایک گروپ دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چھ انجینئروں کو گرفتار کرلیا۔ ان چھ انجینئروں کا شمار ملک کے چوٹی کے انجینئروں میں ہوتا تھا۔ ان میں ماموں خروش بھی شامل تھے۔

میں اس روز گھر پر ہی تھی کہ ماموں فائق کا فون آگیا۔ فائق بے حد جذباتی آدمی تھے۔ خاندان کے ہر فرد کی تکلیف کو وہ بڑی شدّت سے محسوس کرتے تھے۔

"تمہارے ماموں خروش کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔" انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کی گرفتاری کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوسکی اور نہ ہی ابھی تک یہ پتا چلا ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوا میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

"کیا میں اس سلسلے میں کسی کام آسکتی ہوں؟" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ماموں خروش کی گرفتاری کی خبر میرے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔

"کچھ نہیں، پورا خاندان بھاگ دوڑ کررہا ہے۔ اگر تم کسی ایسے آدمی کو جانتی ہو جو اس سلسلے میں کچھ مدد کرسکتا ہو تو اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش ضرور کرو۔" ماموں فائق نے کہا اور فون بند کردیا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ نئی حکومت کے بعض عہدیداروں سے سلمان فیملی کے کچھ تعلقات تو تھے لیکن مذہبی رہنماؤں سے ان کا کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن جیسے ہی ماموں خروش کی گرفتاری کی اطلاع ملی خاندان کا ہر فرد حرکت میں آگیا تھا۔ ہمارے خاندان کی کچھ رشتے داریاں سبھوری خاندان سے بھی تھیں۔ مذہبی رہنماؤں سے اس خاندان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اس خاندان کا ہر شخص اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ خروش کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا اور اسے کہاں رکھا گیا تھا۔ یہ بھی سوچا جارہا تھا کہ کیا کسی کو رشوت دے کر خروش کو رہائی دلائی جاسکتی تھی؟ لیکن سوال یہ تھا کہ رشوت کی پیش کش کسے کی جائے اور کتنی رقم میں معاملہ طے ہوسکتا تھا۔

ان چھ انجینئروں کی گرفتاری کے ساتھ ہی بڑے بڑے اداروں کے ہیڈ آفسز، ریستورانوں اور پرائیویٹ سیکٹر کے متعلقہ شعبوں میں کام بند ہوگیا۔ ان کے گھروں میں بھی اس وقت تک صفِ ماتم بچھی رہی جب تک یہ انجینئرز رہا نہ ہوگئے۔

ماموں خروش سے میری ملاقات رہائی کے دو دن بعد ہوئی تھی۔ ان پر ابھی تک دہشت سی طاری تھی۔

"وہ لوگ زبردستی اندر گھس آئے تھے" ماموں خروش نے اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا "ان کے ہاتھوں میں خودکار اسلحہ تھا۔ انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا انہوں نے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی اور نہ ہی ہم میں سے کسی نے کچھ پوچھنے کی جرأت کی تھی۔ انہوں نے ہمیں دفتر سے نکال کر دھکیلتے ہوئے ایک بس میں ٹھونس دیا۔ ان میں سے ایک نے ہم پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا 'تم لوگ قیمتی کاروں میں بیٹھنے کے عادی ہو۔ بس میں بیٹھنے کا آج تک اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔ اب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ایران کے غریب لوگ کس طرح سفر کرتے ہیں' اس کے ساتھ ہی ان سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ تم جانتی ہو کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور میرے گھٹنوں میں بھی درد رہتا ہے۔ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے مجھے بس پر سوار ہونے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی' انہوں نے مجھے دھکے دے کر بس میں ٹھونس دیا۔ دوسرے انجینئروں کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کمپنی کے ایک آدمی نے میرا کوٹ پکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے بولا "یہ قیمتی کپڑا خریدنے کے لئے تم نے رقم کہاں سے لی تھی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ لوگوں کے پاس پہننے کو ڈھنگ کا کپڑا اور کھانے کو روٹی تک نہیں اور تم لوگوں کے یہ ٹھاٹھ ..... "مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ہمارے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جانے والا تھا۔"

"وہ ہمیں شہر کی ایک ایسی گلی میں لے گئے جس کے بارے میں' میں کچھ نہیں جانتا۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی' اس کے بعد وہ ہمیں تنگ اور طویل راہداریوں میں لے کر چلتے رہے۔ ہمیں بار بار سر جھکائے رکھنے کی ہدایت کی جاتی رہی کیونکہ چھت بہت نیچی تھی۔ میرا خیال ہے وہ کسی قسم کی سرنگ تھی۔ بعض جگہوں پر تو ہمیں دور تک گھٹنوں کے بل جھک کر رینگنا پڑتا۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ کہاں لے جایا جا رہا تھا لیکن زیادہ فاصلہ چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے ہی طے ہوا تھا۔ بالآخر ایک جگہ رک کر ہم سے پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔ وہ ہم سے ہمارے گورنمنٹ کے ٹھیکوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا 'تم لوگوں کو یہ بڑے بڑے ٹھیکے محض اس لئے ملے تھے کہ تم لوگ شاہ کے دوست تھے' تم لوگ چور ہو اور تم لوگوں نے حکومت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔"

"زیادہ تر وہی لوگ بولتے رہے۔ ہم نے بہت کم زبان کھولی تھی۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ پیاس سے ہم سب کی بری حالت ہو رہی تھی۔ ہمیں پینے کے لئے پانی دیا گیا۔ اس وقت تک ہماری آنکھوں سے پٹیاں نہیں کھولی گئی تھیں۔ پانی پینے کے بعد میں فائر کی آواز کا منتظر رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب ہمیں گولی سے اڑا دیا جائے گا لیکن گولی نہیں چلی۔ اس کے بجائے ہماری آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئیں اور جانتی ہو ہم کہاں تھے؟ اس عمارت میں جس میں ہمیں لے جایا گیا تھا۔ وہاں کوئی نیچی چھت یا سرنگ نہیں تھی۔ وہ ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھے ہمیں جانوروں کی طرح اس عمارت کے مختلف کمروں میں کئی گھنٹوں تک گھماتے رہے تھے۔ عمارت سے باہر لا کر ہمیں ایک بار پھر بس میں ٹھونس دیا گیا اور وہ لوگ ہمیں شہر کی ایک سڑک پر چھوڑ کر چلے گئے۔"

اس واقعے کے بعد ماموں خروش کو مختلف معمولی الزامات کے تحت چار مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ایک مرتبہ تو اسے پانچ مہینے جیل میں گزارنے پڑے تھے۔ آخری مرتبہ اسے ۱۹۸۶ء میں گرفتار کیا گیا۔ ان دنوں اخبارات کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جس کے پاس ڈائنا مائٹ موجود ہو وہ مقامی کمیٹی کو اطلاع دے۔ ایک بلڈر ہونے کی حیثیت سے ماموں خروش کے پاس ڈائنا مائٹ موجود رہتا تھا اور اس کے پاس اس کا اجازت نامہ بھی تھا۔ ایک شریف شہری کی طرح خروش ڈائنا مائٹ کی اطلاع دینے کے لئے کمیٹی کے مقامی دفتر گیا تو اسے گرفتار کر کے دو مہینوں کے لئے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ گرفتاری کی اس مرتبہ بھی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی تھی۔

انقلاب کے بعد ایران میں لوگوں کی گمشدگی روز مرہ کا معمول بن گیا تھا۔ ڈھائی سال کے عرصے میں' میں خود دو مرتبہ اغوا ہوتے ہوتے بچی تھی۔ میرے شوہر کا بزنس پارٹنر عبداللہ تسلیمی بہائی فرقے کا سرکردہ آدمی تھا۔ بہائی فرقہ انیسویں صدی کے وسط میں وجود میں آیا تھا۔ اس سے پہلے یہ بھی شیعہ فرقے میں شامل تھے۔ علیحدہ فرقہ بن جانے کے باعث انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اس وقت ایران میں بہائی فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی آبادی تین لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔ ان کے بہت سے عقائد ایسے تھے جنہیں شیعہ ازم میں بدعت سمجھا جاتا تھا۔ ایران میں بھی ایسی بدعتوں کے لئے سنگساری کی سزا مقرر تھی۔ امام خمینی نے اقتدار سنبھالتے ہی بہائی فرقے کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا اور اس فرقے سے تعلق رکھنے والوں کو یہ موقع بھی فراہم کیا تھا کہ وہ دوبارہ شیعہ ازم اپنالیں بصورت دیگر انہیں سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی جان بچانے کے لئے امام خمینی کی پیش کش قبول کر لی تھی جبکہ اکثریت نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد بہائیوں کے ساتھ جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال نہیں ملتی۔

عبداللہ تسلیمی کو بہائی فرقے میں نمایاں مقام حاصل تھا اگرچہ اس کی جان کو ہروقت خطرہ رہتا تھا لیکن اس نے محض اپنی جان بچانے کے لئے ملک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک مرتبہ اس کے گھر پر کھانے کے دوران میں نے اس سے کہا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ انہیں تم سے شدید نفرت ہے۔ وہ جلد یا بدیر تمہیں پکڑ ہی لیں گے۔ تم باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"اگر میں چلا جاؤں تو میرے فرقے کے باقی لوگوں کا کیا ہو گا؟" عبداللہ تسلیمی نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہم ان سب کو ایران سے نکالنے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔"

امام خمینی نے بہائیوں کے اجتماعات پر بھی پابندی عائد کر دی تھی۔ یہ ۱۹۸۰ء کے موسم بہار کی بات ہے' ایک روز عبداللہ تسلیمی اور اس کے گیارہ دوسرے معتبر بہائی لیڈر ایک خفیہ اجتماع میں شریک تھے کہ کمیٹی نے چھاپہ مار کر ان سب کو گرفتار کر لیا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ گرفتاری کے بعد انہیں کہاں لے جایا گیا تھا۔ عبداللہ کی بیوی اس کی واپسی کی امید لگائے بیٹھی تھی کیونکہ اخبارات میں اس کی موت کی خبر نہیں چھپی تھی۔ ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلتے چلے گئے۔ عبداللہ تسلیمی یا اس کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی بات سننے میں نہیں آئی تھی لیکن عبداللہ کی بیوی کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور واپس آئے گا۔ امام خمینی کی حکومت پر بین الاقوامی دباؤ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر ایک روز عبداللہ تسلیمی کی دل شکستہ بیوی ایران چھوڑ کر چلی گئی۔

○☆○
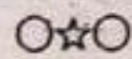
انقلاب خون کی بھینٹ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

میرا خیال ہے ہم بھی پاگل ہی ہو گئے تھے کیونکہ سنگین ترین صورتِ حال کے باوجود ہم پارٹیوں کے ہنگامے بپا کرتے رہتے۔ میں اور میری دوست عورتیں شوخ میک اپ کرتیں' پنڈلیوں سے اوپر تک اسکرٹ پہنتیں اور بعض مواقع پر خوب اودھم مچاتیں۔ میرا زیادہ وقت نئے کپڑوں کی خریداری اور اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں گزرتا۔ حامد سے بھی میری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

شراب پر پابندی کے بعد میرے اکثر دوست تمباکو میں افیون پینے لگے تھے۔ شاہ کے زمانے میں یہ بہت گھٹیا نشہ سمجھا جاتا تھا جو بوڑھوں کے لئے مخصوص تھا لیکن اب یہ نشہ نوجوان نسل میں مقبول ہو رہا تھا۔ ہر محفل سلگتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی اور افیون نوشی کے پائپ کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ یہ نشہ بھی اگرچہ مہنگا ہونے کے علاوہ غیر قانونی تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تہران میں افیون کا سیلاب آ گیا۔ اس حکومت میں دو ہی چیزوں کی افراط تھی۔ مذہب اور افیون۔

میرے سب ہی دوست کثرت سے افیون استعمال کرنے لگے تھے اور افیون کے حصول کا بڑا ذریعہ ایک مذہبی رہنما تھا۔ یہ مذہبی رہنما حامد کا دوست تھا۔ یہ دوستی بھی اپنی جگہ بڑی انوکھی اور دلچسپ تھی۔ ملک بھر کے چھوٹے بڑے مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی کی تقلید میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سیاہ لبادوں اور پگڑیوں پر فخر کرتے تھے لیکن ہمارا یہ مذہبی رہنما یورپی لباس کا دلدادہ تھا۔ وہ کپڑوں کی خریداری کے سلسلے میں اکثر حامد سے مشورے لیا کرتا تھا۔ اس کی خواہش پر ہم اسے کئی مرتبہ اپنے ساتھ ویک اینڈ پر کیسپئن بھی لے گئے تھے۔ یہاں وہ کئی کئی گھنٹوں تک غائب رہتا اور جب واپس آتا تو اس کے ساتھ شراب کی بوتلوں کی کئی پیٹیاں اور افیون بھی ہوتی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ غیر قانونی چیزیں کہاں سے لے آتا تھا۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ ہمارے ساتھ رنگ رلیوں میں شامل نہیں ہو سکتا تھا لیکن دور بیٹھا پُرشوق نگاہوں سے لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک مرتبہ حامد کو شرارت سوجھی۔ وہ اس ملا کی رفاقت کے لئے تہران کی ایک خوب صورت کال گرل کو ساتھ لے آیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی ہر مرتبہ ہمارے ساتھ آتی رہی اور چند مہینوں بعد ہمیں یہ جان کر حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کہ اس منشیات فروش مذہبی رہنما نے اس کال گرل سے شادی کر لی تھی۔

میرے اور حامد کے تعلقات کچھ اور گہرے ہو گئے تھے' اگرچہ اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے کسی فریب میں نہیں رکھنا چاہتا لیکن میں اسے اس کے لاابالی پن شیریں گفتاری کی وجہ سے پہلے سے زیادہ ہی پسند کرنے لگی تھی۔ باتوں کے فن میں وہ بڑا ماہر تھا۔ وہ بے تکان گھنٹوں بولتا رہتا اور سننے والے اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہتے۔ وہ شراب پانی کی طرح پیتا تھا لیکن اس پر کبھی نشے کی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ جنس مخالف کے لئے اس میں بڑی کشش تھی۔ میرے دوستوں کے حلقے کا ہر فرد ہمارے تعلقات کی نوعیت سے واقف تھا لیکن اس کے باوجود لڑکیاں اس سے اظہارِ عشق سے باز نہیں آتی تھیں۔ میں نے حامد کو کبھی کسی معاملے میں پریشان یا فکرمند نہیں دیکھا تھا لیکن انقلاب دوسروں کی طرح اب اس پر بھی اثر انداز ہونے لگا تھا ہمارے حلقے کا ہر نوجوان مایوس نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے ایسے گھرانوں میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ ان کے والدین نے

ان کے لئے درخشاں مستقبل کا بندوبست کردیا تھا لیکن اس انقلاب نے ان کے سامنے ایسے گھمبیر اندھیرے پھیلادیے تھے جن میں کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ان اندھیروں میں پوری طرح غرق ہونے سے پہلے زندگی کی بچی کچی رنگینیوں سے لطف اندوز ہولینا چاہتے تھے۔

میرے اکثر مرد دوستوں نے کام کاج پر جانا بند کردیا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی فیکٹریوں میں تیار ہونے والی مصنوعات کی اب مانگ نہیں رہی تھی۔ جہاں افراتفری کا عالم ہو، لوگ ایک وقت کی روٹی کے لئے دھکے کھاتے پھر رہے ہوں وہاں تعیشات کے سامان کو کون پوچھتا دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ایسے لوگوں کے لئے اپنے کام پر جانا اب خطرے سے خالی نہیں رہا تھا۔ ہر شخص کے ذہن پر گرفتاری کا خوف تھا۔ ادھیڑ عمر کے بڑے بڑے صنعت کار پہلے ہی ملک چھوڑ کر جاچکے تھے۔ وہ اپنے جوان بیٹوں کو اس امید پر چھوڑ گئے تھے کہ شاید حالات بدل جائیں اور وہ اپنے کاروبار پر گرفت قائم رکھیں لیکن انقلابی حکومت نے بھی یہ طے کررکھا تھا کہ ہر قسم کی چھوٹی بڑی صنعت کو ضبط کرلیا جائے گا اور جو لوگ زندگی بھر عیش کرتے رہے تھے انہیں کوڑی کوڑی کو محتاج بنادیا جائے گا۔ ہر صنعت کار، بزنس مین اور دولت مند شخص کے ذہن پر یہ خوف طاری تھا کہ کمیٹی کے دہشت گرد کسی بھی لمحے رائفلیں تانے ان کے دفتروں یا گھروں میں گھس سکتے ہیں۔ گرفتاری سے بچنا تو کسی طرح سے بھی ممکن نہیں تھا لیکن انہیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ گرفتاری کے بعد ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح حامد بھی چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک تو وہ سلطنت آباد میں واقع اپنے دفتر جاتا رہا، دفتر آمدو رفت کے لئے اس نے کوئی خصوصی وقت نہیں رکھا تھا۔ اپنے سیکریٹری یا دفتر کے کسی بھی شخص کو اس نے کبھی اپنے پروگرام سے آگاہ نہیں کیا تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس کے خلاف جاسوسی کرسکتا تھا، اس کے ماں باپ امام خمینی کی ایران واپسی کے فوراً ہی بعد ملک سے چلے گئے تھے۔ ان دنوں حامد ایک کاروباری سلسلے میں ایران سے باہر گیا ہوا تھا لیکن اس امید پر واپس آگیا تھا کہ شاید اپنے کاروبار اور جائداد پر گرفت قائم رکھ سکے۔

حامد کا سب سے پہلا ٹاسک اپنے والد کی اس عالیشان رہائش گاہ کو ان پانچ گھر یلو ملازمین کے قبضے سے آزاد کرانا تھا جو اس کے والدین کے جانے کے بعد اس خوبصورت عمارت کو اپنی ملکیت سمجھ بیٹھے تھے، اگرچہ حامد باہر جانے سے پہلے پہاڑی پر واقع اپنے خوبصورت اپارٹمنٹ میں رہا کرتا تھا لیکن اب وہ اپنے والد کے مکان میں منتقل ہوگیا تھا۔ اس کا مقصد نوکروں کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ لوگ اپنی جائداد سے دست بردار نہیں ہوئے۔

انقلاب کے انیس مہینوں بعد حامد کو پہلی مرتبہ حکومت کی طرف سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے والدین پیرس میں تھے، وہ خود بھی چند روز کے لئے پیرس جانے کا پروگرام بنارہا تھا لیکن جب وہ ایئر پورٹ پہنچا تو اسے ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ انقلاب کے ابتدائی دور کی افراتفری میں قانونی طور پر بھی ملک سے باہر جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ غیر قانونی طور پر بھی ملک سے نکلنا بہت آسان تھا، اگرچہ یورپی ممالک، امریکا، کینیڈا کے لئے ویزا بھی آسانی سے مل جاتا تھا اور اگر آپ کا نام ان افراد کی فہرست میں شامل تھا جن پر ملک سے باہر جانے کی پابندی عائد کردی گئی تو بھی رشوت دے کر آپ آسانی سے باہر جاسکتے تھے، ایک اونچے درجے کا مذہبی رہنما جو مہدی رنگو کے نام سے مشہور تھا، اس معاملے میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ وہ نی خاندان لاکھوں ڈالر رشوت لے کر انہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیتا تھا۔ اس کا طریقہ واردات بہت سیدھا سادا تھا۔ ہمارے جو دوست اسے رشوت دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے ان کے کہنے کے مطابق یہ شخص مطلوبہ آدمیوں کو لے کر سیدھا جہاز تک پہنچ جاتا۔ ایئر پورٹ پر چیکنگ کرنے والے کمیٹی کے آدمی اسے یا اس کے ساتھ آنے والوں کو روکنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے کیونکہ حکومت میں بھی اسے بڑا عمل دخل حاصل تھا لیکن ۲۸ جون ۱۹۸۱ء کو وہ ایک جلسے میں بم کے دھماکے سے ہلاک ہوگیا۔ اس کے ساتھ ۷۲ آدمی ہلاک ہوئے تھے جن میں ایک اور سرکردہ آیت اللہ محمد بہشتی بھی شامل تھے۔

خطرات حامد کے گرد گھیرا تنگ کررہے تھے، اس کی طلبی کے لئے کمیٹی کی طرف سے اشتہار دیا گیا تھا، اس اشتہار کے رد عمل کے طور پر حامد نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا، وہ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کے بجائے روپوش ہوگیا۔ حامد کے چند دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ بار بار اپنے ٹھکانے بدل رہے تھے۔ حامد کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ اب اس کے لئے تہران میں کوئی جائے پناہ نہیں رہی، بالآخر اس نے افغانستان یا ترکی کے راستے ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

اس انقلاب کا ایک اور خوفناک پہلو یہ تھا کہ خاندان بچھڑ گئے تھے۔ کسی گھر کے بچے تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے جبکہ گھر والے ایران میں محصور ہوکر رہ گئے تھے۔ بچوں سے ان کا ہر قسم کا رابطہ منقطع ہوچکا تھا، یا کسی گھر کا سربراہ

کاروباری سلسلے میں ملک سے باہر تھا اور اب وہ جان کے خوف سے واپس آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کے اہلِ خانہ خوف وہراس میں مبتلا تھے۔

لیکن ہم جیسے لوگ شاید ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے۔ انقلاب کے پہلے دو سال تک میری دو چار دوست عورتیں ہمیشہ میرے گھر آکر رہا کرتی تھیں' میرے یہاں ان کے بوائے فرینڈز کی آمد و رفت بھی آزادانہ تھی۔ میرے گھر آکر وہ لوگ ایک طمانیت سی محسوس کرتے تھے۔ انہیں احساس ہوتا تھا جیسے اس گھر میں انقلاب کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔

میری ایک کزن شولے بھی میرے ساتھ رہا کرتی تھی' وہ خاصی حسین تھی اس نے ایک ایسے شخص کو اپنے جال میں پھانس رکھا تھا جس کا تعلق تہران کی ایک نہایت معزز صنعت کار فیملی سے تھا' اس کی بیوی اور بچے یورپ میں تھے۔ وہ اکثر میرے گھر آتا رہتا تھا کیونکہ اس کی کوئی کاروباری مصروفیت نہیں رہی تھی۔ اس کا کاروبار ضبط کر لیا گیا تھا اور اس کے خاندان کے ہر فرد کی گرفتاری کا حکم جاری ہو چکا تھا' انقلاب سے پہلے ہم اس قسم کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے' لیکن اب ہم نے تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا' ہم میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی' پہلے کسی کے شوہر یا کسی کی بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اب کس کی بیوی کس کا شوہر والی بات تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب نے ہمارے اس چھوٹے سے گروپ کے لئے بے راہ روی کے راستے ہموار کئے تھے' ملک بھر میں جہاں پردے کی سختی سے پابندی کرائی جارہی تھی' غیر مردوں اور عورتوں کو محض بات کرنے کے جرم میں جیلوں میں ٹھونسا جارہا تھا' وہاں ہماری یہ چھوٹی سی دنیا بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ ہم عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پہلے اگر مجھے کسی عورت کے بارے میں یہ معلوم ہوتا کہ وہ بیک وقت دو مردوں سے رومانس لڑا رہی ہے تو میں اس سے بات تک کرنا چھوڑ دیتی تھی لیکن اب ایک عورت کئی کئی مردوں سے تعلقات استوار کئے ہوئے تھی اور مجھے بالکل برا نہیں لگتا تھا۔

حامد سے میرے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔ میری بے راہ روی کا یہ حال تھا کہ میں اس کے بغیر ایک رات بھی نہیں گزار سکتی تھی۔ مزید تسکین کے لئے میں نے بے تحاشا شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی۔

ایک مرتبہ ۱۹۸۰ء میں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حامد نے ایک رات کسی دوسری عورت کے ساتھ گزاری تھی تو میں نے چھ مہینوں تک اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس دوران میری ملاقات ایک اور شخص سے ہو گئی' مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس شخص سے ملاقات کے بعد میری دنیا ہی بدل گئی تھی۔

اس روز میں شولے اور اس کے دوست درویش کے ساتھ رائل کلب کے ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ درویش کا ایک دوست فیری بھی وہاں آگیا۔ فیری پُرکشش اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ ہم پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے کی محبت کا شکار ہو گئے تھے۔ اس ملاقات کے دوسرے ہی روز ہم چاروں نے تہران کے شمال میں کوہ البرز کے دامن میں ایک اطالوی سائیٹ کیمپ میں دو تین راتیں گزارنے کا پروگرام بنا لیا' یہاں ایک اطالوی اور ایرانی کنسٹرکشن کمپنی کے اشتراک سے بہت بڑے تعمیراتی منصوبے پر کام ہو رہا تھا۔ درویش اور فیری کے والد اس کمپنی کے حصے دار تھے۔

فیری کا باپ ایرانی اور ماں سوئس تھی۔ ماں کے ناطے اسے سوئس شہریت بھی حاصل تھی اور اس کے پاس سوئس پاسپورٹ بھی تھا میرے خیال میں اس پاسپورٹ کی وجہ سے اسے یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ وہ کسی دشواری کے بغیر کسی بھی وقت ملک سے باہر جا سکتا تھا' لیکن اس کے والد' جس کے شاہ کے خاندان سے گہرے تعلقات تھے' امام خمینی کی حکومت میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا' وہ ان چند لوگوں میں شامل تھا جنہیں شاہ' تہران سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

تہران کے سوشل حلقوں میں اس خاندان کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ فیری کی ایک خوبصورت یہودی لڑکی سے منگنی ہو چکی تھی لیکن امام خمینی کے ایران واپسی کے فوراً بعد وہ یہودی خاندان ملک سے فرار ہو گیا تھا کیونکہ وہ یہودیوں سے امام خمینی کی نفرت سے پوری طرح واقف تھے۔

فیری کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے کی تیاری کرتے ہوئے میں نے ایک دو مرتبہ اس یہودی لڑکی کے بارے میں بھی سوچا تھا' مجھے یقین تھا کہ میں اس کے حق پر ڈاکا نہیں مار رہی تھی کیونکہ وہ یورپ میں تھی اور ایران میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کل کا سورج کسی کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔

وہ ویک اینڈ میرے لئے خوشی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا کیمپ میں رہائش پذیر اطالوی کارکنوں کے خاندانوں نے اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ مذہبی حکام ابھی تک ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ خود امام خمینی بھی چاہتے تھے کہ بعض ادھورے بڑے بڑے تعمیراتی منصوبے مکمل کئے جائیں۔ ان میں ڈیم جیسے منصوبے کو اہمیت حاصل تھی' اس کی تکمیل سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس منصوبے پر اطالوی انجینئروں کو کام جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی' اور ان کی ذاتی زندگی میں بھی کسی قسم کی

مداخلت کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

کھانے کا اہتمام ایک بہت بڑے ہال میں کیا گیا تھا جسے بڑی عمدگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ میزوں پر تازہ پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے۔ برف سے بھرے ہوئے بڑے بڑے ڈرموں میں بڑی بڑی بوتلیں دبی ہوئی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی، یہ کیمپ بھی اسی شہر کا ایک حصہ تھا جہاں کمیٹی نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پندرہ لاکھ ڈالر مالیت کی شراب نالیوں میں بہادی تھی لیکن لگتا تھا اس کیمپ میں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

کھانے کے دوران اطالوی بینڈ، موسیقی کی تانیں بکھیرتا رہا

کھانے کے بعد ڈانس کا پروگرام تھا، بہت عرصے بعد ایسی تفریح سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا، ہم رات بھر رقص کرتے رہے، لیکن لگتا تھا خوشیاں جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھیں، فیری سے ملاقاتوں کو چند ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ کمیٹی نے فیری کی گرفتاری کا حکم جاری کردیا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں نے اپنے دوستوں کے سامنے روتے ہوئے کہا جو ان دنوں میرے گھر میں رہائش پذیر تھیں "اگر وہ ایران ہی میں رہے تو میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن اگر وہ ملک سے باہر چلا گیا تو میں اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔"

"اسے ایران میں روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے" ایک لڑکی نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ وہ کمیٹی کو مطلوب ہے، اگر تم گمنام کال کے ذریعے کمیٹی کو یہ اطلاع دے دو کہ وہ کس فلائٹ سے فرار ہو رہا ہے تو وہ لوگ یقیناً اسے روک لیں گے، ممکن ہے اسے چند روز کے لئے جیل میں بھی ڈال دیا جائے لیکن رہا ہونے کے بعد وہ ملک سے باہر نہیں جاسکے گا اور اس طرح تم نہایت آسانی سے اس پر قبضہ جما سکتی ہو۔"

اس کی یہ تجویز سن کر میں دہشت زدہ سی رہ گئی۔ لوگ اپنی پسندیدہ ہستیوں کو اپنے سے قریب رکھنے کے لئے اس قسم کے ہتھکنڈے بھی استعمال کر رہے تھے، لیکن میں فیری کے سلسلے میں کوئی ایسا اوچھا ہتھکنڈا، استعمال نہیں کر سکتی تھی

بالآخر فیری قانونی طور پر ایران سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا، ایئرپورٹ پر بھی اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس نے مجھے فون کیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے لئے بے چین ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتا گیا، دو سال بعد اس نے اپنی یہودی منگیتر سے شادی کرلی اور اب وہ امریکا میں آباد ہیں۔

فیری کے جانے کے چند ہی روز بعد میں نے ایک اور شخص سے تعلقات استوار کر لئے۔ انقلاب سے پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح ایک کے بعد دوسرے مرد میری زندگی میں آتے رہیں گے لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اس انقلاب کی وجہ سے ہم اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے تھے، ہم میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔

صوفی، میری کزن شولے کے بوائے فرینڈ درویش کا سوتیلا بھائی تھا، وہ قاچارہ شہزادہ تھا، اور غالباً اپنے قبیلے کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی۔ اس کے دادا اور شاہ کے والد سرزمین ایران کے لئے ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تھے۔ اس کے دادا کی کئی بیویاں اور ان سے بیس اولاد بھی تھیں۔ اس خاندان کا ہر فرد زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب زندگی گزار رہا تھا

درویش اور صوفی کا باپ ایک ہی تھا لیکن مائیں الگ الگ تھیں۔ صوفی کئی مینوفیکچرز کمپنیوں اور لامحدود زرعی اراضی کا مالک تھا، لیکن نہایت دولت مند اور ماضی میں انتہائی طاقتور آدمی ہونے کے باوجود وہ ایک ہمدرد، خوش اخلاق اور پڑھا لکھا آدمی تھا، وہ میرا مخلص ترین دوست تھا اور اب بھی ہے۔

میں کئی مہینوں سے محسوس کر رہی تھی کہ صوفی میری طرف جھک رہا تھا لیکن میں نے کبھی بھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ وہ شادی شدہ تھا، اس کی بیوی سوئٹزرلینڈ میں تھی جہاں اس کا عالیشان مکان تھا۔ دو بچوں میں سے ایک سوئٹزرلینڈ میں اور دوسرا انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا۔

فیری کے جانے کے بعد میں تنہا رہ گئی تھی، مجھے ایک ہمدرد دوست اور ساتھی کی ضرورت تھی، اور میرے خیال میں صوفی سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا، صوفی سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار ثابت ہوئے تھے لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ اندھیرے ایک بار پھر ہمارے گرد احاطہ کر رہے تھے۔

یہ ستمبر ۱۹۸۰ء کی بات ہے، اس رات میں باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ شولے کا فون آگیا۔ اس کی آواز میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

"خدا کے لئے گھر سے باہر مت نکلنا" اس نے کہا "میں ابھی تمہارے پاس آرہی ہوں۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک ٹیکسی مکان کے سامنے رکی۔ شولے ٹیکسی سے اتری اور بدحواسی کے عالم میں دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بار بار اس طرح پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

شولے کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ خوف کی شدت سے اس کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سانس اس طرح پھولی ہوئی تھی جیسے میلوں کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرکے آئی ہو

چند منٹ تک وہ یونہی بدحواس سی کھڑی رہی پھر کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کمیٹی والے درویش کے تعاقب میں ہیں۔ ہم اس کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اس کے بھائی کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ کمیٹی کے بھیڑیے اسے گرفتار کرنے آرہے ہیں۔ ہمارے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم فوراً ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔"

شمران کے علاقے میں ایک بہت بڑے احاطے میں درویش اور اس کے تمام بھائیوں کے بنگلے تھے اور درویش کی خوش قسمتی تھی کہ کمیٹی والے اس کی تلاش میں غلط بنگلے میں گھس گئے تھے۔ اپنے بنگلے کے عقبی دروازے سے فرار ہونے کے بعد درویش، شولے کے ساتھ اپنی کار میں جیسے ہی مین روڈ پر مڑا اس نے کمیٹی کی رینج روور کو کمپاؤنڈ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"درویش نے مجھے راستے میں ایک جگہ کار سے اتار دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی گرفتاری کی صورت میں، میں بھی کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ ایک شادی شدہ مرد اور ایک غیر شادی شدہ عورت کا ایک ساتھ ہونا سنگین جرم ہے۔ مجھے اتارنے کے بعد وہ اپنے کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہے۔ اپنے اس دوست کے بارے میں اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھر گئے ہیں سوسن! ہمیں یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر ہمیں تلاش کر ہی لیں گے۔"

لگتا ہے درویش جان بوجھ کر خطرات کو دعوت دے رہا تھا کیونکہ دوسرے دن صبح سویرے ہی درویش میرے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ شولے بھی وہیں تھی۔ درویش نے ناشتا ہمارے ہی ساتھ کیا اور پھر رائل کلب میں دوپہر کا کھانا بھی اس نے ہمارے ساتھ کھایا۔ ایک طرح سے وہ عقلمندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سڑکیں اور دوستوں کے مکان اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ کوئی گھریلو ملازم بھی اس کی جاسوسی کر سکتا تھا جبکہ رائل کلب جیسی جگہیں اس کے لئے محفوظ تھیں یہاں صرف دولت مندوں کی آمدورفت تھی۔ ہر شخص دوسرے کے راز سے واقف تھا۔ گویا سب ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور کسی کو کسی سے خطرہ نہیں تھا۔

دو ہفتے بعد کمیٹی نے اسے مفرور قرار دیتے ہوئے اخبارات میں اس کی گرفتاری کا اشتہار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کنسٹرکشن کمپنی، جس میں کروڑوں ڈالر مالیت کی بھاری مشینری بھی شامل تھی اور اس کا بنگلا بھی ضبط کر لیا گیا۔ درویش کے لئے اب ایران میں رکنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ چند روز بعد وہ ترکی کے راستے ملک سے فرار ہو گیا۔ صرف شولے اور میں اس کے فرار سے واقف تھیں۔ ہمیں جہاں اس کے زندہ بچ جانے کی خوشی تھی وہاں افسوس بھی ہو رہا تھا کہ ہم ایک اچھے دوست سے محروم ہو گئے تھے لیکن چند روز بعد شولے بھی اسی طرح ترکی کے راستے ملک سے فرار ہو گئی اور میں ایک اور اچھی دوست سے محروم ہو گئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس وقت بالکل اکیلی رہ گئی کیونکہ اس وقت تک میرے ساتھ رہنے والی تمام دوست یا تو کسی نہ کسی طرح ملک سے فرار ہو گئی تھیں یا انہوں نے شادیاں کر لی تھیں یا اپنے عزیزوں کے ہاں چلی گئی تھیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہوئے مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ چند روز بعد میں نے اپنے مکان کا بیسمنٹ اپنی ممانی گیتی کے سپہوی خاندان کے ایک پرانے ڈرائیور کو دے دیا۔ جلال آغا تقریباً بیس بائیس سال سے اس خاندان کی ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی بیوی فرح کے علاوہ اس کے دو بچے بھی تھے۔ میری عدم موجودگی میں فرح میرے بیٹے فرہاد کا بھی خیال رکھتی اور حقیقت تو یہ تھی کہ گھر میں اپنی عمر کے دو بچوں کی موجودگی سے فرہاد کا بھی دل لگ گیا تھا۔ جلال آغا چونکہ سپہوی خاندان کا پرانا نمک خوار تھا۔ اس لئے مجھے اطمینان تھا۔ ابتلا کے اس دور میں اس جیسے قابل اعتماد لوگوں کا ملنا مشکل تھا۔

لیکن صوفی سے میں نے جس قسم کے خفیہ تعلقات استوار کر رکھے تھے اس کے پیش نظر میرا اکیلے رہنا ہی مناسب تھا۔ کوئی خدشہ تو نہیں تھا مگر جلال آغا اور اس کی فیملی کے بیسمنٹ میں آنے کے بعد ہم کچھ محتاط ہو گئے تھے۔ اس قسم کے تعلقات رکھنا اب اگرچہ برائی میں شامل نہیں تھا لیکن اگر میرے خاندان والوں کو صوفی سے میرے تعلقات کی نوعیت کا علم ہو جاتا تو وہ اعتراض ضرور کرتے۔

ویک اینڈ پر فرہاد اپنی دادی کے ہاں چلا جاتا اور صوفی چوری چھپے میرے گھر آجاتا اور دو دن ہم کمروں میں بند رہ کر ہی گزار دیتے۔ اس طرح کسی کے دیکھ لئے جانے کا بھی اندیشہ نہیں تھا۔ ان دنوں صوفی میرے گھریلو اخراجات کا حساب کتاب مرتب کر رہا تھا۔ میں ناشتا اور کھانا وغیرہ تیار کرتی۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہم بلیک مارکیٹ سے خریدی ہوئی شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے آتشدان کے سامنے بیٹھے موسیقی سنتے رہتے۔ صوفی اکثر اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی ویڈیو فلم لے آتا۔

صوفی کبھی کبھار عام دنوں میں بھی آجاتا اور ہمیں سیر کرانے کے لئے البرز لے جاتا۔ فرہاد بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ حامد کی طرح وہ صوفی کو بھی خاندان کا کوئی دور کا رشتے دار سمجھنے لگا تھا۔ کبھی ہم البرز کی پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر کسی ایسے ریسٹورنٹ میں بیٹھ جاتے جہاں ہمارے کسی رشتے دار یا کمیٹی کے کسی آدمی سے سامنا ہونے کا اندیشہ

نہ ہوتا۔

صوفی سے میری ملاقاتوں کو چھ مہینے ہو چکے تھے' اس کی موجودگی سے میں اپنی زندگی میں ایک نیا جوش و ولولہ محسوس کرنے لگی تھی لیکن ایک بار پھر یہی کہوں گی کہ خوشیاں مجھے راس نہیں آتی تھیں۔ کمیٹی کے شکاری اب صوفی کے پیچھے لگ گئے تھے۔ قاچار کا شہزادہ' اپنے دور کا کھلنڈرا اور ہنس مکھ صوفی اب خوف کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت تک تو وہ مختلف اوقات میں اپنے دفتر بھی چلا جاتا تھا۔ اس کی رہائش بھی اپنے خوب صورت بنگلے میں تھی لیکن اب وہ ایک سوٹ کیس اٹھائے دربدر پھر رہا تھا۔ ایک رات کسی ایک دوست کے گھر میں گزارتا تو دوسری شام کسی دوسرے دوست کے دروازے پر دستک دے رہا ہوتا۔ کمیٹی کے شکاری اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے لیکن وہ ان سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہتا تھا۔ ایسے موقعے پر دوست ہی ایک دوسرے کے کام آرہے تھے۔ کسی کو پناہ دینا اگرچہ خود کشی کے مترادف تھا لیکن مخلص دوست ایک دوسرے کے لئے ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ ایک دوست نے صوفی کو شہر کے متوسط علاقے میں واقع اپنا فلیٹ دے دیا۔ وہاں صوفی کے لئے خطرہ کسی حد تک کم تھا۔ صوفی نے بڑی محنت سے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرلی تھیں کیونکہ اس کا چہرہ بھی اس کے نام کی طرح ہر طبقے میں جانا پہچانا تھا۔ مرسیڈیز چھوڑ کر اس نے پیکان کار لے لی تھی۔ متوسط طبقے میں عام طور پر یہی کار استعمال ہوتی تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ محتاط ہو گیا تھا۔ قیمتی لباس کے بجائے وہ عامیانہ سا لباس پہننے لگا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور جب بھی اسے فلیٹ سے باہر جانے کی ضرورت محسوس ہوتی وہ میلے سے لباس پر لمبا سا لبادہ اور سر پر ہیٹ پہن لیتا جس کا گوشہ پیشانی پر جھکا رہتا۔

ایک روز جبکہ فرہاد اسکول گیا ہوا تھا۔ میں صوفی سے ملنے کے لئے اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو کسی سنسنی خیز جاسوسی ناول کا کوئی کردار سمجھ رہی تھی۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے صوفی کو اپنے آنے کے بارے میں فون پر اطلاع دے دی تھی۔ اس طرح پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے اپنی کار اس کے اپارٹمنٹ ہاؤس سے کچھ دور ایک کاروباری علاقے میں روک لی۔ چند ہی سیکنڈ بعد صوفی کی کار وہاں آکر رکی۔ میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کار سے اتر کر اس کی کار میں بیٹھ گئی۔ کار فوراً ہی حرکت میں آگئی۔ صوفی نے مجھے بڑی سختی سے منع کیا تھا کہ آئندہ میں اپنی فائر برڈ کار استعمال نہ کیا کروں کیونکہ یہ قیمتی کار فوراً ہی نظروں میں آسکتی تھی۔ اس نے مجھے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے لمبے بال اسکارف میں چھپا کر رکھا کروں۔

مختلف سڑکوں کا چکر لگانے کے بعد جب صوفی کو یقین ہو گیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا تو اس نے کار کا رخ اپنے اپارٹمنٹ ہاؤس کی طرف موڑ دیا۔ کار کو گیراج میں بند کرکے ہم پچھلے زینے سے چوری چھپے اس کے فلیٹ میں آگئے۔

ایک ایسا شخص جس نے شہزادوں کی طرح زندگی گزاری ہو' اس کے لئے شہر کے تھرڈ کلاس علاقے میں فلیٹ کی یہ زندگی کسی بھیانک خواب سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ صوفی یہ زندگی کس طرح گزار رہا تھا لیکن بہرحال اسے اپنی جان زیادہ عزیز تھی۔ اس نے اپنے تمام دوستوں سے بھی کسی حد تک ناتا توڑ رکھا تھا۔ اس خوف سے کہ فون ٹیپ نہ کیا جارہا ہو۔ اس نے فون پر بھی اندرونی اور بیرونی ملک رابطے ختم کردیئے تھے۔ میں واحد ہستی تھی جس کا اس سے مستقل رابطہ تھا۔

صوفی کے فلیٹ میں اگرچہ باقاعدگی سے میری آمدورفت تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب اس سے ملنے میں وہ لطف نہیں آتا تھا۔ اب میرے ذہن میں باربار یہ خیال آنے لگا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ صوفی ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا وہ اگر چاہتا تو ملک سے فرار ہو سکتا تھا لیکن مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ محض میری وجہ سے یہاں رکا ہوا تھا۔ میں بار بار اس سے کہتی رہتی۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ' اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں گی۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔"

لیکن میری باتوں کا صوفی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کمیٹی کی طرف سے اس کی گرفتاری کا حکم تو پہلے ہی دیا جاچکا تھا لیکن اب ایک نیا حکم جاری کردیا گیا تھا کہ صوفی کو دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیا جائے۔ میں ایک بار پھر منت سماجت کرنے لگی کہ وہ بھاگ جائے لیکن حسب معمول اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ مجھے بہرحال' صوفی کی جان عزیز تھی۔ میں اسے کمیٹی کے جلادوں سے بچانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ ایران سے نہ گیا تو میں اس سے تعلقات ختم کردوں گی۔ میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ فرار کے منصوبے بنانے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اس قدر دور نکل گئے تھے کہ کسی کے لئے واپسی ممکن نظر نہیں آتی تھی لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ میں ایک لمحہ بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتی تھی' میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ویسے بھی میرے خیال میں ہم دونوں کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ اسے اپنی بیوی سے محبت

ہے۔ وہ اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور میں صوفی کو اس کے لئے مجبور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں ایک بار پھر اکیلی رہ گئی تھی۔ میرا دامن پہلے کی طرح خالی تھا۔

صوفی کو تعلقات منقطع کر لینے کی دھمکی دینے کے ساتھ ہی میں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ اگر اس سے ملتی رہی تو وہ جانے کا نام نہیں لے گا۔ وہ دن میں کئی کئی مرتبہ فون کرتا لیکن میں کال کا جواب نہ دیتی۔ میں نے ایسی بے رحمی اور سنگدلی کا مظاہرہ کبھی بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کی جان بچانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا چند روز بعد ایک دوست کے ذریعے مجھے صوفی کا پیغام ملا کہ وہ فرار ہو رہا ہے اور جس روز وہ ایران سے رخصت ہو رہا تھا اس روز مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے جدا ہو رہا ہو۔

صوفی کی طرح اور بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو ایران سے فرار ہو رہے تھے... اگرچہ ان کے خلاف زیادہ سنگین الزامات نہیں تھے لیکن کسی کی گرفتاری کے لئے کمیٹی کے پاس کسی معقول وجہ کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ لوگوں کے خلاف اجتماعی الزامات ریڈیو پر نشر اور سرکاری اخبارات میں شائع ہوتے رہتے۔ وہ الزامات یہ تھے کہ دولت مندوں نے ناجائز ذرائع سے دولت جمع کر رکھی تھی۔ اپنے کاروبار کے ذریعے دولت جمع کرنا کسی بھی ملک میں جرم نہیں سمجھا جاتا لیکن ایران کی انقلابی حکومت کی منطق ہی نرالی تھی۔ مذہبی رہنماؤں کو دولت مندوں سے شدید نفرت تھی' اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ خود زندگی بھر اس نعمت سے محروم رہے تھے اور یہ ان کا احساس کمتری تھا جو دولت مندوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر مجبور کر رہا تھا۔ ان کا یہ نظریہ بہت ہی انوکھا تھا کہ ہر دولت مند شخص نے یہ دولت ناجائز ذرائع سے جمع کی تھی۔

میرے دوستوں کے حلقے میں سب ہی لوگ دولت مند تھے۔ ان لوگوں نے اپنی بیویوں سے کاروباری موضوع پر بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان سب کو جانتی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی ناجائز ذرائع سے دولت جمع نہیں کی تھی۔ کبھی کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ ان کے کاروبار بہت وسیع تھے۔ کروڑوں کا سرمایہ لگا ہوا تھا اور ظاہر ہے منافع بھی اسی شرح سے حاصل ہوتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ دولت سمیٹنے کے لئے ناجائز ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہر دولت مند شخص بے ایمان اور بدعنوان تھا۔

صوفی کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اپنی صورتِ حال کا جائزہ لینے لگی۔ بہت سے لوگ باہر جا چکے تھے اور ہمارے دوستوں کا حلقہ سکڑتا جا رہا تھا۔ موت کے فرشتے اگرچہ ہمیں بھی چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہم زندگی کی بچی کھچی رنگینیوں سے خوشہ چینی میں مصروف تھے۔

○☆○

وہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۰ء کی روشن صبح تھی۔ آسمان پر بادل کے کسی چھوٹے سے ٹکڑے کا بھی نام و نشان تک نہیں تھا۔ میرے وطن کی سرزمین پہلے ہی مذہبی رہنماؤں کے عتاب کا نشانہ بنی ہوئی تھی کہ اس روز اس ملک پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ صبح سات بجے جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں یہی سمجھی کہ میرے کسی دوست کا فون ہو گا جو مجھے لنچ کے لئے مدعو کرنا چاہتا ہو گا لیکن وہ ایک اور لڑکی کے دوست کی کال تھی جو ان دنوں میرے گھر پر رہ رہی تھی۔

"عراقیوں نے بمباری کر کے تہران ائرپورٹ تباہ کر دیا ہے۔"

وہ شخص فون پر چیختے ہوئے کہہ رہا تھا "ریڈیو کھول لو' جنگ شروع ہو چکی ہے...."

اس کے جملے اگرچہ بے ربط تھے لیکن مفہوم سمجھ میں آگیا تھا' اس کے ساتھ ہی میرے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔

عراق سے شط العرب کے علاقے میں سرحد بندی کا تنازعہ خاصا پرانا تھا' دونوں ممالک دریائے شط العرب پر اپنا حق جتا رہے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں شاہ ایران اور عراقی حکومت کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے تھے جس کی رو سے عراق نے دریا پر ایران کا حق تسلیم کر لیا تھا اور اس کے عوض شاہ ایران سے یہ ضمانت حاصل کر لی تھی کہ ایران کی حدود میں رہنے والے کردوں کو عراق کے خلاف جنگی کارروائیوں کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس معاہدے کے بعد شاہ ایران اور عراق کے صدر صدام حسین کے درمیان دوستی کے مضبوط رشتے قائم ہو گئے تھے اور جب ۱۹۷۸ء میں شاہ ایران نے صدام حسین کو مشورہ دیا کہ نجف میں ایران کے جلاوطن مذہبی رہنما امام خمینی کو عراق سے نکال دیا جائے تو صدام حسین نے اس مشورے پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اور اب ایران میں امام خمینی کے برسراقتدار آنے سے عراقی صدر صدام حسین بھی اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ ایران میں شیعہ ازم کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا جبکہ عراق میں آدھے سے زیادہ شیعہ آبادی ہونے کے باوجود حکومت سیکولر بعث پارٹی کی تھی جس کے تمام سرکردہ لیڈر سنی مسلمان تھے۔ ایران میں امام خمینی کے برسراقتدار آنے کے بعد امام خمینی کی ہدایات پر عراق کے شیعہ مسلمانوں میں بھی صدام حسین کی حکومت کے خلاف سرگرمیوں کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے لیکن صدام حسین بھی موقع کی

تلاش میں تھا۔ شاہ کے زمانے میں معاہدہ ہونے سے پہلے ایران نے عراق کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ علاقے اب بھی ایران ہی کے قبضے میں تھے۔ عراقی صدر صدام حسین کا خیال تھا کہ ایران میں افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مقبوضہ علاقے واگزار کرائے جا سکتے تھے۔

اس روز جب پہلی مرتبہ ہم نے بموں کے دھماکوں کی آوازیں سنیں تو ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ عراق سے یہ جنگ ایران کی تباہی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ ٹیلی فون کال ریسیو کرنے کے بعد ہم تھوڑی دیر کو باہر آگئے تھے لیکن بموں کے دھماکوں کی آوازیں سنتے ہی مکان میں گھس گئے۔ خوف سے ہماری بری حالت ہو رہی تھی۔ ہمارا مکان مہر آباد ائرپورٹ سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ ہمارا مکان مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔ دروازے بند کر لینے کے بعد باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی لیکن جب ریڈیو کھولا گیا تو ہمیں صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا اناؤنسر ہسٹریائی انداز میں چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کسی ایمرجنسی کے بغیر گھروں سے باہر نہ نکلیں' عراقی طیارے کسی بھی وقت دوبارہ حملہ کر سکتے ہیں۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد گاڑیاں نہ چلائیں اور گھروں میں کسی قسم کی روشنی نہ جلائیں۔ ریڈیو کھلا رکھیں۔ ہدایات وقتاً فوقتاً نشر کی جاتی رہیں گی۔"

یہ اعلانات باربار نشر ہو رہے تھے۔ جنہیں سن سن کر ہماری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایران مشرقِ وسطیٰ کا سب سے زیادہ طاقتور ملک تھا۔ اس کی فوجی قوت دوسروں سے کہیں زیادہ تھی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایران کی فوجی قوت کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی عراق' ایران پر کس طرح حملہ کر سکتا تھا؟ ایران کی باقاعدہ مسلح افواج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی (شاہ کے زمانے میں یہ تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تھی) چار لاکھ ریزرو فوجی تھے۔ ایک ہزار چھ سو برطانوی اور امریکی ٹینک اور جرمن ۔F.14' نام کیٹ لڑاکا طیاروں کی تعداد ۷۷ تھی۔ ہم ہمیشہ یہ سمجھتے رہے تھے کہ عراق کبھی ایران پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا لیکن شاہ کے زوال اور امام خمینی کی آمد کے بعد سے ایران مسلسل اندرونی خلفشار کا شکار تھا جس سے یقیناً ایران کمزور ہو گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا عراق اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا؟

ریڈیو پر باربار اعلانات نشر ہو رہے تھے۔ لوگوں کو جنگ کے حوالے سے حفاظتی طریقے بتائے جا رہے تھے اور مختلف ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ان اعلانات سے خوف و ہراس میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر فرہاد کی تھی جو ان دنوں میری ایک دوست کے ہاں رہنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ میری دوست کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا اور اب جبکہ جنگ چھڑ چکی تھی شہر میں اتنا طویل فاصلہ طے کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

صورتِ حال بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ عراقی طیاروں نے اس روز ایران کے مزید نو ہوائی اڈوں پر بمباری کی تھی۔ مہر آباد ائرپورٹ پر بھی مزید کئی حملے ہوئے تھے۔ اس بدتر صورتِ حال کے باعث فرہاد کے سلسلے میں میری وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ کمیٹی نے اگرچہ شہریوں کے گھروں سے نکلنے پر پابندی لگا دی تھی لیکن مجھے فرہاد کو ہر صورت میں گھر لے کر آنا تھا۔ بالآخر میں گاڑی لے کر گھر سے نکل آئی۔ شہر میں عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ ہر شخص بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہروں پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ ائرپورٹ کی طرف سے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شہر میں افراتفری کے باعث ایک گھنٹے کا راستہ دو گھنٹوں میں طے ہوا اور بالآخر جب میں اپنی دوست کے گھر پہنچی تو فرہاد مجھ سے لپٹ گیا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔

"کیا یہ لوگ ہمیں قتل کر دیں گے ممی؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

میرے پاس اس کے معصوم سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے گھر لے آئی۔ کئی روز تک ہم گھر میں محبوس رہے میرے اور فرہاد کے علاوہ میری تین چار دوست لڑکیاں بھی موجود تھیں اور اتفاق سے ان دنوں میرے والد بھی کسی کام کے سلسلے میں تہران آئے ہوئے تھے۔ الگ الگ کمروں میں سوتے ہوئے ہمیں خوف محسوس ہوتا تھا اس لئے ہم سب نے اس بڑے کمرے میں قالین پر بستر لگا لئے تھے جہاں سردیوں میں چوبیس گھنٹے آتشدان روشن رہتا تھا۔ ابتدا میں تو ہم نے اس حکم کی بڑی سختی سے پابندی کی تھی کہ گھروں میں کسی قسم کی روشنی نہ جلائی جائے لیکن پھر میرے والد نے کھڑکیوں اور روشندانوں پر اچھی طرح پردے لگا کر موم بتیوں کا انتظام کر لیا۔ ہم موم بتیوں کی روشنی میں موسیقی سنتے اور تاش کھیلتے رہتے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ جنگ کی صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے دن عراقی طیاروں نے ابادان کی آئل ریفائنری پر بمباری کر کے اسے تباہ کر دیا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی ریفائنری سمجھی جاتی تھی۔ اس ریفائنری کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے ایران نے عراق کے دارالحکومت بغداد پر بمباری شروع کر دی جس کے جواب میں عراق نے خرگ آئی لینڈ پر ملک کے سب سے بڑے آئل ٹرمینل کو تباہ کر دیا۔ اس جنگ نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں

لے لیا تھا۔ دونوں ملکوں کی تیل کی بر آمد بند ہو گئی۔ عراق کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی لیکن ایران کی معیشت بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ابادان آئل ریفائنری اور خرگ آئی لینڈ میں آئل ٹرمینل کی تباہی کے باعث ملک میں تیل کی شدید قلت پیدا ہو گئی تھی۔ کمیٹی کی اجازت کے بغیر پیٹرول اور گھریلو استعمال کے تیل کی خرید و فروخت جرم قرار دے دی گئی۔

شہر کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے جن پھر گیا ہو۔ ہر چہرہ آسیب زدہ سا نظر آتا تھا۔ بالآخر شہر میں کرفیو لگا دیا گیا جس کی سختی سے پابندی کرائی گئی۔ گھر سے باہر قدم رکھنے والے ہر شخص کو گولی سے اڑا دیا جاتا۔

وہ ملک جو تیل کی بر آمد میں دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا، اب تیل کے قطرے قطرے کو محتاج ہو رہا تھا ملک کا ہر شخص ہر قسم کے ایندھن اور توانائی کے استعمال میں کہیں زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ ہم پورے گھر میں صرف ایک چھوٹا سا بلب جلاتے اور سردی ہونے کے باوجود ہم نے نہانے کے لئے واٹر ہیٹر کا استعمال بند کر دیا تھا۔

ایندھن اور خوراک کی قلت نے خوفناک صورتِ حال اختیار کرلی۔ باورچی خانوں میں جہاں شیلف کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے رہتے تھے، اب خالی نظر آرہے تھے۔ جن کے پاس پیسہ تھا وہ کئی گناہ زیادہ قیمت پر بلیک مارکیٹ سے یہ چیزیں خرید رہے تھے۔ خوردنی تیل اور اس قسم کی چیزیں تو بازار سے اس طرح غائب ہوئی تھیں جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو اگر کسی دوست کو یہ پتا چلتا کہ فلاں دکان پر گھی کئی گنا زیادہ قیمت پر دستیاب ہے تو وہ اپنے دوستوں کو اس طرح راز دارانہ انداز میں اس دکان کا پتا بتاتا جیسے کسی خزانے کا راز بتا رہا ہو۔ اسی طرح کلائی بھی غائب ہو گئی تھی۔ دوسروں کی طرح ہم نے بھی مہنگے داموں ضرورت کی چیزیں خرید کر ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ ہیٹنگ آئل کی صورتِ حال سب سے زیادہ سنگین تھی۔ میں اس امید پر تہران کی سڑکوں پر گھومتی رہتی کہ شاید کہیں تیل کا ڈلیوری ٹرک نظر آجائے اگر کوئی ایسا ٹرک نظر آجاتا تو میں ڈرائیور کو بھاری رشوت دے کر پورا ٹینکر اپنے گھر لے آتی۔ آئل ٹینکروں کے ڈرائیور بھی ہم جیسے لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرنے کے باوجود بعد میں یہ انکشاف ہوتا کہ آئل ٹینکر میں آدھے سے زیادہ پانی ملا ہوا تھا۔

امام خمینی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد عوام سے روٹی، کپڑے اور مکان کا وعدہ کیا تھا لیکن اب لوگوں کو نہ کپڑا دستیاب تھا اور نہ روٹی۔ نئے مکان تعمیر ہوتا تو کجا، پہلے سے بنی ہوئی عمارتیں بھی بمباری سے تباہ ہو رہی تھیں۔ جنگ کی شدت میں جیسے جیسے اضافہ ہو رہا تھا ایران ایک ایسی چیز سے بھی محروم ہو رہا تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی اور وہ تھی ایران کی نوجوان نسل۔

شاہ کا تختہ الٹنے کے بعد امام خمینی نے ہزاروں لوگوں کو اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور اب اپنے ایک اور مقصد کے حصول کے لئے ایران کی نوجوان نسل کو جنگ کی آگ میں جھونکا جا رہا تھا اور امام خمینی کا وہ مقصد تھا صدام حسین کی تباہی اور عراق میں شیعہ حکومت کا قیام۔

عراق، ایران جنگ کو شروع ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور جب میں ایران سے فرار ہوئی تھی تو ایران کے سنجیدہ طبقے میں اس قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں کہ امام خمینی اپنے "جہاد" کے لئے ایران کے معصوم عوام سے بہت زیادہ قیمت وصول کر رہے تھے۔

جنگ شروع ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد حامد ایک بار پھر میری زندگی میں آگیا تھا۔ چھ ماہ کے اس عرصے میں حامد میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی کہ اب وہ میرے لئے زیادہ فکر مند رہنے لگا تھا۔ پہلے میں نے اپنے خاندان کے کسی فرد سے بھی حامد کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب میں اپنے بعض رشتے داروں سے اسے متعارف بھی کرانے لگی تھی۔ حامد کو یہ بھی فکر تھی کہ اگر ہم کمیٹی کے شکاریوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اب وہ اکثر و بیشتر مجھ سے کہا کرتا تھا۔

"سوسن! دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ اب ختم کردو۔ خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ تمہارے ذاتی دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت تمہارے لئے کوئی بڑی مصیبت پیدا کر سکتے ہیں۔"

حامد نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن کون تھے لیکن اس نے رات کو میرے گھر قیام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دن میں بھی وہ چند منٹ سے زیادہ نہ رکتا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کمیٹی کے شکاری کسی بھی وقت میرے گھر پر چھاپہ مار سکتے تھے اور ہم دونوں کو "غیر قانونی تعلقات" کے سنگین جرم میں گرفتار کیا جاسکتا تھا۔

ایک مرتبہ حامد نے مجھے، فرہاد اور میری چند دوستوں کو اپنے ایک دوست کے گھر مدعو کیا جہاں وہ ان دنوں رہائش پذیر تھا۔ اس کا یہ دوست امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا تھا لیکن انقلاب کے بعد بدترین صورتِ حال کے باعث اس نے اپنا کاروبار چھوڑ دیا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ہمارے آنے سے بہت خوش ہوئے تھے۔

ہم تقریباً دو مہینے اس گھر میں رہے۔ اس دوران میں نے حامد کی اتنی خدمت کی تھی کہ اپنے شوہر کی بھی اتنی خدمت

نہیں کی ہوگی۔ گھر کے ملازموں کے ساتھ میں بھی ہر وقت کام میں لگی رہتی۔ حامد کے کپڑے میں خود دھوتی' اس کے لئے کھانا خود پکاتی اور برتن بھی خود ہی دھوتی۔ میں نے زندگی میں کبھی اپنے کپڑے بھی نہیں دھوئے تھے لیکن حامد کے کپڑے دھونے اور اس کی خدمت کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی اور وہ بھی میری خدمات کو اس طرح قبول کررہا تھا جیسے میں اپنا فرض ادا کررہی ہوں اس پر کوئی احسان نہیں لاد رہی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے حامد میں ایک اور تبدیلی بھی محسوس کی تھی۔ وہ خود تو دوسری عورتوں کے ساتھ بھی فلرٹ کرتا رہتا تھا لیکن اگر مجھے کسی مرد کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ جاتے۔

عراق سے طویل جنگ ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ ہم سائرنوں کے چنگھاڑنے کی آوازوں اور طیاروں کی گھن گرج کے عادی ہوچکے تھے۔ اب ہمیں شہر یا اس کے گرد ونواح میں عراقی طیاروں کی بمباری کی پروا نہیں رہی تھی' ویسے تہران کو اب عراقی طیاروں سے زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر خرم شہر' اباوان اور ان علاقوں کو نشانہ بنا رہے تھے جہاں تیل کے کنویں یا ریفائنریاں تھیں۔

میرے خیال میں ہم میں جنگ سے سب سے زیادہ متاثر فرہاد ہوا تھا۔ انقلاب کے بعد میں اسے اپنے کمرے میں سلانے لگی تھی کیونکہ سڑکوں پر چوبیس گھنٹے ہونے والی فائرنگ سے وہ دہشت زدہ سا رہتا تھا۔ بعض اوقات سوتے میں چیختا ہوا اٹھ جاتا اور اب جنگ نے اس پر دہشت سی طاری کررکھی تھی۔ رات کو کئی کئی مرتبہ سائرنوں کی آواز سے اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا' وہ اکثر چیختا ہوا اٹھ جاتا۔

"ممی... وہ ہمیں قتل کرنے آرہے ہیں... یہاں سے بھاگ چلو..."

میں نے تین مہینوں تک اسے اسکول نہیں جانے دیا اور جب وہ دوبارہ اسکول جانے لگا تو سائرن کی آواز سنتے ہی میں اسکول کی طرف بھاگ اٹھتی تاکہ خدانخواستہ کچھ ہوجائے تو میں اس کے قریب رہوں۔

میں نے کبھی کسی بات کی پروا نہیں کی تھی لیکن دو واقعات نے مجھے بڑی شدت سے احساس دلادیا کہ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔

یہ انقلاب کے نو مہینے بعد کی بات ہے۔ ایک روز دروازے پر دستک کی آواز ابھری' میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کمیٹی کے دو مسلح آدمیوں کو دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی۔ میں ان کے سامنے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ یہ گھر کس کی ملکیت ہے اور یہاں کون رہتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے اور میں اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں رہتی ہوں۔

چند اور سوالات کرنے کے بعد وہ تو واپس چلے گئے لیکن میرے دماغ میں آندھیاں سی چلتی رہیں۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے؟ یہ معمہ دو دن بعد حل ہوگیا۔ ہمارے گھر کے سامنے گیس کمپنی کا ایک ملازم رہائش پذیر تھا۔ جس سے ایک پڑوسی کی حیثیت سے میرے تعلقات خوش گوار تھے۔

"دو دن پہلے جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ ہماری گیس کمپنی میں کام کرنے والے ایک آدمی نے تمہارے خلاف کمیٹی کو رپورٹ کردی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ امام خمینی نے ہر شخص کے لئے ایک گھر کا وعدہ کیا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جبکہ بہت سے لوگ بے گھر ہیں۔ تمہیں اپنے بیٹے کے ساتھ اتنے بڑے مکان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے' وہ آدمی بہت ہی حاسدانہ فطرت کا مالک ہے۔ کمیٹی والوں نے مجھ سے اس سلسلے میں پوچھا تھا۔ میں نے انہیں اس آدمی کے خلاف خوب بھردیا۔ کمیٹی والوں نے اس شخص کو ڈانٹ دیا تھا کہ آئندہ کسی کے خلاف جھوٹی شکایت نہ کرے۔"

گیس کمپنی کے کئی ملازم ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے۔ میرا شوہر کاشان بھی ان کا خیال رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں جب بھی کوئی پارٹی ہوتی ان کے گھروں میں کھانا ضرور بھیجا جاتا اس کے علاوہ وہ ان لوگوں کی تھوڑی بہت مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ کاشان کے انتقال کے بعد میں نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا تھا۔ یہ میرا اچھا طرزِ عمل تھا کہ میں ایک بڑی مصیبت سے بچ گئی تھی۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا جس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میں کمیٹی کے ممبروں کی نظر میں آچکی تھی۔

اس رات میرے گھر میں ایک چھوٹی سی پارٹی تھی۔ کھانا تیار ہوچکا تھا۔ میرے مہمان ہاتھوں میں شراب کے گلاس لئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ جیسے ہی کھانے کی میز پر پہنچے میرا بیٹا فرہاد دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ اس وقت پائیں باغ میں کھیل رہا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

"ممی!" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "دو فوجی گیٹ میں داخل ہوکر اندر آرہے ہیں۔"

یہ اطلاع ہمارے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی

میرے مہمان نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گلاسوں کی شراب کچن کے سنک میں بہادی اور وہسکی اور واڈکا کی بوتلیں اٹھاکر مختلف کمروں کی طرف دوڑ پڑے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی اندر قیمتی شراب باتھ روم کے اندر بہادی گئی' فوجیوں کے خوف سے ایک مہمان عورت بے ہوش ہوگئی جبکہ دوسری کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ دہشت سے سب کے چہرے دھواں ہو رہے تھے' اس پارٹی کے لئے میں نے چند ملازم باہر سے بلوائے تھے۔ ہمیں خوف اور دہشت میں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں سرخوشی کی چمک ابھر آئی تھی۔ بالآخر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی (بیرونی گیٹ خاصا دور تھا اور انہیں مکان کے دروازے تک پہنچنے میں دو تین منٹ لگ گئے تھے) دروازہ کھولا تو انکشاف ہوا کہ وہ کمیٹی کے آدمی نہیں پولیس والے تھے' امام خمینی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد پولیس کے نہ صرف تمام اختیارات چھین لئے گئے تھے بلکہ ان کی تنخواہوں میں بھی کمی کردی گئی تھی۔ اب پولیس والوں کا کام صرف ٹریفک کے چالان کرنا رہ گیا تھا' پولیس کے بہت سے ملازم اب گھروں اور گاڑیوں کی رکھوالی کرکے اپنی آمدنی کا ذریعہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔

"خانم!" ان میں سے ایک نے مجھے نرم لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہم صرف یہ بتانے آئے ہیں کہ آپ کے مہمانوں میں سے کسی نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا' میں نے کچھ رقم انعام کے طور پر اس کے ہاتھ میں تھمادی (ظاہر ہے وہ اس امید پر آئے تھے)

"ایک بات اور خانم!" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "کمیٹی والے کچھ عرصے سے آپ کے اس مکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اس عمارت کو اپنا علاقائی ہیڈ کوارٹر بنانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔ جب میں اندر آئی تو میرے مہمان اسی طرح خوف و دہشت کی تصویر بنے بیٹھے تھے' اس واقعے کے بعد کسی کا کھانے پینے کو دل نہیں چاہا تھا۔ پارٹی برباد ہو کر رہ گئی تھی' یہ اگرچہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی لیکن اس سے مجھے احساس ہوگیا تھا کہ آئندہ مجھے محتاط رہنا ہوگا۔ میری یہ چھوٹی سی جنت بھی اب میرے لئے محفوظ نہیں رہی تھی' میرے خیال میں حامد واقعی عقلمند تھا جس نے میرے گھر آمد و رفت بہت کم کردی تھی' میں سوچ رہی تھی کہ کاش! میں بھی اس کی طرح احتیاط پسند ہوتی۔

۱۹۸۱ء کے وسط تک یہ احساس شدت اختیار کرگیا تھا کہ میں اب زیادہ عرصے تک تہران میں نہیں رہ سکتی تھی' بالآخر میں نے ماں کی آغوش کی طرح محبت سے بھرپور اپنا یہ وطن چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور یہاں سے نکلنے کی تیاریاں کرنے لگی

میری ممانی گیتی پہلے ہی ایران چھوڑ کر جاچکی تھی' کچھ عرصے پہلے یہ نیا قانون نافذ کیا گیا تھا کہ جن لوگوں کے اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچے بیرونی ملک میں زیر تعلیم ہیں وہ ان سے ملنے کے لئے جاسکتے ہیں لیکن اس میں بھی یہ شرط رکھی گئی تھی کہ میاں بیوی میں سے صرف ایک فرد جاسکتا تھا جبکہ دوسرے کو یرغمال کے طور پر ایران ہی میں رہنا ہوگا لیکن یہ قانون بھی فوراً ہی منسوخ کردیا گیا تھا کیونکہ اس طرح بہت سے لوگ باہر جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

گیتی کی دو بیٹیاں نیویارک میں زیر تعلیم تھیں۔ قانون کی منسوخی سے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بھی ایران سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ جب میرا ماموں اردشیر ترکی کے راستے غیر قانونی طور پر فرار ہوا تھا' ایران چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اپنا ریسٹورنٹ ولا۔ ریزرو' گیتی کے ایک رشتے دار کو اونے پونے میں فروخت کردیا تھا' گیتی کا سپہری خاندان خاصا بڑا تھا اور مذہبی رہنماؤں سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے اور اس لئے وہ اب تک ہر قسم کے دباؤ سے بچے ہوئے تھے۔

اردشیر اور گیتی نے لا۔ ریزرو ریسٹورنٹ ۱۹۷۵ء میں کھولا تھا۔ اس وقت شراب پر پابندی نہیں تھی' یہ ریسٹورنٹ بہت کامیاب بزنس دے رہا تھا' لیکن انقلاب کے بعد جب شراب پر پابندی لگادی گئی تو کمیٹی کے شکاری وقتاً فوقتاً ریسٹورنٹ پر چھاپے مارنے لگے کیونکہ ان کے خیال میں یہاں گاہکوں کو غیر قانونی طور پر شراب مہیا کی جاتی ہے۔ کمیٹی کے ان چھاپوں کی وجہ سے ریسٹورنٹ کا کاروبار ٹھپ ہوگیا' بعد میں جب غیر قانونی طور پر شراب بننے لگی تو بہت سے گاہک اپنے ساتھ شراب لے آتے۔ ایسے گاہکوں کو ریسٹورنٹ کی طرف سے گہری رنگت والے گلاس فراہم کئے جاتے تھے تاکہ شراب نظر نہ آسکے' چند مہینوں بعد کمیٹی نے ایک بار پھر ریسٹورنٹ پر چھاپہ مارا اور ہزاروں مالیت کا پورک (سؤر کا منجمد گوشت) اور سی فوڈ ضائع کردیا کیونکہ ان چیزوں کی خرید و فروخت اور استعمال بھی جرم قرار دے دیا گیا تھا۔

جب میں ایران سے فرار ہوئی تو اس وقت بہت سے لوگوں نے ہوٹلوں اور ریستوران میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ شہر میں زیادہ تر کرفیو نافذ رہتا تھا اور پھر کمیٹی کے شکاری ہر وقت سڑکوں پر دندناتے پھرتے تھے جو کسی بھی راہگیر کو کسی بھی وجہ کے بغیر گرفتار کرسکتے تھے۔ دوسرے ریستورانوں کی طرح لا۔ ریزرو میں بھی صرف دوپہر کے

کھانے کے وقت کچھ رونق رہتی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر ماموں اردو شیر اور گیتی ریسٹورنٹ کو اونے پونے میں فروخت کر کے چلے گئے تھے۔

اردو شیر اور گیتی کے جانے کے بعد میں نے اپنے بیٹے فرہاد کے گارجینز پر یہ دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ فرہاد کا کچھ سرمایہ باہر منتقل کرنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ اگر ہمیں اچانک ایران سے جانا پڑے تو پیسوں کے معاملے میں کوئی پریشانی نہ ہو

میرے ماموں اس سلسلے میں فرہاد کے گارجینز سے مسلسل میٹنگز کررہے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھے مکان فراخت کرنے کی اجازت دیدی' اس وقت تک ڈالر کے مقابلے میں تمن کی قیمت بہت زیادہ گرچکی تھی جس سے فرہاد کے سرمائے کی ویلیو بھی کم ہوتی جارہی تھی' میرے شوہر کا ایک بزنس پارٹنر جمشید بلیک مارکیٹ سے سوئس اکاؤنٹ میں ستر ہزار ڈالر منتقل کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن یہ رقم مجھے کبھی نہیں مل سکی۔

بہت عرصے بعد جمشید نے مجھے بتایا کہ میرے ایران سے نکلنے کے بعد کمیٹی نے فرہاد کے سرمائے کی چھان بین کی تھی اور کمی پوری کرنے کے لئے ستر ہزار ڈالر کی وہ رقم اسے اپنی جیب سے فرہاد کے اکاؤنٹ میں جمع کروانی پڑی تھی۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ یہ سب جھوٹ تھا' جمشید یہ خطیر رقم ہضم کرگیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں بہت عرصے سے اپنے شوہر کاشان کے بزنس پارٹنر جمشید اور اپنے سسرالی رشتے داروں کی شاطرانہ چالوں کی شکار ہورہی تھی' کاشان نے فرہاد کے لئے جو کثیر زر نقد چھوڑا تھا اسے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ہتھیا رہے تھے۔ اس فریب کاری میں فرہاد کے چچا علی کا زیادہ ہاتھ تھا' میرے منع کرنے کے باوجود اس نے فرہاد کے اکاؤنٹ سے ایک بہت بڑی رقم اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں لگائی تھی' ان دنوں کسی بھی کاروبار میں سرمایہ لگانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ خصوصاً کنسٹرکشن کمپنی تو بری طرح تباہ ہورہی تھیں' بالفرض اگر علی کی کمپنی کسی طرح سنبھل بھی جاتی تو فرہاد کو منافع میں سے ایک بھی تمن نہیں مل سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ کی اس کمپنی کا شیئر ہولڈر نہیں تھا' کمپنی کے تمام شیئر تو کاشان کی وصیت کے مطابق اس کے بہن بھائیوں میں تقسیم ہوچکے تھے اور اب وہ اس کمپنی کو تباہی سے بچانے کے لئے فرہاد کا سرمایہ استعمال کررہے تھے اور میں کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ کاشان نے مرتے وقت اپنی وصیت کے ذریعے میرے تمام حقوق چھین لئے تھے' اس نے اپنے بیٹے کا مستقبل بھی اس کی ماں کے بجائے دوسروں کو سونپ دیا تھا۔

جمشید اور علی مجھ سے ایک ایسی دستاویز پر بھی دستخط کروانا چاہتے تھے جس میں گھر کی تمام چیزوں کی فہرست اور ان کی قیمت لکھی ہوئی تھی... اگرچہ قانون نے گارجینز کی حیثیت سے انہیں یہ حق دیا تھا لیکن اس بات کو اب تین سال گزر چکے تھے' وہ لوگ میری طرف سے یہ ضمانت چاہتے تھے کہ گھر کی کوئی چیز بیچی نہیں جائے گی اور فہرست کے مطابق کسی بھی چیز کی کمی کی صورت میں اس کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی' کاشان کی وصیت میں بھی یہ وضاحت کردی گئی تھی کہ میں اگر شادی نہ کروں تو اس گھر میں رہ سکتی تھی اور چیزیں استعمال کرسکتی تھی لیکن کسی چیز کو فروخت کرنے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

قانونی طور پر یہ فہرست تین سال پہلے کاشان کی موت کے بعد مخصوص مدت میں تیار ہوجانی چاہئے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور قانون کے مطابق فہرست تیار نہ کرسکنے کی صورت میں وہ لوگ جنہیں گارجین مقرر کیا گیا تھا اپنے اس حق سے محروم ہوسکتے تھے اور گارجین شپ ختم ہونے کے ساتھ ہی رقم پر بھی ان کا کنٹرول ختم ہوجاتا۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد فیملی والے مجھ سے اس فہرست پر دستخط کیوں کرانا چاہتے تھے وہ تو بہت عرصہ پہلے ہی اس گھر کی بہت سی قیمتی چیزیں لے جا چکے تھے' اگر اب میں اس فہرست پر دستخط کردیتی تو نہ صرف یہ کہ فرہاد کی سرپرستی کے سلسلے میں قانونی حق برقرار رہتا بلکہ ان کی چوریوں کی بھی پردہ پوشی ہوجاتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے شوہر کی موت کے بعد میں اور ممانی گیتی میرے کمرے میں بیٹھی تھیں کہ علی دندناتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور کچھ کہے بغیر اسٹیریو نکال کرلے گیا۔ اس نے اس سلسلے میں نہ تو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی کوئی وضاحت کی تھی' میرا خیال ہے کہ وہ اس گھر کی ہر چیز پر اپنا حق سمجھتا تھا' میں اور گیتی خاموش بیٹھی یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جو کچھ ہورہا تھا وہ ہم دونوں کے لئے ناقابل یقین سا تھا بعد میں وہ اسٹیریو میں نے علی کے گھر میں رکھا ہوا دیکھا تھا لیکن اس کی بیوی کا اصرار تھا کہ یہ اسٹیریو انہوں نے بازار سے خریدا تھا۔

کاشان کی موت کے بعد گھر کی اور بھی بہت سی چیزیں غائب ہوگئی تھیں۔ کاشان کے سونے' پلاٹینم اور ہیرے جڑے ہوئے کئی سگریٹ لائیٹر' چھ نکون کیمرے جن کے ساتھ ہزاروں ڈالر مالیت کے مختلف لینسز بھی تھے' ہیروں کے لاتعداد کف لنکس اور ایسی بہت سی دوسری چیزیں غائب کردی گئی تھیں اور ظاہر ہے یہ میرے سسرالیوں کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہوسکتا تھا۔

اگر شروع میں فہرست بن جاتی تو تمام چیزوں کی ذمے داری

ایک زمانے میں بینکوں میں یہ طمطراق نہ تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض بینکوں میں تو ویسا ہی فرنیچر ہوتا تھا جیسا چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں اور قصباتی پوسٹ آفسوں میں، جہاں کرسی کی بید کی بنائی ادھڑنے کے بعد اس میں فارغ التحصیل صاحبزادے کی تختی جڑ دی جاتی ہے اور ریٹائر ہونے سے پہلے ہر بابو چاقو سے اپنا نام میز پر کندہ کر جاتا ہے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔ میز کرسیوں کی ٹانگوں میز، ابھی پولیو نہیں ہوا تھا اور بینکوں میں کیکڑے جیسی ٹانگوں والے مڑے تڑے فرنیچر نے "پیڈ فرنیچر" کا روپ دھارنے کا رواج نہیں پایا تھا۔ باتھ روم کی دیواروں پر بھی پنسل سے جو باتصویر عبارتیں تحریر ہوتی تھیں ان کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ نسل کشی کے گھوڑے اگر اپنی خواہشات قلم بند کرنے پر قادر ہوتے تو یہی کچھ رقم کرتے۔ صورتِ حال اب بحمد اللہ روبہ اصلاح ہے۔ غسل خانوں میں اب فحش اور ناشائستہ فقرے بالکل نظر نہیں آتے۔ باتھ روم ٹائلز اتنی چکنی اور گلیزڈ ہوتی ہیں کہ ان پر پنسل سے کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔

☆○☆ مشتاق احمد یوسفی کی "زرگزشت" سے ☆○☆

مجھ پر عائد ہو سکتی تھی اور میرے سسرال والے اب بھی ان چیزوں کا الزام مجھ پر لگا رہے تھے۔ میرے پاس اپنے دفاع کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا کہ اب میں اس فہرست پر دستخط نہ کروں اور میں ان کے شدید دباؤ کے باوجود دستخط کرنے سے انکار کرتی رہی۔

وہ لوگ فرہاد کو ملک سے باہر لے جانے کی میری تجویز کی بھی شدید مخالفت کر رہے تھے، مجھے ان سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے رقم ملک سے باہر اسمگل کرنے کے لئے اپنے ذرائع تلاش کرنا شروع کر دیے، میری ایک دوست اینا کا شوہر پال تہران میں ایک مغربی ملک کے سفارت خانے سے وابستہ تھا۔ شروع میں تو وہ میرے لئے رقم اور جیولری ملک سے باہر اسمگل کرنے کے لئے اپنا سفارتی اسٹیٹس استعمال کرتا رہا پھر اس نے میری ملاقات ایک پیشہ ور اسمگلر سے کروادی۔ وہ اطالوی تھا جو قالین اسمگل کر کے یورپ کے کسی بھی ملک میں پہنچا سکتا تھا جنہیں بعد میں فروخت کر کے رقم کھری کی جاسکتی تھی۔

ایک رات میں نے اینا، پال اور اس اطالوی اسمگلر کو کھانے پر مدعو کر لیا۔ دراصل میں اپنے ماحول میں رہتے ہوئے اس شخص کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتی تھی، مجھے یقین ہے کہ بیرون ملک مالی مسائل کے حل کے سلسلے میں قالینوں کی اسمگلنگ کا مشورہ میرے خاندان کا کوئی فرد نہیں دے سکتا تھا۔ امام خمینی کی حکومت میں ملک سے کرنسی، جیولری، قالین، قدیم سکوں یا کسی بھی قیمتی چیز کی اسمگلنگ سنگین جرم تھا اور اس کی کم سے کم سزا موت تھی، ایرانیوں کے لئے غیر ملکی بینکوں سے لین دین پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی اور ملک سے باہر جانے والی ڈاک بھی باقاعدگی سے چیک کی جاتی تھی تاکہ غیر ملکی بینکوں کے پے آرڈر یا ڈرافٹ وغیرہ باہر نہ بھجوائے جاسکیں، یہ قانون ہم جیسے طاغوتی لوگوں (شیطان کے چیلے) سے نمٹنے کے لئے نافذ کیے گئے تھے، قالینوں کی اسمگلنگ کا فیصلہ کر کے میں چونکہ اپنی زندگی داؤ پر لگا رہی تھی اس لئے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں اس شخص کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی۔

وہ اطالوی اسمگلر ادھیڑ عمر اور پُر وقار شخصیت کا مالک تھا، میں نے چند ہی باتوں میں یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، اس نے بلا تکلف اپنی شرائط سے آگاہ کر دیا۔

"میرے ٹریلر ٹرک میں ایک خفیہ خانہ بنا ہوا ہے، میں اسمگلنگ کا مال اس میں چھپا کر لے جاتا ہوں۔" میں اگرچہ تہران اور اٹلی کے درمیان لاتعداد چکر لگا چکا ہوں لیکن کسٹمز یا کسی اور ایجنسی کے آدمی آج تک اس ٹرک میں اس خفیہ خانے کا سراغ نہیں لگا سکے۔ بعض اوقات تو رشوت دے کر کسی چیکنگ کے بغیر سرحد عبور کر جاتا ہوں، لیکن اس کے باوجود خطرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا اگر تم میرے ذریعے قالین بھجوانا چاہتی ہو تو اس کے لئے تمہیں ساڑھے سات سو سوئس فرانکس فی قالین ادائیگی کرنا ہوگی۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں وہ قالین اٹلی نہیں کسی اور یورپی ملک بھجوانا چاہتی ہوں جہاں میرا کزن دارا انہیں وصول کرے گا۔ اس ملک کا نام سن کر اس کے منہ سے بے اختیار سیٹی کی آواز نکل گئی۔

"یہ بڑا مشکل کام ہوگا، اس ملک کی سرحد دنیا کی ٹائٹ ترین سرحد ہے۔ ہم یہ کام کر تو سکتے ہیں لیکن اس میں بڑا رسک ہوگا۔ ہمارا طریقہ کار یہ ہوگا کہ قالین ایک دین کے ذریعے سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا دیے جائیں گے۔ وہاں سے قالین سروں پر لاد کر رات کی تاریکی میں سرحد پار کر کے ایک مخصوص جگہ پہنچ جائیں گے وین قانونی طور پر سرحدی چوکی سے ہوتی ہوئی اس جگہ پہنچ جائے گی، اور قالین اس میں لاد دیے جائیں گے۔ تمہارے

کزن کو ٹیلی فون کے ذریعے آگاہ کردیا جائے گا کہ قالینوں کی ڈلیوری کب اور کہاں ملے گی لیکن ایک بات پہلے ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس پروگرام میں اچانک کوئی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اگر پولیس یا متعلقہ اداروں کو بھنک بھی مل گئی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے اسمگلنگ اس کے لئے کوئی معمولی بات ہو' بہرحال وہ شخص مجھے پسند آیا تھا اور میں اس پر اعتماد کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔

اسمگلنگ کے سلسلے میں ایک قابل اعتماد رابطہ قائم ہوتے ہی میں نے قیمتی قالین جمع کرنے شروع کر دیئے' قالینوں کی تلاش کے چکر میں میں' ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئی تھی جو تھی تو ایران ہی کا ایک حصہ مگر میرے لئے قطعی اجنبی تھی' قالین ایران کی قدیم تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ بیرونی دنیا میں یہی خوبصورت قالین ہماری فنی مہارت اور محبت کا مظہر سمجھے جاتے ہیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے چادر اوڑھی اور ایک ٹیکسی پر اچھے قالینوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اپنی کار میں نے اس لئے استعمال نہیں کی تھی کہ اس کے ذریعے میرا سراغ لگایا جاسکتا تھا' تقریباً چھ کلو میٹر کے علاقے میں تنگ سی گلیوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ گلیوں میں دونوں طرف ٹین کی چھتوں والی لاتعداد چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں' تنگ اور بل کھاتی ہوئی گلیوں پر مشتمل یہ بازار شہر کے وسط میں تھا' اور یہی تہران میں سب سے بڑا کاروباری مرکز بھی سمجھا جاتا تھا۔

تاجروں نے ایران کی سیاست اور معیشت میں ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے' چھوٹی چھوٹی دڑبہ نما تنگ سی دکانوں میں بیٹھے ہوئے مالکان بلاشبہ کروڑ پتی لوگ تھے' بعض کے مکانات اس قدر عالیشان تھے کہ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا' ان بازاریوں (دکانداروں) کی اکثریت کا تعلق مذہبی گھرانوں سے تھا' یہ لوگ بینکنگ کا غیر قانونی کاروبار بھی وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور اس کے لئے کسی قسم کی دستاویزات کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کروڑوں کا بزنس محض زبانی طور پر ہی طے ہو جاتا تھا' یہاں آنے کے لئے میرے چادر اوڑھنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ میں اپنے آپ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایسی جگہوں پر آنے جانے کے لئے عورتوں کا چادر میں لپٹے ہونا ضروری تھا۔

میں... بڑھیا قالینوں کے انتخاب کے سلسلے میں کئی روز تک بازار میں گھومتی رہی' دکانوں پر تبریز' اصفہانی' بلوچستانی' کاشانی قالینوں کی بھرمار تھی۔ ان میں قم کے سلکی قالین بھی تھے' ان قالینوں کو دیکھ کر بے اختیار انہیں خریدنے کا دل چاہتا تھا۔ میں کبھی شاپنگ کے لئے بازار نہیں گئی تھی لیکن اب روزانہ ہی ان بازاروں کی خاک چھانتی ہوئی نظر آنے لگی تھی' ان تنگ سے بازاروں میں صبح سے شام تک ایک عجیب افراتفری کا سماں رہتا تھا۔ دکانداروں اور گاہکوں کی تکرار کرتی ہوئی اونچی آوازیں' ہاکروں کا شور' گدھا گاڑیوں کی یلغار اور چاروں طرف سے اٹھنے والی ہا ہو کی آوازوں سے سر دکھنے لگتا تھا۔

میں نے قالین خریدنے کے لئے ہر وہ چیز فروخت کر دی جس سے تھوڑی بہت رقم مل سکتی تھی' میں نے اپنی اور اپنی والدہ کی شادی کی انگوٹھیاں بھی اسی ہزار ڈالر میں فروخت کر دیں۔ اس کے علاوہ وہ فرنیچر جو میں نے دو امریکیوں سے اونے پونے داموں میں خریدا تھا' اپنے برتن اور ہر وہ چیز بیچ ڈالی جو قانونی طور پر میری ملکیت تھی اور میرے مرحوم شوہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا' میں اپنے شوہر کی کوئی چیز فروخت کر کے اپنے سسرال والوں کو اپنے خلاف کسی کارروائی کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس طرح میں نے تقریباً چار لاکھ ڈالر مالیت کے قالین اسمگل کروائے جو بحفاظت میرے کزن دارا تک پہنچ گئے۔ قالینوں کی اسمگلنگ کی اس کارروائی میں میرے لئے قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ جب بھی نئی کھیپ بھیجنی ہوتی' میں اطالوی اسمگلر کو اطلاع دے دیتی' تین آدمی میرے گھر پر پہنچ جاتے۔ وہ ہر قالین کو الگ الگ بینٹ کر پلاسٹک میں پیک کر کے باہر کھڑی ہوئی پیکان میں پہنچا دیتے۔ وہ کوئی بڑی گاڑی استعمال کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ بڑی گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی رہتی تھی جبکہ پیکان کو متوسط طبقے کی سواری سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن وہ جب تک موجود رہتے میری جان سولی پر ٹنگی رہتی۔ خطرہ ان کے جانے کے بعد بھی موجود رہتا' اگر وہ میرے گھر میں یا باہر کہیں بھی پکڑے جاتے تو انہیں تو جیل بھیج دیا جاتا لیکن مجھے فوراً ہی فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جاتا۔

میں نے اپنے شوہر کے بزنس پارٹنر جمشید سے کچھ ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ایک اہم قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا' جمشید بھی ان دنوں اپنی بعض قیمتی اشیاء ملک سے باہر اسمگل کرنے کے لئے ذرائع تلاش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بھی اپنے قالینوں کی اسمگلنگ کے منصوبے سے آگاہ کر دیا اور کہا کہ اگر وہ بھی قالین اسمگل کرنا چاہتا ہے تو انہیں میرے گھر پہنچا دے' تاکہ اگلی شپمنٹ میں بھیج دیئے جائیں۔ جمشید نے اگرچہ میرے ساتھ بہت سی زیادتیاں کی تھیں لیکن میں اس کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا رہی تھی' وہ تقریباً دو ملین ڈالر مالیت کے قالین باہر بھیجنا چاہتا تھا۔

اچھے قالینوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ میں اپنا مکان فروخت کرنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ میں اچھی طرح

جانتی ہوں کہ میرے سسرال والوں نے مجھے مکان بیچنے کی اجازت محض اس لئے دے دی تھی کہ وہ فرہاد کے دوسرے سرمائے پر قابض ہو سکیں۔ میں مکان کے لئے گاہک تلاش کرتی رہی' اس دوران مجھے یہ تجربہ بھی ہو گیا کہ لوگ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں کو کس طرح لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاشان کی زندگی میں اس مکان اور اس سے ملحق باغ کے لئے سات ملین ڈالر کی آفر مل چکی تھی لیکن انقلاب کے بعد جائیدادوں کی قیمتیں خوفناک حد تک گر چکی تھیں۔ میں اس عالیشان مکان اور اس سے ملحق زمین کے لئے صرف دو ملین ڈالر کا مطالبہ کر رہی تھی۔ کئی گاہک ملے تھے' انہیں مکان پسند بھی آیا تھا اور ان کی باتوں سے لگتا تھا جیسے وہ شام سے پہلے پہلے سودا کر لیں گے لیکن کسی سے معاملہ طے نہیں ہو سکا تھا' جو لوگ مکان دیکھنے آئے تھا ان کا تعلق میری طرح امراء سے نہیں تھا۔ مکان دیکھنے کے لئے گھر کا کوئی ایک فرد نہیں' پورا خاندان چلا آیا تھا۔ سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں' شور مچاتے ہوئے بچے اور مجھے اونے پونے مکان بیچنے کے لئے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مرد۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس انقلاب کے بعد بعض پُراسرار ذرائع سے نئی نئی دولت آئی تھی۔ یہ لوگ میرے گھر کا قیمتی فرنیچر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیٹنگ اور ایئر کنڈیشنگ کا کمبائنڈ سسٹم دیکھ کر تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ پورے ملک میں یہ واحد عمارت تھی جہاں مکان کو گرم اور ٹھنڈا رکھنے کے لئے یہ جدید ترین سسٹم نصب تھا' ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوتی تھی کہ انقلاب کے بعد یہ لوگ یکایک اتنے دولت مند کیسے ہو گئے تھے اور شمران جیسی اونچی سوسائٹی کے علاقے میں اپنے آپ کو کیسے ایڈجسٹ کر سکیں گے۔

ادھر میں قالین جمع کرنے اور مکان فروخت کرنے کی مہم میں مصروف تھی اور دوسری طرف حامد ملک چھوڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا' لیکن وہ میری وجہ سے کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

"خدا کے لئے تم جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤ۔" میں نے حامد سے کہا' صوفی کے بعد وہ دوسرا شخص تھا جسے میں انقلابی بھیڑیوں سے بچانا چاہتی تھی "خدا کے لئے چلے جاؤ۔ وہ کسی بھی وقت تم تک پہنچ سکتے ہیں۔"

حامد کئی مہینوں سے اپنے دوستوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی کبھار اپنی ضرورت کی چیز لینے کے لئے اپنے گھر چلا جاتا لیکن کمپنی والے مسلسل اس کی تلاش میں تھے' اس کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہو چکے تھے۔ اس کی کمپنی اس کے ماتحتوں کے قبضے میں تھی اور اسے اپنی کمپنی اور جائداد کی واپسی کی کوئی امید نہیں رہی تھی' جب میں نے حامد کو اپنے قالینوں کی اسمگلنگ کے بارے میں بتایا تو وہ بڑا حیران ہوا تھا۔

"تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "تم جانتی ہو اسمگلنگ کی سزا موت ہے' اگر پکڑی گئیں تو تمہیں کسی صورت بھی معاف نہیں کریں گے۔"

لیکن میں نے یہ کارنامہ کر دکھایا تھا' لیکن مجھے افسوس بھی تھا' مجھے ایران میں رہتے ہوئے حامد کی جو محبت حاصل تھی اس کا میں ایران سے باہر رہتے ہوئے تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' اور حامد کو بھی شاید اس صورت حال کا احساس تھا۔

"یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" ایک رات اس نے کہا تھا "ایران سے نکلنے کے بعد ہمیں یہ سب کچھ کہاں ملے گا' میں تمہاری محبت کو کہاں تلاش کروں گا۔"

بالآخر حامد کی تیاری مکمل ہوئی اور دسمبر ۱۹۸۱ء کی ایک برفانی رات میں وہ ترکی کے راستے ایران سے فرار ہو گیا' اسے یقین تھا کہ اب وہ دوبارہ ایران کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکے گا' تقریباً دس دن بعد اس نے استنبول سے فون پر بتایا کہ وہ خیریت

پچھلی صدی کے اخبار بے شک اردو میں نہیں اردوئے معلّٰی میں ہوتے تھے۔ نئے زمانے کی آپادھاپی نے زبان کا لطف غارت کر دیا ہے۔ پرانے دفتروں کا ماحول بھی بہت پُرسکون ہوتا تھا۔ کاتب بیٹھا لکھ رہا ہے۔ ایڈیٹر کو آواز دی "حضور' پاؤ کالم رہ گیا ہے' اس کے لئے میٹر دے دیجئے۔"

ایڈیٹر پکارتا ہے "لکھو آج چوک میں دو تانگوں کی ٹکر ہو گئی' تین آدمی زخمی ہو گئے' ایک کی حالت خراب ہے' آگے خود بڑھا لو۔"

تھوڑی دیر بعد کاتب پھر پکارتا ہے "حضور دو تین سطریں پھر بھی خالی بچتی ہیں۔"

ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "اچھا' ان میں خبر کی تردید دے دو کہ ہم نے تحقیق کی' یہ خبر سراسر غلط ثابت ہوئی۔"

ابن انشاء کے ایک کالم سے اقتباس

سے پہنچ گیا ہے' اس نے بتایا کہ اس کا یہ سفر بہت کٹھن ثابت ہوا تھا لیکن اس نے تفصیل نہیں بتائی تھی اور اس وقت مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ چند مہینوں بعد مجھے بھی اس کٹھن راستے پر چلنا ہو گا۔

حامد کے جانے کے بعد میں نے بھی سنجیدگی سے فرار کی راہیں تلاش کرنا شروع کردیں ۔ میں نے اپنے دوستوں کو بتادیا تھا کہ میں رقم اور کچھ قیمتی چیزیں ملک سے باہر بھجوانا چاہتی ہوں ' میرے پاس کچھ ایسی چیزیں اب بھی موجود تھیں جنہیں میں بیچ سکتی تھی ۔ میرے ایک دوست نے چند ایسے دوستوں کا پتا بتادیا جو ملک سے فرار ہونا چاہتے تھے اور اپنی چیزیں فروخت کرکے ایران کے تاریخی ڈاک ٹکٹوں کی صورت میں محفوظ کررہے تھے ۔ ڈاک ٹکٹیں چھپا کرلے جانا قدرے آسان تھا اور یورپی ممالک میں ان کی اچھی قیمت مل سکتی تھی۔

اس چکر میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو بعد میں میرا دوسرا شوہر بنا اور ایران سے فرار میں بھی اس سے بڑی مدد ملی تھی' کمال سے میری پہلی ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی جہاں وہ ایک عورت اور ایک مرد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' کمال کے چہرے کے نقوش بھی واجبی سے تھے ۔ مجھے اس وقت اس میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی تھی کیونکہ اس وقت میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان لوگوں سے کاروباری باتیں کرنے آئی تھی کیونکہ ان کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ ایران سے فرار میں میری مدد کرسکتے تھے ۔

حامد جاچکا تھا' میں ایک بار پھر اکیلی رہ گئی تھی ۔ مجھے دل بہلانے کے لئے ایک سہارے کی بھی ضرورت تھی ۔ کمال نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میری محبت میں گرفتار ہوگیا تھا' اس ملاقات میں موجود دوسرے لوگ فرار کے سلسلے میں گفتگو کرتے رہے تھے جبکہ کمال کی تمام تر توجہ مجھ پر مرکوز رہی تھی ۔ ایک موقع پر اس نے کہا تھا ۔

"اگر تم ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمارے ساتھ فرار ہونے کے لئے بروقت تیار نہیں ہوسکتیں تو ہم تمہاری وجہ سے اپنا پروگرام تبدیل بھی کرسکتے ہیں ۔"

اور میرا خیال ہے اس نے غلط نہیں کہا تھا ۔ ہماری ملاقات کو اگرچہ چند منٹ ہی ہوئے تھے لیکن وہ میری وجہ سے اپنی زندگی کے راستے تبدیل کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔

میں ان لوگوں کو اپنے گھر لے آئی تاکہ ہم تفصیل سے گفتگو کرسکیں' دوسرا آدمی کمال کا کزن تھا جو نوادرات کا ماہر سمجھا جاتا تھا ۔ میرے پاس ایک قدیم پینٹنگ تھی اور میں اس کی قیمت کا اندازہ بھی لگوانا چاہتی تھی' وہ تقریباً ایک گھنٹا میرے ہاں رہے تھے اور اس دوران کمال مجھے اس رات ایک پارٹی میں اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کرتا رہا تھا' اس نے میرا کوئی بھی عذر قبول کرنے سے انکار کردیا تھا ۔ بالآخر میں نے اور میری دوست نے اس کے گھر کھانا کھانے کی دعوت قبول کرلی ۔

دوسرے دن ہم سلطنت آباد میں واقع کمال کے گھر پہنچ گئیں' مکان خاصا وسیع وعریض اور خوبصورت تھا ۔ مکان کے کمرے ایسی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کا شمار قدیم نوادرات میں کیا جاسکتا تھا ۔ کمال کا باپ ایک کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا لیکن کچھ عرصے پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا تھا اور کمال جائداد اور کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے تہران ہی میں رہ گیا تھا' خود کمال وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا لیکن انقلاب کے بعد نئے وزیر خارجہ نے دفتر میں اعلان کردیا تھا کہ کسی طاغوتی کی اب اس محکمے میں کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اس سے پہلے کہ کمال مختلف ہتھکنڈوں سے پریشان کیا جاتا' اس نے خود ہی ملازمت چھوڑ دی تھی ۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا' اس کا باپ پیرس میں بیٹھا اسے کاروباری سلسلے میں ہدایات دیتا رہتا تھا ۔

مجھ سے ملاقات سے چند مہینے پہلے کمال شیراز میں ہسپتال کے ایک زیر تعمیر پروجیکٹ کا معائنہ کرنے کے لئے گیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا ۔ دوسری بہت سی کمپنیوں کی طرح اس کی کنسٹرکشن کمپنی بھی قرضوں کے بھاری بوجھ تلے دب چکی تھی اور قرضوں کی ادائیگی کا کوئی وسیلہ نہیں رہا تھا' حکومت نے بھی زیر تعمیر سرمایہ کاری کے منصوبوں کے بلوں کی ادائیگی سے انکار کردیا تھا' حکومت کا کہنا تھا کہ ملک اتنے بڑے اسپتال کی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اور یہ کہ کمپنی پہلے ہی جعلی بلوں کے ذریعے حکومت سے لمبی رقمیں ہتھیا چکی تھی ۔

دو مہینے جیل میں گزارنے کے بعد ایک مقامی آیت اللہ کی مدد سے کمال کو رہائی مل گئی ۔ اس آیت اللہ نے کمال کو ان الزامات سے بری قرار دیتے ہوئے ایک کلیرنس سرٹیفکیٹ بھی دیدیا تھا ۔ کمال اس سرٹیفکیٹ کو تعویز کی طرح بروقت اپنے پاس رکھتا تھا کیونکہ کوئی بھروسا نہیں تھا کہ انہی الزامات کے تحت اسے کب دوبارہ گرفتار کرلیا جائے ۔

کمال مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا' کبھی وہ پھولوں کے گلدستے بھجوادیتا' کبھی دن میں کئی کئی مرتبہ فون کرکے میری خیریت معلوم کرتا اور کبھی پارٹیوں پر چلنے کے لئے مجبور کرتا' بالآخر ایک دن میں نے اسے چائے پر بلانے کا فیصلہ کرلیا' اس نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دل کی بات کہہ ڈالی ۔

"اب میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے سوسن! اور تم وہ لڑکی ہو جس کی مجھے تلاش تھی ۔"

اس میں شبہ نہیں کہ کمال مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔

لیکن ملک کی موجودہ صورت حال نے مجھے بدل کر رکھا تھا۔ میں اب تک کئی مردوں کا کھلونا بنی رہی تھی' اگرچہ میں خود بھی مردوں کی تلاش میں رہتی تھی لیکن اب تک یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ میں ان سے کیا چاہتی تھی۔ کمال بھی وقتاً فوقتاً شادی کی تجاویز پیش کرتا رہتا تھا لیکن میں نے نہ تو اقرار کیا تھا اور نہ ہی کبھی اسے مایوس کیا تھا۔ انکار نہ کرنے کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ کم از کم ایک ایسا آدمی تو سامنے آیا تھا جو بدترین حالات میں مجھے تحفظ فراہم کرنے کو تیار تھا لیکن میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہتی تھی' حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی' مجھے تو ملک سے فرار کے لئے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔

فروری ۱۹۸۲ء میں یہ احساس اور بھی شدّت اختیار کر گیا تھا کہ اب مجھے جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اسکولوں کے نئے نظام سے میرے بیٹے کی زندگی بھی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ وہ چونکہ ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا اس لئے احساسِ کمتری میں مبتلا متعصب ٹیچرز اس کے ساتھ بہت نارواسلوک اختیار کئے ہوئے تھیں' میں فرہاد کو اچھی طرح جانتی تھی' وہ بہت ہی ذہین اور فرمانبردار قسم کا لڑکا تھا' لیکن معمولی معمولی باتوں پر سخت ترین سزا دینا روز کا معمول بن چکا تھا۔ اس اسکول میں نچلے طبقے کے بچوں کے آجانے کی وجہ سے فرہاد کا اخلاق بھی متاثر ہو رہا تھا' وہ ایسی ایسی باتیں کرنے لگا تھا جن کے بارے میں' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس کے علاوہ میرا مکان بھی دوسروں کی نظروں میں آچکا تھا اور میرے سسرال والے بھی میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ غالباً چوبیس گھنٹے میری نگرانی کی جاتی تھی کیونکہ انہیں معلوم رہتا تھا کہ میں کب' کہاں' اور کس کے ساتھ تھی میری ساس کو میری سماجی سرگرمیوں' پر شدید اعتراض تھا۔ پہلے تو میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ لوگ میری سرگرمیوں پر نگاہ کیوں رکھے ہوئے تھے لیکن ایک دو مرتبہ ساس سے جھگڑوں کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آگئی' وہ لوگ میرے خلاف ایسی شہادتیں جمع کر رہے تھے جن کی بنا پر مجھے بدچلن اور آوارہ قرار دے کر فرہاد کو قانونی طور پر اپنی تحویل میں لے سکیں۔

اس سنگین صورت حال کے باوجود میں نے ایک آخری اور بہت بڑی پارٹی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ اس پارٹی میں صرف عورتوں کو خصوصاً ان عورتوں کو' مدعو کیا جائے گا جو اس خونی انقلاب کی باتیں کرنے کے بجائے زندگی سے بھرپور قہقہے لگا سکتی ہوں' گا سکتی ہوں' اور رقص کر سکتی ہوں' میرے مہمانوں کی اس فہرست میں تہران کی بڑی بڑی رقاصاؤں' گلوکاراؤں اور ایکٹریسوں کے نام شامل تھے۔

قطب شمالی کے متعلق جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں وہ بہت حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں جنریشن گیپ کا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ کیونکہ باپ اور بیٹے کی عمر میں بس "دنوں" ہی کا فرق ہوتا ہے۔ شادی کی رسوم بھی عجیب ہیں۔ بچہ ابھی بیس بائیس "دن" ہی کا ہوتا ہے کہ اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر شادی صبح ہوئی ہے تو "رات" کے پچھلے پہر تک یہ برخوردار والد صاحب بھی کہلانے لگتے ہیں۔ اللہ اللہ! ہتھیلی پر سرسوں جمانا اسی کو کہتے ہیں۔ گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا۔

جی چاہتا ہے قطب شمالی میں جا بسیں

گھبرا گئے ہیں روز کے شام و سحر سے ہم

عطاالحق قاسمی کے سفرنامے

"شوق آوارگی" سے

وہ فروری کی ایک سہ پہر تھی' میرے گھر میں تقریباً چالیس حسین ترین عورتیں جمع تھیں' ہم پانچ گھنٹوں تک پرانے ایرانی گانے گاتی رہیں' روایتی رقص کرتی رہیں اور قہقہے لگاتی رہیں۔

میرے ان مہمانوں میں ایک بہت مشہور ایکٹریس بھی شامل تھی اس کی آواز بھی غضب کی تھی شاہ کے زمانے میں وہ اکثر ٹی وی پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی.... لیکن امام خمینی کے برسرِاقتدار آنے کے بعد اپنے طبقے کے دوسرے لوگوں طرح اسے بھی اچھوت قرار دے دیا گیا تھا اور آج طویل عرصے کے بعد اسے اپنے فن کے اظہار کا موقع ملا تھا' وہ اپنی پُرسوز آواز میں شاہ کے زمانے کے ایک مشہور شاعر کی غزلیں سناتی رہی۔

اس پارٹی کے لئے میں نے بلیک مارکیٹ سے بڑھیا شراب کی درجنوں بوتلیں خرید لی تھیں۔ تقریب کے اختتام تک تمام بوتلیں خالی ہو چکی تھیں اور ہم سب پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی' یکایک میں نے ایران سے فرار

ہونے کا ارادہ ترک کردیا۔ ایسی محفلیں مجھے دنیا کے کسی حصے میں بھی نہیں مل سکتی تھیں۔

وہ رات میں نے اپنی سوچوں میں گزاری "کیا واقعی مجھے یہاں رہ جانا چاہئے؟ ممکن ہے حالات بہتر ہو جائیں۔ میں اپنا گھر اپنا خاندان' اور یہ سب کچھ کیوں چھوڑوں؟ باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایران سے نکلنے کے بعد ہم زندہ بھی رہ سکیں گے یا نہیں؟"

○☆○

کئی مہینوں بعد میں اس قدر گہری اور پُرسکون نیند سوئی تھی صبح جب میری آنکھ کھلی تو گرم گرم بستر سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا' باہر رگوں میں منجمد کردینے والی سردی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۸ فروری ۱۹۸۲ء کا دن تھا' جمعرات کی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ گزشتہ رات کی پارٹی میں پُرانے دوستوں کی موجودگی سے بڑا حوصلہ ملا تھا' میں نے ایران ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا ایسے محبت کرنے والے دوستوں کی موجودگی میں مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی اور مجھے اپنے ایرانی ہونے پر فخر تھا' حکمران تو آتے جاتے رہتے تھے' ان مذہبی رہنماؤں کو بھی ایک نہ ایک دن جانا ہی پڑے گا۔

یہ ہمارے خاندانی اجتماع کا دن تھا' یہ ایک روایت سی بن گئی تھی کہ ہر دو ہفتے بعد خاندان کے کسی نہ کسی گھر میں خواتین کا اجتماع ہوتا تھا' اس اجتماع میں دن بھر گپ شپ رہتی اور صبح سے رات تک تاش کھیلی جاتی' تاش پر چھوٹے پیمانے پر نقد شرطیں بھی لگائی جاتیں۔ اس روز یہ محفل ممانی طوطی کے ہاں جمنے والی تھی۔ میری کزن فاریہ بھی اپنی چند دوستوں کے ساتھ وہاں آنے والی تھی' اس روز میں نے لباس کے معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ یہ لباس دراصل میرے پرانے اسٹائل اور نئے مروجہ لباس کا کومبی نیشن تھا' شارٹ اسکرٹ اور بغیر آستین کی بلاؤز اب خواب بن کر رہ گئے تھے۔ ریڈیو کے علاوہ اخبارات میں بھی روزانہ امام خمینی کے احکامات شائع ہو رہے تھے کہ عورتوں کو سر سے پیر تک لباس میں پوشیدہ رہنا چاہئے۔ کمیٹی کے شکاری سڑکوں پر کاریں روک کر یہ چیک کرتے رہتے تھے کہ عورتوں کا لباس امام خمینی کے احکامات کے مطابق ہے یا نہیں۔ میں اور میری دوستوں نے کبھی ان احکامات کی پروا نہیں کی تھی' لیکن کئی ماہ بعد ایک روز جب فاریہ میرے گھر آئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ کسی انجانے خوف سے بالکل سفید ہو رہا تھا۔

"سوسن! معلوم ہے اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار لہراتے ہوئے کہا "بازار میں دو عورتوں کے چہرے پر محض اس لئے تیزاب پھینک دیا گیا کہ انہوں نے چادر نہیں پہنی تھی۔ یہ لوگ تو وحشیوں سے بھی بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔

اس واقع کے بعد گھر سے باہر نکلتے ہوئے میں لباس کے معاملے میں زیادہ ہی محتاط ہو گئی تھی۔ خصوصاً حجاب پہننا تو کبھی نہیں بھولتی' میں نے صرف حجاب پر ہی اکتفا کیا تھا کیونکہ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے چادر نہیں اوڑھوں گی۔ اس روز میں نے جو لباس پہنا تھا وہ کچھ ہی عرصے پہلے ایک امپورٹر کی دکان سے خریدا گیا تھا' ممانی طوطی کا ..... خوبصورت گھر میرے گھر سے اگرچہ صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا لیکن گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے حجاب پہن لیا تھا جس سے میرے سنہری بال اور چہرے کا بیشتر حصہ چھپ گیا تھا' حامد اگرچہ کار کے معاملے میں بھی مجھے بار بار تنبیہہ کر چکا تھا لیکن میں ہمیشہ فائر برڈ ہی استعمال کرتی تھی۔

طوطی کے گھر میں گزرنے والا وقت بے حد خوشگوار ثابت ہوا تھا' پورے دن سیاسی موضوع پر کوئی معمولی سی بات بھی نہیں ہوئی تھی' کیونکہ یہ پہلے ہی طے تھا کہ ان محفلوں میں سیاست پر بات نہیں ہوگی اور پھر چھ بجے کے لگ بھگ جیسے ہی دن کی روشنی دم توڑنے لگی تمام مہمان عورتیں ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگیں۔ ہم لوگ پوری طرح اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنے اپنے گھر پہنچ جانا چاہتے تھے' کیونکہ شام ہوتے ہی کمیٹی کے شکاری گاڑیوں کی چیکنگ شروع کردیتے تھے' رخصت ہوتے ہوئے میں نے خاندان کی ہر خاتون کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں فرہاد کے سوا اور کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کھانے کے بعد جب فرہاد سو جائے گا تو میں THE AOTHER SIDE OF MIDNIGHT یا SCRUPLES میں سے کوئی ایک فلم دیکھوں گی۔ سخت پابندی کے باوجود ایسی فلمیں کسی ویڈیو شاپ پر چوری چھپے مل جاتی تھیں۔

جب میں گھر پہنچی تو فرہاد' ڈرائیور جلال آغا اور اس کے بچوں کے ساتھ بیسمنٹ میں کھیل رہا تھا' میں نے دل ہی میں قسمت کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا کہ مجھے جلال آغا جیسے اچھے لوگ مل گئے تھے' میرے اپنے ملازم ہفتے میں صرف تین چار دن آیا کرتے تھے اور وہ بھی دن کے وقت' لیکن جلال آغا کی فیملی کے آنے کے بعد میں مطمئن ہو گئی تھی کہ رات کو بھی گھر کی حفاظت رہے گی۔ میں فرہاد کو لے کر اندر آگئی اور کھانا تیار کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا' دوسری طرف کمال تھا۔

"آج رات میں تمہارے گھر آرہا ہوں سوسن!" کمال نے میری آواز سنتے ہی کہا' کمال ان دنوں کچھ زیادہ ہی بے تکلف

ہونے کی کوشش کر رہا تھا' اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے گلدستے بہت خوبصورت اور فرہاد کو دیے جانے والے کھلونے بہت قیمتی ہوا کرتے تھے لیکن وہ مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی دباؤ ڈالنے لگا تھا۔

"نہیں کمال!" میں نے کہا۔ "آج میں بہت تھکی ہوئی ہوں' کل رات کا پروگرام کیسا رہے گا؟"

"میں تمہارے گھر کے قریب ہی ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں۔ واپسی پر تمہارے ہاں آؤں گا۔ رات کا پروگرام نہ سہی صرف چند منٹ رکوں گا۔" کمال نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

میں انکار نہیں کر سکی' نہ جانے کیا بات تھی کہ میں مردوں کے سامنے کبھی بھی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال میں نے طے کر لیا تھا کہ اس وقت کمال کو صرف چائے پر ہی ٹرخانے کی کوشش کروں گی اور اسے ڈرائنگ روم یا بیڈ روم میں لے جانے کے بجائے کچن ہی میں بیٹھ کر بات کروں گی۔

ٹیلی فون کرنے کے بعد میں اپنے آپ سے الجھنے لگی' میں جس شخص کو انکار کرنا چاہتی تھی اسے آنے کی اجازت دے بیٹھی تھی۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ میں دوسروں کو کیوں خوش کرنا چاہتی تھی' اگر میں کچھ سمجھ سکتی تھی تو صرف اتنا کہ میں نے غیر شعوری طور پر مردوں کو اپنی زندگی پر حکمرانی دے رکھی تھی۔ تقریباً ڈھائی مہینے پہلے جب حامد ایران سے فرار ہوا تھا تو میں نے قسم کھائی تھی کہ اب کسی مرد کو اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دوں گی کیونکہ اب میں مردوں سے کسی حد تک بیزار ہو چکی تھی۔ میں نے حامد کو کس کس طرح نہیں چاہا تھا۔ کیسے کیسے اس کی خدمت نہیں کی تھی۔ اس کے گندے موزے تک اپنے ہاتھوں سے دھوئے تھے جبکہ میں نے اپنی زندگی میں خود اپنا کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا اور اب کمال میری زندگی میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا جس سے میری ملاقات صرف ایک مہینہ پہلے ہوئی تھی اور اسے میں اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی۔ مجھے دوستوں کی یہ بات تسلیم کرنے سے بھی انکار نہیں تھا کہ کمال ہر لحاظ سے حامد سے بہتر تھا لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا جبکہ وہ اپنی محبت زبردستی مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے تھے فرہاد کو کھانا کھلا کر فارغ ہوئی تھی کہ آٹھ بجے کے قریب کمال پہنچ گیا' اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرا ایمان ایک بار پھر متزلزل ہو گیا۔ وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوبرو لگ رہا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے ڈرائیو وے میں اس کی سلور کلر کی مرسیڈیز بھی کھڑی دیکھ لی تھی۔

اس کی کار دیکھتے ہی میری پیشانی پر بل پڑ گئے تھے' کمال جب بھی آتا اپنی کار یا تو میرے گھر کے سامنے کھڑی کرتا یا گلی میں کسی ایسی جگہ چھوڑ دیتا جہاں سب کی نظروں میں آ سکتی تھی جبکہ حامد نے کبھی بھی ایسی حرکت نہیں کی تھی بلکہ جب میں اکیلی ہوتی تو وہ میرے گھر آنے سے بھی کترانے لگا تھا کیونکہ وہ میرے لئے کوئی پریشانی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جبکہ کمال ہمیشہ اپنی قیمتی کار پر آتا تھا' گویا جان بوجھ کر خطروں کو دعوت دینے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے ساتھ کچن میں آنے کے بعد کمال مجھے بتانے لگا کہ اس نے ایران سے فرار کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔

"میں نے پرانے ڈاک ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کر لیا ہے ان کے لئے مجھے تقریباً ساڑھے چار ملین تمن (سات لاکھ امریکی ڈالر) ادا کرنا پڑیں گے۔ میرے کزن نے مجھے یقین دہانی کرائی ہے کہ یورپ میں یہ قدیم ڈاک ٹکٹ تقریباً دوگنی قیمت پر فروخت ہو جائیں گے۔ یہ ٹکٹ خریدنے کے لئے میں اپنا مکان بیچ رہا ہوں۔"

"یہ ٹکٹ تم کس سے خرید رہے ہو؟ اور پھر تم یہ ٹکٹ بیک وقت کس طرح اپنے ساتھ لے جا سکو گے؟" میں نے کہا۔

"ایک مذہبی قسم کا آدمی ہے جس کا ایران سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تک اس سے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ سارا معاملہ ایک ایجنٹ کے ذریعے طے ہو رہا ہے۔" کمال نے بتایا۔

ابھی ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی' دستک اگرچہ ایسی نہیں تھی جس سے کسی قسم کا شبہ ہو سکتا لیکن میرے جسم میں بے اختیار خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی میرے ہاتھ میز کے کنارے پر سختی سے جم گئے۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر پہلے سے اطلاع دیے بغیر کوئی بھی دوست رات کے وقت کسی کے گھر نہیں جایا کرتا تھا۔

"کمال!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا کوئی ایسا جاننے والا نہیں جو اس وقت آ سکتا ہو۔ بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔ پچھلے دروازے سے نکل جاؤ۔ باغ میں سے ہوتے ہوئے پہاڑی کی طرف دیوار سے کود جانا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔ تم آسانی سے کود جاؤ گے۔"

"میرا یہاں سے بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے' اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو میرا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ کمال اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے خیال میں کامن سنس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کمال اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم دونوں کا ایک جگہ موجود ہونا قانونی طور پر سنگین جرم تھا۔ لیکن اسے شاید اس کی پروا نہیں تھی حالانکہ فرہاد، جلال آغا اور اس کی بیوی بیسمنٹ میں تھے لیکن اخلاقیات کے نئے قانون کی رو سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کوئی عورت اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کئی عورتوں کو محض اس لئے گرفتار کیا جا چکا تھا کہ انہیں ایسے مردوں کے ساتھ دیکھا گیا تھا جن سے ان کا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ کمال یہ سب کچھ جانتا تھا لیکن اس وقت اس سے بحث کا وقت نہیں تھا۔

خوش قسمتی سے اس وقت میں پورے لباس میں تھی، دروازہ کھولنے کے لئے جانے سے پہلے میں نے حجاب بھی پہن لیا تھا جو ہمیشہ داخلی دروازے کے قریب ہال میں ایک جگہ رکھا رہتا تھا، مجھے یقین تھا کہ دروازے کے سامنے بے ترتیب داڑھیوں، بے ترتیب لباس اور عجیب و غریب حلئے والے کمیٹی کے مسلح آدمی ہوں گے لیکن اس کے برعکس ان دو آدمیوں کو دیکھ کر مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان تھے۔ ان میں سے بڑے کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے نیوی بلیو سوٹ اور ہائی نیک سویٹر پہنا ہوا تھا، اس کے ساتھی کی عمر بائیس تیئس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے بھی براؤن رنگ کا سوٹ اور ہائی نیک سویٹر پہن رکھا تھا۔ دونوں نے چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو ان کی عمر کے حساب سے بھلی لگ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے مطمئن سی ہوگئی۔ ان کا کمیٹی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔

بلیو سوٹ والے نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"زحمت کی معذرت چاہتے ہیں خانم! دراصل ہم نچلی منزل پر رہنے والوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا میں آپ کے بارے میں کچھ جان سکتی ہوں؟" میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ان کو یہ بتا دیا جائے کہ ہم دوست ہیں۔"

"آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ان سے بات کرنی ہے بس۔"

"لیکن آپ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"نچلی منزل پر رہنے والوں سے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں کیسے سمجھ لوں کہ آپ دوست ہیں جبکہ ان کا نام تک نہیں جانتے۔"

"زیادہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ انہیں اوپر بلالیں۔" براؤن سوٹ والا کہتے ہوئے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

وہ نرم اور شائستہ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے، میں بار بار

پوچھ رہی تھی کہ وہ کون ہیں اور وہ ہر بار میرے سوال کو نظرانداز کررہے تھے' بالآخر بوڑے نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں ان کے بارے میں کچھ شکایات ملی ہیں۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں۔"

انہوں نے اگرچہ ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا تھا لیکن یہ آخری جملہ سنتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے اگر ان کا تعلق کمیٹی سے تھا تو وہ جلال آغا کے بارے میں شاید یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کمیونسٹ تو نہیں یا حکومت کے خلاف کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث تو نہیں ہے۔

"وہ بہت ایماندار' شریف اور مذہبی لوگ ہیں' میں نے آج تک ان کے بارے میں کوئی شکایت نہیں سنی" میں نے کہتے ہوئے' دروازہ بند کردیا۔

کمال اس دوران ہال میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً آنے والوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ جلال آغا کو بلانے کے لئے تہہ خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کمیٹی کے آدمی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں پوچھی لیکن تمہاری موجودگی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے' پلیز چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ لوگ تمہیں یہاں دیکھ لیں۔"

"احمق مت بنو سوسن!" کمال نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تمہیں پریشان کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

میں بے بسی سے پیر جھٹکتے ہوئے تہہ خانے کی طرف بڑھ گئی اور جب میں نے جلال آغا کو بتایا کہ دو آدمی اس سے ملنے آئے ہیں تو اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو ان کی آمدورفت کے لئے مخصوص تھا' جو ہمارے سائیڈ والے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس نے باہر نکل کر ان دونوں آدمیوں کو اس طرف بلالیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی برابر والے دروازے سے باہر نکل آئی۔ دراصل میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ جلال آغا سے کیا پوچھنا چاہتے تھے۔ میں ٹہلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔ نہ جانے کیوں میری ریڑھ کی ہڈی میں یکایک سردی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ نیلے سوٹ والے نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ہم اس کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟ آپ تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں؟" میں نے لہجے میں بھاری پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا حالانکہ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔

"ہمارا تعلق منکرات سے ہے اور ہمارے پاس اس کے گھر کی تلاشی لینے کا وارنٹ موجود ہے" اس مرتبہ براؤن سوٹ والے نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی ہم آپ کے گھر کی تلاشی بھی لینا چاہیں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتی براؤن سوٹ والا جلال آغا کے ساتھ بیسمنٹ میں چلا گیا اور نیلے سوٹ والا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میرے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوگیا اور میں اور میرا بیٹا پانچ گھنٹوں تک اذیت کی سولی پر ٹنگے رہے۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس اجنبی کے پیچھے ہی دروازے میں داخل ہوگئی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سے چل رہی تھیں' منکرات امام خمینی کی حکومت کا وہ خوفناک اسکواڈ تھا جو عوام سے اسلامی قوانین کی پابندی کروانے پر مامور تھا۔ میں اپنی غفلت اور بے پروائی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس گھر میں جو کچھ بھی ملے گا ان کے پیش نظر میں کتنے اخلاقی جرائم کی مرتکب ہوسکتی تھی' یہ سوچتے ہوئے دفعتاً میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں ماموں خروش کو لکھے جانے والے خط کو تو بھول ہی گئی تھی۔ یہ خط داخلی دروازے کے قریب ہی ایک اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ خط میں نے یہاں اس لئے رکھ دیا تھا کہ صبح باہر جاتے ہوئے اسے بھیجنے کے لئے لے جاؤں گی اگر یہ لوگ میرے گھر میں ملنے والی ہر قابل اعتراض چیز کو نظرانداز کر بھی دیں تو صرف یہ خط مجھے اور میرے ماموں کو زندگی بھر کے لئے جیل پہنچا سکتا تھا۔ اس خط میں میں نے قالینوں اور دیگر چیزوں کی اسمگلنگ کے بارے میں پوری تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ خط پر ماموں خروش کا سوئس بینک کا پتا لکھا ہوا تھا۔ یہ خط حوالہ ڈاک کرنے کے بجائے میں اپنی دوست اینا کے شوہر بال کے حوالے کردیتی جو اسے اپنے سفارت خانے کے ذریعے ملک سے باہر بھجوا دیتا۔

میں دروازے میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔ میری نظریں دیوار کے قریب اسٹینڈ پر رکھے ہوئے اس خط پر مرکوز تھیں جس پر میری قسمت کا انحصار تھا' لیکن نیلے سوٹ والا وہ شخص اس طرف توجہ دیئے بغیر آگے نکل گیا اور ایک جگہ رک کر ہال کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران اس کا براؤن سوٹ والا ساتھی بھی آغا کے تہہ خانے کی تلاشی لے کر واپس آگیا تھا۔

"حسن!" اس نے نیلے سوٹ والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تہہ خانے میں کوئی خاص چیز نہیں ملی" وہ چند

لمحوں کو خاموش ہوا پھر دونوں فارسی ۔ بجائے ترکی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

یوں تو ایران میں بہت سے غیر ملکی طبقے آباد ہیں لیکن ترکیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہر طبقہ اپنی زبان کو ترجیح دیتا ہے یا جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ اپنی زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ میرے ننہیالی اور ددیالی آباو اجداد بھی ترک تھے۔ ہمارے خاندان میں ترکی زبان بھی بولی جاتی تھی اور مجھے بھی اس زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ میں نے فوراً ہی ان کی گفتگو میں مداخلت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے امام خمینی کے انقلاب کی تعریف کرتے ہوئے ترکی زبان میں کہا۔

" آپ لوگوں کا تعلق بھی ایران کے ترک آبادی والے حصے سے ہے۔ چلئے کم از کم ایک قدر تو ہم میں مشترک ہے۔"

انہوں نے جواب دینے کے بجائے سرد نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر کچن کے قریب کھڑے ہوئے کمال کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ کون ہے؟" نیلے سوٹ والے نے پوچھا جسے حسن کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔" اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی کمال بول اٹھا" میں اس کا دوست ہوں۔"

میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ وہ کمینے کے آدمیوں کے سامنے بڑے فخر سے یہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ میرا دوست ہے۔

"یہ دراصل ہمارا خاندانی دوست ہے" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وضاحت کی" ان کے گھرانے سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں اور یہ میرے مرحوم شوہر کے کاروباری معاملات میں میری مدد کرتا ہے۔"

" رات کو اس وقت" براؤن سوٹ والے نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ساڑھے نو بج چکے ہیں' تم اپنے آپ کو ایک شریف زکہ خاتون کہتی ہو۔ صرف طوائفیں ہی رات کے وقت مردوں کو اپنے گھر بلاتی ہیں۔ پارٹی کے دوسرے لوگ کہاں ہیں۔

اس کے سوال پر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ گھر میں اس وقت میرے' کمال اور فرہاد کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"ہمیں اطلاع ملی تھی کہ یہاں عیاشی کرنے کے لئے ایک پارٹی ہو رہی ہے" براؤن سوٹ والے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا" ہماری اطلاع کے مطابق یہاں تقریباً ہر روز طاغوتیوں کی محفلیں جمتی ہیں اور خوب رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ دوسرے لوگ کہاں ہیں۔ فرار ہو گئے کیا؟"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ انہیں شاید کوئی غلط اطلاع ملی تھی یا ممکن ہے رپورٹ کسی اور مکان کے بارے میں ملی ہو اور وہ غلطی سے یہاں آگئے تھے۔" یہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران میرا بیٹا فرہاد اور جلال آغا کے دونوں بچے اپنے کمرے سے باہر آگئے۔ وہ لوگ غالباً یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس وقت آنے والے مہمان کون تھے۔ حسن نے ان بچوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹکنے لگا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس گھر کے بارے میں ملنے والی رپورٹ غلط تو نہیں تھی۔ اسی لمحے فرہاد کے کمرے سے وہ آواز سنائی دی جو مذہبی رہنماؤں کے لئے قابل نفرت تھی۔ یعنی انگریزی... اس وقت وی سی آر پر انگریزی کارٹون فلم چل رہی تھی۔ یہ آواز سنتے ہی حسن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ گویا انہیں ایک قابل اعتراض چیز مل گئی تھی۔ وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ جہاں ٹی وی پر [illegible] اسٹریٹ چل رہی تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر تک اسکرین پر دیکھتے رہے پھر حسن نے ٹیلی ویژن کی ٹرالی پر رکھے ہوئے چار ویڈیو کیسٹ اٹھالئے اور ایک ایک کیسٹ وی سی آر میں لگا کر دیکھنے لگا۔ وہ ہر کیسٹ کو کہیں کہیں سے چلا کر یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی فلمیں ہیں۔ ان میں سے ایک Scrurles دوسری The Other Side Of Midnight اور تیسری Airport تھی۔ جب کوئی [illegible] ان کے چہروں پر نفرت کے تاثرات ابھر آتے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ جب وہ تینوں فلموں کا معائنہ کر چکے تو میری طرف متوجہ ہو گئے۔ زبان کھولنے میں پہل براؤن سوٹ والے نے کی تھی۔ اس کا لہجہ پہلے سے کہیں سخت تھا۔

"سب انگلش فلمیں... بے ہودہ اور عریاں۔ ایسی چیزیں گھر میں رکھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی...؟"

اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور یہ نفرت اس دولت مند بگڑی ہوئی عورت کے لئے تھی جو مجرمانہ انداز میں سر جھکائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ فلمیں تم نے کہاں سے لی ہیں؟" اس مرتبہ حسن نے پوچھا۔ میں نے وڈیو شاپ کا [illegible] بتادیا اس سلسلے میں جھوٹ بولنا بیکار تھا کیونکہ [illegible] دکان کا نام کیسٹوں پر بھی لکھا ہوا تھا۔ وہ کیسٹ دوبارہ وی سی آر میں لگانے لگے۔ غالباً یہ اطمینان کرلینا چاہتے تھے کہ ان میں عریانیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ فلمیں دیکھتے رہے پھر اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ میں اب بھی اس خط کے بارے میں سوچ رہی تھی جو بیرونی دروازے کے قریب اسٹینڈ

پر رکھا ہوا تھا اور کسی بھی لمحے ان کی نظروں میں آسکتا تھا لیکن انھیں تو 'پارٹی' کی تلاش تھی۔ ڈائننگ روم میں بالآخر انھیں وہ چیز نظر آہی گئی جس سے ان کے اس شبے کی تصدیق ہو سکتی تھی کہ میرے گھر میں پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ چیز وہ بڑی ڈائننگ ٹیبل تھی جس پر بیک وقت چوبیس آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔

"یہ جوا کھیلنے کی میز ہے۔" براؤن سوٹ والے نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا۔ تمہارے مہمان اس میز پر بیٹھ کر جوا کھیلتے ہیں۔"

"یہ ڈائننگ ٹیبل ہے اس پر کھانا کھایا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنی بڑی میز پر جوا کیسے کھیلا جا سکتا ہے۔"

لیکن برتنوں کی الماری کی تلاشی کے دوران میرے خلاف کچھ اور شہادتیں مل گئیں۔ ایک دراز سے تاش کی چند گڈیاں اور ایسی چیزیں مل گئیں جن سے جوا کھیلا جاتا ہے۔ یہ چیزیں میرے خلاف ایک ایسا ٹھوس ثبوت تھا جس کی تردید نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "شاید یہ وہ کھانا ہے جو تم اپنے مہمانوں کو اس میز پر پیش کرتی ہو۔ اب ہمارا یہ شبہ تقویت پکڑ رہا ہے کہ یہ مکان جوئے اور قحبہ خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں سے ہمیں بہت سی چیزیں مل جائیں گی۔"

اگلے چار گھنٹوں تک وہ گھر کی ایک ایک چیز کی تلاشی لیتے رہے۔ بادی النظر میں انھیں دیکھنے پر یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سیدھے سادے معصوم سے نوجوان ہوں اور انقلاب سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ رہا ہو لیکن اب وہ جس طرح کام کر رہے تھے اس سے ان کی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ انھیں ایسے کاموں کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ آٹے، چینی کے برتنوں تک میں ہاتھ ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ہر تصویر کے پیچھے، ہر کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کر، میرے ہر پرس اور ہر کپڑے کو جھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے بلبوں کے شیڈ اور ٹیبل۔لیمپوں کے بیس تک کھول ڈالے، کمروں کے اندر رکھے ہوئے پودوں کے گملوں کی مٹی تک الٹ دی گئی۔ ہر کشن اور ہر میٹرس کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا اگر کسی جگہ کوئی چیز چھپائی ہوتی تو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ حسن نے ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز سے میرے وہ پرائیویٹ خطوط بھی نکال لئے جو بڑی احتیاط سے ایک ریشمی رومال میں . . . کر . . . . رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے اوپر وہ خط رکھا ہوا تھا جو امریکا میں میری رہائش کے دوران ایک لڑکے نے مجھے لکھا تھا۔ میری نو عمری کے زمانے میں یہ پہلا لو لیٹر تھا جو کسی لڑکے نے مجھے لکھا تھا اور محض یادگار کے طور پر میں نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ یہ خط میں نے اپنے شوہر کی نگاہوں سے بھی چھپائے رکھا تھا لیکن حسن نے اسے بڑی آسانی سے تلاش کر لیا تھا۔ خط پڑھتے ہوئے اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا جبکہ میرا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا لیکن ظاہر ہے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اس تلاشی کے دوران کمال ہال میں کھڑا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جبکہ فرہاد ہر جگہ میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا وہ بار بار مجھ سے ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا۔ "ممی! یہ کون لوگ ہیں۔ ہمارے گھر کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا! یہ لوگ تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔"

"لیکن ... یہ چاہتے کیا ہیں؟"

فرہاد کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

حسن اور اس کا ساتھی اب اس کمرے میں آگئے جو میری پسندیدہ جگہ تھی۔ میں اکثر اس کمرے میں آتشدان کے سامنے بیٹھ کر ٹی وی پر ویڈیو فلمیں دیکھا کرتی تھی۔ وہ دونوں جیسے ہی کتابوں کے شیلفوں کی طرف بڑھے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کمرے میں انھیں میرے خلاف مغرب زدہ ہونے کے اور بہت سے ثبوت مل جائیں گے۔ میرے شوہر کاشان کو مطالعے سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ اکثر مغربی لٹریچر پر مبنی کتابیں اور میگزین خریدتا رہتا تھا۔ ان میں اگرچہ "تعمیراتی" موضوع پر بھی کچھ کتابیں اور میگزین تھے لیکن ان میں چند پلے بوائے اور اس قسم کے دیگر میگزین بھی موجود تھے۔ پلے بوائے کے بارے میں تو میں بھول چکی تھی۔ یہ تمام میگزین آتشدان کے دونوں طرف ریکارڈ پلیئر اور ٹیپ ریکارڈر کے قریب اونچی شیلفوں میں بڑے قرینے سے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

براؤن سوٹ والا ایک ایک میگزین اٹھا کر ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ کسی میگزین میں جب کسی عورت کی نیم عریاں تصویر یا مرد عورت کو قریب قریب بیٹھے ہوئے دیکھتا اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ جاتے اور حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگتیں۔ پلے بوائے کے ٹائٹل دیکھتے ہی اس نے یہ میگزین اس طرح فرش پر پھینک دیے تھے جیسے غلطی سے بچھوؤں کو ہاتھ میں اٹھا لیا ہو۔

"تم جانتی ہو یہ سب کچھ خلاف قانون اور سنگین جرم ہے۔" اس نے خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد کسی چیز کو یہاں سے ہٹانے کی کوشش نہیں کرو گی۔ ہر چیز جوں کی توں رہنی چاہئے۔ ہم کل کسی بھی وقت یہ چیزیں لینے کے لئے آسکتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تمہارے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کی جائیں گی اور کوئی ثبوت ضائع کرنا ایک اور سنگین جرم ہو گا۔

میرا جی چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا لیکن میں بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھی۔ بالآخر میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"مجھے معاف کر دیجئے جناب! مجھے گھر میں ان چیزوں کی موجودگی کا کوئی علم نہیں تھا۔ یہ میگزین میرے شوہر کے تھے میں نے تو آج سے پہلے انہیں دیکھا تک نہیں تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد میں نے اس کی چیزوں کو کبھی چھوا بھی نہیں تھا اگر مجھے پہلے ان میگزین کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو انہیں ضائع کر چکی ہوتی اگر آپ اجازت دیں تو میں آج ہی رات انہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔"

لباس کے اندر میرا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ میں بار بار ملتمسانہ انداز میں ہاتھ مل رہی تھی۔ میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے انہیں یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ میں بھی ان کی ہم خیال ہوں۔ میرا بھیک مانگنے والا رویہ اختیار کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے گرفتار نہ کریں اور میرے بیٹے کو مجھ سے جدا نہ کریں۔

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے برعکس وہ خاموشی سے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تاکہ گھر کے زیادہ سے زیادہ حصے کو کم سے کم وقت میں کھنگال سکیں۔ براؤن سوٹ والا کمال کے ساتھ نچلی منزل پر ہی رہ گیا جبکہ حسن نے غراتے ہوئے مجھے اوپر چلنے کو کہا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ ہم دونوں میں سے کسی کو ایک لمحے کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ حسن کے ساتھ اوپر کی منزل پر جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ حسن کو کسی طرح اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اپنے ساتھی کی نسبت وہ زیادہ خوش اخلاق، نرم مزاج اور نرم خو ثابت ہوا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر کسی طرح اسے اپنا دوست بنا لوں تو شاید کسی قسم کی سزا سے بچ جاؤں۔ کچھ لوگ جو جیل جا چکے تھے۔ میں ان کی دردناک داستانیں سن چکی تھی اور اس وقت میرا ذہن ایسی ہی باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کمیٹی والوں کے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا۔ ہمارے لئے وہ وحشی تھے۔ اس طبقے کے لوگوں کے ساتھ جیلوں میں سب سے زیادہ وحشیانہ اور بربریت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ میرے عالیشان مکان کے سجے سجائے وسیع و عریض کمرے، سکی قالین، نوادرات اور قیمتی سازو سامان دیکھ کر ان کے چہروں پر نفرت و حقارت کے جو تاثرات ابھر رہے تھے ان سے میں اپنے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس کتیا کے پاس یہ سب کچھ کیوں ہے جبکہ ہم ایسی چیزوں سے محروم ہیں، ظاہر ہے اس کے علاوہ وہ اور کیا سوچ سکتے تھے۔ ہمیں ذلیل و رسوا کر کے انہیں روحانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ میں رضا کو اب تک نہیں بھولی تھی۔ کیبنٹ میں کوڑوں سے اس کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔

میرے لئے سب سے زیادہ دہشت ناک بات یہ تھی کہ میں فرہاد کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد تو وہ میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی چپک گیا تھا۔ بعض اوقات رات کو جب میں اسے سلانے کے لئے بستر پر لٹاتی تو وہ کہتا "آپ مجھے سوتا چھوڑ کر کہیں چلی تو نہیں جائیں گی ممی؟" اب میں اپنے ماضی پر پچھتا رہی تھی۔ ایک چھ سالہ بچے کی ماں ہوتے ہوئے مجھے ایسی سرگرمیوں میں حصہ ہی نہیں لینا چاہئے تھا۔ انقلابی تہران میں ہم جیسی عورتوں کو تفریح کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ مجھے نہ تو کسی قسم کی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہئے تھا اور نہ ہی کسی مرد کو اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت دینا چاہئے تھی۔

اوپر کی منزل پر پہنچ کر حسن سیدھا میرے بیڈروم میں داخل ہو گیا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب ہی کھڑا طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر کپڑوں والی الماری کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ الماری کھولنے سے پہلے اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ منتخب کر کے ہونٹوں میں دبایا اور ماچس کے لئے جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"میں ماچس لے کر آتی ہوں کچن میں رکھی ہوئی ہے؟" میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی طرف مائل کرنے کے اگرچہ کئی منصوبے تھے لیکن میرے دماغ پر تو وہ خط سوار تھا جو ٹائم بم کی طرح نیچے ہال میں اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا اور یہ بم کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ حسن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گئی۔ زینہ اترتے ہی میں نے اسٹینڈ پر رکھا ہوا وہ لفافہ اٹھا لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کچن کے قریب سرونٹ بیڈروم میں داخل ہو گئی۔ وہ خط میں نے اسی کمرے میں بچھے ہوئے بیڈ کے میٹرس کے نیچے چھپا دیا۔

دوبارہ زینہ چڑھتے ہوئے دفعتاً میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ان دونوں نے مکان میں داخل ہوتے وقت اسٹینڈ پر رکھا ہوا وہ خط ضرور دیکھا ہو گا۔ ممکن ہے اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہو لیکن اب اس کی عدم موجودگی دلوں میں شبہات پیدا کر سکتی تھی۔ میں دوبارہ زینے سے اتر آئی۔ اس وقت کمال اور براؤن سوٹ والا حسن کا ساتھی لیونگ روم میں تھے اور مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے میں نے وہ خط دوبارہ اسٹینڈ پر رکھ دیا اور ایک بار پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی زینہ طے کرنے لگی۔ میرے ایک ہاتھ میں ماچس تھی جسے میں نے اس بھاگ دوڑ میں کچن سے اٹھا لیا تھا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک

رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر مجھے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ میری قسمت کی ڈور ان دونوں کے ہاتھوں میں تھی اور اس موقع پر میری معمولی سی لغزش مجھے تباہی کے غار میں دھکیل سکتی تھی۔

جب میں دوبارہ اوپر پہنچی تو حسن پروجیکشن روم میں تھا۔ اس نے ایک ریل کی فلم ادھیڑ ڈالی تھی اور اب تیز روشنی میں فلم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے ماچس لے لی اور فلم کا معائنہ کرتا رہا۔

فوٹوگرافی اور موی فلمیں بنانا میرے شوہر کا مشغلہ تھا۔ اس شوق پر اس نے لاکھوں ڈالر خرچ کر ڈالے تھے۔ وہ جب بھی یورپ جاتا۔ ساحل اور دیگر تفریحی مقامات پر گھنٹوں فلم بناتا رہتا۔ اپنے تہران والے اس گھر میں بھی اس نے ہماری بہت سی فلمیں بنائی تھیں۔ کبھی کمروں میں، کبھی باغ میں اور کبھی سوئمنگ پول پر نہاتے ہوئے۔ ہماری شادی کی چار فلمیں تھیں۔ فلموں کے اس ذخیرے میں میری والدہ کی شادی کی فلم بھی شامل تھی جو ماموں خروش نے بنائی تھی۔ فلموں کے اس ذخیرے میں ہماری زندگی بھر کی یادیں محفوظ تھیں۔ جنہیں اب تک بڑی حفاظت سے رکھا گیا تھا۔

لیکن دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اس کمرے میں خاندانی یادوں پر مشتمل ان فلموں کے علاوہ اور بھی ایسا بہت سا مواد موجود تھا جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ میں ایک اچھی مسلمان خاتون نہیں تھی۔ فرانس اور یورپ کے ساحلوں پر نیم عریاں لباس میں نہاتے اور پیراکی کرتے ہوئے میری بہت سی فلمیں بھی یہاں موجود تھیں۔ مزید بر آں Emmanuelle نامی بالکل عریاں فلم بھی اسی ذخیرے میں شامل تھی۔ یہ فلم بہت عرصے پہلے میرے شوہر نے خریدی تھی اور ہم دونوں وقتاً فوقتاً اسے دیکھتے رہتے تھے۔

"پروجیکٹ چلاؤ" حسن نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے جناب کہ مجھے پروجیکٹ چلانا نہیں آتا۔ اس کے علاوہ اس کا بلب بھی ٹوٹا ہوا ہے۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت قے ہو جائے گی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔

ہم دونوں کچھ دیر تک پروجیکٹ سے الجھتے رہے لیکن اسے چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس سے مایوس ہو کر اس نے فلموں کی ریلیں ادھیڑنا شروع کر دیں اور فلم کا تیز روشنی میں معائنہ کرنے لگا۔ اسے ان فلموں میں قابل اعتراض مناظر کی تلاش تھی۔ ایک گھنٹے تک وہ کچھ بولے بغیر اسی طرح فلمیں دیکھتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کس قسم کی فلمیں ہیں۔ یہ غلاظت تم نے کہاں سے جمع کی ہے؟"

"یہ میری خاندانی فلمیں ہیں جناب! ان میں اور کچھ نہیں ہے۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا "لیکن شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ فلمیں تمہارے لئے کتنی بڑی مصیبت پیدا کر سکتی ہیں اگر یہ فلمیں کمیٹی کے دفتر میں دکھائی جائیں تو تمہارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔" حسن نے کہا۔ اس وقت میری حالت یقیناً غیر ہو گئی ہو گی کیونکہ حسن کے چہرے پر کسی قدر ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میرا کلیجہ ایک بار پھر منہ کو آنے لگا۔ میں دوڑتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی اور بیسن میں قے کر دی۔ گیلے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھنے کے بعد میں ایک بار پھر دوڑتی ہوئی پروجیکشن روم میں پہنچ گئی۔

"اب میں کیا کروں جناب؟ یہ میرے شوہر کا مشغلہ تھا۔ تمام فلمیں اسی نے جمع کر رکھی تھیں۔ اس کی سزا مجھے تو نہیں ملنی چاہئے۔"

"ٹھیک ہے" حسن نے نرم لہجے میں جواب دیا "اگر تم کسی بڑی مصیبت سے بچنا چاہتی ہو تو انہیں فوراً ضائع کر دو۔ مٹی کا تیل لے آؤ، ہم ابھی انہیں جلا کر ضائع کر دیں گے"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پھانسی کا پھندہ میرے گلے سے ہٹا لیا گیا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ بالآخر اس شخص کو مجھ پر رحم آ ہی گیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ جناب! میں ابھی مٹی کا تیل لے کر آتی ہوں، ہم ابھی انہیں ضائع کر دیں گے" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اس دوران حسن کا دوسرا ساتھی اوپر آ گیا تو ممکن ہے وہ حسن کو اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دے۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر گیراج میں پہنچ گئی.... ایک بوتل میں تیل بھر کر لے آئی۔

"انہیں کہاں جلایا جائے؟" حسن نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"بالکونی ٹھیک رہے گی۔ میں نے بالکونی کی طرف اشارہ کیا۔ جو کافی کشادہ اور لمبی تھی۔ ہمارے بیڈ روم کے علاوہ دوسری منزل کے کئی کمروں کے دروازے اس بالکونی میں کھلتے تھے۔

"لیکن کیا آگ سے فرش کی ٹائلیں خراب نہ ہو جائیں گی؟" حسن نے کہا۔

اس وقت ان فلموں کی قدر و قیمت کی پروا تک نہیں رہی تھی، بالکونی کی ٹائلوں کے بارے میں کون سوچتا۔ اس وقت تو میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ یہ دونوں آدمی جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں اور مجھے میرے بیٹے

کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں۔

"ناکموں کی پروا مت کریں، فلمیں جلانا ضروری ہیں" میں نے کہا اور فلمیں اٹھا اٹھا کر بالکونی کے فرش پر ڈھیر کرنے لگی۔ پروجیکشن روم کے کئی شیلف فلموں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رو دوں، میرے خاندان کی یادوں کا قیمتی سرمایہ ایک بے ترتیب ڈھیر کی صورت میں میرے سامنے پڑا تھا، میں بڑی مشکل سے آنسو ضبط کئے ہوئے تھی۔

حسن نے فلموں کے اس ڈھیر پر تیل چھڑک کر دیا سلائی جلائی اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں ایک لمحے کو سحر زدہ سے انداز میں دیا سلائی کے ننھے سے شعلے کو دیکھتی رہی پھر اسے فلموں کے ڈھیر پر اچھال دیا۔ بھک کی آواز ابھری اور بالکونی میں الاؤ بھڑک اٹھا۔

بالکونی میں بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر جلال آغا اوپر آگیا، اس کے ساتھ فرہاد بھی تھا۔ فرہاد میری ٹانگوں سے لپٹ گیا، اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"ممی! کیا ہم اپنا گھر بھی جلا دیں گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے ذہن میں کیا تھا لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ وہ اجنبی اس کے گھر میں گھس آئے تھے۔ جنہوں نے پورے گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا اور اس کی ماں مجرموں کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

جلتی ہوئی فلموں کے ڈھیر سے اٹھتے ہوئے رنگین شعلے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا دل بھی ان کے ساتھ جل کر راکھ ہو رہا ہو، میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ میں نے فرہاد کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس کے جسم میں بھی تھرتھراہٹ سی تھی۔ ہمارے قریب ہی حسن بھی بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ جلال آغا کے چہرے پر اس وقت عجیب سے تاثرات تھے، شعلوں کی جلتی ہوئی روشنی میں ہر چہرہ پراسرار لگ رہا تھا۔ میری کیفیت تو یہ تھی جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ میں پلک جھپکے بغیر ان جلتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہی تھی جو اب قدرے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ بالآخر شعلے بجھ گئے۔ بالکونی کے فرش پر اب پلاسٹک کی راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ میری زندگی بھر کی حسین اور قیمتی یادوں کی راکھ تھی۔

حسن نے وہاں مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ شعلوں کے سرد پڑتے ہی وہ میرے قریب سے گزرتا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ اس دوران اس کا براؤن سوٹ والا دوسرا ساتھی بھی وہاں پہنچ گیا۔

میرا خیال ہے کمال کے بھاگنے کا اب انہیں خطرہ نہیں رہا تھا، وہ دونوں بڑے ماہرانہ انداز میں بیڈ روم کی تلاشی لینے لگے۔ میں بھی بیڈ روم میں موجود تھی، یہ کمرا میری پناہ گاہ تھا۔ دن بھر کے ہنگامے کے بعد جب رات کو میں اس کمرے میں آتی تو مجھے بڑا سکون ملتا تھا لیکن اب میری یہ پناہ گاہ بھی تاراج ہو رہی تھی۔ یہاں تلاشی کے دوران انہیں ایک ایسی چیز بھی مل گئی جو ان کے خیال میں میرے جرائم کا جیک پاٹ تھا۔ پیٹرول کے غیر قانونی کوپن تھے جو میں نے ایک لفافے میں پلنگ کے میٹریس کے نیچے چھپا کر رکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی چور بھی گھر میں گھس آتا تو یہ کوپن تلاش نہیں کر سکتا تھا لیکن کمیٹی کے ان ماہرین نے انہیں بڑی آسانی سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان دونوں نے ایک نظر دیکھتے ہی یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ یہ کوپن غیر قانونی طور پر خریدے گئے تھے۔ براؤن سوٹ والا میری طرف گھوم گیا۔ وہ عمر میں اگرچہ حسن سے چند سال چھوٹا تھا لیکن اس کے بات کرنے کے انداز میں بڑی رعونت تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔

"یہ کوپن تم نے کہاں سے خریدے ہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ایک سنگین جرم ہے؟ یہ تم نے کس سے خریدے تھے؟ جلدی بتاؤ" اس نے کوپنوں کا بنڈل میرے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، میں اس قدر خوف زدہ تھی کہ میرے منہ سے ٹھیک سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے، میں نے اس ٹیکسی کمپنی کا نام بتا دیا جہاں سے میں اکثر ٹیکسی منگوایا کرتی تھی۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ بعد میں ٹیکسی کمپنی والوں کی بھی شامت آ جائے گی، لیکن ظاہر ہے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ دونوں نچلی منزل پر آ گئے۔ پیٹرول کے کوپن بھی انہی کے پاس تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے ہی تھی۔ فرہاد نے میرا دامن تھام رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے میں دو مرتبہ سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔ کمال سیڑھیوں کے قریب ہی ہال میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر کھول رہا ہو۔ حسن اور اس کا ساتھی ہال میں رکھے ہوئے اسٹیریو ایکوپمنٹ، ٹیپ ریکارڈر، درجنوں ریکارڈز اور کیسٹوں کو گھور رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" براؤن سوٹ والے نے حسب عادت بگڑے ہوئے لہجے میں کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو لاتعداد کیسٹوں اور ریکارڈوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ ایک دو کیسٹ یا ریکارڈ کافی ہو سکتے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ کیسٹ..." وہ ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کرنے لگا جہاں

شیلفوں میں لاتعداد آڈیو کیسٹ سجے ہوئے ہیں۔" پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے موسیقی کا بہت سا سامان جمع کر رکھا ہے اور تم جانتی ہو کہ یہ سب کچھ خلاف قانون ہے۔ اب تم ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ ہر چیز جوں کی توں رہنے دی جائے۔ ہم کل واپس آئیں گے اور تمام کیسٹ' میگزین اور فلمیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

تلاش کا سلسلہ جاری تھا' اور پھر شراب کی بوتلیں بھی ان کی نظروں میں آ گئیں۔ مجھے اور کاشان کو بڑھیا شراب کا شوق تھا' کاشان کو تو اچھی سے اچھی شراب جمع کرنے کا جنون تھا۔ اس نے دنیا کی بہترین شراب کا ذخیرہ کر رکھا تھا۔ اس کے انتقال کو اگرچہ تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اب بھی درجنوں بوتلیں موجود تھیں۔ حامد بھی وقتاً فوقتاً اس ذخیرے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا تھا۔ انقلاب کے بعد شراب کی قیمت میں بھی بے حد اضافہ ہوا تھا۔ ان دنوں بلیک مارکیٹ میں وسکی کی ایک بوتل چار ہزار تمن (تقریباً تین سو امریکی ڈالر) میں مل رہی تھی' میرا کزن کامران بھی شراب کا بڑا رسیا تھا۔ وہ محض اچھی شراب خریدنے کے لئے ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ پیرس ضرور جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ کئی کئی بوتلیں تحفے میں لا کر دیا کرتا تھا۔

حال ہی میں اس ملک سے فرار ہونے والے ایک دولت مند ایرانی نے عمدہ شراب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بیچا تھا' اس ذخیرے کا بڑا حصہ کامران ہی نے خریدا تھا۔ وہ میرے لئے اکثر سرخ فرانسیسی شراب بھی لایا کرتا تھا۔ یہ شراب اب یورپ میں بھی تبرک سمجھی جاتی ہے۔

ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ امام کے آنے کے بعد گھر میں شراب پینا یا شراب رکھنا بھی ایک سنگین جرم تھا' لیکن جہاں ہم اور دوسرے بہت سے جرائم کے مرتکب ہو رہے تھے وہاں ہم نے اس جرم کو بھی نظر انداز کر رکھا تھا لیکن ہم نے احتیاطاً شراب کا یہ ذخیرہ اپنے باغ میں چھپا رکھا تھا۔ باغ میں جگہ جگہ گڑھے کھود کر شراب کی سیکڑوں بوتلیں دفن کر دی گئی تھیں۔ میرا مالی حسین جس کی رہائش بھی باغ کے شمالی کونے میں تھی' نے شراب کی سیکڑوں بوتلیں چھپانے میں میری بڑی مدد کی تھی۔ گھر میں' میں نے صرف چند بوتلیں رکھی ہوئی تھیں جو اسٹیریو ایکوپمنٹ کے پیچھے کیبنٹ میں چھپا رکھی تھیں۔

حسن اور اس کا ساتھی اگرچہ اس ہال کی پوری طرح تلاشی لے چکے تھے لیکن پھر یکایک حسن کو خیال آیا کہ انہوں نے اب تک اس کیبنٹ کی تلاشی نہیں لی تھی۔

"یہ کیبنٹ کھولو" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچن میں ایک چابیوں کا گچھا موجود ہے لیکن مجھے معلوم نہیں اس میں کون سی چابی لگتی ہے۔" میں نے جز بز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"چابیاں لے کر آؤ۔"

"یس سر!" میں کہتے ہوئے کچن کی طرف دوڑ گئی اور چابیوں کا ایک گچھا لا کر اس کے حوالے کر دیا۔ گچھے میں کئی چابیاں تھیں۔ حسن بڑے اطمینان سے ایک ایک چابی آزماتا رہا بالآخر ایک چابی لگ گئی۔ کیبنٹ کھلتے ہی ان دونوں کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس کیبنٹ میں' میں نے شراب کی ڈیڑھ درجن بوتلیں چھپا رکھی تھیں۔

ان کے سلسلے میں تم دو میں سے ایک کام کر سکتی ہو۔" حسن نے شراب کی بوتلوں اور میز پر رکھے ہوئے تاش کے بنڈلوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "یا تو یہ تمام چیزیں لے کر میرے ساتھ باہر باغ میں چلو اور انہیں میری موجودگی میں ضائع کر دو یا کل صبح ہم انہیں کمیٹی کے دفتر لے جائیں گے۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں حرکت میں آ گئی تھی۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جلال آغا کی مدد سے میں نے وہ بوتلیں گیراج والے دروازے سے باہر پہنچا دیں پھر تاش کے بنڈل اور دوسری چیزیں بھی لے گئی۔ کمال خاموش کھڑا خشمگیں نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے یہ چیزیں باہر لے جانے میں میری کوئی مدد نہیں کی تھی۔ شاید وہ اب بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اب تک اس ساری صورت حال سے بالکل لاتعلق رہا تھا۔

جس وقت میں تاش کی گڈیوں اور دوسری چیزوں کو آگ لگانے جا رہی تھی۔ جلال آغا نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"خانم! تاش کے یہ بنڈل اتنے قیمتی ہیں کہ انہیں جلاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے' اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک پیکٹ غائب کر دوں؟"

"اگر تمہارے اندر اتنی ہمت ہے تو بیشک غائب کر دو" میں نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا "لیکن اگر پکڑے گئے تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔"

بہرحال' جلال آغا تاش کا ایک پیکٹ غائب کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ میں نے دوسرے درجنوں پیکٹ' کھیل سے متعلق قوانین پر کتابیں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کو آگ لگا دی۔ اس وقت مجھ پر مایوسی اور غصے کی سی کیفیت طاری تھی اور میں تاش کے بنڈل اٹھا اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک رہی تھی' پھر شراب کی بوتلیں اٹھا اٹھا کر مکان کی ماربل کی دیواروں پر مارنے لگی۔ مکان کی دیوار اور اس

کے آس پاس شراب خون کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ انقلاب نے اسی طرح انسانی خون بہایا تھا اگرچہ میں اپنے خلاف جرائم کے سنگین ثبوت ضائع کررہی تھی لیکن یہ منظر دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا خون کھول اٹھا تھا۔

آگ ابھی اچھی طرح نہیں بجھی تھی کہ حسن اور اس کے ساتھی نے مجھے اوپر کی منزل پر میرے بیڈ روم میں بلالیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک انہوں نے مجھے گرفتار کرنے کے سلسلے میں اشارتاً بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ میگزین، ٹیپ اور فلمیں وغیرہ لینے کے لئے صبح واپس آئیں گے۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ جلد سے جلد چلے جائیں تاکہ میں گھر کے تمام دروازے بند کرکے اپنے بیٹے کو سینے سے لپٹا کر رو رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ انہوں نے میرے گھر کو الٹ کر رکھ دیا تھا اور رضاکارانہ طور پر ہر چیز کو ضائع کرنے کی اجازت دینے سے میں یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہمدردی اور رعایت کررہے تھے لیکن جب میں بیڈ روم میں داخل ہوئی تو میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میں جسے ہمدردی سمجھے ہوئے تھی وہ مجھے ذہنی اذیت پہنچانے کی ایک چال تھی۔ اب وہ پہلے سے بہت مختلف نظر آرہے تھے، ان کے چہروں پر روایتی درندگی تھی۔ حسن نے بھی شائستگی اور شرافت کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔

"اب جبکہ تلاشی کا کام تقریباً مکمل ہوچکا ہے ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اس آدمی کا تم سے کیا رشتہ ہے؟" حسن نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ وہ ہمارے گھرانے کا دوست اور کاروباری مشیر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ سب بکواس ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ تمہارا عاشق ہے اور تم اس کے ساتھ سوتی ہو، بولو۔ کیا یہ غلط ہے؟ تمہارا بیٹا رات کو کہاں سوتا ہے تم اسے نچلی منزل کے بیڈ روم میں سلاتی ہو تاکہ تم اس کی مداخلت کے بغیر اپنے عاشقوں کے ساتھ آزادی سے رنگ رلیاں منا سکو۔ تم اپنی راتیں غیر مردوں کے ساتھ اس بستر پر گزارتی ہو؟"

حسن نے کہتے ہوئے غصے سے میرے بستر پر گھونسا مارا۔ سلیقے سے بچھی ہوئی نیلے سلک کی چادر سمٹ گئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ بستر اب میرا نہ رہا ہو۔ میں ویران سی نگاہوں سے کرسیوں، گلاس، کافی ٹیبل اور خوبصورت گلدان کی طرف دیکھنے لگی جس میں گلاب کے پھول سجے ہوئے تھے مجھے یاد نہیں تھا کہ یہ پھول میں نے آج صبح گلدان میں سجائے تھے یا صدیوں سے یہاں پڑے ہوئے تھے، مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ یہ کمرا کس کا تھا، میرا دماغ کسی پھرکی کی طرح گھوم رہا تھا۔

"بولو۔ خاموش کیوں ہو؟" حسن کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

"کس کے عاشق؟ کیسے عاشق؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس کمرے میں میرا بیٹا میرے ساتھ سوتا ہے" میں نے کھڑکی کے قریب چھوٹے بیڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں فرہاد سویا کرتا تھا

"ہمیں ان لوگوں کی فہرست چاہئے..." براؤن سوٹ والے نے خونخوار بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے کہا "جن کے ساتھ تم راتیں گزارتی رہی ہو۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہاں کون کون لوگ آتے رہے ہیں۔ دیکھو..." وہ کہتے ہوئے میرے اس قدر قریب آگیا کہ مجھے اپنے چہرے پر اس کی سانس کی تپش محسوس ہونے لگی "ہم جانتے ہیں کہ تم اس آدمی کے ساتھ سوتی ہو، ہم تمہارے معائنے سے ڈاکٹر سے اس کی تصدیق بھی کرواسکتے ہیں۔"

میرے پیٹ میں ایک بار پھر گرہیں سی پڑنے لگیں، کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے قے پر قابو پایا تھا میں اس وقت اپنے آپ کو تنہا اور بالکل بے بس محسوس کررہی تھی۔ جو ان خونخوار بھیڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ میری ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ میں سہارے کے لئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگانا چاہتی تھی لیکن اسی لمحے حسن نے ایک کاغذ میری طرف بڑھادیا۔ اس پر میرے ان تمام گناہوں کی تفصیل لکھی ہوئی تھی جس کے ثبوت میرے گھر سے دستیاب ہوئے تھے۔ اس میں ان تمام چیزوں کی فہرست بھی موجود تھی جنہیں یا تو ضائع کردیا گیا تھا یا اب بھی موجود تھیں۔

"تمہیں اس کاغذ پر دستخط کرنا ہوں گے۔"

"نہیں" میں بے اختیار چیخ اٹھی۔ اس کاغذ پر دستخط کرنا اپنے موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ یہ تمام سنگین ترین جرائم تھے۔ ان سے کہیں ہلکے جرائم پر ہزاروں لوگوں کو موت کی سزا دی جاچکی تھی۔ لوگوں کی زبانی اور اخبارات کے ذریعے روزانہ ایسی وحشت ناک خبریں سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ روزانہ سیکڑوں لوگ لاپتا ہوجاتے تھے۔

سیکڑوں گرفتار ہوتے تھے اور پھر ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا جاتا تھا، اب تک اس بارے میں لوگ جو کچھ بھی کہتے رہے تھے وہ غلط نہیں تھا، حقیقت میرے سامنے تھی۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی اور گھٹنوں پر جھک کر ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

میں ایک ایسے کاغذ پر دستخط کرسکتی ہوں جس میں میرے مکان سے برآمد ہونے والی فلموں، میگزین اور آڈیو

کمشس کی موجودگی کا اعتراف ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی کاغذ پر دستخط نہیں کروں گی ۔ تم مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے" میں نے روتے ہوئے کہا۔

اس لمحے فرہاد بھی کمرے میں آگیا۔ مجھے ان دونوں کے سامنے جھکتے اور روتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگا۔

" خدا کے لئے میرے بیٹے پر ہی ترس کھاؤ ۔ مجھے چھوڑ دو' خدا کے لئے مجھے معاف کردو" میں فرہاد کو اپنے ساتھ لپٹا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی لیکن ...... ان کا تعلق ایران کی مذہبی حکومت سے تھا۔ ان کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے ۔ وہ مجھے اپنے تیار کردہ میرے اعتراف جرم پر دستخط کرنے پر مجبور کرتے رہے۔

"اس پر دستخط کرو' ابھی... اسی وقت..." حسن نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میں گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کی کوشش کی ۔ میرا خیال تھا کہ میری اطاعت کے اظہار سے اس کا دل پگھل جائے گا یا کم از کم وہ یہ احساس کرے گا کہ وہ مجھے خاصا ذلیل کرچکے ہیں لیکن یہ وہ پتھر تھے جن میں جونک نہیں لگ سکتی تھی' اس نے مجھے دھکا دے کر پیچھے گرادیا۔

" ایک مسلمان عورت کسی غیر مرد کو نہیں چھو سکتی" اس نے غراتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک اور کاغذ اٹھالیا اور اپنی طرف سے فہرست تیار کرنے لگی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں نے وہ فہرست کیسے تیار کرلی تھی ۔ میرے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے' جیسے تیسے آڑھے ترچھے حروف میں لسٹ تیار کرکے اس پر دستخط کردئے اور کاغذ حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ۔

" اس سے زیادہ میں کسی چیز پر دستخط نہیں کروں گی ۔"

حسن نے کاغذ پر ایک نظر ڈالی اور کچھ کہے بغیر اسے جیب میں رکھ لیا اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل کر نیچے جانے کے لئے زینے کی طرف بڑھ گئے ۔ میں بھی لڑکھڑاتی ہوئی ان کے پیچھے ہی لپکی۔

کمال ہال میں کھڑا تھا اور ان دونوں نے ایک بار پھر اس سے پوچھ گچھ شروع کردی تھی کہ وہ کون ہے ۔ اب تک جو بھی کارروائی ہوئی تھی اس کے دوران کمال خاموشی سے ہال میں کھڑا رہا تھا اور اب وہ بڑے ناگوار سے لہجے میں ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا حالانکہ میں بڑے اصرار سے کچھ اور کہتی رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو میرا دوست کہنے پر ہی بضد رہا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو میرا دوست بتانے میں بڑا فخر محسوس کر رہا تھا جیسے ہم ایران میں .... میں نہیں کسی یورپی ملک میں رہ رہے ہوں جہاں عورتوں سے دوستی کو واقعی فخر سمجھا جاتا ہے ۔

اس مرتبہ ان دونوں کے چند سوالوں کے جواب دینے کے بعد کمال نے جیب سے شیراز کے آیت اللہ کا وہ خط نکال کر ان کے حوالے کردیا جس میں کہا گیا تھا کہ کمال کو کسی معاملے میں گرفتار یا پریشان نہ کیا جائے ۔ خط میں اس امر کی بھی وضاحت کردی گئی تھی کہ کمال صرف دولت مند ہی نہیں بلکہ حکومت کے ایک بہت بڑے تعمیراتی منصوبے پر کام بھی کر رہا ہے ۔ خط میں کمال کی کنسٹرکشن کمپنی کا نام بھی درج تھا خط پڑھتے ہوئے حسن کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی ۔

" اوہو -" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" ملک کی سب سے بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا سربراہ... اب سمجھا... تمہارا باپ کہاں ہے ؟"

" وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے" کمال نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

" تم جیل میں بھی رہ چکے ہو ۔ کیا اس کی وجہ بتانا پسند کرو گے ؟"

" وجہ بھی اس خط میں لکھی ہوئی ہے " کمال نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

" ہاں' میں نے پڑھ لیا ہے" حسن نے کہا پھر بولا" میرا خیال ہے اب ہم کاروں کی تلاشی لیں گے ۔"

کمیٹی کے لوگوں کو کاروں' خصوصاً مرسیڈیز بینز اور رینج روورز سے خصوصی دلچسپی تھی' وہ بہت معمولی باتوں پر ایسی قیمتی کاریں ضبط کر لیتے تھے اور مالکان کو بعد میں ان کا سراغ تک نہیں ملتا تھا ۔ ہم مکان سے نکل کر گیراج میں آگئے ' خوش قسمتی سے میرے شوہر کاشان نے انتقال سے کچھ عرصے پہلے مرسیڈیز اور رینج روور بیچ دی تھی اور میرے پاس صرف فائربرڈ تھی اور میرے خیال میں اس کار سے ان لوگوں کو زیادہ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن کمال کے پاس نئی اسپورٹس ماڈل مرسیڈیز تھی ۔ کمال کی کار کی تلاشی کے دوران انہیں ڈیش بورڈ کے خانے سے پیٹرول کے چند کوپن مل گئے تھے ۔

براؤن سوٹ والا کوپن ہوا میں لہراتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا" یہ دیکھو مجھے اس کار سے کیا ملا ہے ۔"

کمال کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ خاموش تماشائی کی طرح دیکھتا رہا تھا اس نے ایک مرتبہ بھی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب وہ اپنا غصہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

" یہ کوپن میں نے بالکل جائز اور قانونی طریقے سے خریدے ہیں ۔ تمہیں انہیں چھونے کا کوئی حق نہیں ہے ۔"

" اوہ' تم ہمیں ہمارے حقوق سے آگاہ کرنے والے کون

ہوتے ہو؟" حسن نے غراتے ہوئے کہا "تم ہمارے ساتھ چلو گے اور ہم تمہاری کار بھی لے جارہے ہیں۔"

"تمہیں میری کار یا کوپن لے جانے کا کوئی حق نہیں ہے کوپن وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھائے تھے" کمال نے سخت لہجے میں کہا۔

لگتا تھا جیسے کمال کو کسی قسم کا ڈر خوف نہ رہا ہو لیکن میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ لوگ اب جانے ہی والے تھے۔ میری گرفتاری کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن کمال کی ہٹ دھرمی کے باعث وہ ہتھے سے اکڑ گئے تھے اس سے پہلے کمیٹی کے آدمیوں سے میرا واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ دوسروں کو ذلیل ورسوا کرکے اور اپنے سامنے جھکا کر انہیں روحانی تسکین ملتی ہے۔ اس کی زندہ مثال میں خود تھی۔

ممکن ہے مجھے اپنے سامنے گڑگڑاتے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے ہوں۔ وہ میری باقی سزا معاف بھی کر سکتے تھے لیکن کمال کی ہٹ دھرمی اور جارحانہ طرز عمل سے ان کے رویے میں ایک بار پھر سختی آگئی۔ جب کمال بار بار پیٹرول کے کوپنوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا رہا تو انہوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ میں اس وقت جلال آغا کے ساتھ گیراج کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ حسن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہارے اس عاشق کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔ کل صبح واپس آئیں گے۔ کسی چیز کو چھونے یا غائب کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

کمال اب بھی اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آیا تھا۔ وہ چیخ کر بولا "میرا خط کہاں ہے۔ اس خط کے ہوتے ہوئے تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔"

"ہمیں تمہارے اس خط کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔" حسن نے سرد لہجے میں جواب دیا اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ مذہبی انقلابی حکومت میں شامل ہر شخص اپنے آپ کو قانون کا مالک اور دوسروں سے بالاتر سمجھ رہا تھا اگر ایک آیت اللہ کوئی فیصلہ کرتا تو دوسرا اسے مسترد کر دیتا۔ ہر شخص اپنے علاقے کا بلاشرکت غیرے حکمران تھا۔ اسے دوسروں کے احکامات کی پروا نہیں تھی۔ کمال کے آیت اللہ کا جاری کردہ وہ خط بھی ردی کاغذ کا ٹکڑا ثابت ہوا تھا۔

"میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں" کمال نے کہا۔

"تم زیر حراست ہو اور اب ہماری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے" حسن نے کہا "تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو سمجھے۔"

اس لمحے براؤن سوٹ والا مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ دیوار کے قریب اسٹینڈ پر رکھا ہوا وہ خط اس کی نظروں میں آگیا۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اب تک انہوں نے میرے خلاف جو بھی شواہد جمع کئے تھے۔ وہ اس لفافے میں بند بارود کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔ مذہبی رہنماؤں کو شاہ' اس کے رشتے داروں اور ساوک کے سابق سربراہ کے بعد جن لوگوں سے شدید نفرت تھی وہ ایران کے وہ دولت مند لوگ تھے جو اپنے سرمائے کو کسی بھی شکل میں ملک سے باہر بھیج رہے تھے۔ ایسے غداروں کا مقدر صرف اور صرف سزائے موت تھی۔

وہ لفافہ اٹھا کر روشنی میں دیکھنے لگا۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں رقم' چیک یا بینک ڈرافٹ وغیرہ تو نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے کمیٹی کے کارکنوں کی اکثریت فارسی بھی ٹھیک سے پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ انگریزی تو ان کے لئے بہت دور کی بات تھی۔ اس خط پر انگریزی ہی میں جنیوا کے یونین بینک آف سوئٹزرلینڈ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ انگریزی کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میری ایک دوست کے نام خط ہے۔ کل پوسٹ کرنے کے لئے یہاں رکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ چند لمحے مشتبہ نگاہوں سے لفافے کو دیکھتا رہا پھر... غیر دلچسپ سمجھتے ہوئے اسے دوبارہ اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ میں چند لمحے پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ سینے میں رکا ہوا سانس خارج کرنے لگی۔ میرے خیال میں اس نے وہ خط محض اس لئے رکھ دیا تھا کہ ملک سے باہر جانے والی تمام ڈاک سنسر کی جاتی تھی اور اگر اس خط میں کوئی خاص بات ہوگی تو یقیناً اسے روک لیا جائے گا۔ اندرون ملک کی ڈاک پر توجہ نہیں دی جاتی تھی اور میرے خیال میں یہ بات تو اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی ہوگی کہ یہ خط پوسٹ کرنے کے بجائے سفارتی ذرائع سے اسمگل کیا جائے گا۔ بہر حال ماموں خروش اور میں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ وہ چند لمحے ہال میں کھڑا نجانے کیا سوچتا رہا پھر باہر آگیا جہاں کمال ابھی تک حسن سے الجھا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھے یاد دلایا کہ وہ کل صبح آئیں گے۔ دفعتاً مجھے یاد آگیا کہ صبح مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا۔ میں جلدی سے بولی۔

"صبح مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے۔ کیا آپ لوگ ذرا دیر سے نہیں آسکتے؟"

"ٹھیک ہے' ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آجائیں گے یا کسی کو بھیج دیں گے۔" حسن نے کہا۔ اب مجھے حیرت

ہوتی ہے کہ میرے ساتھ وحشیوں جیسا سلوک کرنے کے بعد ڈاکٹر کے پاس جانے کی مہلت کیسے دے دی تھی۔

جب وہ کمال کو لے کر جانے لگے تو کمال نے میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "سوسن! میری کزن کو فون کر دو' اس کا فون نمبر سکس فور...."

"بکواس بند کرو۔" براؤن سوٹ والے نے اسے ڈانٹ دیا۔ اب تم کسی کو فون نہیں کر سکتے۔ تم جیل جا رہے ہو۔"

"ڈبل تھری ایٹ سیون... اسے بتا دینا میں کہاں ہوں۔ نمبر یاد کر لو۔ سکس فور ڈبل تھری ایٹ سیون...." وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے اور کمال چیخ چیخ کر نمبر دہرا رہا تھا۔

میں بھی اس نمبر کو یاد رکھنے کے لئے ذہن میں دہراتی رہی۔ وہ لوگ کمال کو گھسیٹتے ہوئے اپنی رینج روور میں لے گئے۔ میں جب فرہاد کا ہاتھ پکڑ کر اندر جانے کے لئے مڑی تو اس وقت بھی میں اس نمبر کو ذہن میں دہرا رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور فرہاد کو سینے سے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت ایک بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ میں اور میرا معصوم بیٹا سوا پانچ گھنٹوں تک اذیت کی سولی پر ٹنگے رہے تھے۔

بہت سے لمحے گزر گئے میں فرہاد کو اپنے ساتھ لپٹائے دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ موت کے وہ فرشتے اگرچہ جا چکے تھے مگر خوف کی شدت سے ابھی تک میرے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ فرہاد کی حالت بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس کے جسم کی تھرتھراہٹ بھی مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ لوگ کون تھے ممی؟ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ لوگ واپس آئیں گے؟ وہ ہمیں اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے تھے؟" فرہاد نے اپنے آپ کو مجھ سے علیحدہ کرتے ہوئے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے "کاش میں بروس لی ہوتا تو میں انہیں اس گستاخی کا مزا چکھا دیتا۔ ایسے کرارے ہاتھ مارتا کہ ان کی گردنیں ٹوٹ جاتیں اور وہ میرے قدموں پر ڈھیر ہو جاتے" وہ بروس لی کی طرح اپنے ہاتھ کو حرکت دینے لگا۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں اب بھی آنسو بھرے ہوئے تھے اب سے پہلے اس نے مجھے کبھی اس طرح پریشان نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح کسی کے قدموں پر جھک کر گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔

"پریشان نہ ہو میری جان!" میں نے اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا "سب ٹھیک ہے" "تمہاری ممی کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ صرف گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے پوچھ گچھ کے سلسلے میں کل تھوڑی دیر کے لئے مجھے ان کے دفتر بھی جانا پڑے' لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے بعد تم پریشان مت ہونا۔"

مجھے وقت گزرنے کا بالکل احساس نہیں رہا تھا' فرہاد کو تسلی دینے کی آڑ میں دراصل میں اپنے آپ کو تسلیاں دے رہی تھی۔ بالآخر میں نے فرہاد کی پیشانی پر بوسا دیتے ہوئے اسے اپنے آپ سے الگ کر دیا' اب مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ خط ابھی تک اسٹینڈ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ خط اٹھا لیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے کر دیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کاغذ کے ان پرزوں کو کہاں پھینکوں' پھر شاید میں انہیں نگلنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ فرہاد نے ایک کارآمد مشورہ دیا۔

"ممی! کاغذ کے یہ ٹکڑے ٹوائلٹ میں بہا دیں۔"

ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باتھ روم میں آ گئے۔ میں نے کاغذ کے وہ پرزے باؤل میں ڈال کر فلش کھینچ دیا۔ کاغذ کے پرزے پانی کے ایک چھوٹے سے بھنور میں گردش کرتے رہے اور پھر پانی کے ساتھ غائب ہو گئے۔

باتھ روم سے باہر آتے ہی مجھے کمال کا خیال آیا وہ نمبر ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا لیکن اپنی پریشانیوں کی وجہ سے بھول جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ لیا اور ٹیلی فون کے قریب آ گئی۔ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بار بار کی کوشش کے باوجود دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر میں اپنے رشتے داروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگی جو اس مصیبت کے وقت میرے کام آ سکتے تھے' سب سے پہلے ماموں فائق سے رابطہ قائم ہوا۔ وہ رات کے پچھلے پہر فون پر میری آواز سن کر بدحواس سے ہو گئے تھے۔ انہیں یہ اندازہ لگانے میں قطعی کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ ورنہ اتنی رات گئے فون کرنے کی تک نہیں تھی۔

"حوصلہ قائم رکھو میری بچی!" انہوں نے میری بات سننے کے بعد کہا "سوچنا پڑے گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ کل ان لوگوں کے آنے سے پہلے میں فرہاد کو لے کر کہیں روپوش ہو جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ایسی حماقت مت کرنا" ماموں فائق نے جلدی سے کہا۔ اس طرح وہ نہ صرف تمہارا مکان اور ہر چیز ضبط کر لیں گے بلکہ تمہیں مفرور قرار دے کر پورے ملک میں تمہاری تلاش شروع ہو جائے گی' تمہاری آزادی کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ ممکن ہے وہ پوچھ گچھ کے بعد تمہیں چھوڑ دیں اگر تم روپوش ہو گئیں تو دوبارہ کبھی اپنے گھر میں قدم نہیں رکھ سکو گی۔ منہ چھپائے در در کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔ ممکن ہے اس طرح بہتری کا کوئی راستہ نکل

آئے۔"

میرے خیال میں ماموں فائق ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مجھے اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ اگر انہوں نے فرہاد کو مجھ سے چھین کر مجھے جیل میں بند کردیا تو کیا ہوگا؟ فرہاد کبھی یہ نہیں سمجھ سکے گا کہ میں اسے چھوڑ کر کیوں گئی تھی' وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

"تم جانتی ہو کہ ان مذہبی حکمرانوں سے میرے تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں ہیں' فون کے ریسیور پر ماموں فائق کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے "لیکن میں بعض ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ صبح اٹھتے ہی میں ایسے لوگوں کی تلاش شروع کردوں گا جو اس معاملے میں ہماری کچھ مدد کرسکتے ہوں۔"

کمال کو اگرچہ ہمارے خاندان میں میری کزن فاریہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن میں نے ماموں فائق کو کمال کی گرفتاری کے بارے میں بھی بتادیا۔ انہیں یہ بتاتے ہوئے مجھے کسی قدر ندامت بھی محسوس ہورہی تھی کہ میں رات کے وقت اپنے گھر میں ایک غیر مرد کے ساتھ پکڑی گئی تھی' لیکن میں ماموں فائق کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ روشن خیال آدمی تھے انہوں نے اس بات کا قطعی برا نہیں مانا تھا۔

"اپنے بیٹے کا خیال رکھو۔ کمال کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے" انہوں نے کہا "وہ ایک بااثر خاندان کا فرد ہے۔ اس کے گھر والے کسی نہ کسی طرح اسے رہائی دلوادیں گے لیکن بہرحال صبح ہونے سے پہلے اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

چند منٹ مزید تسلیاں دینے کے بعد ماموں نے فون بند کردیا' اس وقت رات کے دو بج چکے تھے میں ایک بار پھر کمال کے بتائے ہوئے نمبر پر ٹرائی کرنے لگی لیکن اس مرتبہ بھی کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی' میں ماموں فروش کے گھر کا نمبر ملانے لگی۔ ممانی نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی' میری بات سن کر وہ دہشت زدہ سی ہوگئیں لیکن وہ فوراً ہی حواس میں آگئی تھیں۔

"اب سوچنا یہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں" وہ بولیں "اوہ' یاد آگیا' ایک امپورٹر سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں' بازار میں اس کے گہرے روابط ہیں اور تم جانتی ہو کہ بازار کے تقریباً سب ہی دکان دار مذہبی لوگ ہیں۔ میں صبح سب سے پہلے اس سے بات کروں گی۔"

ممانی سے بات کرنے کے بعد میں ایک بار پھر کمال کا دیا ہوا نمبر ڈائل کرنے لگی' یہ اس کی ایک کزن کا نمبر تھا جس سے میں صرف ایک مرتبہ ملی تھی۔ اس کا نمبر ملاتے ہوئے میں اپنے آپ سے ندامت بھی محسوس کررہی تھی' وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی؟ وہ یقیناً یہی سمجھے گی کہ میں نے رات کے وقت کمال کو خود اپنے گھر بلایا ہوگا مجھے بہرحال' اسے کمال کی گرفتاری کی اطلاع دینی تھی۔ کئی مرتبہ کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر کال ریسیو کرلی گئی خوش قسمتی سے کال کمال کی کزن کے شوہر نے ریسیو کی تھی' میری بات سننے کے بعد وہ کچھ دیر تک مجھ سے اظہار ہمدردی کرتا رہا پھر بولا "کمال کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہم اس کا بندوبست کرلیں گے۔"

میں نے اس رات آخری کال اپنی کزن فاریہ کو کی تھی۔ فاریہ ہی نے مجھے کمال سے متعارف کرایا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا پارہ چڑھ گیا اور میں فاریہ پر اپنا غصہ اتارنے لگی۔

"دیکھ لیا نا۔ کمال نے مجھے مصیبت میں پھنسا ہی دیا' میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن میرے لئے کوئی بڑی پریشانی پیدا کردے گا۔"

"تم کمال کو الزام نہیں دے سکتیں" فاریہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا "وہ تمہاری محبت میں اس قدر پاگل ہوچکا ہے کہ اسے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔"

"اس کی محبت اور بے قابو جذبات بالآخر مجھے بھی لے ڈوبے" میں نے غصے میں کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

جب میں سب لوگوں کو فون کررہی تھی اس دوران جلال آغا اور اس کی بیوی فرح بار بار کمرے میں آجارہے تھے' وہ وقتاً فوقتاً موقع پاکر مجھے تسلی بھی دیتے کہ صورت حال زیادہ سنگین نہیں ہے۔ وہ اگرچہ مجھے تسلی دے رہے تھے لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ خود کسی معاملے میں خاصے بے چین اور مضطرب ہورہے ہیں۔ بات کرتے ہوئے فرح مجھ سے نظریں چرالیتی اور جلال آغا بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہتا۔

اب میں ان چیزوں کے بارے میں سوچنے لگی جن سے حسن وغیرہ کے آنے سے پہلے پہلے نجات حاصل کرلینا ضروری تھا۔ میرے ذہن پر سب سے زیادہ بوجھ شراب کی ان سیکڑوں بوتلوں کا تھا جو باغ میں دفن تھیں ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے جلال آغا کو زمین کھودنے کو کہا تو وہ بولا "اس وقت تو باہر بہت اندھیرا ہے' ذرا دن کا اجالا ہولینے دیں' پھر دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے؟"

اجالے کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم فوٹو لائبریری اور لیونگ روم میں بکھرے ہوئے رسالوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان میں سے وہ تصویریں پھاڑنے لگے جو کمیٹی والوں کی نظروں میں بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی تھیں۔ ان رسالوں سے تصویریں پھاڑتے ہوئے میرا دھیان بار بار دوسری چیزوں کی طرف جارہا تھا جن کی گھر میں موجودگی میرے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں بار بار اٹھ کر ان چیزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کررہی تھی۔ ان میں عورتوں کی عریاں تصویروں والی کچھ کتابیں اور غیر قانونی طور پر خریدے گئے پیٹرول

کے کچھ کوپن بھی شامل تھے جو باورچی خانے میں ایک دراز میں پوشیدہ تھے۔ فوٹو البموں میں میری اور میرے دوستوں کی ایسی تصویریں بھی موجود تھیں جو کیپسین والے مکان کے سوئمنگ پول میں نیم عریاں لباس میں پیراکی کرتے ہوئے کھینچی گئی تھیں۔ اگرچہ کئی مہینے پہلے میں نے ان البموں سے 'تجارتی اور سماجی حلقوں میں بڑے بڑے لوگوں 'فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ کھینچی ہوئی اپنی تمام تصویریں نکال دی تھیں لیکن اس کے باوجود میں ایک بار پھر بیہ کرلینا چاہتی تھی کہ کسی البم میں کوئی ایسی تصویر رہ تو نہیں گئی تھی' بالآخر رسالوں میں سے پھاڑی جانے والی تمام یاں تصویریں آتشدان میں جمع کر کے انہیں دیا سلائی دکھادی گئی۔

گھر کو "گناہوں" سے پاک کرنے کی کوشش میں 'میں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑی پھر رہی تھی۔ فرہاد بھی ہر جگہ میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا' میں چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح سوجائے کیونکہ اسے اسکول بھی جانا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر اب بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ سب کچھ نارمل ہے لیکن پھر اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور یہ خوفناک حقیقت میرے سامنے آگئی کہ سب کچھ نارمل نہیں تھا۔ میری زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی تھی' مجھے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ وہ صبح اسکول کیسے جائے گا؟ اسے اسکول چھوڑنے اور لینے کون جائے گا؟ اس کی دادی اور چچا وغیرہ کو جیسے ہی پتا چلے گا کہ میں گرفتار ہو گئی ہوں ور مجھے یقین تھا کہ انہیں فوراً ہی پتا چل جائے گا کیونکہ وہ پر اسرار ذرائع سے میرے ہر معاملے سے باخبر رہتے تھے' وہ فوراً ہی فرہاد کو لے جائیں گے اور میں جانتی تھی کہ فرہاد کی واپسی کے لئے مجھے ایک طویل جنگ لڑنا پڑے گی۔

لیکن فرہاد کے ذہن پر اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ کسی طرح سونے کو تیار ہی نہیں تھا' گھر کے کمروں میں پاگلوں کی طرح بھاگ دوڑ کرتے ہوئے رات بیت گئی۔

صبح چھ بجے جب دن کا ہلکا سا اجالا کھڑکی کے روزن سے جھانکنے لگا تو میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ میں اپنے آپ کو آنے والے دن کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرنے لگی۔ اس وقت تک میرے تمام رشتے داروں کو میری متوقع گرفتاری کا پتا چل گیا تھا اور دن چڑھتے ہی ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا تھا۔ میرے دوست اور رشتے داروں نے بھاگ دوڑ شروع کردی تھی اور جو اس سلسلے میں پہلے ہی کوئی قدم اٹھا چکے تھے مجھے اس سے آگاہ کیا جارہا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ماموں فاخر نے فون کیا۔

"روشنی کی پہلی کرن پھوٹتے ہی ہم نے رابطہ مہم شروع کردی تھی' ان مذہبی رہنماؤں کو رشوت دے کر کوئی کام کروالینا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن اس کے لئے کسی قابل اعتماد آدمی کا ہونا ضروری ہے' ورنہ وہ یہی سمجھیں گے کہ انٹی کرپشن کی طرف سے انہیں کسی جال میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

"ہمیں کم از کم کتنی رقم کا انتظام کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا

"فی الحال یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ انہیں کتنی رقم پر آمادہ کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ تمہارے خلاف چارج کیا لگائے جاتے ہیں" ماموں نے جواب دیا اور چند منٹ مزید گفتگو کرنے کے بعد فون بند کردیا۔

دن کی روشنی ہوتے ہی میں جلال آغا اور مالی حسن کو لے کر باغ میں پہنچ گئی۔ پہلے ان جگہوں کا معائنہ کیا گیا جہاں شراب کی بوتلیں دفن تھیں جو جگہ ابھری ہوئی اور مشکوک نظر آرہی تھی وہاں سے بوتلیں نکال کر گڑھوں کو مزید گہرا کھود کے بوتلیں دوبارہ دفن کردی گئیں اور زمین اس طرح ہموار کردی گئی کہ وہاں کسی قسم کا شبہ نہ کیا جاسکے۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے یہ سب کچھ کرتے رہے پھر میں اندر آکر جیل جانے کی تیاری کرنے لگی۔ مجھے ماموں فروش اور دیگر لوگوں نے وقتاً فوقتاً جیل کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ بہت خوفناک تھا' سرد اور تاریک کمرے' خوراک اتنی کم کہ بچے کا بھی پیٹ نہ بھر سکے اور بیرونی دنیا سے رابطے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے گرم پانی سے غسل کیا اور بالوں کو خوب مل مل کر دھویا کیونکہ جیل میں قیدیوں کے لئے نہانے دھونے کا تصور ہی نہیں تھا' پھر ناخنوں سے نیل پالش صاف کر کے انہیں کاٹ لیا۔ نئے ایران میں لمبے ناخن اونچی سوسائٹی کی علامت سمجھے جاتے تھے' میں نے وہ تمام زیور بھی اتار دیا جو عام طور پر پہنے رہتی تھی۔ ان میں طلائی انگوٹھیاں' ایک قیراط کے چار ہیروں والی سونے کی چین' جو کاشان نے شادی کے موقع پر دی تھی' اور ہیرے کے ٹاپس شامل تھے۔ سر کے بالوں کو جوڑے کی صورت میں باندھ کر میں نے چہرہ بھی خوب رگڑ رگڑ کر دھویا تھا تاکہ میک اپ کے کسی قسم کے آثار باقی نہ رہیں۔ جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کا تنقیدی جائزہ لیا تو اپنی شکل دیکھ کر ایک لمحے کو میں خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ رات بھر روتے رہنے سے میری آنکھیں ابھی تک سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹ خشک تھے۔

پھر میں لباس پہننے لگی۔ قمیض کے اوپر میں نے پورے آستین کا سوئٹر' اس پر کارڈیگن اور اونی اسکرٹ پہننے کے بعد اوپر ایک لمبا اونی کوٹ بھی پہن لیا۔ یہ میرے برسوں پرانے کپڑے تھے۔ ان کا انتخاب میں نے اس لئے کیا تھا کہ لوگ غیر ضروری طور پر میری طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ میں نے جوتے بھی پہن لئے تھے کیونکہ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کمیٹی والے کس وقت پہنچ جائیں۔ جب میں مکمل طور پر تیار ہوچکی تو اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

اگرچہ میں نے حسن سے ڈاکٹر کے ہاں جانے کی مہلت لے لی تھی لیکن اب ڈاکٹر کے ہاں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اس کے علاوہ میں زیادہ سے زیادہ وقت فرہاد کے قریب رہ کر گزارنا چاہتی تھی۔ میری بہت سی دوست میرے گھر آنا چاہتی تھیں تاکہ کمیٹی والے جب مجھے گرفتار کرنے کے لئے آئیں تو وہ میرے قریب موجود رہیں۔ ویسے مجھے شبہ تھا کہ کمیٹی والے میرے مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔ ممکن ہے میرے گھر میں بہت سے لوگوں کی موجودگی انہیں پسند نہ آئے اور وہ میرے خلاف کوئی اور الزام بھی تیار کر لیں۔

لیکن میں نے سیمیں کو فون کر کے بلوا لیا تھا۔ وہ میرے بچپن کی دوست تھی اور اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ اس وقت مجھے اس جیسی دوست کی ضرورت تھی حالانکہ اس کا اپنا چھ سال کا بچہ تھا لیکن جب میں نے فون کیا تو اس نے آنے میں چند منٹ سے زیادہ کی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے ہم برسوں سے بچھڑی ہوئی ہوں۔ فرہاد بھی اپنے ایک ہم عمر کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

سیمیں نے رول کیا ہوا ایک پوسٹر بغل میں دبا رکھا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھی کہ وہ فرہاد کے لئے نئی کارٹون لے کر آئی ہے لیکن جب اس نے پوسٹر کھولا تو میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا' وہ امام خمینی کی تصویر تھی۔

"یہ تصویر لیونگ روم میں لگا لو" سیمیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کی موجودگی سے تمہارے بارے میں کم از کم یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ تم ایک انقلابی خاتون ہو۔ یہ لوگ اسی قسم کی چیزیں پسند کرتے ہیں۔"

تقریباً نو بجے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ اس وقت میں فرہاد کے جوتوں کے فیتے باندھ رہی تھی۔ دستک کی آواز سن کر میرے ہاتھ کانپ گئے اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ لوگ اتنی صبح نہیں آ سکتے کیونکہ حسن نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب یا خود آئیں گے یا کسی اور کو بھیج دیں گے۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی۔

"اوہ تم" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم بھی آنے والی ہو۔"

"یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟" منصورہ نے میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بے پناہ ممتا تھی "کسی کا انتقال ہو گیا ہے یا مصیبت کا کوئی اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تم پر اور تم نے یہ لباس کیسا پہن رکھا ہے؟"

"کل رات کمیٹی والے آئے تھے" میں نے کہا "آج وہ لوگ مجھے گرفتار کرنے آ رہے ہیں۔"

"اوہ" منصورہ کا چہرہ دھواں ہو گیا "اس حکومت کے پاس لوگوں کو پریشان کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا' بہرحال فکر مت کرو' وہ تمہیں گرفتار نہیں کر سکتے۔"

"منصورہ! میرا خیال ہے کہ تم چلی جاؤ۔ تمہیں یہاں دیکھ کر نجانے وہ تمہارے بارے میں کیا سوچیں ان کا خیال ہے کہ میں طوائف ہوں۔ وہ میرے ہاں ہر آنے والے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

"مجھ پر شک!" منصورہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اس قسم کے لوگوں سے ڈر جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی اور اگر انہوں نے تمہیں گرفتار کیا تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گی وہ لوگ مجھے نہیں روک سکتے اور نہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور اب یہ بتاؤ کہ تم نے ناشتا کیا ہے یا نہیں' میرا خیال ہے نہیں کیا ہے' چہرے سے لگتا ہے جیسے تم نے کئی روز سے کچھ نہ کھایا ہو۔"

منصورہ کا اندازہ درست تھا۔ میں نے واقعی ناشتا نہیں کیا تھا اور گزشتہ رات کو میں بار بار باتھ روم جاتی رہی تھی۔ خوف کے باعث مجھے ڈائریا ہو گیا تھا اور اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میرا معدہ کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا" میں نے منصورہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے دو انڈوں کا آملیٹ ٹھیک رہے گا۔ تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہئے۔ خالی پیٹ رہنے سے طبیعت خراب ہو جائے گی۔ جیل میں تمہیں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔"

منصورہ کے اصرار پر میں نے آملیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کا ایک سلائس بھی کھا لیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم تینوں کمرے میں بکھرے ہوئے میگزین اور فلمیں وغیرہ اٹھا کر دروازے کے قریب ڈھیر کرنے لگیں۔ اس دوران میری نظر اپنی کلائی کی طرف اٹھ گئی۔ میری کلائی پر سنہری رولیکس گھڑی بندھی ہوئی تھی۔

"میں جیل میں یہ گھڑی نہیں پہن سکتی لیکن جیل میں رہتے ہوئے مجھے وقت دیکھنے کی پریشانی ہو گی" میں نے منصورہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

منصورہ نے فوراً ہی اپنی سستی سی گھڑی اتار کر میری طرف بڑھا دی۔

"لو' یہ پہن لو اور اگر انہوں نے تم سے یہ گھڑی چھین بھی لی تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اب ہمارے لئے کوئی مصروفیت نہیں رہی تھی۔ ہم کچن کی میز پر بیٹھ کر وقت گزرنے کی انتظار کرنے لگیں۔ میں کبھی بیٹھ جاتی اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔ دوستوں اور رشتے داروں کے ٹیلی فون بدستور آ رہے تھے۔ ان فون کالز سے مجھے خاصہ حوصلہ مل رہا تھا اگر کمیٹی والے مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانے کی مہلت دے سکتے تھے تو ممکن ہے وہ مجھے گرفتار کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ ممکن ہے وہ

مجھے محض خوفزدہ کرنا چاہتے ہوں۔ انہوں نے مجھے شراب، تاش کی گڈیاں اور قابل اعتراض فلمیں جلانے کی اجازت دے دی تھی۔ انہوں نے میرے پیٹرول کے کوپن ضبط کر لئے تھے۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اب دوبارہ نہیں آئیں گے لیکن میں سمجھتی تھی کہ ان کی قیاس آرائیاں غلط تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ کمیٹی والے مجھے معاف نہیں کریں گے۔ وہ جس کے پیچھے لگ جاتے تھے اسے چھوڑ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔۔ عفو اور درگزر کا لفظ ان مذہبی رہنماؤں کی لغت میں تھا ہی نہیں۔

ٹھیک دو بجے دروازے پر دستک کی آواز ابھری تو میں اچھل پڑی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے منصورہ اور تمیس کی طرف دیکھا اور ہم تینوں دروازے کی طرف بڑھیں۔ دونوں بچے بھی ہمارے پیچھے ہی تھے دروازہ کھولتے ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ دونوں اگرچہ اجنبی تھے لیکن ان کے کمیٹی والے ہونے پر کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ پرانی سی فوجی وردیاں، سیاہ داڑھیاں اور کندھے پر لٹکی ہوئی آٹومیٹک رائفلیں۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ ہم تینوں کو دیکھ کر فوری طور پر ان کے ذہنوں میں کیا خیال آیا ہو گا۔ ہم تینوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے سروں پر اسکارف بندھے ہوئے تھے اور دو بچے ہماری ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے۔

"سوسن آزادی۔" ان میں سے ایک نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔

"میں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"ہم تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

"اندر آ جاؤ۔"

وہ دونوں اندر آ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے انہیں یقیناً اس کی توقع نہیں تھی۔ امام خمینی کی تصویر کے سامنے وہ ایک لمحہ رکے اور پھر ادھر ادھر گھومتے ہوئے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"کیا تمہارے گھر میں کوئی غیر قانونی چیز موجود ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔

"گزشتہ رات تمہارے گھر کی تلاشی لی گئی تھی؟"

"ہاں۔"

"انہیں یہاں سے کیا ملا تھا؟"

"کوئی خاص چیز نہیں چند میگزین اور چند خاندانی فلمیں۔ وہ سب یہاں موجود ہیں" میں نے دروازے کے قریب ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، میں نے اپنے آپ کو ایک اچھی خاتون خانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں چائے کی پیشکش کی۔ طاغوتی عام طور پر کمیٹی والوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ کمیٹی والے بھی ان سے شدید نفرت کرتے تھے لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں نے چائے کی پیشکش قبول کر لی تھی کیونکہ میں یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسے موقع پر کمیٹی والے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ انہیں زہر نہ دے دیا جائے۔

انہوں نے کھڑے کھڑے چائے پی اور پھر بلا تکلف گھر کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے انداز سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ میرے خلاف کوئی ثبوت ملنے کی امید کے بجائے محض تجسس کی وجہ سے تلاشی لے رہے تھے۔ ہم خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔ تینوں میں سے کسی ایک نے ایک لفظ تک بولنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

انہوں نے تقریباً دو گھنٹے بعد اپنے ہیڈ کوارٹر فون کیا اور اس آدمی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی جس نے گزشتہ رات میرے گھر کی تلاشی لی تھی۔ وہ بون یار منکرت میں تھا۔ یہ کمیٹی کا سب سے با اختیار اور طاقتور شعبہ تھا۔ کمیٹی کا ہر سیکشن شہر میں اپنے اپنے علاقے کا ذمہ دار تھا لیکن بون یار منکرت کو پورے تہران میں ہر قسم کی کارروائی کے اختیارات حاصل تھے۔ اس کے فرائض میں طوائفوں، منشیات، شراب اور جوئے کے بارے میں تحقیقات کرنا اور ان لوگوں کے بارے میں تحقیقات کرنا شامل تھا جو بڑی بڑی پارٹیاں منعقد کرتے رہتے تھے۔ یہ تحقیقات عام طور پر کوئی شکایت ملنے پر ہی کی جاتی تھیں، مجھے حیرت تھی کہ میرے خلاف شکایت کس نے کی تھی۔ بون یار منکرت کی رپورٹ کو حتمی سمجھا جاتا تھا اور اس پر شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"حسن۔۔۔! ہاں۔۔۔ ہم یہاں پہنچ چکے ہیں" وہ آدمی فون پر بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "ہمیں تو یہاں کوئی قابل اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ کیا اس عورت کو گرفتار کر لیا جائے؟"

میں اگرچہ ٹیلی فون سے کئی فٹ دور کھڑی تھی لیکن ریسیور پر ابھرنے والی حسن کی غصیلی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"احمق کہیں کے، تم اب تک وہاں کیا کرتے رہے ہو؟ تمہیں تفریح کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ اسے فوراً یہاں لے آؤ۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔ ایک منٹ۔۔۔۔ ذرا اس عورت کو فون پر بلاؤ۔"

اس شخص نے فون کا ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اس شخص کی آواز فوراً ہی پہچان لی جس نے گزشتہ رات کسی قدر شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اب وہ غصے میں بپھرا ہوا تھا اس کے لہجے میں شائستگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے مجھے ان

دونوں آدمیوں کو بلا وجہ روکے رکھنے کا الزام دیتے ہوئے دھمکی
دی کہ اگر میں فوری طور پر ہیڈ کوارٹر نہ آئی تو مجھے سنگین نتائج
بھگتنے پڑیں گے۔ میں اب تک یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ شاید
مجھے چھوڑ دیا جائے گا لیکن کمیٹی کے آدمیوں سے ایسی کوئی امید
رکھنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت تھی، کسی پر رحم کرنا تو یہ جانتے
ہی نہیں تھے۔ ان دونوں آدمیوں کا رویہ بھی فوراً ہی بدل گیا تھا۔
ان میں سے ایک نے لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے مجھے چلنے
کو کہا" اس لمحے منصورہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"میں اور یہ بچہ بھی اس کے ساتھ جائیں گے" منصورہ نے
ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اسے اکیلی نہیں جانے
دوں گی۔"

"اس کے ساتھ کوئی نہیں جا سکتا" اس آدمی نے کرخت
لہجے میں کہا " قانون کے مطابق یہ اکیلی ہمارے ساتھ جائے گی
کسی اور کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

فرہاد سمجھ گیا تھا کہ مجھے اس سے چھین کر لے جایا جا رہا ہے
وہ مجھ سے لپٹ گیا اس نے میرے کپڑے اس قدر سختی سے
مٹھیوں میں جکڑ لئے تھے کہ انگلیوں کی گرہیں تک سفید پڑ گئی تھیں

"ممی! میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا" اس نے روتے
ہوئے کہا " مجھے چھوڑ کر مت جایئے میں بھی آپ کے ساتھ
جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے" ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے کہا...
یہ دونوں زیادہ سے زیادہ جیل کے دروازے تک ساتھ جا سکتے ہیں
اس کے آگے جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

اس کی یہ ہمدردی بھی کافی تھی۔ میں نے سیمیں کی پیشانی پر
پھر بوسہ دیا اور حسرت بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔
میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر واپس آ بھی گئی تو اس گھر میں مجھے
پناہ کا احساس نہیں رہے گا۔ جب میں دروازے سے باہر نکلی تو
جلال آغا اور اس کے بیوی بچے بھی باہر آ گئے تھے۔ جلال آغا اور
فرح خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ انہوں نے نہ تو
ہمدردی کا ایک لفظ کہا اور نہ ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ مکان کے سامنے
سرمئی رنگ کی پیکان کھڑی تھی جس پر موٹے حروف میں کمیٹی
لکھا ہوا تھا اور چھت پر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے، میں منصورہ
اور فرہاد کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ دونوں اگلی سیٹوں پر تھے۔ لمبی لمبی آٹومیٹک رائفلوں کا کار
میں سمانا ممکن نہیں تھا، اس لئے رائفلوں کی نالیاں کھڑکی سے باہر
نکلی ہوئی تھیں۔ کار جیسے ہی ڈرائیو وے سے نکل کر سڑک پر پہنچی
ان میں سے ایک نے لاؤڈ اسپیکر کا سوئچ آن کر دیا اور فضا ایک
مذہبی رہنما کی آواز سے گونجنے لگی۔ میرے مکان کے سامنے
گیس کمپنی کے ورکر بھی گھروں کے سامنے کھڑے تھے، میں تقریباً
ان سب کو جانتی تھی۔ ابھی دو تین روز پہلے ہی تو میں نے ان کے
گھروں میں کھانا بھجوایا تھا، وہ سب لوگ خاموشی سے ہماری
طرف دیکھ رہے تھے اور میرا چہرہ شرم کی حدت سے تپ رہا تھا۔

کار شہر کی طرف جانے والی ڈھلوان سڑک پر دوڑ رہی تھی
لیکن مجھے ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا
جا رہا تھا۔ شمران اور سلطنت آباد کے خوبصورت اور وسیع
وعریض بنگلے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور اب ہم شہر کے پرہجوم
علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ ٹریفک کی وجہ سے کار کی رفتار بہت ہلکی
ہو گئی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ جھک جھک کر کار میں
دیکھ رہے تھے، ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات
ابھر رہے تھے۔ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ ان دو عورتوں کا کیا
جرم ہو سکتا ہے؟ ان کے ذہنوں میں صرف دو ہی باتیں آ سکتی
تھیں، طوائفیں یا کمیونسٹ۔ بہرحال کسی چہرے پر مجھے ہمدردی کے
تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک کار شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی
بالآخر جب ہم تخت جمشید ایونیو پر ایک شاندار عمارت کے
سامنے پہنچے تو اس وقت سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔

یہ تین منزلہ خوبصورت عمارت میرے لئے اجنبی نہیں تھی
اس کے چاروں طرف وسیع وعریض باغ اور ایک خوبصورت
سوئمنگ پول بھی تھا۔ یہ عمارت ایک دولت مند ایرانی فیملی کی
ملکیت تھی لیکن امام خمینی کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً ہی بعد وہ
لوگ ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ میں اس فیملی کو ذاتی طور پر تو
نہیں جانتی تھی لیکن ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور
میرے خیال میں انہوں نے ملک سے فرار ہو کر عقلمندی کا ثبوت
دیا تھا۔

ڈرائیور نے کار عمارت کے بیرونی گیٹ کے قریب روک لی،
گیٹ کے جنگلے سے دوسری طرف کا منظر نظر آ رہا تھا۔ جہاں کبھی
خوبصورت لان ہوا کرتا تھا وہاں اب خود رو جھاڑیوں کی بھرمار
تھی۔ سوئمنگ پول میں خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اس تباہ
حالی کے باوجود اس عمارت کا شمار اب بھی تہران کی چند
خوبصورت عمارتوں میں ہوتا تھا۔

"چلو۔ اب تم دونوں اتر جاؤ" ڈرائیور نے منصورہ اور فرہاد
دونوں کو اشارہ کیا۔

فرہاد کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ منصورہ ہمارے ساتھ اندر جانے
کو بضد تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "ضد مت کرو
منصورہ! تم فرہاد کو لے کر سامنے والی دکان میں ٹھہر جاؤ۔ آدھے
گھنٹے تک میرا انتظار کرنا اگر میں نہ آئی تو فرہاد کو لے کر گھر چلی
جانا۔"

"تم فرہاد کی فکر مت کرنا، میں اپنے بیٹے کو بلواؤں گی تاکہ
اس کا دل بہلا رہے" منصورہ نے کہا۔

میں نے فرہاد کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور پھر ان دونوں

آدمیوں کے ساتھ گیٹ میں داخل ہو گئی۔ گیٹ کے اندر بھی پختہ سڑک تھی۔ عمارت گیٹ سے خاصی دور تھی' ہم سڑک پر چلتے ہوئے بالآخر وسیع و عریض برآمدے کی سنگ مرمر کی کشادہ سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔

یہ منکرت کا ہیڈ کوارٹر تھا' اس میں جلد ہی بنی ہوئی تھی عمارت کے اندر اچھا خاصا رش تھا۔ مسلح آدمی اور سیاہ پگڑیوں والے مولوی راہداریوں میں آجا رہے تھے' صرف اس عمارت پر کیا منحصر ان دنوں ہر سرکاری دفتر میں اس قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ چھوٹے بڑے مذہبی رہنما ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے۔

منکرت کے اس ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی میرے ذہن پر عجیب سا خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں نے یہ بات بھی فوراً ہی محسوس کر لی تھی کہ یہاں کسی عورت کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میرے دونوں محافظ مجھے اشارہ کرتے ہوئے ایک زینے کی طرف بڑھ گئے۔ میں خوف سے سہمی سہمی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تیسری منزل تک پہنچتے ہوئے میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ ایک طویل راہداری کے اختتام پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ انہوں نے ایک کمرے کے سامنے رکنے کا اشارہ کیا اور ان میں سے ایک نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ یہ منکرت کے متعلقہ شعبے کے سربراہ کا دفتر تھا۔

"آجاؤ" اندر سے ایک آواز ابھری۔

ایک محافظ نے دروازہ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ وسیع و عریض کمرا تھا جو کسی زمانے میں ڈائننگ روم ہوا کرتا تھا لیکن اب اسے دفتر بنا لیا گیا تھا' اس کمرے میں صرف دو میزیں تھیں' بائیں طرف والی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی فائلیں چیک کر رہا تھا۔ میز پر فائلوں کا انبار سا لگا ہوا تھا۔ دوسری میز نسبتاً بڑی اور کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی تھی' اس میز پر بھی فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا ایک آدمی فائلیں دیکھ رہا تھا جبکہ اس کے سامنے کھڑا ہوا ایک ادھیڑ عمر داڑھی والا شخص میز پر جھکا کسی فائل کے بارے میں وضاحت کر رہا تھا۔ بیٹھا ہوا وہ شخص کمیٹی کے اس شعبے کا سربراہ تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچی اس شخص نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اس کی شکل دیکھتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ حسن تھا' وہی شخص جس نے گزشتہ رات میرے گھر کی تلاشی لی تھی اور کئی گھنٹوں تک ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا تھا' اسے دیکھ کر مجھے کسی حد تک اطمینان سا ہوا کیونکہ گزشتہ رات اپنے ساتھی کی نسبت اس نے کسی حد تک شرافت و شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ اس وقت بھی کسی حد تک ہمدردی سے پیش آئے گا لیکن مجھے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ شعبے کے سربراہ کو خود میرے گھر چھاپہ مارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی جبکہ اس قسم کی کارروائیوں کے لئے کمیٹی کے عام کارکنوں سے کام لیا جاتا تھا' میرے خلاف کس قسم کی شکایت کی گئی تھی کہ منکرت کے سربراہ کو خود یہ زحمت کرنی پڑی تھی؟

"تو تم آ گئیں" حسن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا میں تاخیر کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟ اور کیا میرے آدمی وہ تمام فلمیں اور ٹیپ لے آئے ہیں؟"

"ہاں" میں نے قریب کھڑے ہوئے دونوں محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اب بھی یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ حسن چند سوالات پوچھنے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دے دے گا۔

"گزشتہ رات آپ کے کہنے پر میں نے ہر قابل اعتراض چیز جلا ڈالی تھی۔ پھر مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے' میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے' میرا بیٹا باہر سردی میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔"

میں اپنے آپ کو اس کے سامنے بہت ستم رسیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی' وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو گڑگڑا کر ان سے رحم کی بھیک مانگتے تھے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ایک اچھی مسلمان خاتون بننے کی کوشش کروں گی اور کسی غیر مرد کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دوں گی' اگر وہ حکم دے گا تو حقیقی ماموں کو بھی گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی۔ میں یہاں سے نکلنے کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی جو وہ چاہتا تھا پہلے میرا خیال تھا کہ میں محض اداکاری کر رہی تھی لیکن یکایک مجھے احساس ہوا کہ یہ اداکاری نہیں حقیقت تھی۔ یہ خوف تھا جو مجھے سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں واقعی اس کے احکامات پر عمل کرنے کو تیار تھی' لیکن حسن کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات ظاہر نہیں ہوئے تھے وہ چند لمحے خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اور پھر میرے ساتھ آنے والے ایک محافظ کو اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے نیچے لے جاؤ۔ ہٹاؤ یہاں۔"

مجھے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میری آہ و بکا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا' اس کا دل پتھر تھا اور پتھر پگھلا نہیں کرتے۔

دونوں محافظ مجھے حسن کے دفتر سے نکال کر گراؤنڈ فلور پر واقع ایک دفتر میں لے آئے' یہ بھی وسیع و عریض کمرا تھا جس میں لاتعداد میزیں بچھی ہوئی تھیں' اس کمرے میں لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ کمرے کی دیواروں پر امام خمینی کی تصویروں والے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ یہ انٹیروگیشن روم تھا' مختلف سمتوں سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ سوال کرنے والوں کا لہجہ بہت دبنگ اور خوفناک تھا جبکہ جواب دینے والوں کے منہ سے مری مری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اکثر چہروں پر خوف اور دہشت کے سائے رقص کر رہے تھے۔

مجھے ایک میز کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا' میز کے پیچھے بیٹھے

ہوئے شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی اس کا جسم خاصا بھاری بھرکم تھا۔ سر پر سیاہ پگڑی اور سفید داڑھی جس میں چند سیاہ بالوں کی جھلک بھی نظر آرہی تھی' میں اگرچہ میز کے دوسری طرف خاصے فاصلے پر کھڑی تھی لیکن اس کے جسم سے اٹھنے والی پسینے کی بو سے میرا دماغ خراب ہوا جارہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر میرے ساتھ آنے والے محافظ سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

ایک محافظ اسے میرے بارے میں بتانے لگا لیکن مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ میرے بارے میں پہلے ہی سب کچھ جانتا تھا اس کے سامنے فائلوں کے انبار پر سب سے اوپر والی فائل پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ اور اسے میرے جرائم کے بارے میں پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک میرے گھر سے برآمد ہونے والی میرے جرائم کا ثبوت فراہم کرنے والی چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے ان اشیا سے زیادہ دلچسپی نہ ہو لیکن جب پیٹرول کے کوپنوں کی باری آئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا اب بھی تم اس ڈرائیور کا نام نہیں بتاؤ گی جس سے تم نے غیر قانونی طور پر یہ کوپن خریدے تھے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا "تم اس کے بارے میں جانتی ہو اور تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ دولت کی فراوانی نے تم لوگوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ تم لوگ سمجھتے ہو دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہو جبکہ دوسرے ان چیزوں سے محروم ہیں' میں اس ڈرائیور کا نام ... کی گاڑی کا نمبر اور رنگ جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں کمیٹی کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ میں اس شخص کا نام نہیں جانتی نہ ... گاڑی کا نمبر اور ماڈل وغیرہ یاد ہے۔ میں نے اس طرف بھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ گاڑی کا رنگ سرخ تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اس وقت تک جیل میں رہو گی جب تک تمہیں سب کچھ یاد نہ آجائے' سمجھیں" اس نے حسب سابق کرخت لہجے میں کہا۔

میں گڑگڑا کر اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگی لیکن میرے الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس نے محافظوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے لے جاؤ' ممکن ہے دو چار روز بعد اسے سب کچھ یاد آجائے۔"

اسی لمحے سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی بھاری بھرکم ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے چادر کے علاوہ سر پر ایک اسکارف بھی اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ آنکھوں اور ناک کے علاوہ اس کا چہرہ پوری طرح چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور بے دردی سے کھینچتی ہوئی دفتر سے باہر لے آئی۔

میں اس وقت منصورہ اور فرہاد کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس عالیشان عمارت کے سامنے ایک دکان میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اندر آئے ہوئے تقریباً پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔ کیا وہ اب بھی دکان میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے؟ میں نے اس عورت کی طرف دیکھا۔

"میرا بیٹا باہر سڑک پر بیٹھا ہوا ہے' مجھے اتنی اجازت دو کہ میں اسے جا کر بتا دوں" میں نے کہا۔

"یہاں آنے کے بعد کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں' نہ ہی کوئی پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ دفتر میں بیٹھے ہوئے داڑھی والے سے بھی سخت تھا۔

"صرف دو منٹ کی بات ہے۔ میں اسے بتا کر فوراً واپس آجاؤں گی۔ تمہارے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے۔ کچھ تو رحم کرو۔"

"تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟" داڑھی والا ہمیں دروازے کے سامنے کھڑا دیکھ کر چیخا "جاؤ' چلی جاؤ یہاں سے۔"

وہ عورت مجھے کھینچتی ہوئی جلدی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ میرا جسم اس وقت تھر تھر کانپ رہا تھا اور میں روتے ہوئے اس عورت سے فریاد کر رہی تھی کہ میرے بیٹے تک میرا پیغام پہنچا دیا جائے لیکن وہ میری کسی بات کا جواب دیے بغیر مجھے گھسیٹتی ہوئی سیڑھیوں پر لے آئی۔

تہ خانے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں پکڑی گئی تو مجھے تم سے زیادہ سخت سزا ملے گی لیکن میں تمہارے بیٹے کو کسی نہ کسی طرح بتا دوں گی کہ تم یہیں رہو گی اب خاموش رہو' کوئی لفظ تمہارے منہ سے نہ نکلے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن اس نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے مجھے تہ خانے کی سیڑھیوں پر دھکیل دیا۔

تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے احساس ہو رہا تھا جیسے مجھے کسی سرد خانے میں لے جایا جا رہا ہو۔ ایک عجیب ناگوار سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ تہ خانے کے دروازے پر کئی محافظ عورتیں کھڑی تھیں' موٹی چادروں میں لپٹی ہونے کے باوجود بھی ان کے جسموں کے صحت مند خطوط نمایاں ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بیزاری سی طاری تھی۔ میری تلاشی لیتے ہوئے بھی بیزاری اور اکتاہٹ کا اظہار واضح تھا' تہ خانے کی طویل راہداری کے دائیں طرف ایک لمبی میز پر امام خمینی کی تصویروں پر مشتمل پمفلٹ اور کتابچے رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر خمینی کی تصویروں والے پوسٹر آویزاں تھے۔ ایک طرف اسپرنگوں والا بیڈ بچھا ہوا تھا جس پر سرخ رنگ کا پلاسٹک بچھا ہوا تھا۔ تہ خانے کے نیم تاریک ماحول میں سرخ رنگ کا یہ بیڈ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا لیکن اس کی سائیڈوں میں چمڑی فیتے لٹکے ہوئے دیکھ کر مجھ

دہشت سی طاری ہوگئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جیل میں آنے والی عورتوں کو اس بیڈ پر لٹا کر کوڑے لگائے جاتے تھے اور ان فیتوں سے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے جاتے تھے۔ میں نے جلدی سے اس طرف سے منہ پھیر لیا۔

محافظ مجھے لے کر راہداری میں چلنے لگی جس کے دونوں طرف کئی دروازے تھے۔ ہر دروازے کے سامنے پردہ پڑا ہوا تھا اس نے ایک دروازے کا پردہ ہٹادیا' اندر کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے زیادہ دیر یہاں نہیں رہنا' کیا میں یہیں کرسی پر بیٹھ سکتی ہوں؟" میں نے محافظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دور کھڑی ہوئی ایک اور محافظ نے میری آواز سن لی تھی۔ وہ چیختی ہوئی ہمارے قریب آگئی اور ایک دوسرے دروازے کا پردہ ہٹا کر مجھے اندر دھکیل دیا۔

اندر کا ماحول نیم تاریک تھا جس سے مانوس ہونے کے لئے چند سیکنڈ لگے۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا جس کی لمبائی تقریباً پچاس فٹ اور چوڑائی تیس فٹ تھی۔ اس کمرے میں لاتعداد عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ درجنوں آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور رخ پھیر لیا۔ میری آمد اس سرد اور تاریک تہہ خانے میں ایک اور اضافہ تھا اور ظاہر ہے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ان میں سے کچھ عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں اور اکثریت ایسی عورتوں کی تھی جن کا تعلق درمیانے یا نچلے طبقے سے تھا' انہوں نے سوتی کاٹن کے ڈھیلے ڈھالے سے لباس پہن رکھے تھے۔ لیکن تقریباً ہر عورت کے سر پر حجاب نظر آرہا تھا جس سے ان کے چہرے بھی کسی حد تک چھپ کر رہ گئے تھے۔ ان عورتوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انہیں کبھی پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملا ہوگا۔ ایسے ستے ہوئے اور فاقہ زدہ چہرے تو میں نے کبھی ٹی وی پر کسی دستاویزی فلم میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ ان میں سے بعض عورتیں آپس میں بات کرتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔

اس تہہ خانے میں اگرچہ کئی کھڑکیاں تھیں لیکن وہ اتنی اونچی تھیں کہ ان سے باہر جھانکنا ممکن نہیں تھا۔ تہہ خانے کے فرش پر پتلا سا قالین بچھا ہوا تھا اس پر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوگیا کہ یہ قالین پانی میں بھیگا ہوا ہے۔ تہہ خانے میں ان عورتوں کے جسموں سے اٹھنے والی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کئی روز سے انہیں نہانے کو تو کیا منہ دھونے کے لئے بھی پانی نہیں ملا ہوگا۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر میں کانپ کر رہ گئی۔

میں کچھ دیر تک اس وسیع و عریض کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر بائیں طرف دیوار کے قریب تھوڑی سی خالی جگہ دیکھ کر اسی طرف بڑھنے لگی۔ دفعتاً میرے قریب فرش پر لیٹی ہوئی ایک عورت چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگی۔ وہ اگرچہ فارسی بول رہی تھی مگر ایسی بگڑی ہوئی فارسی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

"اپنے یہ گندے جوتے اتار دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں ہم نماز پڑھتے ہیں اور تم نواب زادیوں کی طرح جوتیوں سمیت چلی آرہی ہو۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے قریب ہی جوتوں کا انبار لگا ہوا تھا' جلدی سے بوٹ اتار کر اس ڈھیر میں پھینک دیئے چند سیکنڈ بعد ہی گیلے قالین پر میرے موزے بھیگ گئے تھے۔ میں جوتوں کے ڈھیر کے قریب اس طرح بیٹھ گئی جیسے موزے اتارنا چاہتی ہوں لیکن دوسروں کی نظر بچا کر میں نے اپنے بوٹ اٹھا کر لباس میں چھپالئے اور خالی جگہ کی طرف بڑھنے لگی۔ کمرے کے اس کونے میں تھوڑی سی جگہ ایسی تھی جہاں قالین نہیں تھا۔ میں نے جوتے وہاں رکھ دیئے اور دوسری عورتوں کی طرح میں بھی سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد میں ایک بار پھر صورت حال کا جائزہ لینے لگی دراصل میں دوسروں کی توجہ چاہتی تھی۔ کوئی مجھ سے یہ تو پوچھے کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں لائی گئی ہوں لیکن مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس تہہ خانے کی بد حال عورتیں بھی امام خمینی کی طرح مجھ جیسی طاغوتی سے شدید نفرت کرتی ہیں۔ یہاں ہر عورت کو ایک کمبل دیا گیا تھا جسے انہوں نے یا تو نیچے بچھایا ہوا تھا یا تہہ کر کے تکیے کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ یہ کمبل نہایت گندے تھے جن کی بو سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں نے بہرحال طے کرلیا تھا کہ خواہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرتی رہوں یہ کمبل استعمال نہیں کروں گی۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر کمبل کی طرح اوڑھ لیا اور دوسری عورتوں کی نظر بچا کر بوٹ بھی پہن لئے لیکن دوسری عورتوں کے لئے یہ کمبل بہت قیمتی تھے۔ اسی وقت ایک کمبل کی ملکیت پر دو عورتوں میں جھگڑا شروع ہوگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئیں۔ پہلے غلیظ گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا پھر وہ لڑاکا مرغیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں۔ وہ ایک دوسرے کے بال نوچنے کے علاوہ لاتوں اور گھونسوں سے حملہ آور ہو رہی تھیں۔ ان کی چیخم دھاڑ کی آوازیں سن کر ایک محافظ عورت دوڑتی ہوئی اندر پہنچ گئی۔ اس نے صرف ایک لمحہ صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر چیخ کر دھمکی دی کہ اگر انہوں نے فوری طور پر جھگڑا ختم نہ کیا تو دونوں کو سزا دی جائے گی۔

ان کا جھگڑا فوراً ہی ختم ہوگیا' محافظ عورت واپس چلی گئی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں' تمام عورتیں بیک وقت بول رہی تھیں' کچھ اس لڑائی پر افسوس کا اظہار کررہی تھیں اور کچھ خوش ہو رہی تھیں۔ چند عورتوں نے سہم کر رونا شروع کردیا تھا۔ ایک عورت میرے بائیں طرف چادر میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ آگے پیچھے جھولتے ہوئے دوسری

عورتوں کو اپنی تکلیف کے بارے میں بتا رہی تھی مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات نمایاں تھے اور وہ کراہتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ مجھے گرفتار کیوں کیا گیا ہے؟"

میرے دائیں طرف والی لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ سال رہی ہوگی وہ ماں بننے والی تھی اور زچگی کے آخری مرحلے میں تھی' وہ اپنی جگہ بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی اس کے ساتھ ہی وہ بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جب درد اٹھتا وہ بے اختیار کراہ اٹھتی۔ اس نے کاٹن کا ہلکا سا لباس پہن رکھا تھا۔ لمبے براؤن بال' ہرن جیسی خوبصورت آنکھیں وہ یقیناً حسین لڑکی تھی لیکن تکلیف کی شدت نے اس کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ وہ بار بار کراہتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میرا شوہر کہاں ہے؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

وہ ترکی زبان میں بول رہی تھی اور میرے خیال میں اسے ترکی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ اس کے لباس سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی دیہی علاقے کی رہنے والی تھی' تہران جیسے شہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

تہہ خانے کی دوسری عورتوں نے ان دونوں کو قطعی نظر انداز کر رکھا تھا۔ وہ دونوں اس جیل میں نئی آئی تھیں اور تیسری میں تھی اور یہ اتفاق ہے کہ ہم تینوں کو ایک ہی کمرے میں جگہ ملی تھی۔ ہال کے وسط میں بیٹھی کچھ عورتیں اپنی ساتھیوں کو دلچسپ کہانیاں سنا رہی تھیں' لیکن غالباً کسی کو بھی ان کہانیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سب فرش پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھیں مگر بولنے والی عورتیں کسی ماہر داستان گو کی طرح بولے چلی جا رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت کہہ رہی تھی۔

"انہوں نے اس عورت کو اس بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جیسے انسانی زندگی کی کوئی وقعت ہی نہ رہی ہو۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکال کر باغ میں لے گئے اور اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا' گولیوں کی آواز پورے محلے نے سنی تھی' ہم نے اسے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ایک اور عورت اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"میں نے بھی ایک عورت کو مرتے ہوئے دیکھا ہے" وہ کہنے لگی "وہ چار ماہ کے لئے حمل سے تھی اور خیال تھا کہ اسے بچے کی ولادت تک چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ لوگ انسان نہیں درندے ہیں۔ یہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے اور اسے سوئمنگ پول میں پھینک دیا' وہ پانی میں غوطے کھاتی ہوئی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگی اور پھر جیسے ہی کنارے کے قریب پہنچی اس پر چاروں طرف سے گولیاں برسا دی گئیں' سوئمنگ پول کا پانی اس کے خون سے سرخ ہو گیا۔"

ایک اور عورت نے میرے قریب بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی کی طرف اشارہ کیا' اس کے بال مردوں کی طرح کٹے ہوئے تھے اور چہرے پر بھی مردانہ پن تھا اس نے بھی نچلے طبقے کی عورتوں کی طرح پھول دار کاٹن کی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہن رکھی تھی۔

"کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسے کیا سزا دی گئی ہے؟"

اس عورت نے کہا پھر کسی طرف سے جواب نہ پا کر خود ہی بولی۔

"موت' یہ شادی شدہ ہے اور اس کا جرم یہ ہے کہ اسے کسی اور آدمی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔"

جس لڑکی کے بارے میں بات کی جا رہی تھی وہ ان باتوں سے لاتعلق اپنے قریب بیٹھی ہوئی ایک اور لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی' اس کی گفتگو اور چہرے سے کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اسے موت کی سزا ملنے والی ہے۔

تہہ خانے میں داستان گوئی کا سلسلہ جاری رہا' کوڑے لگائے جانے کی کہانیاں' لوگوں کے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے قصے اور جیل کی محافظ عورتوں کے ظلم و ستم کی داستانیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں اس جیل میں مجھ جیسی نئی آنے والیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ ان باتوں کو سننے کے بعد میں یہ سوچنے لگی تھی کہ اگر چند کوڑوں کی سزا کے بعد مجھے چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی میری خوش قسمتی ہوگی۔

تہہ خانے کی دیواروں پر لگے ہوئے لاتعداد پوسٹر یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھے کہ ہم امام خمینی سے فرار حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ امام خمینی کی تصویروں کے علاوہ جلی حروف میں ان کی تقریروں کے اقتباسات اور تعلیمات پر مبنی پوسٹر بھی نظر آ رہے تھے' ایسے پوسٹر بھی دکھائی دے رہے تھے جن میں ڈرائنگ کے ذریعے نماز کے طریقے بتائے گئے تھے۔ ماموں فروش نے بتایا تھا کہ جیل میں قیدیوں کو نماز پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والوں کو نماز پڑھنا بھی آتی تھی یا نہیں۔ میں نے کبھی نماز پڑھنا نہیں سیکھی تھی' اور اب جیل کے اس تہہ خانے میں لگے ہوئے پوسٹروں کو دیکھ دیکھ کر نماز کے طریقوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امام خمینی کی جیلیں ہٹلر کے کنسنٹریشن کیمپوں سے مختلف نہیں تھیں۔ یہاں بھی سرکاری جاسوسوں کی بھرمار تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان عورتوں میں سے کون میری نگرانی کر رہی تھی یا کس وقت مجھے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے۔ خوف کی شدت سے میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا' لیکن اس کے باوجود میں نماز کے طریقے یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

سردی کی شدت اور ٹھنڈی جگہ پر بیٹھے رہنے سے مجھے ہاتھ

روم جانے کی حاجت محسوس ہوئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی اور ... وہ ہٹا کر کسی محافظ کی تلاش میں راہداری میں نظریں دوڑانے لگی، لیکن جب کوئی محافظ نظر نہ آئی تو میں دروازے سے نکل کر راہداری میں آگئی عین اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک محافظ عورت نکل کر سامنے آگئی۔

"اے" وہ چیخی "کہاں جارہی ہو؟"

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا' اس کی عمر کسی طرح بھی اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

"سسٹر! میں باتھ روم جانا چاہتی ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ باتھ روم کس طرف ہے؟" میں نے کہا۔

"آئندہ مجھے سسٹر مت کہنا" اس نے ناگوار لہجے میں کہا اور دوسری محافظ عورتوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی جو اسی وقت وہاں پہنچی تھیں "تم جیسی شہزادیوں کے لئے ہم نے بہترین باتھ روم بنا رکھا ہے۔ اس راہداری کے آخر میں بائیں طرف والے دروازے میں چلی جاؤ لیکن جلدی واپس آجانا۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے آکر تمہیں وہاں سے نکالنا پڑے۔"

مجھے اس لڑکی کے طرز عمل پر شدید حیرت ہوئی تھی' اتنی کم عمری میں ایسا سفاکانہ رویہ' کمینی' دراصل ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی۔ یہی سوچتی ہوئی میں باتھ روم میں داخل ہو گئی لیکن اندر قدم رکھتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ باتھ روم غلاظت سے بھرا ہوا تھا اور تعفن سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اس تہہ خانے میں صرف ہمارا ہی کمرا نہیں تھا دو اور کمرے بھی تھے جن میں قیدی عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ اس طرح اس قید خانے میں قیدیوں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک سو تھی اور اتنی بڑی تعداد کے لئے صرف ایک باتھ روم بہت ہی ناکافی تھا' میں فارغ ہو کر فوراً ہی باہر نکل آئی۔

اگرچہ شام کے ساڑھے سات بجے تھے لیکن لگتا تھا جیسے رات نصف سے زیادہ بیت گئی ہو۔ تقریباً اسی وقت کھانا تقسیم کیا جانے لگا۔ پلاسٹک کے پیالوں میں گدلا سا شوربا تھا جس سے ناگوار سی مہک اٹھ رہی تھی۔ چمچے ان دھلے تھے' میرے ہاتھ میں پیالہ تھمائے جانے سے پہلے ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں یہ کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ میں پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ سوپ کس چیز سے بنایا گیا ہوگا۔ اس شوربے میں آلو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے' مٹر' گاجروں کے ٹکڑے اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی نظر آرہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ہیڈ کوارٹر کے عملے کا بچا کھچا کھانا تھا جو قیدیوں کو دے دیا گیا تھا۔

دوسری قیدی عورتیں میری طرح نہیں تھیں' وہ بھوکی لگ رہی تھیں ... کھانے کو دیکھ رہی تھیں' بعض عورتوں نے دوپہر کی بچی ہوئی روٹی نکال لی جو انہوں نے رومالوں میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے چھپا رکھی تھی' وہ بڑے اطمینان سے روٹی شوربے میں بھگو بھگو کر کھانے لگیں' کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔

ترکی زبان بولنے والی وہ لڑکی جو اپنی ہی مصیبت میں گرفتار تھی' میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"سسٹر!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم کھانا کیوں نہیں کھا رہیں۔ جسم اور روح کا ناتا قائم رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کھانا ضروری ہے۔"

"میری فکر مت کرو۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکی تھی" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو شاید میں بھی نہ کھا سکوں۔ پلیز! تھوڑا بہت کھالو" اس کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت اور محبت تھی

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے" میں نے پھر انکار کر دیا۔

"اگر تم واقعی کھانا نہیں چاہتیں تو یہ کھانا میں ... لے لوں؟" اس مرتبہ اس کے لہجے میں ہلکی سی شرمندگی بھی تھی۔

"اوہ' کیوں نہیں' مجھے بے حد خوشی ہوگی" میں نے جواب دیا۔

وہ سرک کر میرے قریب آگئی' اس نے کن انکھیوں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے میرا پیالہ اپنی طرف سرکا لیا۔ کھانے کے دوران وہ سرگوشیوں میں مجھے اپنی کہانی سنانے لگی۔

"میرا تعلق آذربائیجان کے علاقے ... سے ہے۔ میری شادی دس مہینے پہلے ہوئی تھی اور اب ماں بننے والی ہوں۔ دو دن پہلے میرے دیور نے مجھے کار پر سیر کی پیشکش کی جسے میں نے فوراً ہی قبول کر لیا' دراصل مجھے گاؤں سے نکلنے کا موقع بہت کم ملتا تھا ان دنوں مجھ پر سخت بوریت سوار تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو شہر کی تفریح ہو جائے گی لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا چاہئے تھا۔ گاؤں سے نکلتے ہی میرے دیور نے اپنے ایک دوست کو بھی کار میں بٹھا لیا۔ گاؤں سے کافی دور نکل آنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ کار روک لی اور مجھے گھسیٹتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے جہاں ان دونوں نے مجھے لوٹ لیا" اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی جیسے اب بھی اس واقعے کی یاد سے خوف محسوس کر رہی ہو۔

"وہ مجھے ویرانے میں چھوڑ گئے۔ میں تقریباً دس میل تک ٹھوکریں کھاتی ہوئی کسی نہ کسی طرح گاؤں پہنچ گئی۔ میں نے اپنے شوہر کو بتایا تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ یہ بات اس وقت میرے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ اس سلسلے میں مجھے خاموشی اختیار کر لینی چاہئے۔ میرا شوہر مجھے ہی لعنت ملامت کرنے لگا۔ اس پر جنون سا طاری ہو رہا تھا اور وہ سب کو قتل کر دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ اسی روز مجھے تہران لے آیا تاکہ اپنے بھائی کے

خلاف رپورٹ لکھوا سکے۔ اس کی رپورٹ پر کمیٹی نے میرے دیور اور اس کے دوست کو گرفتار کرلیا۔ آج صبح انہیں اسی اسی کوڑوں کی سزا دینے کے بعد چھوڑ دیا گیا لیکن پھر مجھے یہاں بند کردیا گیا' میں نہیں سمجھ سکتی کہ یہ لوگ میرے خلاف کس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ میں اسے تسلی دینے کی کوشش کررہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کے خلاف کیا کہوں۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے اپنا مسئلہ تو بہت ہی معمولی نظر آنے لگا تھا۔

ہمارے قریب چادر میں لپٹی ہوئی دوسری عورت بھی اس کی باتیں سن رہی تھی' اس کے خاموش ہوتے ہی وہ بولی۔

"میری بات سننے کے بعد تم ہی فیصلہ کرو کہ میرا کیا جرم ہوسکتا ہے؟" وہ کہنے لگی "میں ایک ٹیکسی پر مارکیٹ سے گھر جارہی تھی' میں اگلی سیٹ پر تھی۔ ایک اور آدمی میرے ساتھ اس سیٹ پر بیٹھ گیا' اس نے اپنی سہولت کے لئے اپنا ہاتھ میری سیٹ کی پشت پر رکھ لیا اس طرح" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا "ہم دونوں اگلی سیٹ پر تھے' کمیٹی والوں نے کارروائی' کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ وہ صرف ہر شخص کے بارے میں چیکنگ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ آدمی تمہارا رشتے دار ہے' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا کہ یہ بھی ایک مسافر ہے جو ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا' میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن کمیٹی والے میری بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے' ان کا کہنا تھا کہ وہ شخص جس طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا وہ یقیناً میرا عاشق ہوگا۔ انہوں نے مجھے اور اس اجنبی کو گرفتار کرلیا۔ میرے شوہر نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا' میں پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ سب سے چھوٹا بچہ تو ابھی صرف تین مہینے کا ہے' وہ بچہ میرا دودھ پیتا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر فون تک کرنے کی اجازت نہیں دی' میرے گھر والوں کو کچھ پتا نہیں کہ میں کہاں ہوں' وہ مجھے کہاں تلاش کریں؟ ہوسکتا ہے وہ شہر کے اسپتالوں میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں کہ شاید میرا ایکسیڈنٹ نہ ہوگیا ہو' یہ تو وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں جیل میں پڑی ہوں گی۔"

وہ عورت بھی رونے لگی' وہ تو باقاعدہ سینہ کوبی کرنے لگی تھی میں اس سے بھی ہمدردی کا اظہار کرنے لگی۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

"سوسن آزادی تمہیں طلب کیا جارہا ہے۔"

میں اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ بالآخر میرے ماموں نے مجھے اس جہنم سے نکالنے کا بندوبست کر ہی لیا تھا' اب مجھے اس جہنم میں رات نہیں گزارنا پڑے گی' مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ فرہاد کو میرا پیغام مل گیا تھا یا نہیں' لیکن میں نے ابھی سے یہ سوچنا شروع کردیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی اسے سینے سے لپٹالوں گی اور خوب پیار کروں گی۔ میں وہاں سے ہٹنے ہی والی تھی کہ چادر میں لپٹی ہوئی عورت نے کہا۔

"تم چادر کے بغیر ان کے سامنے نہیں جاسکتیں' جب تک تمہارے جسم پر چادر نہیں ہوگی وہ تم سے بات بھی نہیں کریں گے۔"

اس نے اپنی چادر اتار کر میری طرف بڑھادی۔ میں نے بادل ناخواستہ اس سے چادر لے لی' یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اپنی مرضی کے خلاف چادر اوڑھنے جارہی تھی' امام خمینی کے انقلاب نے بالآخر مجھے یہ انقلابی یونیفارم پہننے پر مجبور کرہی دیا تھا۔

چادر اوڑھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اوپر ناگوار سا بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ سوسن آزادی چادر کی تاریکی میں غائب ہوگئی تھی' جیسے روشنی میں رہنے والے جانور کو اندھیرے غار میں دھکیل دیا گیا ہو۔ میری صرف آنکھیں برہنہ تھیں لیکن رو رو کر سوجی ہوئی وہ آنکھیں بھی شاید میری نہ رہی ہوں۔

میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچی' محافظ عورت نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے تہہ خانے سے نکال کر گراؤنڈ فلور پر انٹروگیشن روم میں لے گئی۔ کمرے میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے' داڑھی والے جس موٹے آدمی نے پہلے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی وہ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں صرف ایک برنر جل رہا تھا جس سے حدت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ کچھ دیر کے لئے تہہ خانے کے سرد جہنم سے نکل آئی تھی۔

مجھے امید تھی کہ میرے تحقیقاتی آفیسر اس مرتبہ میری توہین اور ذلت کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کریں گے لیکن اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر ان کے لہجے میں کسی حد تک شائستگی تھی۔ وہ ایک بار پھر میری گرفتاری کی وجوہات پر باز پرس کرنے لگے۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ میں نے پیٹرول کے وہ کوپن کہاں سے لئے تھے اور کمال سے کیا رشتہ تھا۔ اس مرتبہ بھی میرا جواب یہی تھا کہ کمال ہمارا خاندانی دوست اور بزنس ایڈوائزر ہے اور اس وقت ایک کاروباری معاملے میں مشورہ کرنے کے لئے آیا ہوا تھا۔

میرے اس جواب پر کمیٹی کا ایک آدمی جو غالباً میرے کیس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا' حیران سا رہ گیا۔

"لیکن کمال نامی اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے' اس کے کہنے کے مطابق اس اس رات وہ شادی کی تجویز لے کر تمہارے گھر آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ہر قیمت پر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ اگر ممکن ہو تو قاضی کو یہیں بلوا کر تم سے اس کا نکاح پڑھوا دیا جائے۔"

اس انکشاف پر میں لرز اٹھی' میں نہیں جانتی تھی کہ کہا!

نے ان لوگوں کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا۔ میرا اس سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' میں تو جیل میں شادی کے خیال ہی سے کانپ اٹھی تھی دفعتاً میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا' اگر کمیٹی والے چاہیں تو کمال سے شادی کی شرط پر مجھے رہا کر سکتے تھے' لیکن میں کمال سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"نہیں نہیں" میں جلدی سے بولی "ہم میں شادی کے موضوع پر کبھی بھی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی میں شادی کرنا چاہتی ہوں' میرے شوہر کے انتقال کو ابھی تین سال ہی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں کمال کو تو اچھی طرح جانتی بھی نہیں۔"

"ہمیں بہرحال یہ سارا معاملہ صاف کرنا ہے۔ تمہیں جیل میں روکے رکھنے کی مجھے کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ شاید صبح تمہیں رہا کر دیا جائے۔"

میں مارے خوشی کے اچھل پڑی' خوشی سے بے قابو ہو کر میں اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھی لیکن پھر یکایک رک گئی۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ گزشتہ رات ایسا کرنے پر حسن نے کس طرح میری توہین کی تھی۔

"کیا میں ابھی جا سکتی ہوں؟ میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"اس وقت!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "ایک اچھی مسلمان عورت رات کو کبھی باہر نہیں نکلتی' تم گھر کیسے جاؤ گی؟"

"ٹیکسی پر" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"ٹیکسی پر!" اس کی حیرت برقرار رہی "رات کے وقت کسی عورت کو ٹیکسی پر سفر نہیں کرنا چاہئے' تمہیں صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں نے آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ دونوں ٹس سے مس نہیں ہوئے اور پھر انہوں نے مجھ سے ایک اور سوال پوچھا۔

"تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

"وہ آذربائیجان میں ہے' زمیندار ہے" میں نے جواب دیا دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو چکی تھی میرے اس جواب پر ان کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔ جو شخص ابھی مجھ سے سوال کرتا رہا تھا وہ میری طرف دیکھتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

"تو تم ایک غاصب زمیندار کی بیٹی ہو' تم لوگ وہ جونکیں ہو جو اس ملک کی رگوں کا خون چوس رہی ہیں۔ جاؤ یہاں سے چلی جاؤ۔ اب تمہیں اس وقت رہائی ملے گی جب ہم چاہیں گے۔"

جب میں دوبارہ تہہ خانے میں پہنچی تو محافظ نئی قیدی عورتوں میں کمبل تقسیم کر رہی تھیں' اس مرتبہ میں نے انکار نہیں کیا' گرم کپڑے اور موٹا اونی کوٹ ہونے کے باوجود سردی میری ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر رہی تھی۔ میں کمبل لے کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

اس وقت مجھے پہلی بار پتا چلا کہ کچھ قیدی عورتوں کے ساتھ بچے بھی تھے۔ ایک عورت کی گود میں دس ماہ کی بچی تھی اور وہ محافظوں کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی بچی کے لئے ایک فاضل کمبل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی' جبکہ دوسری عورت اس پر اپنے کمبل کی چوری کا الزام لگا رہی تھی۔ ان دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ محافظ عورت نے آکر انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے خاموش کر دیا۔ اس وقت ایک اور سنسنی خیز منظر بھی دیکھنے کو ملا۔ ایک عورت کا تین سالہ بچہ اس کے قریب فرش پر لیٹا ہوا تھا اور ایک شیر خوار بچی اس کی گود میں بھی تھی جسے وہ کمبل میں لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

صدمے سے میری بری حالت ہو رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ معصوم بچے اس شدت کی سردی میں رات کس طرح گزاریں گے۔ یہ لوگ اتنے بے رحم تھے کہ انہیں معصوم بچوں پر بھی ترس نہیں آیا تھا۔ مجھے فرہاد کا خیال آگیا' اگر وہ یہاں پر ہوتا تو نہ جانے اس پر اور مجھ پر کیا بیتتی' لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے گھر پر تھا اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی موجود تھا۔

میں نے کمبل چٹکیوں سے پکڑ کر قالین پر بچھا لیا تاکہ فرش کی کم سے کم ٹھنڈک میرے جسم تک پہنچ سکے۔ پیروں کی سردی بچانے کے لئے میں نے بوٹ بھی نہیں اتارے تھے' میں سمٹ سمٹا کر کمبل پر لیٹی ہی تھی کہ میری نظریں ایک "لاوارث" کمبل پر جم گئیں۔ جو میرے قریب ہی پڑا ہوا تھا' میں نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی اس کمبل کا دعوے دار نہیں تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے وہ کمبل کھینچ کر اپنے کوٹ میں چھپا لیا اور اسے لپیٹ کر تکیہ بنا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی کو میرے پاس اس دوسرے کمبل کی موجودگی کا پتا نہیں چل سکا تھا' میں نے اس کمبل کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس خوفناک ماحول میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے قریب ہی ترکی بولنے والی لڑکی رات بھر تکلیف کے باعث کراہتی رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے یہاں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب تکلیف بڑھ جاتی تو وہ بری طرح ہاتھ پیر پٹخنے لگتی۔ تکلیف کی شدت سے کسی وقت اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی تو دوسری قیدی عورتیں اسے چلا چلا کر برا بھلا کہنے لگتیں۔

"خاموشی سے لیٹی رہو۔ دوسروں کی نیند بھی خراب کر رہی ہو۔ یہاں کوئی تمہاری مدد کرنے نہیں آئے گا۔ اگر تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں تو ہال سے باہر نکل جاؤ۔"

"اب اگر یہ شور مچائے تو اسے اٹھا کر ہال سے باہر پھینک دو۔"

وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ہال کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ تکلیف اب اس کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی اس عورت سے جس نے مجھے چادر دی تھی پوچھا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟ کیا انہیں کسی کی تکلیف کا احساس نہیں؟ وہ جانتی ہیں کہ یہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔ اگر اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتیں تو اسے اس طرح برا بھلا تو نہ کہیں۔"

"حیرت ہے" اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں ان عورتوں کے بارے میں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ طوائفیں ہیں۔ منشیات کی عادی انقلاب کے فوراً ہی بعد کمیٹی نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ ان میں سے بیشتر عورتیں ایسی ہیں جو تقریباً دو سال سے اسی تہ خانے میں بند ہیں۔ کچھ عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان سے کسی ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

وہ ترک لڑکی ہال سے باہر جاچکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی چیخ کی آواز سنائی دی تو میں صورت حال معلوم کرنے کے لئے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ وہ راہداری میں لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ کبھی پیٹ پکڑ کر دہری ہوجاتی اور کبھی اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لئے دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑی ہوجاتی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہورہا تھا۔ تکلیف بڑھتی تو اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل جاتی۔ میں ان مذہبی رہنماؤں کے بارے میں سوچنے لگی جنہوں نے اس لڑکی کو جیل میں بند کیا تھا۔ میرے خیال میں وہ انسان کہلانے کے قابل بھی نہیں تھے۔ معصوم شیر خوار بچے جیلوں میں سردی کی شدت سے ٹھٹھر رہے تھے۔ یہ لڑکی اپنے بچے کو جنم دینے والی تھی لیکن کسی کے دل میں رحم نہیں تھا۔ اب تو محافظ عورتیں بھی اسے برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

"اپنی جگہ پر جاؤ اور آرام سے لیٹی رہو" ایک محافظ عورت نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "یہاں کوئی تمہارے نخرے نہیں اٹھائے گا... اور اگر اب تمہارے منہ سے آواز نکلی تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔"

وہ لڑکی اپنی جگہ پر واپس آگئی۔ وہ اپنی جگہ پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کی منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہورہی تھیں۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک محافظ عورت نے دروازے پر نمودار ہوکر اعلان کیا کہ پندرہ منٹ بعد لائٹ بند کردی جائے گی۔ اگر کسی کو باتھ روم جانا ہو تو اس موقع سے فائدہ اٹھالے۔ لائٹ بند ہونے کے بعد ہال کا دروازہ بھی باہر سے بند کردیا جائے گا جو صبح چھ بجے سے پہلے نہیں کھلے گا۔ یہ سنتے ہی میں اس محافظ عورت کی پاس پہنچ گئی اور اسے بتایا کہ سردی کی وجہ سے مجھے بار بار حاجت محسوس ہورہی ہے۔ اگر دروازہ بند کردیا گیا تو میں حاجت کے لئے کہاں جاؤں گی؟

"یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔" محافظ عورت نے بلی کی طرح غراتے ہوئے کہا "دروازہ بند ہونے کے بعد تم صرف ایک مرتبہ آواز دے کر بلا سکتی ہو۔ ہم رات بھر تمہاری ڈیوٹی نہیں دیتے رہیں گے۔"

ٹھیک پندرہ منٹ بعد لائٹ بند ہوگئی۔ پورے ہال میں سرسراہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ عورتیں اپنے آپ کو آرام پہنچانے کے لئے بار بار کروٹیں بدل رہی تھیں لیکن ظاہر ہے یہاں کسی کروٹ آرام نہیں مل سکتا تھا۔ وہ ترک لڑکی میرے ساتھ چت کر لیٹی ہوئی تھی اور میں اس کے جسم کی حرارت محسوس کررہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس گھنٹے میں اس کے ہاں ولادت ہوجائے گی۔

میں ایک بار پھر فرہاد کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس بوڑھی محافظ عورت نے فرہاد کو میرا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں۔ میں اس سلسلے میں بار بار تہ خانے کی محافظ عورتوں سے پوچھتی رہی تھی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں کونے میں سمٹ کر لیٹ گئی۔ کوٹ کو اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند کا کوسوں دور تک پتا نہیں تھا۔ میرا ذہن پراگندہ ہورہا تھا اور میں بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ کمیٹی میرے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی۔ میری قسمت کی ڈور ان مردوں کے ہاتھ میں تھی جو عورتوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ یہاں کسی سے انصاف کی توقع نہیں تھی۔ ہر شخص کا اپنا قانون تھا۔

ترک لڑکی کی کراہیں مسلسل میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اڑتالیس گھنٹوں سے نہ تو سوئی تھی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا تھا۔ اس کے باوجود میری آنکھوں میں نہ تو نیند کا نشان تھا اور نہ ہی بھوک پیاس محسوس ہورہی تھی۔

وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہورہا تھا۔ ہال میں چاروں طرف سے عورتوں کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور میں اپنی جگہ پر لیٹی تاریکی میں گھور رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر نجانے کب میں بھی نیند کی اندھیری آغوش میں پہنچ گئی۔

○☆○
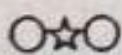
اللہ اکبر... اللہ اکبر...

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

ہال کی دیوار پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر سے گونجنے والی مؤذن کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت صبح کے چھ بجے تھے میرے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا میرے حواس مختل تھے،

کچھ دیر تک تو میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ آوازیں کہاں سے آرہی تھیں اور میں کہاں تھی' لیکن پھر بتدریج میرے حواس قائم ہونے لگے اور پچھلے روز کے واقعات کی یادوں نے میرے دماغ پر یلغار کردی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دوسری قیدی عورتیں بھی آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگی تھیں۔ تہ خانے کی اونچی کھڑکیوں سے مدھم سا اجالا اندر آنے لگا تھا۔ اس لمحے ہال کا دروازہ کھلا اور مکروہ صورت والی ایک محافظ عورت نے اندر داخل ہو کر اعلان کیا کہ سب لوگ اٹھ جائیں' کچھ دیر بعد ناشتا آنے والا ہے۔ واپس جاتے ہوئے وہ دروازے کے قریب ٹھٹک کر رہ گئی۔ دروازے میں غلاظت دیکھ کر وہ وحشیوں کی طرح چیخنے لگی۔

"یہ کس حرامزادی کی حرکت ہے؟" وہ دروازے میں بکھری ہوئی غلاظت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخی "کون ہے وہ؟ اگر کسی نے اعتراف نہ کیا تو سب کی سزا میں تین دن کا اضافہ کردیا جائے گا۔ جلدی بتاؤ یہ کس کتیا کی حرکت ہے؟"

ہال میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ تمام عورتیں سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں' چند منٹ بعد محافظ عورت کمرے میں دبکی ہوئی ایک عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی دروازے کی طرف لے آئی۔ وہ عورت چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کسی نے اس کے خلاف شکایت کی تھی یا دوسروں کو سزا سے بچانے کے لئے اس نے خود ہی اس جرم کا اعتراف کرلیا تھا۔ وہ لمبے قد کی دبلی پتلی سی عورت تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال کی رہی ہوگی۔ فاقہ کشی کے باعث وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

اسے گزشتہ روز میرے آنے سے کچھ دیر بعد ایک اور عورت کے ساتھ اس تہ خانے میں لایا گیا تھا۔ ان کے آنے کے فوراً ہی بعد تہ خانے کی تمام عورتوں کو پتا چل گیا تھا کہ وہ طوائفیں تھیں اور انہیں مردوں کے ساتھ داد عیش دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا' ان کے قبضے سے ہیروئن بھی برآمد ہوئی تھی۔

محافظ اس عورت کو بالوں سے گھسیٹتی ہوئی ہال سے باہر لے جارہی تھی۔ اس نے نہ تو مزاحمت کی کوشش کی تھی اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکالی تھی۔ اسے تہ خانے سے باہر لے جاکر راہداری میں سرخ پلاسٹک والے بیڈ پر اوندھا لٹا کر اس کے ہاتھ پیر چرمی فیتوں سے باندھ دیئے گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی فضا کوڑے لگنے کی اور اس عورت کی چیخوں کی آواز سے گونجنے لگی۔

اسے اسی کوڑے مارے گئے۔ جب ایک محافظ عورت کوڑے مارتے مارتے تھک جاتی تو کوڑا دوسری محافظ کے حوالے کردیا جاتا تاکہ کوڑے مارے جانے کی قوت میں کمی نہ آنے پائے۔ ہر محافظ عورت کے کوڑے مارنے کا انداز مختلف تھا۔ کسی نے بڑے تیزی سے ہاتھ چلائے اور کوئی رک رک کر کوڑے مار رہی تھی۔ کوڑے مارتے ہوئے ایک محافظ عورت کے منہ سے غراہٹیں سی نکل رہی تھیں' اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنی پوری نفرت کا اظہار کررہی تھی۔ میں اپنی جگہ پر جمی بیٹھی تھی' ہر کوڑے کی آواز کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوڑے اس عورت پر نہیں میری پیٹھ پر برسائے جارہے ہوں۔ عورت کی دل دوز چیخوں سے میرا دل دہل رہا تھا۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

اسی کوڑے لگائے جانے کے بعد وہ عورت اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ محافظ عورتیں اسے اٹھا کر فرش پر ڈال گئیں' قیدی عورتیں اس کے گرد جمع ہوگئیں۔ میں نے بھی عورتوں کے بیچ میں جھانک کر دیکھا' یہ خوفناک منظر میری قوت برداشت سے باہر تھا۔ اس عورت کی پشت ادھڑی ہوئی تھی' کئی جگہوں سے گوشت کے لوتھڑے نظر آرہے تھے۔ کیبن میں رضا اور اس کے دوست کو کوڑے لگنے کے بعد میں نے ان کی پشت بھی دیکھی تھی لیکن جس طرح درندہ صفت محافظ عورتوں نے اس عورت کی پشت ادھیڑی تھی اسے بربریت کی بدترین مثال کہا جاسکتا تھا۔

ایک قیدی عورت نے اپنے لباس میں چھپی ہوئی کریم کی ڈبیا نکال لی اور بڑی آہستگی سے اس عورت کی پشت پر کریم ملنے لگی لیکن وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ ہاتھ کا معمولی سا لمس بھی اس کے لئے قابل برداشت نہیں تھا لیکن شاید اس کی قوت برداشت ویسے ہی جواب دے گئی تھی کیونکہ اس کی چیخیں اب کراہوں میں بدل گئی تھیں اور پھر یہ کراہیں بھی بند ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہوچکی تھی لیکن اس لمحے فضا ایک بار پھر خوفناک چیخوں سے گونج اٹھی۔ اب ایک اور عورت کو کوڑے لگائے جارہے تھے۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس پورے جیل خانے میں کوڑے لگانے کے لئے صرف یہی ایک بیڈ تھا کیونکہ اوپر کی منزل سے مرد قیدیوں کو بھی اسی جگہ لا کر کوڑے مارے جارہے تھے۔ ان کی چیخوں سے ہمارے دل دہل رہے تھے

ایک طرف ہال کی دیواروں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں پر نماز پڑھائے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور دوسری طرف قید خانے کی فضا کوڑے کھانے والوں کی بھیانک چیخوں سے گونج رہی تھی۔ ناشتے سے پہلے پہلے دس مردوں اور عورتوں کو کوڑے لگائے جاچکے تھے۔

ناشتے میں ایک کپ کڑوی کسیلی چائے' ڈبل روٹی کا ایک پیس اور پنیر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا شامل تھا۔ بھوک سے میری بری حالت ہورہی تھی چنانچہ اس مرتبہ میں کھانے سے انکار نہیں

کر رکھی تھی۔

ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد ایک اور عورت کو کوڑے لگائے جانے لگے۔ اس عورت کو تہ خانے کے دوسرے ہال سے لایا گیا تھا اور ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کا جرم کیا تھا جس کی اسے یہ سزا دی جارہی تھی کوڑے لگائے جانے سے پہلے ہی اس عورت نے چیخنا چلانا شروع کردیا تھا۔

"تم مجھے کوڑے نہیں لگا سکتیں۔ میں بیمار ہوں" اس نے روتے ہوئے کہا "تم لوگ مجھے قتل کردو گے۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔"

لیکن ان درندہ صفت محافظ عورتوں میں رحم نام کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بیڈ پر فیتے باندھے جانے کے دوران بھی وہ عورت چیختی چلاتی رہی اور جب اسے کوڑے لگائے جانے لگے تو اس کی بھیانک چیخیں آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگیں۔ جذبات کی شدت سے میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک کوڑے کے شڑاتوں اور عورت کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر چیخوں کی آواز بند ہوگئی لیکن کوڑے برستے رہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ عورت کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس خاموشی نے ہمیں دہلا کر رکھ دیا۔ وہ عورت بے ہوش ہوگئی تھی یا مرگئی تھی؟ لیکن محافظوں نے اسے چیک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کوڑے برستے رہے۔ اسی کی گنتی پوری کرنے کے بعد ہی ان کے ہاتھ رکے تھے۔

اور پھر جب بیڈ کے چرمی فیتے کھول کر اس عورت کو اٹھایا جانے لگا تو اچانک اس عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ نہ بے ہوش ہوئی تھی نہ مری تھی۔ وہ بڑے استقلال سے خاموشی سے کوڑے کھاتی رہی تھی اور اب پشت ادھڑی ہونے کے باوجود محافظ عورتوں سے الجھ رہی تھی۔ وہ انہیں گالیاں دیتے ہوئے ان سے ہاتھا پائی کررہی تھی، پھر اس نے کوئی چیز اٹھا کر اس میز پر دے ماری جس پر شیشے کے نیچے امام خمینی کی تقریروں اور تعلیمات پر مشتمل کتابچے پڑے ہوئے تھے۔ میز پر بچھا ہوا شیشہ چھناکے کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ شور کی آواز سن کر کچھ اور محافظ عورتیں دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں اور مغضوب عورت پر چاروں طرف سے لاتوں اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی۔ ہمارے ہال کی تمام عورتیں یہ تماشا دیکھنے کے لئے راہداری میں جمع ہوگئی تھیں لیکن یہ ہنگامہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا تھا۔ محافظ عورتیں اسے بے بس کرکے گھسیٹتی ہوئی دوسرے ہال میں لے گئی تھیں۔

"اس عورت کو دیکھا تھا تم نے؟" میری پڑوسی عورت نے واپس آکر کہا "وہ سر سے پیر تک خون میں تر ہورہی تھی لیکن وہ بڑی باہمت تھی۔ اسی کوڑے کھانے کے بعد بھی وہ محافظوں سے لڑتی رہی۔"

کئی مرتبہ میرا بھی دل چاہا تھا کہ اس عورت کی طرح میں بھی درندہ صفت محافظ عورتوں کا منہ نوچ لوں لیکن میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو میرا حشر اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ کوئی قیدی عورت میری حمایت میں زبان نہیں کھولے گی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہاں بیٹھی کوڑے کھانے والے مردوں اور عورتوں کی بھیانک چیخیں سنتی رہوں۔

بارہ بجے کے لگ بھگ دوپہر کا کھانا آگیا۔ اس مرتبہ کھانے میں پتلا سا شوربا اور ابلے ہوئے چاول تھے۔ وہ کھانا بھی اوپر والوں کا بچا کھچا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔

دو بجے کے قریب ایک بدصورت محافظ عورت نے ہال میں داخل ہوکر میرا نام پکارا اور مجھے تہ خانے سے نکال کر پہلی منزل کے ایک دفتر میں لے گئی۔ اس مرتبہ تحقیقاتی آفیسر وہی داڑھی والا تھا جس نے یہاں لائے جانے کے بعد سب سے پہلے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی۔ لگتا تھا جیسے ان لوگوں کو پیٹرول کے کوپنوں کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی ہو۔ مجھ سے بار بار یہی پوچھا جارہا تھا کہ میں نے وہ کوپن کس ڈرائیور سے خریدے تھے۔ میرا جواب وہی تھا جو پہلے دے چکی تھی۔ مجھے اس ڈرائیور کا نام معلوم نہیں تھا البتہ کار اور ڈرائیور کا حلیہ بار بار بتا چکی تھی۔

"تم اس وقت تک یہاں سے نہیں جاسکتیں جب تک ہم اس ڈرائیور کو تلاش نہ کرلیں" اس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی پسینے کی بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

اس نے محافظ کو ان تین آدمیوں کو آگے لانے کا اشارہ کیا جو میز سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ غور سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں اس ٹیکسی کمپنی کے ڈرائیور تھے جہاں سے میں اکثر ٹیکسی منگوایا کرتی تھی۔ میں ان کی ٹیکسیوں پر بڑی شان سے رائل کلب اور دوسری جگہوں اور پارٹیوں میں جایا کرتی تھی اور بڑی بڑی رقمیں انہیں بطور ٹپ دیا کرتی تھی اور اب وہی خانم سوسن مجرم کی حیثیت سے ان کے سامنے کھڑی تھی میں اگرچہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور میری آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں لیکن ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"میں نے ان میں سے کسی سے کوپن نہیں خریدے تھے" میں نے تحقیقاتی آفیسر کو بتایا اور پھر ان تینوں سے معذرت کرنے لگی کہ انہیں میری وجہ سے یہ زحمت اٹھانا پڑی تھی۔

وہ تینوں باہر جارہے تھے کہ کمال کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ کمال میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرادیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے کیسے پہچان لیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے میری طرف آنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ آنے والا دوسرا آدمی اسے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ میں کمال کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اپنے تحقیقاتی آفیسر کی طرف متوجہ ہوگئی جو

دہاڑتے ہوئے مجھ سے ایک بار پھر یہ پوچھ رہا تھا کہ میں نے پیٹرول کے وہ کوپن کہاں سے خریدے تھے۔ میں نے ایک بار پھر وہی کچھ بتادیا جو پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکی تھی۔ وہ لوگ یقیناً ڈرائیور کی تلاش میں تھے مگر ٹیکسی کمپنی نے اس ڈرائیور کو غائب کردیا ہوگا اور میرے خیال میں یہ انہوں نے اچھا ہی کیا تھا۔

"جب تک تمہاری یادداشت بحال نہ ہوجائے' تم یہیں رہو گی" تحقیقاتی آفیسر نے غراتے ہوئے کہا "دو چار دن تہہ خانے میں رہو گی تو تمہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔ جاؤ چلی جاؤ۔"

مجھے ایک بار پھر تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وقت دھیرے دھیرے رینگتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کو اب میری پروا نہ رہی ہو۔ میرے رشتے دار کہاں تھے؟ میرے ماموں کیا کر رہے تھے؟ میرے دوستوں کے تعلقات کیا ہوئے تھے۔ کیا یہ رات بھی مجھے جیل ہی میں گزارنی پڑے گی؟ برف خانے سے زیادہ سرد اس تہہ خانے میں جہاں میرے قریب پڑی ہوئی وہ حاملہ لڑکی تکلیف کی شدت سے مسلسل کراہ رہی تھی اور مجھے بار بار اپنی چادر مستعار دینے والی عورت چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی تھی۔ میں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے آنسو بہانے لگتی۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد تہہ خانے کی فضا کوڑے کھانے والے کسی مرد یا عورت کی خوفناک چیخوں سے گونجنے لگتی۔

تقریباً چار بجے سہ پہر ایک محافظ عورت نے میرا نام پکارتے ہوئے بتایا کہ منصورہ اوپر ویٹنگ روم میں میرا انتظار کر رہی ہے لیکن مجھے منصورہ سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ صرف اس کی موجودگی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ محافظوں نے جب منصورہ کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دی تو اس نے یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ میرے لئے ٹوتھ پیسٹ' صابن' اور تولیا وغیرہ لے کر آئی ہے لیکن یہاں کلی کرنے کو پانی دستیاب نہیں تھا۔ میں نے وہ چیزیں واپس بھجوادیں اور محافظ سے کہا۔

"میری طرف سے اس نیک دل خاتون کا شکریہ ادا کردو اور کہو کہ یہ چیزیں واپس لے جائے۔ یہاں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور پھر محافظ نے مجھے وہ دہشت ناک خبر سنائی جس کے لئے میں بالکل تیار نہیں تھی۔

"اس عورت نے کہا تھا کہ تم تک یہ اطلاع پہنچادی جائے کہ تمہارے بیٹے کو اس کی دادی لے گئی ہے۔"

یہ اطلاع میرے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ فرہاد اپنی فیملی کے قبضے میں جاچکا تھا۔ وہ اسے مجھ سے دور رکھنے کے لئے ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔ وہ عدالت میں بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ میں چونکہ جیل میں رہ چکی ہوں اس لئے فرہاد کو اپنے پاس رکھنے کی اہل نہیں ہوں۔ وہ ابھی فرہاد کو لے کر گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں گے۔ میرا مکان' جائداد سے ملنے والا میرا ماہانہ الاؤنس' میری کار اور ہر وہ چیز جو میرے تصرف میں تھی' آہستہ آہستہ ان کے قبضے میں چلی جائے گی۔

میں دل ہی دل میں منصورہ کا شکریہ ادا کرنے لگی کہ وہ میری خیریت دریافت کرنے کے لئے یہاں تک آگئی تھی لیکن میں ایک بار پھر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی تھی کہ میرے خاندان والے کہاں تھے اور وہ کیا کر رہے تھے؟ منصورہ جیسی عورت جس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں تھا میری خیریت معلوم کرنے جیل آسکتی تھی تو میرے قریبی رشتے داروں کے راستے میں کون سی رکاوٹ تھی۔ کیا وہ خوفزدہ تھے؟ کیا امام خمینی نے ہمیں اتنا بزدل بنادیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی مدد بھی نہیں کرسکتے تھے؟

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کھانا تقسیم ہونے لگا لیکن میں نے اس وقت بھی کھانا لینے سے انکار کردیا۔ اس وقت تو کھانا دیکھنے ہی میں اتنا برا لگ رہا تھا کہ میرے قریب بیٹھی ہوئی حاملہ لڑکی نے بھی ؎ے کھانے سے انکار کردیا۔

آدھی رات کو لائٹ آف کردینے کے بعد دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ وہ ترک لڑکی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ تکلیف کی شدت سے وہ بدحال ہورہی تھی۔ میرا دل اس کے لئے کڑھ رہا تھا لیکن ظاہر ہے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی کراہوں اور چیخوں سے دوسری عورتیں بھی پریشان ہورہی تھیں۔ بعض نے تو اسے گالیوں سے نوازنا شروع کردیا تھا۔ بالآخر رات کے پچھلے پہر تین بجے کے قریب ایک محافظ عورت صورت حال معلوم کرنے کے لئے اندر آئی۔ ترک لڑکی کی حالت دیکھنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کو فون کردیا جس کی رہائش جیل کے کمپاؤنڈ ہی میں تھی۔ کچھ دیر بعد دو محافظ عورتیں اس ترک لڑکی کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔

لیکن پندرہ منٹ بعد وہ ترک لڑکی واپس آگئی۔ اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح کراہ رہی تھی اس کے ساتھ آنے والی محافظ عورتوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بچے کی ولادت میں ابھی کم از کم دو دن باقی ہیں۔ اسے آخری وقت تک جیل میں رہنا ہوگا۔

وہ ترک لڑکی شاید اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ لائٹ جیسے ہی دوبارہ بند ہوئی وہ بری طرح تڑپنے لگی۔ وہ بار بار مجھ سے لپٹ جاتی اور میں خود بھی روتے ہوئے اسے تسلی دینے لگتی۔

جیل میں میری دوسری صبح بھی پہلی صبح سے مختلف ثابت نہیں ہوئی۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کو کوڑے لگانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ میں نے رات ہی کو فیصلہ کرلیا تھا کہ آج دن میں یہاں سے نکل جاؤں گی خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

نو بجے کے قریب ناشتا تقسیم ہوا۔ وہی چائے کا ایک کپ'

ڈبل روٹی کا ایک پیس اور پنیر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا۔ مجھے بہرحال یہ ناشتا زہرمار کرنا پڑا۔ اس دوران ہال سے باہر محافظوں کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ہال پر یکایک سناٹا سا چھا گیا۔ یہ ٹیلی فون کال کسی کی رہائی یا کسی کی سزا کا باعث بن سکتی تھی۔ فون پر بات کرنے والی محافظ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم اسے اسپتال بھجوانے کے لئے آدمی بھیج رہے ہو۔ چلو شکر ہے۔ ہمیں اس کی چیخوں سے نجات مل جائے گی۔ اچھا... زچگی کے بعد اسے دوبارہ یہاں لایا جائے گا اور... کیا۔ اسے گولی ماردی جائے گی... گڈ... یہی ہونا چاہئے۔ ٹھیک ہے... میں انتظار کررہی ہوں..."

ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ہماری قوت گویائی شاید سلب ہوچکی تھی کیونکہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا۔ ہم میں سے اکثر سمجھ گئی تھیں کہ کس کے بارے میں بات ہورہی تھی لیکن وہ لڑکی چونکہ ترکی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتی تھی اس لئے اسے پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ ہم سب لوگ خاموش بیٹھے ہمدردانہ نگاہوں سے اس ترک لڑکی کو دیکھ رہے تھے کہ محافظ عورت اندر آگئی۔ اس نے لڑکی کو ترکی زبان میں بتایا کہ کچھ دیر بعد اسے اسپتال بھیج دیا جائے گا۔

"خدا کا شکر ہے" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی "اب میں آرام سے بچے کو جنم دے سکوں گی۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اس بے چاری کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بچے کی ولادت کے ساتھ ہی اس کی اپنی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کئی دفعہ میرے دل میں آیا تھا کہ اسے حقیقت سے آگاہ کردوں لیکن اس خوف سے زبان نہیں کھول سکی کہ قیدیوں میں بہت سی جاسوس عورتیں بھی موجود تھیں۔ محافظ عورت نے بھی اس ترک لڑکی کو نہیں بتایا تھا کہ بچے کی ولادت کے بعد اسے گولی ماردی جائے گی۔ دوسری عورتوں نے بھی اس سلسلے میں زبان بند رکھی تھی۔ شاید وہ بھی خوفزدہ تھیں کہ ان کے خلاف رپورٹ کردی گئی تو انہیں سزا دی جائے گی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد دو عورتیں آکر اس ترک لڑکی کو لے گئیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ اسے حقیقت سے آگاہ نہ کرنے کا میرا فیصلہ درست تھا یا نہیں؟ اس لڑکی کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جارہی تھی کہ راستے میں اسے پکڑ لیا گیا۔ کمیٹی کے بھیڑیوں نے یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ اس کا بہنوئی ہے اور وہ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جارہی تھی۔ اسے گرفتار کرنے والے بضد تھے کہ وہ اس کا عاشق تھا۔ مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس لڑکی کا انجام کیا ہوا؟ زچگی کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا تھا یا واقعی گولی ماردی گئی تھی۔ بہرحال اس کا شمار ان ہزاروں بے گناہ عورتوں میں ہوتا تھا جو امام خمینی کی جیلوں میں پڑی سڑ رہی تھیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا اور جن کا انجام بالآخر بھیانک موت پر ہوتا تھا۔ ان عورتوں کے عزیزوں کو بھی کبھی پتا نہیں چل سکا کہ وہ یکایک کہاں غائب ہوگئی تھیں۔

○☆○
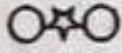
تقریباً ایک بجے دوپہر کے قریب مجھے پھر پوچھ گچھ کے لئے طلب کرلیا گیا۔ اس مرتبہ تہہ خانے سے نکلتے ہوئے میرے دل و دماغ پر بے پناہ مایوسی طاری تھی۔ مایوسی کی اس دبیز دھند میں امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ممکن ہے مجھے بھی اس ترک لڑکی کی طرح کسی خوفناک انجام کا سامنا کرنا پڑے۔

انکوائری کے دوران تحقیقاتی آفیسر پھر وہی سوالات کرتا رہا جن کا میرے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران اسے کسی بڑے افسر نے اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوسری میز پر پہنچ گئی۔ جہاں بیٹھے ہوئے تحقیقاتی آفسر کے چہرے پر کسی حد تک نرمی کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

"خدا کے لئے یہ بتادیجئے کہ حسن سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ میں اس سے ضروری بات کرنا چاہتی ہوں" کہنے کے ساتھ ہی میں نے اظہار عقیدت کے طور پر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دینا چاہا اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں ایک بار پھر یہ بھول گئی تھی کہ مسلمان عورت کسی مرد کو نہیں چھوتی۔

"تم... گندی... غلیظ... عورت... پیچھے ہٹو" اس نے نفرت سے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اس نے مجھے گندی اور غلیظ عورت کہا تھا۔ یہ لوگ بھول گئے تھے کہ خود کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے لیکن یہ اپنے آپ کو درست سمجھتے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں لیکن بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہوسکی تھی کیونکہ اس وقت مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے میں ایک بار پھر اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ مجھے حسن کے بارے میں بتادیا جائے کہ وہ کہاں بیٹھتا ہے۔

"میں تمہیں اس کے پاس نہیں لے جاسکتا" اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کہاں بیٹھتا ہے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"اس کا دفتر تیسری منزل پر ہے لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا اگر تم خود رسک لینا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں" اس نے جواب دیا۔

رسک سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تہہ خانے میں قیدیوں کے علاوہ اس بلڈنگ میں اب تک مجھے کوئی عورت دکھائی نہیں دی تھی جبکہ قدم قدم پر کمیٹی کے مسلح آدمی کھڑے تھے۔ مجھ پر کسی ایسے آدمی کا شبہ بھی ہو سکتا تھا جو چادر میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہو اور اس شبے میں گولی بھی ماری جا سکتی تھی لیکن میں نے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ تحقیقاتی افسر اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ دوسرا تحقیقاتی افسر کسی اور سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میں نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرے ساتھ آنے والی محافظ عورت بھی کمرے میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ میرے لئے بہترین موقع تھا۔

میں کمرے سے نکل کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ میں بیک وقت دو دو سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔ تیسری منزل تک پہنچتے ہوئے میرا سانس بری طرح پھول گیا۔ دفعتاً نیچے سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کرخت آواز دیواروں اور چھت سے ٹکرا کر چاروں طرف گونج رہی ہو۔

"رک جاؤ۔ کہاں جا رہی ہو؟ رک جاؤ۔"

ایک لمحے کو میں نے سوچا تھا کہ اس آواز کو نظر انداز کر کے دوڑتی رہوں۔ میرے سامنے صرف تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں لیکن اسی لمحے یہ خیال بھی آیا کہ اگر میں نے حکم نہ مانا تو شاید مجھے گولی مار دی جائے۔ میں نے مڑ کر نیچے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ تحقیقاتی افسر رائفل تانے کھڑا تھا۔

"مجھے حسن سے بات کرنی ہے تیسری منزل تک جا رہی ہوں کہیں بھاگنے کی کوشش نہیں کر رہی" میں نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

"تم صرف جیل جا سکتی ہو۔ شرافت سے نیچے آ جاؤ" اس نے حکم دیا۔

میں وہیں کھڑے کھڑے ایک بار پھر اسے اللہ اور رسول کے واسطے دینے لگی کہ مجھے حسن سے ملنے کی اجازت دے دی جائے میں اسے کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر مسلسل بولتی رہی اور اسی کے ساتھ ہی غیر محسوس انداز میں اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھ دیا' پھر دوسری سیڑھی پر پہنچ گئی اور جب اس نے کچھ نہیں کہا تو آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں نے تیسری منزل کی راہداری میں دوڑنے لگی۔

حسن کے دفتر کا دروازہ سیڑھیوں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ میں متوحش نگاہوں سے دروازے کے سامنے ایک لمبی قطار کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حسن سے ملنا چاہتے تھے اور اپنی باری کے انتظار میں قطار بنائے کھڑے تھے اگر میں اس لائن میں لگ جاتی تو شاید تین گھنٹوں بعد بھی میری باری نہ آتی۔ میرے پاس تو اس وقت آزادی کے تین منٹ بھی نہیں تھے تین گھنٹے تو بہت لمبی مدت ہوتی ہے۔ میں نے مایوسانہ نگاہوں سے مردوں کی اس لمبی قطار اور پھر دروازے پر متعین دو مسلح محافظوں کی طرف دیکھا اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں اطمینان سے ٹہلتی ہوئی دروازے کے قریب آ گئی اور اس سے پہلے کے محافظ کچھ سمجھ سکتے' میں دروازے کو دھکا دیتے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

حسن ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا جس پر فائلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے لیکن میں سب کو نظر انداز کرتی ہوئی حسن کی میز کے سامنے پہنچ گئی۔

"حسن آغا! مجھے بہت سزا مل چکی ہے" میں نے بھیک مانگتے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے سبق مل گیا ہے۔ میرا چھوٹا سا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہوگا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ خدا کے لئے مجھے گھر جانے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کے آئندہ خلاف قانون کوئی کام نہیں کروں گی اگر قانون کہتا ہے تو میں اپنے باپ اور بھائی کو بھی اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ مجھے گھر جانے دو۔ پلیز۔"

اس لمحے تحقیقاتی افسر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شاید یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی شکایت تو نہیں کر رہی ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی لیکن جب حسن نے ترکی زبان میں مجھ سے نرم لہجے میں بات کی تو اس کے چہرے کی کرختگی بھی غائب ہو گئی۔

"ٹھیک ہے اب تھوڑی دیر کے لئے خاموش بیٹھ جاؤ۔ میں ایک ضروری فائل دیکھ رہا ہوں" میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تحقیقاتی افسر بھی کرسی پر بیٹھ کر میز پر رکھی ہوئی فائلوں کی طرف دیکھنے لگا۔

حسن کبھی فائل کو دیکھنے لگتا اور کبھی میز کے قریب کھڑے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص سے کچھ پوچھنے لگتا۔ یہ فائل یقیناً اسی شخص سے متعلق تھا۔ اس دوران مجھے کمرے کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ میری کرسی کھڑکی کے قریب ہی تھی جہاں سے سڑک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دو دن میں پہلی مرتبہ مجھے باہر جھانکنے کا موقع ملا تھا۔

باہر زندگی بھرپور انداز میں موجود تھی۔ سڑک پر شور مچاتی ہوئی گاڑیاں' فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ۔ میں خود بھی کئی مرتبہ اس عمارت کے سامنے سے تیز رفتاری سے کار چلاتی ہوئی گزری

تھی لیکن اس وقت میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ یہ عمارت دکھوں کو اس طرح اپنے اندر چھپالے گی کہ بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ ختم ہو جائے گا اور وہ اس کے تہہ خانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیں گے۔

اب مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر آزادی سے چلتے ہوئے لوگ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ آزادی کا مفہوم کیا ہوتا ہے
حسن کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے مجھے یہ احساس کیوں ہونے لگا تھا کہ شاید کچھ عرصے اور مجھے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع نہ مل سکے۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا جیسے کمرے میں موجود سب لوگ کسی کے احترام میں اپنی جگہوں سے اٹھ کر کھڑے ہو رہے ہوں۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک مذہبی رہنما کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک صحت مند آدمی تھا۔ جلد کی رنگت قدرے گہری' سیاہ داڑھی اور سر پر سفید پگڑی تھی۔ اسے دیکھ کر حسن بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کسی مذہبی رہنما کی تعظیم کس طرح کرنی چاہئے۔ کیا عورتوں کو بھی مردوں کی طرح کھڑے ہو جانا چاہئے؟ یا زبانی طور پر کچھ کہنا چاہئے؟ میری ساس نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ کسی مسلمان عورت کو مردوں کے سامنے بولنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ عورت کی آواز سے بھی مرد کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ میں بہرحال اس مذہبی رہنما کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ میں اس سے بے رخی برت رہی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بڑبڑانے والے انداز میں چند تہنیتی الفاظ بھی کہے تھے۔ میں فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں اس وقت پوری طرح چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میری نظریں فرش پر مرکوز تھیں۔

حسن اس مذہبی رہنما کو مختلف قیدیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے معائنے کے لئے چند فائلیں بھی اس نے سامنے رکھ دی تھیں لیکن میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ مذہبی رہنما بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے حسن سے میرے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ حسن دوسرے قیدیوں کے بارے میں بتاتا رہا لیکن وہ مذہبی رہنما بار بار میرے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ میں کون ہوں؟ مجھے جیل میں کیوں ڈالا گیا ہے؟ اس نے حسن سے میرا فائل لے لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اس وقت میں اپنے آپ کو حسن کے دفتر میں کسی حد تک محفوظ سمجھ رہی تھی لیکن وہ مذہبی رہنما مجھے اس دفتر سے نکال لایا تھا۔ ان مذہبی رہنماؤں سے مجھے شدید نفرت تھی۔ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی نہ ہی میں نے کبھی ان کی کوئی پروا کی تھی لیکن اب میری زندگی اور موت اس مذہبی رہنما کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فیصلہ اس کو کرنا تھا کہ مجھے کوڑوں کی سزا دے کر چھوڑ دیا جائے یا فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے۔

ہم حسن کے دفتر سے نکل کر راہداری میں چلتے ہوئے تیسرے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جہاں لاتعداد میزیں بچھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر ہر شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے کسی کو اس کا نام لیتے ہوئے بھی سنا تھا۔ وہ حجت الاسلام طباطبائی تھا۔ یہ نام سنتے ہی میرے رگ وپے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایران میں مذہبی لحاظ سے درجہ بندی ہے۔ آیت اللہ کو سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر حجت الاسلام کا درجہ تھا گویا یہ دوسرے نمبر پر سب سے بڑا مذہبی رتبہ تھا۔ طباطبائی کا تعلق تہران کے ایک بہت بڑے خاندان سے تھا اور وہ مورالٹی اسکواڈ کا سربراہ تھا۔

اس ہال میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں دو میزیں تھیں۔ اس نے مجھے ایک میز کے سامنے لکڑی کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرا پورا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ سردی کی ایک غیر فطری سی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میرے ہونٹ کاغذ کی طرح خشک تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نہ تو حلق میں اٹکا ہوا تھوک نگل سکتی ہوں اور نہ ہی منہ کھول سکتی ہوں۔

طباطبائی نے شاید میری حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے مجھ سے چائے کے لئے پوچھا۔ میں اس قدر خوفزدہ تھی کہ فوراً ہی انکار کر دیا۔ اگرچہ بھوک پیاس سے میری بری حالت ہو رہی تھی لیکن دو دن سے مجھ پر جو بیت رہی تھی اس کے پیش نظر میرے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں نکل سکتی تھی۔ میرے انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے طباطبائی نے کمرے میں کھڑے ہوئے ایک آدمی کو چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

طباطبائی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں نے بھی پہلی مرتبہ توجہ سے میز کی طرف دیکھا۔ جس پر فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ بھی یقیناً میری طرح کے کیس تھے۔ جن سے متعلق یہ کیس تھے وہ لوگ یقیناً جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔

کمرا بالکل سادہ سا تھا۔ لکڑی کی دو عام سی میزیں اور کئی کرسیاں۔ اس عمارت پر قبضہ کرنے سے پہلے یہاں جو بھی قیمتی سامان ہو گا وہ یقیناً نیلام کے ذریعے فرخت کر دیا گیا ہو گا۔ ضبط شدہ چیزوں کی فروخت سے ملنے والی رقم کو دولت مندوں کی طرف سے نئی حکومت کے لئے "عطیہ" کہا جاتا تھا۔

طباطبائی کو شاید میری بہت زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"اتنا پریشان کیوں ہو؟ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ اب تمہیں مزید کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

میں نے شاید صدیوں بعد ایسی شیریں، نرم اور ہمدردانہ آواز سنی تھی لیکن اس کے باوجود میرے ہونٹ جیسے سل کر رہ گئے تھے۔ آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔ کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ میں نے اپنے ہونٹ اور حلق تر کرنے کے لئے چند گھونٹ بھرے طباطبائی مختلف سوالات پوچھ رہا تھا۔ مجھے جیل میں کب لایا گیا تھا؟ مجھے یہاں لانے والا کون تھا؟ مجھ پر کیا الزامات عائد کئے گئے تھے؟

یہ تمام تفصیل فائل میں موجود تھی لیکن لگتا تھا کہ وہ فائل دیکھنے کے بجائے ساری باتیں مجھ سے ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں دو راتوں سے جیل میں بند ہوں تو وہ برافروختہ سا ہو گیا۔

"میں جب بھی چند روز کے لئے باہر جاتا ہوں یہاں کی گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے۔ تمہیں تو یہاں لانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کس معاملے میں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں؟ اسی لئے تو میں زیادہ دنوں کے لئے کہیں باہر نہیں جاتا۔"

اس کی باتوں سے مجھے خاصا حوصلہ مل رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ خوبرو آدمی تھا۔ اس کی بادامی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی

"ہاں، اب بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے؟" طباطبائی نے پوچھا

اس وقت تک میں چائے کا نصف کپ پی چکی تھی۔ میرے اندر بولنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی اور میں بڑی حد تک اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا بیٹا شاید اب مجھ سے چھین لیا جائے۔

"اگر مجھے جیل سے نجات مل بھی گئی تو مجھے اپنے سسرال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہیں جیسے ہی پتا چلا کہ میں جیل میں ہوں وہ فرہاد کو لے گئے تھے۔ بیٹے کو واپس لینے کے لئے مجھے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔ میرے شوہر کے انتقال کے بعد وہ لوگ مجھے ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں انہوں نے کئی مرتبہ فرہاد کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تھی لیکن موقع نہیں ملا تھا اور اب انہیں موقع مل گیا ہے جس سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔"

طباطبائی میرے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میرے شوہر کا انتقال کس طرح ہوا تھا۔ اس نے میرے لئے کیا کچھ چھوڑا تھا اور میرے سسرال والے کون تھے؟ میں نے ان کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے اپنے شبے کا اظہار بھی کر دیا کہ غالباً انہی کی شکایت پر اس روز کمیٹی نے میرے گھر پر چھاپہ مارا تھا جس کے نتیجے میں مجھے یہ سب کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ میرے گھر میں کمال کی موجودگی کے بارے میں کمیٹی کو کس نے بتایا تھا۔ اس کا پہلے سے آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ آنے سے صرف چند منٹ پہلے اس نے فون کیا تھا۔

پھر طباطبائی نے پوچھا کہ میں نے گھر میں تاش اور شراب وغیرہ کیوں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اس سوال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا اور غالباً حسن کے دفتر میں آنے سے پہلے اسے میرے بارے میں یہ تمام معلومات حاصل تھیں۔ اگرچہ حسن نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تلاش کے دوران گھر سے برآمد ہونے والی بعض چیزوں کو نظرانداز کر دیا جائے گا لیکن طباطبائی کو ایک ایک چیز کے بارے میں معلوم تھا۔ اس کے باوجود اس کا رویہ خاصا نرم تھا۔ میرے خیال میں وہ مجھے مجرم ثابت کرنے کے لئے نہیں محض تجسس کی بنا پر یہ سب کچھ دریافت کر رہا تھا۔

میں بڑے پرسکون انداز میں اس کے سوالات کے جواب دے رہی تھی لیکن میں نے اسے اپنے شوہر کے ترکے کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتایا۔ گھر میں شراب کی بوتلوں کی موجودگی کے بارے میں بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے میری باتوں کا کس حد تک یقین کیا تھا لیکن وہ اس طرح سر ہلاتا رہا جیسے میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں ٹھیک ہے۔ میں یہ بھی سوچتی رہی تھی کہ اس کے اس ہمدردانہ طرز عمل کا کیا مطلب ہو سکتا ہے لیکن بہرحال مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ دوسروں کی طرح دھونس دھمکیوں سے کام نہیں لے رہا تھا۔

"مجھے کمال نامی اس شخص کے بارے میں بتاؤ جو تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

کمال کے بارے میں کوئی سوال اگرچہ غیر متوقع نہیں تھا لیکن میں محتاط ہو گئی تھی۔

"مجھے اس سے کوئی جذباتی یا قلبی لگاؤ نہیں۔ وہ محض ایک دوست ہے جو میرے شوہر کے بعض کاروباری معاملات میں مشورہ دیتا رہتا ہے۔ اس روز بھی وہ ایک کاروباری معاملے پر مشورہ کرنے ہی آیا تھا۔ مجھے اس سے یا کسی اور سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن اس نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ اس رات شادی کی تجویز لے کر تمہارے گھر گیا تھا اور ہر قیمت پر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے" طباطبائی نے کہا۔

ایک لمحہ کے لئے میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ یہ مذہبی رہنما مجھے جیل ہی میں کمال سے شادی پر مجبور تو نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو کمال کو اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی۔ اس سے شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ حامد کا خیال ابھی تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

"میں ایک بیوہ عورت ہوں" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا "ایک کمسن بیٹے کی ماں بھی ہوں۔ ایک فرض شناس ماں کی حیثیت سے میں اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر اپنی تمام تر

توجہ مرکوز رکھنا چاہتی ہوں۔ اس لئے میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"ہوں" طباطبائی نے سہلاتے ہوئے کہا "تمہاری پوزیشن کو سمجھتے ہوئے میں بھی تمہیں شادی نہ کرنے کا مشورہ دوں گا۔ بیوہ کی حیثیت سے تم اپنے شوہر کے مکان میں رہ سکتی ہو اور تمہیں اس کے کاروبار سے ماہانہ الاونس بھی مل رہا ہے۔ شادی کی صورت میں تم ان تمام چیزوں سے محروم ہو جاؤگی لیکن اگر تم کسی سے وقتی طور پر شادی کرنا چاہو تو۔۔۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "تو تمہیں مکان اور کار کے علاوہ دیگر حقوق بھی حاصل رہیں گے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دولت مند خاندان سے تعلق رکھنے والا اعلیٰ درجے کا یہ مذہبی رہنما مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مجھے قتل یا کسی اور سزا سے محض اسی لئے بچانا چاہتا تھا کہ اسے مجھ سے ذاتی دلچسپی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگی تھی کہ متعہ کی تجویز پیش کرکے دراصل وہ اپنے لئے پیغام دے رہا تھا۔

"تم جانتی ہو کہ اس مذہبی حکومت میں۔۔۔" اس نے دھیمے گھماتے ہوئے کہنا شروع کیا "کوئی عورت کسی مرد سے یا کوئی مرد کسی عورت سے دوستی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بہتر طریقہ یہی ہے کہ کسی سے متعہ کر لیا جائے۔ بعض اوقات مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ یہ حکومت کر کیا رہی ہے۔۔۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے بھی میری طرح حکومت کے معاملات سے شدید اختلاف ہو۔

ٹھیک اسی لمحے دو محافظ ایک بوڑھے آدمی کو پکڑے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ وہ بیچارہ خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک محافظ نے طباطبائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آدمی اپنی بیوی کو لینے کے لئے آیا ہے۔"

"تو اس کی بیوی اس کے حوالے کر دو" طباطبائی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ دونوں محافظوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر پہلا محافظ بولا "لیکن جناب! اب اس کی بیوی یہاں نہیں ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے؟" طباطبائی نے اسے گھورا۔

"اسے دس دن پہلے گولی ماردی گئی تھی" محافظ نے کہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا "اسے غلطی سے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔"

"دیکھا تم نے؟" طباطبائی میری طرف گھوم گیا "میں اگر دو تین دن کے لئے بھی کہیں باہر چلا جاؤں تو یہاں یہی کچھ ہوتا ہے" وہ پھر محافظ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اس کی بیوی کو گرفتار کیوں کیا گیا تھا؟"

اس سے پہلے کہ محافظ کوئی جواب دیتا وہ بوڑھا آدمی بول پڑا

دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے T.V خریدا جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی۔ جب بھی T.V بگڑا محمد اعظم نے کمپنی کو فون کیا، مکینک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکینک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکینک نے تیس روپے فیس جمع کرائی، شام کو آیا T.V دیکھا، اینٹینا گھمایا اور چلا گیا۔ T.V کام کرنے لگا۔ ہر مہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز محمد اعظم نے ایک دوکان پر T.V گائیڈ نامی کتاب دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ 75% T.V کی خرابی صرف انٹینا کی خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والا کا چھاپہ ہوا کلر T.V گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا؛ محمد اعظم نے کلر T.V گائیڈ بھی تیس روپے میں خرید لیا اور اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ تو محمد اعظم نے ہمت کرکے مرمت کا سامان جو T.V کو چیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے T.V پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے T.V بھی درست کئے اور تین مہینے میں خود پر بھروسہ کرنے لگا۔ ایک دن دیکھا۔ محمد اعظم کے گھر پر بورڈ لگا تھا:

کلر و بلیک اینڈ وائٹ T.V ریپیر ہاؤس

ملنے کا وقت صبح ۰ سے ۹ بجے تک شام چھ بجے کے بعد

اس طرح محمد اعظم نے اپنے لیے پارٹ ٹائم ورک حاصل کرکے اپنی آمدنی بھی بڑھائی اور اپنے T.V کی مرمت فیس سے بھی بچ گیا۔ ہر وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو اور T.V سے دلچسپی رکھتا ہو۔ T.V گائیڈ اور کلر ٹی وی گائیڈ پڑھ کر اچھا مکینک بن سکتا ہے۔

رام کرشن اگروال۔

اس کے کہنے کے مطابق میاں بیوی میں گھریلو معاملات پر اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا' چند ہفتے پہلے ان میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا اس نے نشے میں آکر اپنی بیوی کے خلاف کمیٹی کو رپورٹ کر دی۔ کمیٹی نے اس کی بیوی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

"اب میں اپنی بیوی کو واپس لینے آیا ہوں۔ میرے چار بچے ہیں' سب سے چھوٹا بچہ صرف تین مہینے کا ہے۔ بچوں کو سنبھالنے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے مجھے بیوی کی ضرورت ہے۔"

اس آدمی کو غالباً یہ جان کر کوئی افسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی کو قتل کیا جا چکا ہے۔ اسے پریشانی تو صرف یہ تھی کہ اس کے بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

طباطبائی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ایک دلچسپ تجویز پیش کی۔

"اس مسئلے کا حل تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔" اس نے محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے تہ خانے میں عورتوں کی جیل میں لے جاؤ اور اپنی بیوی کے بدلے یہ جس عورت کو پسند کرے اسے اس کے حوالے کر دو۔"

مجھے طباطبائی کے اس فیصلے پر حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر اس وقت میں جیل میں ہوتی تو میں بھی عورتوں کی لائن میں کھڑی ہوتی تاکہ بندر کی صورت والا یہ شخص اپنی بیوی کے بدلے کسی عورت کا انتخاب کر سکے۔

محافظوں نے اس وقت یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھا کہ اپنی بیوی کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے کے جرم میں اس آدمی کو ابھی اسی کوڑے لگنا باقی ہیں' لیکن طباطبائی غالباً اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس کی کوڑوں کی سزا معاف کر دی ہے۔ جاؤ' اب نئی بیوی کے انتخاب میں اس کی کچھ مدد کرو۔"

وہ آدمی طباطبائی کو دعائیں دیتا ہوا محافظوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

"دیکھا تم نے؟" طباطبائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک دن کے لئے یہاں سے غیر حاضر رہنا بھی غضب ہو جاتا ہے۔"

"آپ واقعی بہت ہمدرد اور نیک دل انسان ہیں" میں نے کہا۔

"شی" اس نے کمرے میں موجود دو آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "ابھی خاموش رہو" کچھ دیر بعد وہ آدمی کمرے سے چلے گئے تو وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تم نیچے تہ خانے میں چلی جاؤ۔ میں تمہاری رہائی کے کاغذات بھیج رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں جیل سے نجات مل جائے گی۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا وہ واقعی میری رہائی کے احکامات جاری کر رہا تھا؟ لیکن اگر واقعی مجھے رہا کیا جا رہا تھا تو مجھے چھوڑنے سے پہلے کوڑوں کی سزا تو ضرور دی جائے گی لیکن میں یہ پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکی کہ مجھے کوڑوں کی سزا تو نہیں دی جائے گی۔ ممکن ہے وہ کوڑوں کی سزا کو بھولا ہوا ہو تو میرے پوچھنے پر اسے یاد آجائے۔ کاغذ پر میری رہائی کا حکم لکھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے نیچے پہنچنے تک یہ حکم نامہ بھی پہنچ جائے گا اور وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

لیکن مجھے جیل کی کارکردگی پر بھروسا نہیں تھا۔ گزشتہ روز ایک عورت نے بتایا تھا کہ اس کی رہائی کے احکامات جاری ہو چکے ہیں اور کاغذات کسی بھی لمحے پہنچنے والے ہیں لیکن پورا دن انتظار کرنے کے بعد بھی اس کی رہائی کے کاغذات نہیں پہنچے تھے اور ٹھیک چار بجے جیل کا دفتر بند ہو گیا تھا۔ دفتر بند ہونے کے بعد کسی کی رہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح اس عورت کو ایک رات اور جیل میں گزارنی پڑی تھی۔

"کیا رہائی کا یہ حکم نامہ میں خود لے جا سکتی ہوں؟" میں نے پر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

طباطبائی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کسی بھی قسم کے کاغذات کسی قیدی کے حوالے کرنا خلاف قانون تھا۔ یہ کام صرف دفتری ذرائع سے ہی ہوتے تھے۔

"اگر میں یہاں ہوتا تو تمہیں یہ ساری مصیبتیں نہ اٹھانا پڑتیں۔ میں تمہیں اپنا فون نمبر دے رہا ہوں اگر تمہیں کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ' خصوصاً اپنی سسرال کے معاملے میں کوئی پریشانی ہو تو تم کسی بھی وقت مجھے اس نمبر پر فون کر سکتی ہو" اس نے کہا

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اس نظام حکومت میں نہایت اعلیٰ سطح پر میرا ایک تعلق بن گیا تھا۔ اب اگر میرے ماموؤں میں سے بھی کسی پر کوئی افتاد نازل ہوئی تو میں ان کی مدد کر سکتی تھی اور اگر میری سسرال والوں نے فرہاد پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تو ان سے تو میں بہت اچھی طرح نمٹ سکتی تھی۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ جیل میں رہتے ہوئے اس مذہبی رہنما سے میری ملاقات ہو گئی تھی

"کیا میں جان سکتی ہوں کہ میرے خلاف کمیٹی میں رپورٹ کس نے کی تھی۔؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"اگر تم چند گھنٹے مزید یہاں رہو تو یہ بھی معلوم کر لیا جائے گا"

لیکن میں یہاں مزید ایک گھنٹے رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

مجھے دوبارہ تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی لیکن میں نے کسی محافظ عورت کو یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے کچھ دیر میں رہائی ملنے والی ہے۔ مجھے کچھ عورتوں سے پہلے ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ محافظ عورتوں کو جیسے ہی کسی عورت کے بارے میں یہ پتا چلتا تھا کہ وہ رہا ہونے والی ہے تو اس کے خلاف اوپر جھوٹی شکایتیں پہنچائی جاتیں تاکہ اس عورت کو مزید چند روز کے لئے اس عقوبت خانے میں روکا جا سکے۔ تہہ خانے میں آتے ہی میں نے اپنے چہرے پر مایوسی طاری کر لی تھی اور جب محافظ اور قیدی عورتوں نے دریافت کیا کہ مجھے اوپر اتنی دیر کیوں لگی تھی تو میں نے انہیں ٹال دیا اور اپنی جگہ پر اس عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی جسے ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی چادر واپس کر دی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کئی گھنٹے گزر گئے ہوں لیکن حقیقت یہ تھی کہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک محافظ نے میرا نام پکارتے ہوئے کہا "سوسن آزادی! تمہیں رہا کیا جاتا ہے ؟"

یہ آواز سنتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہو آزادی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہی تو ہے۔ میرے ساتھ والی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اب میں کیا کروں گی؟" اس نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میرا ایک کام کر دو تو میں تمہاری بڑی احسان مند ہوں گی۔ میرے شوہر کو فون کر کے بتا دینا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ میری بے گناہی پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ میری رہائی کے بعد اگر اس نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں کیا کروں گی ؟"

"شش" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "آہستہ بولو۔ تم جانتی ہو یہاں سے پیغام باہر بھیجنا بھی سنگین جرم ہے۔ مجھے فون نمبر بتاؤ۔ میں کاغذ پر لکھ لیتی ہوں۔"

مجھے یہ خوف بھی تھا کہ اگر یہاں سے نکلتے ہوئے وہ فون نمبر میرے قبضے سے پکڑا گیا تو مجھے دوبارہ اس تہہ خانے میں دھکیل دیا جائے گا۔ محافظ عورتیں وقتاً فوقتاً ہمیں یاد دلاتی رہتی تھیں کہ رہا ہونے والی عورت کسی قیدی عورت سے اس کے کسی رشتے دار کا فون نمبر لے کر نہ جائے۔ پکڑے جانے کی صورت میں سخت سزا دی جائے گی لیکن اس کے باوجود میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بدحواسی میں اس عورت کو اپنے ہی گھر کا فون نمبر یاد نہیں رہا تھا۔ کبھی وہ کچھ بتاتی کبھی کچھ۔ بالآخر اسے اپنی ایک دوست کا نمبر یاد آ گیا جسے میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر اسکرٹ کی بیلٹ کے نیچے چھپا لیا۔ میرے قریب کی چند اور عورتوں نے کھانے پینے کی کچھ چیزوں کی فرمائش کی تھی حالانکہ باہر سے چیزیں بھیجنے کی بھی ممانعت تھی۔ میں نے اپنا کوٹ پہن لیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

میں بیک وقت دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی تہہ خانے سے نکل کر کشادہ راہداری میں پہنچ گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس دروازے کی طرف بڑھنے لگی جہاں سے دو دن پہلے اندر داخل ہوئی تھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی بیرونی گیٹ سے نکل کر سڑک کے اس پار والی دکان میں داخل ہو گئی جہاں اس روز میں نے منصورہ اور فرہاد کو انتظار کرنے کو کہا تھا۔ اس روز گھر سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے کچھ رقم اسکرٹ کے اندر چھپالی تھی۔ میں نے قیدی عورتوں کی فرمائش کے مطابق دہی کے دس ڈبے، جوس کے ڈبے اور کھانے پینے کی دیگر چیزیں خریدیں اور دوبارہ آہنی گیٹ میں داخل ہو گئی۔ تہہ خانے میں پہنچ کر میں نے وہ چیزیں ایک محافظ عورت کے حوالے کر دیں اور اسے بتایا کہ یہ چیزیں ان عورتوں کے رشتے داروں نے دی ہیں جو باہر کھڑے تھے اگر میں یہ کہتی کہ یہ چیزیں میں لے کر آئی ہوں تو فوراً واپس کر دی جاتیں۔ میں اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ چیزیں ہال میں نہ پہنچا دی گئیں۔

سڑک پر آتے ہی میں نے ایک پبلک ٹیکسی رکوائی اور جلدی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی جہاں ایک مرد مسافر پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت میرا دل خوشی سے مچل رہا تھا۔ خوشی میرے چہرے سے بھی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"بہت خوش ہو خانم! کوئی خاص بات؟" ڈرائیور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ روشن اور چمکتا ہوا دن، چہرے سے ٹکراتے ہوئے ہوا کے خوشگوار جھونکے، مجھے یہ دنیا پہلے کبھی اتنی حسین نظر نہیں آئی تھی۔

"تم یقین نہیں کرو گے کہ میں کہاں سے آ رہی ہوں" میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اس جیل سے رہا ہو کر آئی ہوں جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں آتا اور تم جانتے ہو میں جیل کیوں گئی تھی؟ میرا جرم صرف یہ تھا کہ میرے گھر میں وڈیو کیسٹ اور موسیقی کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ میرے قبضے سے پیٹرول کے چند کوپن بھی برآمد ہوئے تھے۔ اس کے لئے مجھے تین دن جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ حکومت لوگوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دے گی۔ میں خوش قسمت ہوں کہ اس جیل سے زندہ واپس آگئی ہوں۔" میں جذبات میں بولے چلی جا رہی تھی۔

ڈرائیور اور ٹیکسی کا دوسرا مسافر معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن دونوں میں سے کسی نے کچھ کہا نہیں تھا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں صرف جیل سے نکلی تھی آزاد نہیں ہوئی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے یہ دونوں آدمی

بھی قید میں تھے . ایران کی سرزمین ایک بہت بڑی جیل بن گئی تھی اور سارا ... محض قید تھا۔ ایران سے نکلے بغیر مجھے آزادی نہیں مل سکتی تھی۔ میں اب بھی قید میں تھی

○☆○

میں جیل سے تو نکل آئی تھی لیکن مذہبی رہنماؤں کی اس حکومت سے میری نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس حکومت سے شدید نفرت تھی جس نے ایک عورت کو محض اس لئے جیل میں ڈال دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھی ایک مرد دوست سے باتیں کررہی تھی۔

میں اپنے آپ سے بھی خوش نہیں تھی کہ اس مرد کو اپنے گھر آنے کا موقع ہی کیوں دیا تھا اور سب سے زیادہ غصہ مجھے اپنے خاندان والوں پر تھا۔ میں تین دن تک جیل میں بیٹھی روتی رہی تھی اور انہوں نے میری خبر تک نہیں لی تھی۔ انہوں نے مجھے رہا کرانے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں سیدھی پھوپی طوطی کے گھر پہنچی تھی اور اپنا سارا غصہ اس پر اتار دیا تھا۔

"تم سب لوگ کہاں تھے؟" میں نے چیختے ہوئے کہا "میری کوئی مدد کیوں نہیں کی؟" وہ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر میں کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

"ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی" بالآخر طوطی کو بولنے کا موقع مل گیا "انہیں معلوم نہیں تھا کہ تمہارا تعلق ایک بہت بڑے خاندان سے ہے اگر ہم کیمٹی پر دباؤ ڈالتے اور انہیں تمہارا خاندانی پس منظر معلوم ہو جاتا تو بات بگڑ سکتی تھی ممکن ہے وہ تمہاری رہائی کے لئے اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کر ڈالتے جس کا انتظام کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوتا اور اس طرح جیل میں پڑی سڑتی رہتیں۔ ہم نے جو ذرائع استعمال کئے تھے ان سے ہم نے تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ تم ایک غریب اور لاوارث عورت ہو۔"

"میں واقعی لاوارث ہوں اسی لئے تو کسی نے مجھے پوچھا تک نہیں" میں نے جواب دیا اور غصے میں پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ اب میرا رخ فرہاد کے اسکول کی طرف تھا۔ چھٹی ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اپنے سسرال والوں سے پہلے اسکول پہنچ جاؤں تاکہ فرہاد کو اپنے قبضے میں لے سکوں۔

میں جیسے ہی اسکول کے سامنے پہنچی چھٹی کی گھنٹی بجی۔ بچے بھیڑ بکریوں کی طرح گیٹ سے باہر نکلنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکول خالی ہو گیا۔ اب صرف وہی بچے رہ گئے تھے جنہیں لینے والے ابھی نہیں پہنچے تھے لیکن فرہاد مجھے نظر نہیں آیا۔ میں اسکول میں داخل ہو کر پرنسپل کے دفتر پہنچ گئی اور جب میں نے فرہاد کے بارے میں دریافت کیا تو وہ الٹا مجھ پر چڑھ دوڑی۔

"فرہاد تین دن سے اسکول نہیں آیا۔ تم لوگ کیسے لاپروا والدین ہو کہ بچوں کو اسکول بھی نہیں بھیجتے؟"

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب میری نفرت کا مرکز میرے سسرال والے تھے۔ اپنی ساس اور علی وغیرہ کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خون کھولنے لگا۔ جب کبھی میں فرہاد کو اپنے ساتھ کیمپنگ لے جاتی تھی اور اس کا اسکول کا ایک دن کا ناغہ ہو جایا کرتا تھا تو یہ لوگ ہنگامہ کھڑا کر دیا کرتے تھے اور اب تین دن سے انہوں نے فرہاد کو اسکول نہیں بھیجا تھا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے فون پر ان کا نمبر ڈائل کیا۔ اتفاق سے کال فرہاد نے ریسیو کی تھی۔ میری آواز سنتے ہی وہ رونے لگا۔

"ممی! آپ مجھے لینے کب آرہی ہیں۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ آپ اتنے دن کہاں تھیں ممی! پلیز جلدی سے آکر مجھے یہاں سے لے جایئے۔"

میں نے فرہاد سے وعدہ نہیں کیا کہ اسے لینے کے لئے کب آؤں گی کیونکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس تک پہنچنے سے پہلے مجھے اس کی دادی وغیرہ سے نمٹنا تھا۔ میں نے فرہاد سے کہا کہ وہ اپنی دادی کو فون پر بلا دے۔

چند سیکنڈ بعد ہی میری ساس کی آواز سنائی دی اس کے لہجے میں سرد مہری تھی لیکن میں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں فرہاد کو لینے آرہی ہوں۔"

"نہیں، تم یہاں نہیں آسکتیں" اس نے سخت لہجے میں جواب دیا "جیل سے آنے کے بعد تم بہت تھک گئی ہوگی۔ تم اپنا خیال رکھو ہم فرہاد کا خیال رکھیں گے۔ تم جو زندگی گزار رہی ہو وہ اس معصوم بچے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اب وہ ہمارے ہی پاس رہے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ فرہاد کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ میرے ساتھ جو کچھ بیت چکی تھی اس کے پیش نظر میں اپنے حق میں زیادہ دفاع نہیں کرسکتی تھی۔ جیل میں گزرنے والے میرے تین دن وہ خوفناک ہتھیار بن گئے تھے جنہیں میری سسرال والے میرے خلاف استعمال کرسکتے تھے اور پھر کچھ سوچے بغیر میں نے فون پر طباطبائی کا دیا ہوا پرائیویٹ نمبر ڈائل کر دیا۔ طباطبائی سے میری بات نہیں ہو سکی تھی لیکن میں نے اس کے سیکریٹری کو پیغام دے دیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے جواب کے لئے کم از کم دو دن انتظار کرنا پڑے گا لیکن اس کے ٹھیک دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ وہ طباطبائی کی کال تھی۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میرا بیٹا جلدی ہی مجھے مل جائے گا۔

اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ فرہاد کی کال تھی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ریسیور پر

میری ساس کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اس نے کہا کہ میں آکر فرہاد کو لے جاؤں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ فرہاد کے سلسلے میں اس نے یکایک اپنا ارادہ کیوں بدل دیا تھا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان کے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ میں فرہاد کو اپنی آغوش میں لینے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچی تو فرہاد دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے چین سی نگاہوں سے سڑک پر کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف دیکھ رہا تھا لیکن میری کار دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ دروازے میں میری ساس بھی کھڑی تھی لیکن جیسے ہی کار رکی اس نے مکان میں داخل ہو کر دروازہ دھڑ سے بند کرلیا۔ میں نے کار سے اتر کر فرہاد کو سینے سے لپٹا لیا اور اس کے رخساروں اور پیشانی پر بے تحاشہ بوسے دینے لگی۔

جب میں گھر پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ جب میں جیل میں تھی تو یورپ سے حامد اور صوفی کا فون آیا تھا اور گزشتہ رات کمال بھی اپنی مرسیڈیز لینے آیا تھا۔ میرے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ڈرائیور جلال آغا کی بیوی فرح بیسمنٹ سے نکل کر آگئی۔ اس کے چہرے پر بدحواسی نمایاں تھی اور وہ مضطربانہ انداز میں بار بار ہاتھ مل رہی تھی۔

"خانم!" اس نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں کہا "مسٹر کمال نے دوبارہ فون کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ آپ پر یہ مصیبت ہماری وجہ سے آئی تھی۔ انہوں نے ہمیں دھمکی دی ہے کہ اگر یہ معلوم ہوگیا کہ کمیٹی کو رپورٹ کس نے کی تھی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں خانم! ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے کسی سے آپ کے خلاف کبھی شکایت نہیں کی۔"

مجھے کمال پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ مصیبت کا یہ پہاڑ مجھ پر دراصل اسی کی وجہ سے ٹوٹا تھا اگر وہ اس روز یہاں نہ ہوتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ میں نے فرح کو تسلی دی کہ انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے گھر میں آئے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمال کا فون آیا "اگر کل مجھے معلوم ہوجاتا کہ تم جیل میں ہو تو میں کبھی بھی رہائی قبول نہ کرتا" اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں رہا کردیا گیا ہے۔"

کمال صرف ایک رات جیل میں رہا تھا۔ دوسرے دن جب میں نے اسے انٹروگیشن روم میں دیکھا تھا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اسے رہا کردیا گیا تھا۔ اس کی رہائی میں اس کے کزن کا ہاتھ تھا جو ایک نامور مذہبی رہنما تھا۔ کمال نے مجھ سے بات کرتے ہوئے یہ اعتراف بھی کرلیا کہ اس نے کمیٹی والوں کو یہی بیان دیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ وعدہ لینے کے بعد کہ آئندہ وہ کسی اکیلی عورت کے گھر نہیں جائے گا اسے رہا کردیا گیا تھا۔ البتہ اس کی کار سے برآمد ہونے والے پیٹرول کے کوپن ضبط کرلئے گئے تھے۔ میں نے کمال سے زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا لیکن اس کے چند سیکنڈ بعد ہی فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس مرتبہ طباطبائی کی کال تھی۔

"مجھے امید ہے کہ تمہارا بیٹا اب تک گھر پہنچ گیا ہوگا" اس نے کہا "تمہارا فون ملنے کے فوراً ہی بعد میں نے تمہاری ساس مسز امینی کو فون کیا تھا' وہ بڑے اچھے لوگ ہیں" اس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسز امینی ایک بہت معروف مذہبی رہنما کی بیٹی ہے۔"

اپنی ساس کی تعریف سن کر میرا خون کھول اٹھا' لیکن ظاہر ہے وہ اس کی تعریف کیوں نہ کرتا کیونکہ اس کا تعلق بھی انہی کے طبقے سے تھا۔

"اب میں تم سے ملنا چاہتا ہوں" طباطبائی کہہ رہا تھا۔ تمہیں اسلامی تعلیمات کی ضرورت ہے اور میں اس سلسلے میں تمہاری رہنمائی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے سوچے سمجھے بغیر ملاقات پر آمادگی ظاہر کردی۔ ملاقات کے لئے مختلف جگہیں تجویز کی جانے لگیں۔ اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے سے منع کردیا تھا کیونکہ اس کا مکان شہر کے غریب طبقے کی آبادی میں واقع تھا اور پھر بقول اس کے مجھ جیسی عورت کے لئے وہاں آنا مناسب نہیں تھا۔ میں اسے اپنے گھر بھی نہیں بلانا چاہتی تھی کیونکہ اس سلسلے میں پہلے ہی کافی مصیبتیں اٹھا چکی تھی۔

"میرا ایک دوست تمہارے ہی علاقے میں رہتا ہے" بالآخر اس نے کہا "میں اس سے بات کرکے اسی کے گھر تم سے ملاقات کا وقت طے کرلوں گا۔"

اس کی اس تجویز پر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں دراصل دنیا کی سب سے بڑی احمق تھی جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ مجھے ایک ایسا اہم اور طاقتور دوست مل گیا ہے جو نہ صرف میرے بلکہ میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے برے وقت میں کام آسکے گا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ میں خاندان کی واحد فرد ہوں جس کے حکومت کی کسی اعلیٰ و مقتدر ہستی سے تعلقات ہوں گے اور میرے دوست و عزیز اپنے مسائل کے سلسلے میں سفارشوں کے لئے میرے پاس آیا کریں گے۔ اگرچہ مجھے یہ شبہ تو تھا کہ حجت الاسلام طباطبائی مجھے اپنی "قانونی بیوی" بنانے کی کوشش کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ میں اپنی باتوں سے اس کا یہ ارادہ تبدیل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گی لیکن اب مجھے اس کی نیت پر شک ہونے لگا تھا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر کمال کا فون آیا اور جب

جاؤ گی" ماموں فائق نے کہا "یہ شخص تمہیں کسی چکر میں پھنسانا چاہتا ہے اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرو۔"

"لیکن کیا میں اسے اپنا دوست نہیں بنا سکتی۔ اس سے میری دوستی پورے خاندان کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم خاندان کی بھلائی کے لئے سوچ رہی ہو لیکن اس کے رتبے کا شخص کسی لالچ کے بغیر تم جیسی عورت کی مدد نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ میں اپنی باتوں سے اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔" میں نے کہا "وہ کسی بھی برے وقت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

یہ مشورہ دینے کے بعد کہ میں طباطبائی کی فون کال کا جواب نہ دوں یا اس سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھوں۔ ماموں فائق نے یہ بری خبر بھی سنائی کہ میرے سسرال والوں نے آج شام چار بجے ہم سے ملاقات کے لئے اصرار کیا تھا۔

یہ ملاقات میری ساس کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس میٹنگ میں فرہاد کے دونوں گارجینز جمشید اور علی کے علاوہ ماہر نفسیات پرویز بھی شامل تھا۔ جسے غالباً عبداللہ سلمی کی جگہ بلایا گیا تھا۔ وہ میری طرف سے اس طرح نظریں چرانے کی کوشش کر رہے تھے جیسے میں کوئی بچی یا مجمہ ہوں۔ وہ لوگ میرے بجائے میرے ماموں ہی سے بات کرتے رہے۔

"سوسن کو اپنی زندگی پر اختیار حاصل ہے۔ وہ جو چاہے کرتی رہے" میرا دیور علی کہہ رہا تھا "لیکن فرہاد کا معاملہ مختلف ہے۔ سوسن کی گرفتاری نے اس کے ذہن کو بہت بری طرح متاثر کیا ہے اور ہم دوبارہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فرہاد اپنی دادی کے پاس رہے گا یہاں اس کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی۔"

جب میں نے علی کی اس تجویز پر اعتراض کیا تو انہوں نے میرے سامنے دو تجویزیں رکھیں۔ پہلی تجویز تو یہ تھی کہ میں امی ہاؤس کے بیسمنٹ میں منتقل ہو جاؤں جہاں میرے علاوہ فرہاد پر ان کی نگاہ بھی رہے گی اور دوسری یہ کہ اگر میں امی ہاؤس میں نہ رہنا چاہوں تو ان کے قریب ہی متوسط علاقے میں کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لوں۔ ان کے کہنے کے مطابق میرا مکان دوسروں کی نظروں میں آ چکا ہے اس کے علاوہ اتنے بڑے مکان میں میرے اکیلے رہنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ میں ان پر یہ واضح کرنے کی ہمت نہیں کر سکی کہ یہ گھر میرے شوہر کا تھا جو اس نے اپنے بیٹے کے لئے وراثت میں چھوڑا تھا اور قانونی طور پر مجھے اپنے بیٹے کے مکان میں رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انہیں فرہاد کا ولی مقرر کیا گیا تھا اور گھر کے اخراجات کے لئے مجھے ماہانہ الاؤنس بھی انہی سے ملتا تھا۔ مالی معاملات میں میں مکمل طور پر ان کی محتاج تھی۔ مجھے بحالت مجبوری ان کی یہ تجویز ماننا پڑی کہ میں کسی چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گی اور فرہاد میرے پاس ہی رہے گا لیکن میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ سب عارضی ہو گا کیونکہ اب میں نے ایران سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرے خاندان والوں پر طباطبائی کا خوف سوار تھا۔ ان کے اصرار پر میں ایک سوٹ کیس میں اپنے اور فرہاد کے کپڑے اور چند ضروری چیزیں لے کر اسی روز دوسرے مکان میں منتقل ہو گئی۔ اب میں بھی عام ایرانیوں کی سی زندگی گزارنے لگی تھی لیکن میں نے دوستوں کے ہاں آنا جانا ترک نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھار میں رات کو بھی دوستوں کے گھر رہ جاتی اور جب کبھی رات کو رہنے کا پروگرام نہ ہوتا تو شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنے گھر واپس آ جاتی۔ اس دوران میں جلال آغا یا اس کی بیوی فرح سے بھی معلوم کرتی رہتی کہ طباطبائی کے آدمی میرے مکان کی نگرانی تو نہیں کر رہے تھے۔ جلال آغا سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ طباطبائی دن میں کئی کئی مرتبہ فون کر رہا تھا۔

مجھے فلیٹ میں منتقل ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا لیکن طباطبائی میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر اس نے کمیٹی کے آدمی میرے مکان پر بھیج دیئے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ میں اس کے فون کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی اور بالآخر اس نے میری گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے۔ اگرچہ جیل سے رہائی کے وقت مجھے ہر قسم کے الزامات سے بری قرار دے دیا گیا تھا لیکن مذہبی رہنماؤں کی حکومت میں کسی کی گرفتاری کے لئے کسی معقول وجہ کی ضرورت نہیں تھی اور پھر یہاں تو معاملہ طباطبائی جیسے مذہبی رہنما کا تھا جس نے میرے حصول کو اپنی ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اب بھی کسی جرم میں حکومت کو نہیں بلکہ حجت الاسلام طباطبائی کو مطلوب تھی۔ میں نے اپنی تمام سرگرمیاں معطل کر دیں۔ فرہاد کے ساتھ اسکول آنا جانا بھی خطرناک تھا کیونکہ اس طرح میں دوسروں کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ فرہاد کو اسکول لانے اور لے جانے کے لئے میرے دوست یہ خدمت انجام دینے لگے۔

کمال نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ بھی میرا پتا معلوم کرنے کے لئے روزانہ جلال آغا کو دھمکاتا رہتا تھا اور بالآخر وہ اس سے میرا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور جب اسے یہ پتا چلا کہ طباطبائی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے لگا ہوا ہے تو وہ بھڑک اٹھا اور اس نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

کمال ہر قسم کے خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے طباطبائی سے ملنے کے لئے اس کے دفتر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا کزن بھی تھا جس کا شمار تہران کے صف اول کے مذہبی رہنماؤں میں

ہوتا تھا۔ طباطبائی جیسے شخص کے راستے میں آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن کمال بھی اپنی قسم کا ایک ہی تھا۔ اس نے طباطبائی کو کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ طباطبائی میرا خیال دل سے نکال دے۔ اس نے طباطبائی کو یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اب اگر اس نے مجھے پریشان کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

"یہ میرا اور سوسن آزادی کا معاملہ ہے" طباطبائی نے اس کی دھمکی کا اثر لئے بغیر کہا "تمہیں یا کسی اور کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔"

صورتِ حال خاصی سنگین تھی۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی تھی۔ میرے چاہنے والوں میں سے ایک اعلیٰ درجے کا مذہبی رہنما تھا جسے حکومت کی طرف سے بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ دوسرا اگرچہ خاصا دولت مند تھا لیکن مذہبی رہنما کے اختیارات کے سامنے بے بس تھا۔

کمال بار بار اصرار کر رہا تھا کہ میں اس سے عارضی شادی کرلوں تاکہ طباطبائی کو نیچا دکھایا جاسکے لیکن میرے خاندان والے اس کے خلاف تھے کیونکہ عارضی بیوی کی حیثیت ایک قانونی داشتہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اسے کسی بھی لمحے کوئی وجہ بتائے بغیر طلاق دی جاسکتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں بھی کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن صورتِ حال نے کچھ عجیب سی شکل اختیار کرلی تھی۔ اگر میں ترکی کے راستے ایران سے فرار کی کوشش بھی کرتی تو انتظامات میں کئی ہفتے لگ سکتے تھے اور یہ قوی امکان تھا کہ اس دوران طباطبائی مجھے تلاش کرکے اپنے شکنجے میں کس لے گا۔ اس شیطان سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں کمال سے شادی کرلوں۔

میرے سامنے ایک اور راستہ بھی تھا۔ اگرچہ یہ راستہ خاصا مخدوش تھا لیکن کمال کی آغوش میں جانے سے پہلے میں نے اسے آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ امام خمینی کے قانون کے مطابق وہ عورت جس نے کسی غیر ملکی سے شادی کی ہو، اپنے خاوند کے ساتھ قانونی طور پر ایران سے جاسکتی تھی اگر کوئی بھروسے کا ایسا غیر ملکی مل جائے جو مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو تو میں ترکی کے راستے فرار ہونے کا خطرہ مول لینے کے بجائے فرہاد کو لے کر قانونی طور پر ایران سے نکل سکتی تھی۔

سوئٹزرلینڈ میں اپنے کزن دارا کے ذریعے مجھے ایک ایسے ایرانی کا پتا مل گیا جس نے ایک سوئس لڑکی سے شادی کررکھی تھی۔ اسے سوئس شہریت بھی حاصل تھی اور اس کے پاس سوئس پاسپورٹ بھی موجود تھا۔ ان دنوں وہ شخص ایران ہی میں تھا۔ اس شخص سے رابطہ کرنے سے پہلے دارا نے سوئٹزرلینڈ میں اس کی بیوی سے رابطہ قائم کرکے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ وہ لڑکی ایرانیوں پر ہونے والے ظلم و تشدد سے واقف تھی۔ اس نے بہ خوشی اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ ایران میں دوسری شادی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسلام نے مرد کو بیک وقت چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔

"میں ایران میں اس شخص سے رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔" دارا نے مجھے فون پر بتایا "تم خود اس سے ملنے کی کوشش کرو اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کردو۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔"

وہ آدمی اپنے بھائی کے ہاں قیام پذیر تھا۔ میں نے ہمت کر کے اسے فون کر ہی دیا اور سرسری سے انداز میں صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

"یہاں آنے کے لئے کوئی پرانی سی کار استعمال کرنا اور کار کو میرے گھر سے دور ہی چھوڑ دینا۔" میں نے اسے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شخص میری دعوت اور ان ہدایات پر خاصا پریشان ہوا ہوگا کیونکہ میں نے اصل بات اسے ابھی تک نہیں بتائی تھی۔ اس سے میری گفتگو اس کی بیوی کے حوالے سے ہوئی تھی۔

جس روز اسے میرے گھر آنا تھا اس روز میں نے اپنی ایک دوست کو بھی بلوالیا تھا تاکہ اگر کمیٹی والے بلہ بول دیں تو مجھے اس آدمی کے ساتھ اکیلی پاکر دوبارہ گرفتار نہ کرلیں۔ اب تک مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ کمیٹی والے میری نقل و حرکت سے

پوری طرح واقف تھے۔ وہ آسیب کی طرح میرے اعصاب پر سوار تھے۔ میں جہاں بھی جاتی کوئی نہ کوئی آدمی میری نگرانی کر رہا ہوتا۔ مجھے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے

پروگرام کے مطابق سہ پہر کے وقت میرا اجنبی مہمان آگیا تقریباً پندرہ منٹ تک ہم اس سے گفتگو کرتے رہے۔ میں ابھی تک اصل موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی اور پھر کپ میں چائے انڈیل ہی رہی تھی کہ میرا ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"کمیٹی..." اس نے ہانپتے ہوئے کہا "میں نے بیرونی گیٹ بند کر دیا ہے تاکہ انہیں کچھ دیر کے لئے روکا جا سکے۔ خدا کے لئے بھاگ جاؤ"

میں نے اپنے مہمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی عقبی دروازے سے باہر لے گئی اور باغ کے اس گیٹ کی طرف اشارہ کیا جو مخالف سمت میں تھا۔ اس دوران کمیٹی والوں نے سامنے والا گیٹ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا تھا۔ میرا مہمان خاصا بدحواس ہو رہا تھا۔ یہ وضاحت کرنے کے لئے وقت نہیں تھا کہ اسے کیوں بھگایا جا رہا ہے۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جائے۔

مہمان کو نکالنے کے بعد میں اپنی دوست کے ساتھ بالکونی میں آگئی۔ یہاں سے گیٹ پر کھڑے ہوئے کمیٹی والے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن میرے مہمان کی زرد پیکان گیٹ کے بائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ کمیٹی کے تین چار آدمی کار کے ارد گرد گھوم کر اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

"وہ اب تک نکل چکا ہوگا" میری دوست نے باغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ میرے مہمان کی طرف تھا "ہمارا یہاں رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔ میری کار گیٹ کے سامنے کھڑی ہے پہلے میں باہر نکلتی ہوں۔ جیسے ہی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنو تم بھی دوڑ کر آجانا۔"

"لیکن فرہاد کا کیا ہوگا؟" میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ "اس کی اسکول بس کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔"

"بس کو ہم راستے ہی میں روک لیں گے" میری دوست نے جواب دیا۔

یہ کوئی نئی اور غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایران کے لوگ اپنے ہی گھروں سے فرار ہونے کے عادی ہو چکے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کمیٹی کے خوف سے ہر شخص ہر وقت بھاگنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

پروگرام کے مطابق ہم باری باری گھر سے باہر نکلے۔ میں جیسے ہی کار میں بیٹھی ٹھیک اسی لمحے فرہاد کی اسکول کی بس وہاں آکر رکی۔ میں ایک بار پھر کار سے اتر آئی اور فرہاد کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کار کی پچھلی سیٹ پر ٹھونس دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد کار حرکت میں آگئی۔ میرے دل کی دھڑکن خوفناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ پورا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کسی بھی لمحہ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کمیٹی کے سارے آدمی گیٹ سے دور زرد پیکان کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میرا مہمان بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا یا پکڑا گیا تھا؟ اپنی دوست کے گھر پہنچتے ہی میں نے اس کے گھر فون کیا لیکن اس کے بھائی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ انکشاف تو تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوا تھا کہ کمیٹی کے آدمیوں نے اسے فرار کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کر لیا تھا۔ مجھے اس کی گرفتاری کا بے حد افسوس ہوا تھا۔ کمیٹی کے آدمی دراصل مجھے گرفتار کرنے آئے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

یہ انکشاف تو بعد میں ہوا تھا کہ اس روز ایک اہم مذہبی رہنما کو قتل کر دیا گیا تھا اور قاتل زرد رنگ کی پیکان میں فرار ہوا تھا۔ میرا مہمان باغ کے عقبی دروازے سے نکل کر اپنی کار لینے کے لئے اوپر سے گھوم کر اس طرف آیا تھا کہ کمیٹی والوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے پاس گاڑی کے کاغذات بھی نہیں تھے۔ یہ کار دراصل اس کے بھائی کی کمپنی کی ملکیت تھی۔ کاغذات کمپنی کے دفتر میں تھے اور دفتر بند ہو چکا تھا۔ میرے اجنبی مہمان پر مذہبی رہنما کے قتل کا شبہ کیا جا رہا تھا لیکن آدھی رات کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ رہائی سے پہلے ایک ایسی تحریر پر اس سے دستخط کروالئے گئے تھے کہ اسے جب بھی طلب کیا جائے گا اسے کمیٹی کے دفتر میں حاضر ہونا پڑے گا۔

اس رات فون پر بات کرتے ہوئے اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے مجھ پر عجیب سی دہشت طاری ہو گئی تھی۔

"وہ مجھ سے بار بار تمہارے بارے میں پوچھتے رہے تھے" وہ بتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ اس وقت بھی خوف سے کپکپا رہا تھا "وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا میں کوئی قحبہ خانہ چلا رہی ہوں اور یہ کہ میں نے تمہیں کتنی فیس ادا کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔ میں تمہارے باپ کا دوست ہوں اور تم سے اس کے بارے میں پوچھنے آیا تھا لیکن معاملہ کیا ہے؟ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

اب اسے یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی وہ ایران سے چلا گیا حالانکہ اسے ابھی کئی روز تک یہاں رہنا تھا اور جس کام سے وہ آیا تھا وہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

اب مجھے کسی پر بھروسا نہیں رہا تھا لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کمیٹی والوں کو اطلاع کس نے دی تھی۔ وہ میرے مہمان کے آنے کے بعد چند منٹ کے اندر اندر کس طرح پہنچ گئے تھے۔ اس رات میں اپنی ایک دوست کے ہاں چلی گئی۔ جسے میرے خاندان والے بھی نہیں جانتے تھے۔ میں نے کسی کو اپنے اس نئے ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے خاندان والوں پر تشدد کر کے ان سے میرا پتا معلوم کیا جاسکتا تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے فرہاد کو بھی اپنی ایک دوسری دوست کے ہاں بھیج دیا تھا۔

ایک طرف حکومت کے اہل کار شکاری کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے تھے اور دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ ایسے لوگوں کے دوست احباب خطرات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود ان سے پوری طرح تعاون کرتے ہوئے انہیں پناہ دے رہے تھے۔ میری بعض دوست ایسی تھیں جن کے شوہر میری وجہ سے ان سے ناراض تھے۔ وہ میرے لئے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے لیکن میری دوستوں نے اپنے شوہروں کی ناراضی کی پروا کئے بغیر مجھے اپنے ہاں پناہ دی تھی اور مجھ سے ہر قسم کا تعاون کیا تھا۔

اس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ گھر سے باہر کوئی معمولی سی آہٹ بھی مجھے بدحواس کر دیتی۔ خوف نے میرے دن کا سکون اور راتوں کی نیند چھین لی تھی۔ کمیٹی کے آدمی شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اگر اس مرتبہ میں ان کے ہاتھ لگ گئی تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے جیل سے رہا نہیں کرا سکے گی۔ میں حجت الاسلام طباطبائی کے رحم و کرم پر تھی۔ میں نے اسے ٹھکرا کر اس کی توہین کی تھی اور طباطبائی اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔

مجھے مردوں اور ان کی بنائی ہوئی سوسائٹی سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ صرف مرد کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی تھی اور اس تحفظ کے بدلے مرد کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا سیکس... وہ خواہ کوئی غنڈہ ہو یا مذہبی رہنما۔ ان کے ذہن اس حد تک پراگندہ تھے کہ وہ سیکس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب میں کسی مرد کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس رات اپنے دوست کے گھر کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے میں بار بار خوف سے تھرا اٹھتی تھی۔ میں اس طرح کانپ رہی تھی جیسے میرے چاروں طرف برف کی دیواریں کھڑی کردی گئی ہوں۔ بار بار میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے اور میں بچوں کی طرح اونچی آواز میں رونے لگتی۔

میری یہ کیفیت دیکھ کر میری دوست نے مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان مت کرو سوسن! اس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سوچو کہ اس صورت حال سے نجات کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔"

"وہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے بدستور روتے ہوئے جواب دیا "میں کہیں بھی چلی جاؤں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ دنوں تک ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکوں گی۔"

میری دوست بھی دیر تک میرے ساتھ روتی رہی۔ بالآخر اس نے مجھے خواب آور گولیاں دے دیں جن سے رات کے پچھلے پہر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح جب میں نے فرہاد کو فون کیا تو میری دوست نے بتایا کہ کمیٹی والے میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر ایک بار پھر میرے گھر گئے تھے۔ ظاہر ہے ان حالات میں میں اپنے گھر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے کمال کو فون کر کے اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر طباطبائی سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"نہیں، خدا کے لئے اس کے سامنے مت جانا" میں نے چیختے ہوئے کہا "وہ تمہیں گرفتار کرلیں گے" لیکن کمال اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔ میں نے اس شرط پر اسے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ اپنے مذہبی رہنما کزن کو ساتھ لے جائے گا "میں پہلے ہی بہت سے لوگوں کے لئے مصیبت کا باعث بن چکی ہوں میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

کمال نے اگرچہ مجھ سے وعدہ کرلیا تھا کہ اپنے کزن کو ساتھ لے جائے گا لیکن وہ اپنی ضد سے باز نہیں آیا اور اکیلا ہی تخت جمشید ایونیو چلا گیا۔ بعد میں اس معرکے کی تفصیل بتاتے ہوئے کمال نے کہا تھا۔

"طباطبائی جیسا ——— آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا اس شخص پر کبھی بھی اور کسی بھی معاملہ میں بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے حیرت ہے امام خمینی نے ایسے آدمی کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ملنے کی کوشش بھی مت کرنا" اس نے حکیمانہ لہجے میں کہا "اگر تم اس کے جال میں پھنس گئیں تو زندگی بھر نہیں نکل سکو گی۔"

میں نے کمال کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ حسد و رقابت کی وجہ سے مجھے طباطبائی سے ملنے سے منع کر رہا تھا۔ جب میں نے ماموں فائق کو فون کیا تو انہوں نے کمال سے زیادہ برہمی کا مظاہرہ کیا۔

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تم کس مصیبت میں پھنس

خانہ چلاتی ہے۔" یہ تمہارے بارے میں اس مذہبی رہنما کے خیالات ہیں جس نے چند روز پہلے تمہیں تمام الزامات سے بری قرار دیتے ہوئے جیل سے رہائی دلائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا خیال ذہن سے نہیں نکال سکتا اور ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن جب تک میں زندہ ہوں وہ اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے گرد جو جال بچھایا گیا تھا وہ سمٹ رہا تھا۔ حصار تنگ ہو رہا تھا۔ ایک طرف حجت الاسلام طباطبائی کی دھمکیاں دوسری طرف یہ خوف کہ میرے سسرال والے فرہاد کو پھر اپنے قبضے میں نہ لے لیں اور تیسری یہ پریشانی کہ مجھے کوئی ایسا آدمی نہیں مل رہا تھا جو ایران سے فرار ہونے میں مدد دے سکے۔ یہ صورتِ حال مجھے مسلسل کمال کی طرف دھکیل رہی تھی۔ گو تحفظ کے خیال سے ہی لیکن میں غیر محسوس طور پر کمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"دیکھو سوسن! اب ہمارا شادی کر لینا ہی بہتر ہے" کمال نے کہا "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور تم جانتی ہو کہ اس طرح ملنے میں ہم دونوں کے لئے کتنے خطرات ہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ شادی کے بعد تمہارے بھی بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ نہ صرف سسرال والے تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے بلکہ طباطبائی کی امیدوں پر بھی پانی پھر جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم موقع ملتے ہی یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ اس انقلاب کے دامن میں ہم جیسے لوگوں کے لئے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔"

کئی روز کی سوچ بچار کے بعد میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ میں اس سے شادی کے لئے تیار تھی لیکن اس کے لئے میں نے کچھ شرائط بھی عائد کر دی تھیں۔ میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کمال سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، میں تو فرہاد کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"میں تم پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے جیسے ہی باہر جانے کا موقع ملا میں فرہاد کو لے کر چلی جاؤں گی" میں نے کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ دینا چاہو گے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے تمہاری پروا نہیں ہوگی۔"

کمال نے میری شرائط مان لی تھیں۔ کمال سے میری ملاقات دو مہینے پہلے ہوئی تھی اور میں اس کے بارے میں پوری طرح جانتی بھی نہیں تھی لیکن یہ شخص ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

دو ہفتے بعد ہماری شادی ہو گئی۔ یہ سادہ سی تقریب میری پھوپھی طوطی کے گھر پر ہوئی تھی جس میں چند قریبی رشتے داروں کے علاوہ مخصوص دوستوں نے شرکت کی تھی۔ میں ابھی اس شادی کو فی الحال اپنی سسرال سے چھپائے رکھنا چاہتی تھی کیونکہ ایران سے اپنے فرار کا منصوبہ بنانے کے لئے کچھ وقت درکار تھا

شادی کی صبح میں خوب روئی تھی۔ میری یہ دوسری شادی کاشان کی شادی سے کتنی مختلف ثابت ہوئی تھی۔ کاشان سے شادی کے بعد پہلی صبح جب میں سو کر اٹھی تھی تو مجھے خوشبودار پانی سے نہلایا گیا تھا۔ خوب بنایا سنوارا گیا تھا۔ میں ایک ایسے شخص کی بیوی تھی جو ہر لڑکی کے دل میں بستا تھا لیکن آج صبح بیدار ہونے کے بعد میں نے صرف اس لئے میک اپ کیا تھا کہ آنکھوں کی سوجن اور چہرے کی زردی کو چھپا سکوں۔ میری یہ شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی تھی جسے میں پوری طرح جانتی بھی نہیں تھی لیکن اب ایران میں زندہ رہنے کے لئے میرے پاس یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا۔

شادی سے چند ہفتے پہلے میں نے ایک بیٹے کی ماں اور بیوہ ہونے کی حیثیت سے اپنے حقوق کے لئے اپنے وکیل سے قانونی کارروائی کے لئے مشورہ کیا تھا۔ میرے خاندان والوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ ان کے خیال میں اس طویل قانونی جنگ میں مجھے کچھ نہیں ملے گا البتہ خاندان کی رسوائی ضرور ہوگی لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے وکیل پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ہر قیمت پر اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ وکیل نے اس سلسلے میں کچھ تجاویز بھی پیش کی تھیں۔

"بعض اعلیٰ حکام سے میرے ذاتی تعلقات ہیں" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "انہیں رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر علی کی پٹائی کرا دی جائے اور اسے دھمکی دی جائے کہ آئندہ تمہیں پریشان کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

"اگرچہ مجھے ان لوگوں سے شدید نفرت ہے" میں نے کہا۔ "لیکن میں ان کے خلاف ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تو پھر یہ ہو سکتا ہے کہ کسی برسراقتدار مذہبی رہنما کو رشوت دے کر انہیں کمیٹی کے ذریعے چند روز کے لئے جیل میں ڈلوا دیا جائے" وکیل نے کہا۔

لیکن میں نے وکیل کی یہ تجویز ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ البتہ اس بات پر آمادہ ہو گئی تھی کہ ان کے خلاف میرے بیٹے کے گارجینز کی حیثیت سے اس کے مالی معاملات میں بدعنوانی اور اس کے سرمائے کو غیر قانونی طور پر اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں لگانے کے الزام میں عدالت میں کیس کر دیا جائے۔

شادی کے دو ہفتے بعد جب میں کمال کے گھر منتقل ہو گئی تھی، ہم نے ایک میٹنگ میں میرے سسرال والوں کو میری شادی کے بارے میں بتا دیا۔ انہیں اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ کمال جیسا دولت مند شخص مجھ سے شادی کیسے کر سکتا ہے لیکن بہرحال انہیں اس بات کی خوشی ضرور ہوئی تھی کہ ایک کانٹا ان کے راستے سے ہٹ رہا تھا۔ شادی کے بعد میں نہ صرف اپنے

ماہانہ الاؤنس سے محروم ہو گئی تھی بلکہ مجھے اب اس مکان میں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں رہا تھا۔ فرہاد کے سرمائے پر اب مکمل طور پر ان کا کنٹرول تھا۔ اس کے اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے وہ اس کی جائداد اور سرمائے کو جس طرح چاہتے استعمال کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ میں نے آج تک اپنے حق مہر کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا اور اب دوسری شادی کے بعد اس حق سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ شوہر کی طرف سے مجھے جو تھوڑی سی زمین ملی تھی وہ بھی اس طرح میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میری سسرال والے اگرچہ مجھ سے چوری چھپے تھوڑی تھوڑی زمینیں فروخت کرتے رہے تھے لیکن اب اس سلسلے میں بھی ان کے راستے کی رکاوٹ دور ہو گئی تھی اور وہ آزادی سے زمینوں کا سودا کر سکتے تھے۔

"اب فرہاد بھی ہمارے پاس رہے گا" علی نے کہا

"نہیں تم لوگ فرہاد کو مجھ سے نہیں چھین سکتے" میں نے جواب دیا۔ "دوسری شادی میں نے محض فرہاد کی بھلائی کے لئے کی ہے۔ تم لوگ ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہو کہ میں ایک اچھی ماں نہیں ہوں لیکن اب تم لوگ مجھ پر انگشت نمائی نہیں کر سکتے۔"

علی یا کسی اور نے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا لیکن میں بھی ان کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی لیکن چند ہی روز بعد میں نے فرہاد کو ان کے قبضے میں دینے کے لئے خود ہی ایک سنہری موقع فراہم کر دیا۔

انقلاب کے بعد میرے جو رشتے دار اور دوست ایران سے فرار ہوتے رہے تھے ان کی بعض چیزیں خرید خرید کر میں اپنے گھر میں جمع کرتی رہی تھی۔ ان میں وہ فرنیچر بھی شامل تھا جو میں نے دو امریکیوں سے خریدا تھا۔ اب میں رقم جمع کرنے کے لئے وہ چیزیں آہستہ آہستہ فروخت کر رہی تھی۔ میری دوست اینا جس کا شوہر پال ایک غیر ملکی سفارتخانے میں تھا۔ مجھ سے کچھ فرنیچر خریدنا چاہتی تھی کیونکہ غیر ملکی چیزیں اب بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔

اس روز میں نے ٹیلی فون پر جلال آغا کو اطلاع دے دی کہ اینا چار بجے آئے گی اسے فرنیچر دے دیا جائے۔ چار بجے کے لگ بھگ میں نے ایک بار پھر گھر فون کیا۔ میرا خیال تھا کہ اینا اس وقت وہاں موجود ہو گی۔ اس مرتبہ کال جلال آغا کی بیوی فرح نے ریسیو کی تھی۔ اس کا لہجہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے کسی کے بات سن لئے جانے کے خوف سے ڈر ڈر کر بات کر رہی ہو۔ اس نے بتایا کہ اینا جا چکی ہے۔

پانچ منٹ بعد میں نے پھر فون کیا۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ اس مرتبہ بھی کال فرح ہی نے ریسیو کی تھی۔ اس نے بتایا کہ پہلے جب میں نے فون کیا تھا تو اس وقت اینا یہاں موجود تھی لیکن اب واقعی جا چکی ہے۔ مجھے فرح کے اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتی اس نے فون بند کر دیا۔

"کمال!" میں نے فون بند کر کے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

"دوبارہ فون کرو" کمال نے کہا "اگر واقعی کوئی گڑبڑ ہے تو میں وہاں جا کر خود معلوم کروں گا کہ کیا معاملہ ہے۔"

کال اس مرتبہ بھی فرح ہی نے ریسیو کی تھی۔ اس کی آواز میں پریشانی نمایاں تھی۔ "مجھے افسوس ہے میں اس وقت کھل کر بات نہیں کر سکی تھی۔" اس نے کہا "تمہاری سسرال والے سب لوگ یہاں جمع تھے۔ انہوں نے تمہاری دوست کو چوری کے الزام میں گرفتار کرا دیا ہے۔ انہوں نے تمہارے بیڈ روم کی تلاشی بھی لی تھی۔"

یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب میں ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہونے والی ہوں جس سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

میرے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی ایک دراز میں وہ چھوٹی سی ڈائری رکھی ہوئی تھی جس میں اسمگل کئے جانے والے قالینوں کی تاریخ وار تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ اس روز افراتفری میں گھر سے نکلتے ہوئے میں یہ ڈائری لینا بھول گئی تھی اور اس کے بعد گھر جانے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا تلاشی کے دوران انہیں ڈائری مل گئی ہے؟ کیا وہ پال کے بارے میں پہلے ہی سے جان چکے تھے اور اسی لئے اینا کی گرفتاری کے لئے پولیس کو بلا لیا تھا؟ انہیں کیا معلوم ہو چکا تھا؟ اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

کمال نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں پاگلوں کی طرح باہر کی طرف دوڑے۔ مجھے یہ ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ اس وقت میں پرانا سا جوگنگ سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گھر میں عام طور سے میں اسی قسم کے کپڑے پہنا کرتی تھی۔ ہم طوفانی انداز میں کمال کے ایک دوست سے دوسرے دوست کے گھر دوڑتے رہے۔

کمال کے بہت سے دوست ایسے تھے جنہیں میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کسی دوست سے باقاعدہ تعارف کا موقع ہی نہیں ملا تھا کمال ان سے کہتا رہا کہ یہ میری بیوی ہے اور شبہ ہے کہ اسے اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہمیں اس سلسلے میں ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

کسی نے بھی ہماری مدد کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ ان سب کے پولیس افسروں سے گہرے مراسم تھے اور ہمارا خیال تھا کہ اینا کو بھی کمیٹی نے نہیں پولیس ہی نے گرفتار کیا تھا کیونکہ چوری جیسے جرائم پولیس کے دائرہ کار میں آتے تھے۔ ان سب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کر کے صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ پتا چلالیں گے کہ اینا

کو کہاں رکھا گیا ہے۔

اس بھاگ دوڑ کے دوران میں وقتاً فوقتاً پال کو بھی فون کرتی رہی تھی تاکہ یہ معلوم کر سکوں کی اینا گھر پہنچ گئی تھی یا نہیں" لیکن میری کوئی کال ریسیو نہیں کی گئی۔ دفعتاً مجھے ایک اور شخص کا خیال آ گیا۔ میری طرح وہ بھی خطرے میں ہو سکتا تھا۔ وہ جمشید تھا۔ میرے پہلے شوہر کاشان کا بزنس پارٹنر۔ اس نے بھی میرے ساتھ کچھ قالین اسمگل کئے تھے۔ ہم نے وقت ضائع کئے بغیر اس کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"جیسے بھی ممکن ہو تمہیں آج رات ایران سے فرار ہو جانا چاہئے" جمشید نے مجھے دیکھتے ہی چیخ کر کہا۔ خوف سے اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میری بیوی بعد میں آ جائے گی۔"

"ایک منٹ" کمال نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "جس سے تم بات کر رہے ہو یہ میری بیوی ہے۔ ہماری شادی چند روز پہلی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے اس طرح راہ فرار اختیار کرنی پڑے۔ یہ مت بھولو کہ تم قالینوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہو۔ اپنی فیملی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کرو بہ صورت دیگر تم بھی نہیں بچ سکو گے۔"

"انہیں روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے" جمشید نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اپنا بیٹا ان کے حوالے کر دو۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے۔ فرہاد جیسے ہی ان کے پاس پہنچے گا تمہاری دوست کو بھی جیل سے رہائی مل جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

کمال کے خیال میں یہ ایک نہایت معقول تجویز تھی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بہتر یہی ہے کہ اینا کو رہائی دلانے کے لئے فرہاد کو چند روز کے لئے ان کے حوالے کر دو۔ فرہاد رو رو کے ان کا جینا حرام کر دے گا اور وہ لوگ اسے خود ہی تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے۔"

"اس خوش فہمی میں بھی مت رہنا" جمشید نے کہا "ڈاکٹر علی اسے سوئٹزرلینڈ بھیجنے کا پروگرام بنا رہا ہے اور میرا خیال ہے یہ بھی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ ملک سے باہر جانے کے بعد تم نہایت آسانی سے اسے اپنی تحویل میں لے سکتی ہو۔"

وہ دونوں اس طرح میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس چیستان کی چابی میرے پاس ہو۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ اس سلسلے میں سوچنا پڑے گا اور اس کے لئے مجھے کچھ وقت چاہئے۔ میں فرہاد کو چند روز تو کیا ایک لمحے کو بھی اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رات ساڑھے دس بجے کے قریب میں نے ایک بار پھر پال کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ اینا گھر پہنچ چکی ہے۔ اینا کو میں کئی سال سے جانتی تھی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہو گئی۔ عام حالات میں بھی وہ کسی بچے کی طرح ڈرپوک اور بزدل واقع ہوئی تھی اور اب جو کچھ بھی ہوا تھا وہ تو اس کے لئے بہت زیادہ تھا۔ اینا نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ کس طرح پیش آیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ شام چار بجے ایک وین لے کر میرے گھر پہنچ گئی تھی اور جلال آغا اور اس کی بیوی فرح کی مدد سے فرنیچر وین پر لاد رہی تھی کہ میری ساس، ڈاکٹر علی اور اس کی دونوں بہنیں وہاں پہنچ گئیں اور اس پر چوری کا الزام عائد کرتے ہوئے پولیس کو فون کر دیا۔

"میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ میں چور نہیں سوسن کی دوست ہوں لیکن تمہاری ساس نے کہا کہ وہ کتیا کسی کی دوست نہیں ہو سکتی۔ اس کو عیش و عشرت کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ وہ میرے بیٹے کی خون پسینے کی کمائی کو بیدردی سے لٹاتی رہی ہے لیکن اب اسے اس گھر کی کسی چیز پر کوئی حق حاصل نہیں۔ میں انہیں خدا اور رسول کے واسطے دے کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہی لیکن انہیں ذرا بھی ترس نہیں آیا اور مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ میں پولیس کو یہ بتاتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ میں ایک غیر ملکی کی بیوی ہوں کیونکہ اس طرح ہمارے لئے مزید پریشانی پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری ابھی شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پال میری ضمانت کے لئے پولیس سے رابطہ قائم کر چکا ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا تھا کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ یہ انکشاف ہوتے ہی میں کانپ کر رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب میں کبھی بھی پولیس کے شکنجے سے نہیں نکل سکوں گی اور سوسن! ان کے پاس تمہاری ڈائری بھی تھی جو تمہارے گھر کے بیسمنٹ میں رہنے والی فرح نے ان کے حوالے کی تھی۔ میں نے پولیس افسروں اور تمہارے سسرال والوں کو اسمگلنگ کے بارے میں کچھ باتیں کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ تمہارے سسرال والوں کو تم سے شدید نفرت ہے اور اب وہ میرا پیچھا بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ جلال آغا اور فرح کے نام سے میرے جبڑے بھینچ گئے۔ ساری بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی میری سسرال والوں کو میری ہر بات کا پتا کس طرح چل جاتا تھا میرے گھر میں کسی مرد مہمان کے آنے کے فوراً ہی بعد کمیٹی والے کس طرح پہنچ جاتے تھے؟ جس رات میرے گھر تلاشی لی جا رہی تھی وہ دونوں میاں بیوی اس قدر کیوں بدحواس ہو رہے تھے۔ میرے گھر میں رہتے ہوئے یہ کم بخت میری ہی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے اور یہ سب کچھ میری سسرال والوں کے ایماء پر ہو رہا تھا اگر اس روز میں طباطبائی کے کہنے پر چند گھنٹے اور جیل میں رک جاتی تو مجھے فائل سے ان دونوں کے ناموں کا بھی پتا چل جاتا جنہوں نے کمیٹی میں میرے خلاف رپورٹ کی تھی۔

پولیس نے اینا کو اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ صبح پہلی

فرصت میں پولیس اسٹیشن پر حاضری دے گی۔ ظاہر ہے پولیس اسے اس وقت تک تنگ کرتی رہتی جب تک میں تھانے میں حاضر ہوکر اس فرنیچر پر اپنی ملکیت ثابت نہ کرتی اور اسمگلنگ کی اس فہرست کے بارے میں ان کی پوچھ گچھ کا سامنا نہ کرتی یا میری سسرال والے اس کے خلاف اپنی رپورٹ واپس نہ لے لیتے۔

میرا پولیس اسٹیشن جانے کا مطلب اپنے آپ کو کمیٹی کے حوالے کردینے کے مترادف تھا اگر میری سسرال والے یہ ثابت کردیتے کہ میں قالین کی اسمگلنگ میں ملوث ہوں تو کوئی طاقت مجھے سزائے موت سے نہیں بچاسکتی تھی اور میری وہ ڈائری میرے خلاف الزام ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔ اگر میں فرہاد کو ان کے حوالے کردوں تو ممکن ہے وہ میرا اور اینا کا پیچھا چھوڑ دیں۔

"میں اب پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی" اینا نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل مٹھی میں مسلا جارہا ہو۔ اپنی آزادی کے لئے مجھے اپنی دوست یا اپنے بیٹے میں سے کسی ایک کی قربانی دینا تھی۔

کئی روز تک میں گھر میں بند رہی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس مسئلے کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اس قدر مخبوط الحواس ہوچکی تھی کہ بار بار اپنے آپ سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتی۔

ایک روز فرہاد نے مجھے فون پر ماموں فائق سے باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ میں نے جیسے ہی فون بند کیا وہ آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولا۔

"ممی! کیا آنٹی اینا آپ کے لئے مجھ سے زیادہ اہم ہیں؟ کیا آپ آنٹی اینا سے مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہیں ممی؟"

"نہیں میری جان!" میں نے اسے سینے سے لپٹا لیا۔ مجھے ایک بار پھر یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل مٹھی میں لے کر مسلا جارہا ہو" تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تم سے زیادہ کسی اور کو چاہتی ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر تم دو چار روز کے لئے اپنی دادی کے ہاں رہ لوگے تو اینا کو جیل نہیں جانا پڑے گا۔"

"آپ یقیناً اسے مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔ اسی لئے مجھے اپنے سے جدا کرنا چاہتی ہیں" فرہاد کہتے ہوئے مجھ سے الگ ہوگیا میں اس معصوم بچے کو کس طرح سمجھاتی کہ اس کی ماں کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ میں یہ سب کچھ اس لئے کررہی ہوں کہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھ سکوں لیکن مجھے احساس ہورہا تھا جیسے میں یہ جنگ ہار جاؤں گی۔

میرے خاندان کا ہر فرد بضد تھا کہ میں فرہاد کو اس کی دادی کے حوالے کردوں۔

اسے چند روز کے لئے ان کی تحویل میں دے دوں۔ ماموں فروش نے بھی یہی مشورہ دیتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔"

"یہ درست ہے" ایک اور دوست نے بھی مشورہ دیا "اگر انہوں نے فرہاد کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ بھی لیا تو تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے اور ہر لحاظ سے اس کا خیال رکھیں گے۔ تم ابھی جوان ہو۔ تم نے شادی بھی کرلی ہے۔ تمہارے ہاں اولاد ہوجائے گی تو تم فرہاد کو بھول جاؤ گی۔"

ان کے ان مشوروں سے میں کھول کر رہ گئی۔ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ وہ میرے اکلوتے بیٹے کے بارے میں بات کررہے تھے۔ مجھے اپنے کلیجے کا ٹکڑا نوچ پھینکنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

دو تین دن گزر گئے۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی بالآخر ایک حل سمجھ میں آہی گیا۔ میں فرہاد کو ان کے حوالے کردوں اور اس دوران ایران سے فرار کا راستہ تلاش کرتی رہوں اور جیسے ہی کوئی انتظام ہو فرہاد کو لے کر نکل جاؤں۔

اینا کی گرفتاری کے آٹھویں دن میں نے فرہاد کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بدلے انہوں نے اینا کے خلاف اپنی رپورٹ واپس لینے کا وعدہ کرلیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے پولیس اسٹیشن حاضر ہونا تھا تاکہ اسمگلنگ کے سلسلے میں لگائے جانے والے الزامات کی تردید کرسکوں لیکن یہ خطرہ بدستور تھا کہ اگر میرے بیان کو تسلیم نہ کیا گیا تو موت کی سزا سے نہیں بچ سکوں گی۔

میں اخبارات میں یہ خبریں پڑھتی رہتی تھی کہ ترکی کی سرحد پر پکڑے جانے والے اسمگلروں کو آئے دن گولی سے اڑا دیا جاتا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کمال کے ایک دور کے رشتے دار کے پولیس چیف سے گہرے تعلقات تھے۔ اس نے پولیس چیف کو یہ یقین دہانی کرادی کہ میرا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے اور میرا اسمگلنگ جیسے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

جب میں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی تو بری طرح بدحواس ہورہی تھی۔ ذہن پر یہی خوف سوار تھا کہ اگر کمیٹی کو یہاں میری آمد کی اطلاع مل گئی تو وہ مجھے گرفتار کرلیں گے۔ پولیس کا اگرچہ کمیٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس اندیشے کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ انہوں نے کمیٹی کو میرے بارے میں اطلاع دے دی ہوگی۔

مجھے فوراً ہی پولیس چیف کے دفتر میں پہنچا دیا گیا۔ وہ تین گھنٹے تک مجھ سے یہ اگلوانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں نے وہ چیزیں کیوں بیچی تھیں جو میرے شوہر کی ملکیت تھیں۔ آخر میں میری ڈائری پر بات آگئی تھی۔

میں اسے یقین دلانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی کہ فروخت

کی جانے والی چیزیں سو فیصد میری ملکیت تھیں اور میرے شوہر کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرا اسمگلنگ کے کسی معاملے سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔

پولیس چیف اس دوران خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا اور یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اس نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ عین اسی وقت جب میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب مجھے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ پولیس چیف ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

فرہاد کو اپنی سسرال والوں کی تحویل میں دینا میری زندگی کا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اپنے جگر کا ٹکڑا نوچ کر پھینک رہی ہوں۔ فرہاد بھی آخری لمحے تک مجھ سے لپٹا روتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اب بھی میں اپنا ارادہ بدل دوں۔

"یاد ہے میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا "انہیں آرام سے مت بیٹھنے دینا۔ ہر وقت روتے اور چیختے چلاتے رہو گے کہ مجھے ممی کے پاس چھوڑ دیں۔ ان کا جینا حرام کر دو۔ فون نمبر یاد رکھنا لیکن انہیں کبھی میرے گھر کا پتا یا فون نمبر مت بتانا۔"

کمال سے شادی کے بعد ہم ایک اور مکان میں منتقل ہو گئے تھے اور اپنے اس ٹھکانے کو اپنی فیملی سے خفیہ رکھا تھا کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ لوگ انتقام لینے کے لئے کسی بھی وقت کمیٹی کو ہمارے گھر کا پتا بتا دیں گے۔

فرہاد کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد میری سسرال والے بہت خوش ہو رہے تھے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں جب چاہوں اس سے ملنے کے لئے بھی آ سکتی ہوں اور ویک اینڈ اور عام تعطیل کے دنوں میں اسے میرے ساتھ رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی اور میں کسی بھی وقت فون پر اس سے بات بھی کر سکتی تھی لیکن مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ مجھ سے یہ وعدے کرتے وقت ان کی نیت صاف نہیں تھی۔ اب انہوں نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ میں صرف جمعے کے روز صبح دس بجے سے سہ پہر چار بجے تک فرہاد سے مل سکتی ہوں۔ فون کے لئے بھی وقت مقرر کر دیا گیا تھا اور اگر اس وقت میں کسی وجہ سے فون نہ کر سکوں یا فرہاد موجود نہ ہو تو اس روز مجھے دوسری مرتبہ فون کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ویک اینڈ پر بھی وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مجھے فرہاد سے ملاقات نہ کرنے دیتے۔

پہلے چند ہفتوں کے دوران جب بھی فون پر بات ہوتی فرہاد روتا اور چیختا چلاتا رہتا کہ میں اسے آ کر لے جاؤں۔ اس کی دادی اس سے ریسیور چھین کر فون بند کر دیتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فرہاد کا انداز بدل گیا۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کرتا جیسے میں اس کی ماں نہیں دوست ہوں۔ میری باتوں کا جواب بہت مختصر دیتا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ اور تاثر سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں بچوں والی شوخی غائب ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں اس حد تک تبدیلی آ چکی تھی کہ جب کبھی کچھ دیر کے لئے مجھے اس سے ملاقات کا موقع ملتا تو وہ اپنی دادی اور اس گھر کے کسی فرد کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیتا۔

"فرہاد!" ایک روز میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میرے ساتھ تمہارا رویّہ کیوں بدل گیا ہے؟ تمہیں اپنی ممی سے محبت نہیں رہی یا کسی بات سے خوفزدہ ہو؟"

"انہوں نے گھر میں ہر جگہ کیمرے لگا رکھے ہیں۔ میری کوئی بھی حرکت ان سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ وہ میری ہر بات سن لیتے ہیں۔ میں جب بھی فون پر آپ سے بات کرتا ہوں یا آپ کے پاس آتا ہوں وہ مجھے ڈانٹتے ہیں۔ اب واپس جاؤں گا تو وہ مجھے مار مار کر سب کچھ اگلوا لیں گے کہ میری آپ سے کیا باتیں ہوئیں تھیں۔"

یہ سب کچھ سن کر میں سناٹے میں آ گئی۔ میں اسے یہ تسلی دینے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کے خلاف اس قسم کی جاسوسی نہیں ہو رہی لیکن فرہاد کو یقین تھا کہ چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ اسے روزانہ ایک گھنٹے کے لئے ماہر نفسیات پرویز کے پاس بھیج دیا جاتا ہے اور وہ اس سے مختلف باتیں پوچھتا اور سمجھاتا رہتا ہے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نفسیاتی حربے استعمال کر کے میرے بیٹے کو میرے خلاف کیا جا رہا تھا۔

"وہ لوگ اکثر یہ کہتے رہتے ہیں کہ آپ اچھی ماں نہیں ہیں کیونکہ نہ تو آپ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں اور نہ ہی مجھے کبھی ہوم ورک کراتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ مجھ سے ملنا بھی نہیں چاہتیں۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ لوگ فرہاد کے دل میں میرے لئے نفرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

اس روز فرہاد کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھی گھنٹوں ہچکیاں لے لے کر روتی رہی اور پھر میں نے کمال کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا۔

"میرا بیٹا!" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "اسے ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ پاگل ہو جائے گا۔ اب میں نے ایران چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم میرا ساتھ دو یا نہ دو۔ میں چند روز میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔" اور اسی روز سے میں نے فرار کی تیاریاں شروع کر دیں۔

سوسن آزادی کے فرار کی یہ داستان ابھی جاری ہے۔ آئندہ شمارے میں پڑھیے۔

بہت سے لوگ ایران چھوڑ رہے تھے جو نسل در نسل اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہوتے رہے تھے' جن کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں اس کی مٹی کا حصہ بن چکی تھیں جنہوں نے اس کی تعمیر میں خون پسینہ ایک کردیا تھا' وہ اب چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں اس سرزمین سے فرار ہونے پر مجبور تھے۔ انہیں کسی بیرونی حملہ آور کا خوف نہیں تھا بلکہ ان کے اپنوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اپنوں ہی کے ہاتھوں جان کے خوف سے منہ چھپائے پھر رہے تھے اور بالآخر اپنی یہ سرزمین چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے جہاں انہوں نے زندگی کے بہترین ماہ و سال گزارے تھے۔

دو سال کے مختصر سے عرصے میں ایران میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ بین الاقوامی مبصرین بھی ان تبدیلیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ماہرین کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً دس لاکھ ایرانی بے سرو سامانی کی حالت میں اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ تقریباً دس ہزار افراد اس انقلاب کی وجہ سے ہلاک ہو چکے تھے۔ عراق سے جنگ کے دوران ایک لاکھ سے زائد ایرانی باشندے ہلاک اور لاکھوں بے گھر ہو چکے تھے۔

امام خمینی کے پرانے حمایتیوں کو بھی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ابوالحسن بنی صدر کو امام خمینی کا سب سے بڑا حمایتی سمجھا جاتا تھا لیکن جب پارلیمنٹ میں اس پر انقلاب سے غداری کا الزام لگایا گیا تو وہ بھی جان بچانے کے لئے خاموشی سے ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ کچھ شہری آزادیوں کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ بنی صدر نے جولائی ۱۹۸۱ء میں پیرس میں جلاوطن حکومت قائم کرلی تھی' کیونکہ اس کے خیال میں اس نے جس انقلاب کی مدد کی تھی وہ ناکام ہو چکا۔

امام خمینی کا سابق وزیر خارجہ صادق قطب زادہ اس سلسلے میں زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوا تھا۔ اپریل ۸۲ء میں' جب میں فرار کے منصوبے بنا رہی تھی' صادق قطب زادہ کو انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ ٹریبونل کی مختصر سی کارروائی کے بعد اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

ایران کی تمام یونیورسٹیاں دو سال سے بند تھیں۔ ماہرین تعلیم امام خمینی کے احکامات کے مطابق نصاب کو اسلامی تعلیمات کے مطابق تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ایران میں زندگی کے ہر شعبے کو اسلامیانے کی بھرپور کوشش کی جارہی تھی۔ تمام مروجہ عدالتی قوانین کو' اسلامی حد' کے مطابق ڈھالا جارہا تھا۔ اسلامی قوانین کے مطابق چور کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے اور زانی کو سنگسار کردیا جاتا لیکن بعض معاملات کچھ ایسے بھی تھے جن میں کچھ الجھن پیش آرہی تھی۔ ان میں سب سے اہم بینکنگ کا مسئلہ تھا۔ اسلام میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے جب کہ بینکنگ کے کاروبار کا انحصار ہی سود پر ہوتا ہے۔ میں جب تک ایران میں رہی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا اور میری اطلاع کے مطابق آج بھی ایران میں سود پر لین دین کا کاروبار جاری ہے۔

معاشرے میں اسلام کے نفاذ کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ سرکاری دفاتر اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں سے اسلامی قوانین کے بارے میں دریافت کیا جاتا اور جو صحیح جواب نہ دے پاتا اسے ملازمت سے نکال دیا جاتا۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلباء سے اعلیٰ تعلیم کا حق چھین لیا گیا تھا۔ اساتذہ کو امام کی تعلیمات کے پرچار پر مجبور کیا جاتا۔ مجموعی طور پر نچلی سطح سے ایک نئے طبقے کو ابھارنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس طبقے ہر فرد کے لئے لازمی تھا کہ وہ امام خمینی کی تعلیمات کا مقلد ہو اور آنکھیں بند کرکے ان کے احکامات پر عمل پیرا ہو۔ اعلیٰ سطح کے لیڈر مذہبی طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا انتخاب خود امام خمینی نے کیا تھا۔

۸۲ء کے موسم بہار میں حکومت نے ایران کے شمال مشرقی علاقوں میں رہنے والے کردوں کے خلاف بھی کارروائی کا آغاز کردیا۔ اس علاقے میں رہنے والے کرد بہت عرصے سے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے اور اب وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کئی روز کی تگ و دو کے بعد بالآخر ایک آدمی نظروں میں آگیا جو ملک سے فرار میں میری مدد کرسکتا تھا لیکن عین آخری لمحوں پر میری ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ اس شخص سے میری ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ حامد کے فرار میں بھی اس نے مدد کی تھی۔ وہ ایک سیاستدان تھا جسے امام خمینی کی پالیسیوں سے شدید اختلاف تھا اور اسی مخالفت کی بنا پر اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ کمیٹی کے اہل کار پورے شہر میں اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لیکن وہ بھی اپنی قسم کا ایک ہی کائیاں آدمی تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا گروہ بنا لیا تھا جو امام خمینی کے مخالفین کو ملک سے فرار ہونے میں مدد دے رہا تھا۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ ترکی کی سرحد عبور کرچکا تھا۔ میں نے اس سے حامد کے حوالے سے ملاقات کی تھی۔ وہ بڑی خوشی سے میری مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں جب بھی فرار ہونا چاہوں اسے مطلع کردوں۔ وہ مجھے باحفاظت سرحد پار پہنچا دے گا۔

اس شخص سے میری ملاقات کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میری نیت ڈانواڈول رہی تھی۔ کبھی فرار کا منصوبہ بناتی اور کبھی ترک کردیتی بالآخر کمال سے شادی کے بعد جب میں نے فرار کا پختہ ارادہ کرلیا تو اس شخص کی تلاش شروع کردی۔ میری

اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ ایک روز اخبار میں یہ سنسنی خیز خبر پڑھی کہ کمیٹی نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ وہ جس مکان میں چھپا ہوا تھا اس کے ایک پڑوسی نے کمیٹی کے مکان میں ... موجودگی کی اطلاع دیدی تھی۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن زخمی ہونے کے بعد پکڑا گیا۔ گرفتاری کے بعد اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا اور جب اس نے اپنا کوئی جرم تسلیم کرنے اور تائب ہونے سے انکار کردیا تو اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

میں ہر طرف سے مایوس ہوچکی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرے تھے۔ امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر مئی ۸۴ء میں فرار کے سلسلے میں اپنے والد سے مدد کی درخواست کی۔ ترکی کے راستے فرار ہونے کے لیے ہمیں کوہ زاگرس کی برف سے ڈھکی ہوئی دشوار گزار پہاڑی چوٹیوں سے گزرنا پڑتا۔ صرف راستہ ہی دشوار گزار نہیں تھا بلکہ یہ علاقے باغی کردوں کا گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ پہاڑوں میں ان کی بیشتر چھوٹی چھوٹی بستیاں بکھری ہوئی تھیں اور مسلح کرد سرکاری فوجی دستوں پر نگاہ رکھنے کے لئے ان پہاڑوں میں گھومتے رہتے تھے۔ اطراف سے گزرنے والے عام لوگ بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں تھے۔ مسافروں کو لوٹ کر انہیں قتل کردیا جاتا اور ان کی لاشیں ان پہاڑوں میں پڑی سڑتی رہتیں۔

آذربائیجان کا وہ علاقہ جہاں میرے والد کی زمینیں تھیں۔ اس پہاڑی سلسلے سے ملا ہوا تھا۔ اس علاقے میں بھی کردوں کی آمدورفت تھی۔ علاقے میں میرے والد کا خاصا اثر رسوخ تھا اور مجھے یقین تھا کہ پہاڑوں میں رہنے والے کردوں سے بھی میرے والد کے تھوڑے بہت تعلقات ضرور ہوں گے۔ ٹیلی فون پر اس قسم کی کوئی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لہٰذا جب میں نے ٹیلی فون میں والد سے رابطہ قائم کیا تو اشاراتی زبان میں بات کی تھی۔ بعض گھریلو معاملات میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ جلد آنے کی کوشش کریں۔ میرے والد یقیناً مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے اگلے ہفتے آنے کا وعدہ کرلیا۔

شاہ کے دور کا ایک سینیٹر میرے والد کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ میرے والد کی طرح وہ بھی آذربائیجان کا ایک بہت بڑا اور بااثر زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ کردوں سے بھی اس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعین کی اکثریت کرد جفاکشوں پر مشتمل تھی لیکن امام خمینی کے انقلاب کے بعد جب اس کی زمینیں ضبط کرلی گئیں تو اس نے آمدنی کے دوسرے ذرائع تلاش کرنا شروع کردئے۔ اس نے اگرچہ بہت سے کام کیے تھے لیکن سب سے زیادہ منافع بخش کام انسانوں کی اسمگلنگ ثابت ہوا تھا۔ اس نے یہی کاروبار شروع کردیا اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ہر کاروبار میں زمینداری سے زیادہ دولت کما رہا تھا۔ وہ فرار ہونے والوں سے بھاری معاوضہ وصول کرتا جس کا کچھ حصہ ان کردوں کو دے دیا جاتا جو ان لوگوں کو ان خطرناک پہاڑیوں سے گزارتے ہوئے بحفاظت ترکی کی سرحد میں پہنچادیتے تھے۔

کردوں کو عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لئے دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ محنتی اور جفاکش لوگ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے — بھیڑ بکریاں پالتے اور ان کے دودھ پنیر اور گوشت پر گزارہ کرتے تھے۔ تاہم وہ اپنی خود مختاری کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اسلحہ خرید سکیں۔

میرے والد کا دوست سابق سینیٹر اور زمیندار مرجانی تہران ہی میں ایک شاندار اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ جب میں والد کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو ہمیں کچھ دیر ویٹنگ روم میں انتظار کرنا پڑا۔ مرجانی اس وقت اپنے کمرے میں کچھ اور لوگوں سے مصروف گفتگو تھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرح ایسی ہی ضرورت کے تحت آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں ایران میں انسانوں کی اسمگلنگ کا کاروبار خاصا مقبول ہوگیا تھا اور ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مرجانی خاصا ملنسار قسم کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ عمر میں وہ میرے والد کے برابر تھا۔ لیکن صحت قابل رشک تھی۔ سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف اور جسم پر قیمتی لباس تھا۔

"ایران سے فرار ہونا چاہتی ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسی وقت ایک ملازم چائے لے کر اندر داخل ہوا، لیکن شاید مرجانی ایسی باتوں میں رازداری کا قائل نہیں تھا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں اپنے ایک کرد دوست سے کہہ دوں گا۔ وہ تمام انتظامات کردے گا اور تمہیں نہ صرف بحفاظت سرحد پار پہنچادیا جائے گا بلکہ تمہارے ساتھ وی آئی پی جیسا برتاؤ کیا جائے گا۔ ایک ہی دن میں تمہیں سرحد پار کرادی جائے گی اور اگلے روز تم استنبول پہنچ جاؤگی۔ اگر تم چاہو تو اسی روز پیرس کے لئے بھی روانہ ہوسکتی ہو۔ تمہیں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا جیسے مجھے سرحد پار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ایسا ہی لگتا تھا جیسے تہران کے ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کا پروگرام بنایا جارہا ہو۔ معاوضہ بالغ افراد کے لئے چھ ہزار اور فرہاد کے لئے تین ہزار امریکی ڈالر طے ہوا تھا۔ مرجانی کے کہنے کے مطابق اگرچہ وہ بچوں کا بھی پورا معاوضہ ہی لیتا تھا لیکن میرے والد کی دوستی کی وجہ سے اس نے فرہاد کا آدھا معاوضہ کم کردیا تھا۔ کمال نے فوراً ہی یہ رقم ادا کردی۔ میرے پاس پیسے ختم ہوتے جارہے تھے۔ کمال سے شادی کے بعد میں جائداد نام کی کوئی چیز بھی فروخت نہیں کرسکتی تھی۔ فرہاد کے نام کسی جائداد سے بھی میں فی الحال

کوئی امید نہیں رکھ سکتی تھی۔ ایران سے نکلنے کے بعد مجھے صرف اس رقم پر انحصار کرنا تھا جو قالینوں اور دیگر قیمتی چیزوں کی اسمگلنگ کی صورت میں دارا کے پاس جمع تھی۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے" میں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "میں اسمگلروں کے کسی پروگرام پر فوراً عمل نہیں کرسکوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ اچانک ہی پروگرام بنالیتے ہیں لیکن مجھے کم از کم ایک ہفتہ پہلے پروگرام کی اطلاع ہونی چاہئے تاکہ میں اس دوران میں اپنے بیٹے کو اپنے پاس لانے کا بندوبست کرسکوں۔ میرا بیٹا میری سسرال والوں کی تحویل میں ہے۔ مجھے اس سے باقاعدگی سے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اسے لانے کے لئے مجھے خاصی تگ ودو کرنی پڑے گی اور ظاہر ہے بیٹے کے بغیر میں یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"عام حالات میں ایسا ہونا مشکل ہے" مرجانی نے کہا لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ ہمیں تمہارے لئے اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ فیصلہ بھی ہم تم پر چھوڑتے ہیں۔ تم جیسے ہی اپنے آپ کو تیار پاؤ' ہمیں اطلاع دے دینا۔ ہم اسی روز یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنالیں گے۔ میرے آدمی ہر وقت تیار رہیں گے' اگر کسی وجہ سے پروگرام ملتوی کرنا پڑ جائے تو ہم ا. ء ہفتے تک انتظار کرلیں گے۔ یہ رعایت تمہارے والد کی وجہ سے ہے۔ یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ مجھے ان کی دوستی کا لحاظ رکھنا ہی پڑے گا۔"

ہم نے احتیاطاً دو ہفتے بعد کی تاریخ طے کرلی اور اس کے ساتھ ہی کمال اور میں نے بڑی عجلت میں تیاریاں شروع کردیں۔ ہمارے فرار کے اس منصوبے میں شیری نامی ایک بوڑھی خاتون بھی شامل تھی۔ شیری ہمارے گھرانے کی بہت پرانی دوست تھی۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ جب بھی ایران سے فرار کا پروگرام بناؤں اسے بھی اس میں شامل رکھوں۔ شیری بھی لاکھوں دوسرے ایرانیوں کی طرح امام خمینی کی حکومت کے عتاب کا شکار رہی تھی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ معذور افراد کے لئے اس کے اسکولوں کو شاہ کی ملکہ شاہ بانو فرح دیبا سے مالی امداد ملتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ شیری کو ان اسکولوں کے لئے شاہ کے قائم کردہ پہلوی فاؤنڈیشن سے بھی مالی امداد ملتی رہتی تھی یہ فنڈ خیراتی اداروں اور سماجی بہبود کے کاموں کے لئے قائم کیا گیا تھا لیکن امام خمینی کی حکومت کا کہنا تھا کہ یہ فنڈ صرف شاہ کے رشتے داروں اور دوستوں کی عیاشی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ امام خمینی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد نہ صرف اس فنڈ سے تمام خیراتی اور سماجی بہبود کے اداروں کی امداد بند کردی گئی تھی' جن میں شیری کے معذور افراد کے اسکول بھی شامل تھے' بلکہ . . کے اسکول بھی بند کردئے گئے تھے۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ شیری کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہوچکے تھے۔

کمیٹی کے اہل کار وقتاً فوقتاً اس کی گرفتاری کے لئے اس کے گھر اور بعض دیگر مقامات پر چھاپے مارتے رہتے تھے لیکن شیری اپنی ایک دوست کے گھر میں روپوش تھی۔

کمال اور شیری کو ان دو ہفتوں کے اندر اندر اپنے مکان فروخت کرنے تھے تاکہ نقد رقم کے علاوہ ایسی قیمتی چیزیں جمع کرلی جائیں جنہیں آسانی ـ ساتھ لے جایا جاسکے۔ کمال نے اپنے کزن کے مشورے پر پرانے ڈاک ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ یورپ میں ان ٹکٹوں کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ میں نے اپنی بچی کچی قیمتی چیزیں جمع کرنی شروع کردیں۔ آخری مرتبہ جب میں اپنے گھر سے بھاگی تھی تو جواہرات کی ایک تھیلی اپنے ساتھ لے آنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اپنے بیشتر جواہرات اگرچہ میں پال کے ذریعے پہلے ہی ملک سے باہر اسمگل کرچکی تھی لیکن یہ ایک تھیلی میں نے کسی ایسے ہی وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لی تھی۔ میں نے چند فرکوٹ اور کچھ دیگر قیمتی ملبوسات بھی اطالوی اسمگلر کے ذریعے قالینوں کے ساتھ باہر بھجوادئے تھے۔ وہ تمام چیزیں دارا تک پہنچ چکی تھیں۔ ان میں سے بعض چیزیں فروخت . . . سیف ڈپازٹ میں جمع کرائی جاچکی تھیں اور کچھ چیزیں اب بھی دارا کے پاس موجود تھیں۔

دو ہفتوں کا وقت پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اس دوران میں بیسیوں آدمی کمال کا مکان دیکھنے آئے تھے۔ ان کاموں سے جو وقت بچتا وہ ہم غیر ملکی کرنسی کی تلاش میں صرف کردیتے۔ ہم نے مرجانی سے بھی کہہ رکھا تھا کہ بلیک مارکیٹ سے بھی جس حد تک ممکن ہو ہمارے لئے غیر ملکی کرنسی کا بندوبست کردے۔ اپنے دوستوں کو چپکے چپکے خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہم اس کوشش میں بھی تھے کہ ترکی سے آگے ہمیں کسی بھی یورپی ملک کا ویزا مل جائے۔

لیکن ایران میں ویزا حاصل کرلینا ممکن نہیں تھا۔ ترکی اور اسپین کے علاوہ ہر ملک نے ایرانیوں کے لئے ویزے کی پابندی عائد کردی تھی' لیکن کمیٹی نے تمام ممالک کے سفارت خانوں پر یہ پابندی عائد کردی تھی کہ جب تک کمیٹی کی طرف سے جاری کردہ اجازت نامہ نہ ہو کسی بھی شخص کو ویزا جاری نہ کیا جائے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جائز طور پر ملک سے جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ زیادہ لوگ ترکی کے راستے فرار ہورہے تھے۔ ترکی میں ہزاروں ایرانی باشندے بے یارومددگار پڑے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کوشش کررہے تھے کہ کسی بھی ملک کا ویزا مل جائے تاکہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کی منصوبہ بندی کرسکیں' لیکن ترکی میں بھی کسی ملک کے ویزے کا حصول آسان نہیں تھا۔ ہم نے مستقل طور پر پیرس میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہاں فرہاد کے نام پر ایک اپارٹمنٹ موجود تھا اور کمال کے والدین بھی پیرس ہی میں رہائش پذیر تھے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ ترکی میں

خوار ہونے کے بجائے تہران ہی سے کسی طرح ویزے کا بندوبست کرلیا جائے۔

یہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی اگرچہ پولیس نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور حجت اسلام طباطبائی نے بھی مایوس ہو کر میری تلاش ترک کردی تھی لیکن جس رات اپنا گرفتار ہوئی تھی اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا تھا کہ میری اور فرہاد کی تصویریں کمیٹی کے ہیڈ کوارٹرز اور علاقائی دفتروں میں آویزاں کردی گئی ہیں۔ ایران کی نئی حکومت کا یہ قانون میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایک محکمہ مجھے بری قرار دے رہا تھا تو دوسرا میری تلاش میں تھا۔ ایسی صورتِ حال میں ویزے کے جائز حصول کے لئے کسی بھی سفارت خانے سے رجوع کرنا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں کمال کے والد کا ایک فرانسیسی دوست ایک کاروباری سلسلے میں تہران آیا ہوا تھا۔ وہ کمال کے لئے بھی اس کے والدین کا ایک پیغام لے کر آیا تھا۔ جب ہم اس سے ملنے گئے تو میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ غیر قانونی ویزے کے حصول کے سلسلے میں وہ ہماری کوئی مدد کرسکتا ہے یا نہیں؟

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تہران آتے ہوئے ایک غیر ملکی سفیر جہاز میں میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ ایرانیوں کو ملک سے فرار ہونے میں مدد دے کر اسے بے حد خوشی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کو بھی ویزا مل جائے گا۔ سفر کے دوران وہ غیر ملکی سفیر مجھ سے خاصا بے تکلف ہوگیا تھا۔ میں اسے فون کردوں گا تم لوگ اس سے مل لینا۔"

ہم اس فرانسیسی کے فون کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں میں اپنے منصوبے کے کٹھن ترین مرحلے سے نمٹنے کی تیاری کرنے لگی اور وہ مرحلہ تھا فرہاد کا حصول۔ اگرچہ جمعے کے دن فرہاد صبح دس بجے سے شام چار بجے تک میرے پاس رہتا تھا لیکن میں کوشش کررہی تھی کہ میری ساس اسے جمعرات کی شام کو میرے پاس آنے کی اجازت دے دے۔ پروگرام کے مطابق اسمگلر جمعے کی صبح چھ بجے ہمیں لینے کے لئے پہنچ جاتے۔ میں نے اپنی ساس سے یہ بہانہ کیا کہ جمعرات کی شام کو فرہاد کے ایک دوست کی سالگرہ ہے۔ اسے اس پارٹی میں جانے کی اجازت دی جائے لیکن میری ساس نے صاف انکار کردیا۔ میں نے مایوس ہو کر اپنے وکیل سے مشورہ کیا۔ میرا وکیل ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جو میرے فرار کے منصوبے سے واقف تھے۔

"ہم انہیں فرہاد کے ٹرسٹ میں بددیانتی کا نوٹس دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ یقیناً ہل کر رہ جائیں گے۔ تمہارے بیٹے کو لانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"

وکیل کا خیال درست ثابت ہوا۔ میرے فرار کے پروگرام

"بنو عباس کے دور میں ایک بزرگ تھے، عبداللہ بن محیرز، اپنے عہد کے بڑے صاحب ورع و تقویٰ، کپڑا خریدنے بازار گئے، قیمت کم کرنا چاہی تو دکاندار نہ مانا۔ دکاندار کا پڑوسی انہیں جانتا تھا۔ کپڑے والے سے کہا "بھائی! کچھ پیسے چھوڑ دو، جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ عبداللہ بن محیرز ہیں۔" عبداللہ نے سنا تو اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے "بیٹے چلو۔ یہاں ہم پیسوں سے کپڑا خریدنے آئے ہیں۔ اپنے دین سے نہیں۔" چنانچہ کپڑا خریدے بغیر واپس چلے گئے۔"

"ایوان صدر میں سولہ سال" م ب خالد

سے تین دن پہلے میرے سسرال والوں کو جیسے ہی نوٹس ملا جمشید نے مجھے فون پر بتایا کہ اس نوٹس سے وہ خاصے پریشان ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو قانونی دھمکی دی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ اپنی من مانی کررہے تھے اور ہر لحاظ سے مجھے دبانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔

"تم یہ کیا حماقت کررہی ہو سوسن؟" جمشید نے کہا "اس قسم کے معاملات تو ہم عدالت میں جائے بغیر بھی طے کرسکتے ہیں۔ عدالت میں جانے کی صورت میں کمیٹی والے بھی متوجہ ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم فرہاد کو اس کے دوست کی سالگرہ پارٹی میں لے جانا چاہتی ہو اگر تم یہ لکھ کردے دو کہ ان کے خلاف یہ نوٹس واپس لے رہی ہو تو میں انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ فرہاد کو ویک اینڈ کے لئے تمہارے پاس بھیج دیا جائے۔"

"اس قسم کی تحریر میں ہفتے کے دن دے سکتی ہوں لیکن اس سے پہلے فرہاد کو میرے پاس ہونا چاہیے" میں نے کہا۔ میں نے ہفتے کے دن نوٹس واپس لینے کی تحریر دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں جانتی تھی کہ اس وقت تک میں فرہاد کو لے کر ان کی پہنچ سے بہت دور جاچکی ہوں گی۔ وہ لوگ ناچتے رہ جائیں گے۔ میرا وکیل میری عدم موجودگی میں بھی ان کے خلاف قانونی کاروائی جاری رکھے گا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا۔ میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں" جمشید نے کہا۔

میں انتظار کرتی رہی۔ ایک دن گزر گیا۔ وہ بدھ کا دن تھا۔ دو دن بعد ہم روانہ ہونے والے تھے لیکن ابھی تک فرہاد میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔ کمال اور شیریں کے مکان بکے تھے اور نہ ہی ہمیں ویزا ملا تھا۔ مایوسی کی دھند ایک بار پھر میرے چاروں طرف

پھیلنے لگی۔ میں رات کو نہ تو سو سکتی تھی اور نہ ہی کچھ کھایا جاتا تھا ایک عجیب سا اضطراب تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پچھلے دس دنوں میں میرا دس پونڈ وزن کم ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ میں نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ اگر جمعرات کو فرہاد مجھے مل گیا اور اس وقت تک کمال اور شیری کے مکان فروخت نہ ہوئے یا ویزے نہیں ملے تو بھی میں چلی جاؤں گی۔ میں مزید انتظار کی اذیت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اگر اس ویک اینڈ پر فرہاد آ گیا تو اس کے بعد دوسرا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی فرانسیسی دوست کا فون آ گیا۔ اس نے سفارت خانے کا نام بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے ویزے کے کاغذات وہاں تیار رکھے ہیں۔ مجھے وہاں جا کر صرف نام بتانا ہوگا اور کاغذات میرے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ جب میں سفارت خانے پہنچی تو ویزا حاصل کرنے والوں کی ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی۔ تہران میں ہر غیر ملکی سفارت خانے کے سامنے اب ایسے ہی منظر دکھائی دیتے تھے اگر میں قطار میں لگ جاتی تو شام سے پہلے میری باری آنا ممکن نہیں تھا۔ میں ہمت کرتے ہوئے گیٹ پر پہنچ گئی اور محافظ کو بتایا کہ مجھے سفیر سے ملنا ہے۔ اس نے مجھے اندر داخل ہونے کا راستہ دیتے ہوئے استقبالیہ کی طرف اشارا کیا۔ وہاں بھی اسی طرح لمبی قطار نظر آ رہی تھی۔

یہاں بھی میں نے وہی حربہ استعمال کرنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی ایک سیکریٹری کو جب میں نے بتایا کہ مجھے سفیر سے ملنا ہے تو اس نے قطار کی طرف اشارا کر دیا۔ اس کا مطلب واضح تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک عورت نے میرا نام پکارا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سر عام مجھے برہنہ کر دیا گیا ہو۔ امام خمینی کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ سفارت خانوں میں تو خاص طور پر تعینات کئے گئے تھے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کون کون ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گئی جہاں شیشے کے پیچھے وہ عورت کھڑی تھی جس نے میرا نام پکارا تھا۔ جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو وہ اونچی آواز میں بولی۔

"اپنے شناختی کاغذات اور کمیٹی کا اجازت نامہ دکھائیے پلیز"

ایک لمحے کو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ فرانسیسی نے تو سفارت خانے کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہمارے پاس کمیٹی کے جاری کردہ کاغذات نہیں تھے۔ میں نے محض دکھاوے کے لئے پرس کھول کر اندر رکھی ہوئی چیزیں ٹٹولنا شروع کر دیں "کاغذات میں نے پرس ہی میں رکھے تھے۔ پتا نہیں کہاں گئے؟" میں پرس میں ہاتھ مارتے ہوئے اونچی آواز میں بولی تاکہ میرے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ یہ سمجھ لیں کہ میرے پاس کاغذات موجود ہیں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی ادھیڑ عمر عورت، جس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی، مجھے گھورتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے تمہارے پاس کاغذات نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ کاغذات کے بغیر تمہیں ویزا نہیں دیا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے میں کاغذات گھر بھول آئی ہوں" میں نے عذر لنگ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کاغذات لے آؤ، ویزا مل جائے گا" اس عورت نے کہتے ہوئے مجھے ایک طرف ہٹنے کا اشارا کیا اور اگلا نام پکارا۔

میں چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ ملک چھوڑنے سے پہلے ویزا ملنے کی ایک امید پیدا ہوئی تھی مگر اندھیرے ایک بار پھر یلغار کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اگلا دن جمعرات تھا اور جمعرات کو سفارت خانہ صرف دو گھنٹے کے لئے کھلتا تھا، جبکہ جمعے کو صبح سویرے ہم جانے والے تھے۔ میرے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو ابھی کسی نہ کسی طرح ویزا حاصل کر لوں یا ترکی میں مہینہ بھر انتظار کرتی رہوں کہ کسی ملک کا سفارت خانہ ترس کھا کر ہمیں اپنے ملک میں داخل ہونے کے لئے ویزا جاری کر دے۔ میری نظریں ایک اور خاتون سیکریٹری پر جم گئیں جو استقبالیہ ہال سے گزرتی ہوئی اس راستے کی طرف جا رہی تھی جہاں ایک مسلح محافظ کھڑا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اسے روک لیا اور ہکلاتے ہوئے سرگوشیوں میں اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ مجھے انتظار کرنے کو کہہ کر وہ محافظ کے قریب سے گزرتی ہوئی راہداری میں غائب ہو گئی۔

تقریباً بیس منٹ گزر گئے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ کمیٹی کا خوف آسیب کی طرح میرے ذہن پر سوار تھا۔ اپنی طرف آنے والے ہر شخص کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ بالآخر ایک اور سیکریٹری میرے پاس آ گئی اور مجھ سے ایک بار پھر سب کچھ معلوم کیا جانے لگا۔ تین افراد کے ویزے کے حصول کے لئے بار بار اپنی کہانی سناتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر دفعہ مجھے ویٹنگ روم میں بھرے ہوئے لوگوں کے سامنے ننگا کیا جا رہا تھا۔ اب مجھے یہ شبہ بھی ہونے لگا تھا کہ ہمارے اس فرانسیسی دوست نے سفیر سے کوئی بات نہیں کی تھی، اگر اس نے بات کی ہوتی تو مجھے اس قدر پریشانی کا سامنا کرنے کے بجائے آتے ہی کاغذات مل جاتے۔ دفتر بند ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ میں متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اتفاق سے راہداری کے سامنے اس وقت محافظ موجود نہیں تھا۔ میں ہمت سے کام لیتے ہوئے راہداری میں داخل ہو گئی اور اس دروازے پر دستک دی جس میں وہ سیکریٹری داخل ہوئی تھی۔ دروازہ اسی عورت نے کھولا جس نے مجھے ویزا دینے

سے انکار کردیا تھا۔ مجھے پہچان کر اس کا چہرہ دھواں سا ہو گیا۔

"کون ہو تم اور ابھی تک یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے تو تمہیں ویزا جاری کرنے سے انکار کردیا تھا۔"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارا کیا اور سرگوشیوں میں اسے بتانے لگی کہ میں نہ تو کوئی دہشت گرد ہوں اور نہ ہی امام خمینی کی جاسوس ہوں۔ وہ میرے بارے میں غالباً یہی کچھ سوچ رہی تھی۔

"میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی" میں نے سرگوشی میں کہا "میں یہاں ویزا لینے آئی ہوں۔ سفیر نے میرے ایک دوست سے وعدہ کیا تھا کہ کمیٹی کے کاغذات کے بغیر مجھے ویزا جاری کردیا جائے گا۔ میں جمعہ کی صبح اپنے کمسن بیٹے کے ساتھ جان بچانے کی کوشش میں یہاں سے فرار ہو رہی ہوں، خدا کے لئے میری کچھ مدد کرو۔"

اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب خوف اور غصے کے بجائے اس کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے تھے

اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے بولی "اندر آجاؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ، گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" اس نے کچھ کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کرتی رہی، پھر اس نے مجھے صبح سویرے آنے کو کہا اور تسلی دی کہ صبح جب میں آؤں گی تو مجھے ویزا تیار ملے گا۔

اسی رات میرے والد بھی آذربائیجان سے آگئے۔ چند روز پہلے میں نے انہیں فون پر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے فرار کے پروگرام سے آگاہ کردیا تھا اور اب وہ مجھے خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ وہ کمال ہی کے گھر آئے تھے اور اس رات میری کزن فاریہ بھی وہاں آگئی تھی۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ میں نے سفارت خانے جا کر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔

"یہ تمہیں پھنسانے کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے" کمال نے کہا "عین ممکن ہے کہ کل صبح جب تم وہاں پہنچو تو کمیٹی والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں۔ صبح مت جانا۔"

لیکن میں کمال کا مشورہ قبول نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سفارت خانے میں میرے ساتھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کیا جا رہا تھا۔ مجھے ہر صورت میں ویزا حاصل کرنا تھا کیونکہ میں فرہاد کے ساتھ مہینوں ترکی میں کسی ملک کے ویزے کے لئے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانا چاہتی تھی۔ جمعرات کی صبح میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ مجھے ابھی تک یہ اطلاع بھی نہیں دی گئی تھی کہ اس دوپہر کو فرہاد کو میرے پاس پہنچا دیا جائے گا یا نہیں۔

اگرچہ کمال اور شیری کے مکانوں میں بھی بعض لوگوں نے دلچسپی ظاہر کی تھی لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی مکان بھی فروخت نہیں ہو سکا تھا۔

شہاب الدین غوری کا ایک امیر تاج الدین یلدز تھا، اس کا ایک لڑکا اپنے استاد سے پڑھ رہا تھا کہ استاد نے تادیب کے لئے غصے میں ایک کوڑا لڑکے کے سر پر مارا۔ جس سے وہ مر گیا۔ تاج الدین یلدز کو خبر ہوئی تو استاد کو بلایا۔ زاد راہ دے کر کہا کہ اس لڑکے کی ماں کو خبر ہونے سے پہلے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

طبقاتِ ناصری کا ایک ورق

اس روز جب میں ویزا لینے کے لئے سفارت خانے پہنچی تو میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ہر لحہ یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کمیٹی کے آدمی مجھے حراست میں لے لیں گے، لیکن میں جیسے ہی ویٹنگ روم میں داخل ہوئی، اس عورت نے مجھے دیکھ لیا جس نے گزشتہ روز مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی اپنے دفتر میں لے گئی اور تین ویزے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی "خدا کرے تم خیریت سے سرحد عبور کر جاؤ" پھر اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھے سینے سے لپٹاتے ہوئے میری پیشانی پر بوسا دیا اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کردیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سفارت خانے سے نکل آئی۔ میں نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ویسے میں دل ہی دل میں اس عورت کی ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکی تھی جس نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے ویزے دے دیے تھے۔ جبکہ ان دنوں ایران کی صورت حال یہ تھی کہ اپنے خاندانی ملازموں، بچوں، رشتے داروں اور دوستوں پر بھی بھروسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جب میں گھر پہنچی تو دوپہر ہو چکی تھی۔

کمال خاصا مضطرب نظر آرہا تھا۔ اسے مکان کا ایک گاہک مل گیا تھا۔ اب صرف قیمت پر معمولی سا اختلاف تھا۔ ہم گھر کی قیمتی چیزیں پہلے ہی فروخت کر چکے تھے اور کمال کا کزن ڈاک ٹکٹ لئے تیار بیٹھا تھا۔ مکان کے پیسے ملتے ہی کمال اسے ادائیگی کر کے ٹکٹوں کا وہ ذخیرہ لے لیتا۔ اس دوپہر کو شیری نے بھی بتایا کہ مکان کا ایک گاہک مل تو گیا ہے لیکن قیمت پر اختلاف ہے اور اسے یقین نہیں تھا کہ آج سودا ہو بھی جائے گا یا نہیں۔

میں نے ساتھ لے جانے والی ضرورت کی تمام چیزیں دو بیگوں میں پیک کرلی تھیں۔ ہمیں صرف دو بیگ ہی ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ میں نے اپنے سونے کے تمام زیورات، جن میں نیکلس، چوڑیاں، کانوں کے بندے، موتیوں کے ہار، ہیرے شامل تھے اور ایسی تمام قیمتی چیزیں بھی بڑی احتیاط سے کپڑوں میں سی لی تھیں۔ میرا بیلٹ، قمیصوں کے کالر، آستین کے کف، اسکرٹ کے بارڈر کی سلائی، جیکٹ کے شولڈر پیڈز

کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی تھی جہاں اس قسم کی کوئی چیز چھپائی جاسکتی ہو۔ میں نے آخری مرتبہ ان تمام چیزوں کو چیک کرلینا ضروری سمجھا تھا۔ خصوصاً اپنی نانی کی فیروزہ کی وہ انگوٹھی' جو خاندانی ورثے کے طور پر مجھ تک پہنچی تھی۔ اس کے بارے میں اطمینان کرلینا چاہتی تھی۔

دوپہر بیت گئی۔ فرہاد کے بارے میں جمشید کی طرف سے ابھی تک اطلاع نہیں ملی تھی۔ مایوسی بڑھتی جارہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے مجھے یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑے گا' لیکن چار بجے جب فون کی گھنٹی بجی تو میں نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ جمشید کی کال تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی میں نے اندازہ لگالیا کہ کوئی اچھی خبر ہوگی "تمہاری سسرال والے مان گئے ہیں۔ تم پانچ بجے فرہاد کو لے آنا" میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے اس کی بات پوری سننے سے پہلے ہی فون بند کردیا۔ میں نے ایک بہت بڑا معرکہ سر کرلیا تھا۔

تہران میں آخری رات گزارنے کے لئے ہم نے میری کزن فاریہ کے گھر کا انتخاب کیا تھا کیونکہ خیال تھا کہ رات تک کمال کے مکان کا سودا ہوجائے گا۔ رات کے وقت اس کے مکان سے کہیں اور جانا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں ہر چیز کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ مجھے یہاں رہتے ہوئے چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ اس مکان اور اس کی ہر چیز سے انس ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب میں دوبارہ اس گھر میں نہیں آسکتی۔ یہ گھر تو کیا میں بھی تہران واپسی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ یہاں میں نے جو زندگی گزاری تھی وہ خواب بن گئی تھی۔

چار بج کر پینتالیس منٹ پر میں گھر سے نکل کر سڑک پر آگئی اور قریب سے گزرنے والی ایک پبلک ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ میں نے پرائیویٹ ٹیکسی لینے سے جان بوجھ کر گریز کیا تھا کیونکہ اندیشہ تھا کہ اس کے ذریعے میرے ٹھکانے کا پتا چلایا جاسکتا تھا۔ جب میں گلی میں داخل ہوئی تو فرہاد دادی کے مکان کے سامنے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی پھوپھی بھی کھڑی تھی۔ میں نے اپنی نند کو خدا حافظ کہا اور فرہاد کو گود میں اٹھا کر ٹیکسی میں بٹھالیا۔ ٹیکسی اسی وقت حرکت میں آگئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں تھا۔ میں فرہاد کو آغوش میں بھینچے بار بار اس کی پیشانی اور رخساروں پر بوسے دے رہی تھی۔ میری اس حرکت پر فرہاد کچھ پریشان سا ہوگیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ممی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سڑک دور دور تک سنسان تھی۔ یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ میری سسرال والے اب میرا سراغ نہیں لگا سکتے' میں سرگوشی میں فرہاد کو بتانے لگی کہ یہ تہران میں ہماری آخری رات ہے۔ کل صبح سویرے ہم اس جہنم سے نکل جائیں گے۔

ٹیکسی میں نے [illegible] کے مکان سے کئی بلاک دور ہی چھوڑ دی تھی' تاکہ اگر بعد میں کسی طرح یہاں تک میرا سراغ لگا بھی لیا جائے تو فاریہ کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ باقی راستہ ہم نے گلیوں میں گھومتے ہوئے پیدل ہی طے کیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹے خوشی میں اس طرح جھومتے ہوئے چل رہے تھے جیسے ہمیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

میرے والد' فاریہ اور اس کے شوہر کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ اس رات ہم لوگ کہاں تھے۔ میں نے اپنے ماموؤں اور دوسرے قریبی رشتے داروں کو بھی اپنے اس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا' ورنہ وہ ہمیں ملنے کے لئے چلے آتے' اس میں نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ان کے لئے بھی خطرہ تھا۔ ہم نے فون پر ہی سب کو خدا حافظ کہا لیکن فون پر بات کرتے ہوئے بھی ہم نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے ماموں فائق سے بات کرنے کے بعد ریسیور رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا۔ کمال کی کال تھی۔ اس نے چہکتے ہوئے بتایا کہ مکان بک گیا ہے۔ اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد شیری نے بھی یہ خوشخبری سنائی "مریض صحت یاب ہوگیا ہے۔"

یہ کوڈ ورڈز میں مکان کے فروخت ہونے کی اطلاع تھی بعد میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے مکان ڈیمانڈ سے کہیں کم قیمت پر فروخت کردئے تھے لیکن ظاہر ہے مجبوری تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اس سے زیادہ مل بھی نہیں سکتا تھا' لیکن ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہوگئی تھی۔ اب ہمارا راستہ بالکل صاف تھا۔

○☆○
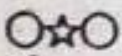
تہران کی وہ آخری رات میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ ہر چہرے پر اداسی اور افسردگی تھی۔ اس رات کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ ہم سرگوشیوں میں الوداعی باتیں کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہی ہم نے روانگی کی تیاری شروع کردی تھی۔ مرجانی اور اس کا کرد ساتھی مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے پر مخصوص دستک سے اپنی آمد کی اطلاع دی تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس جہنم سے نکلنے کی خوشی بھی تھی اور اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ بھی۔ مرجانی اور اس کے کرد ساتھی کا جوڑ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ مرجانی چھوٹے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس نے حسبِ معمول اس وقت بھی قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا کرد ساتھی خاصا دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ وہ ایران کی شمال مشرقی سرحد پر پہاڑوں میں آباد اپنے چھوٹے سے قبیلے کا سردار تھا اور اس کی زندگی گھوڑے کی پشت پر گزری تھی۔

ہمیں آخر تک اس طویل قامت کرد کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا اور اس سفر کے دوران ہم جب تک اس کے ساتھ رہے اس نے اپنی زبان کو بہت کم حرکت دی تھی۔

۲۸ جولائی کی صبح ٹھیک چھ بجے ہم رخصت ہوئے۔ ہمارے مکان سے نکلنے سے پہلے فاریہ نے دروازے سے باہر جھانک کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ گلی میں کوئی موجود تو نہیں تھا۔ مرجانی رینج روور کے اسٹیئرنگ پر تھا۔ وہ مین روڈ پر آنے سے گریز کرتے ہوئے ویران اور چھوٹی سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ فضا پر اعصاب شکن سکوت طاری تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ صبح کی یہ خاموشی دیکھی تھی۔ راستے میں کہیں کہیں کمیٹی کی پیٹرولنگ گاڑیاں بھی نظر آئی تھیں لیکن مرجانی ان سے پہلو بچاتا ہوا نکل گیا تھا۔ اِکا دُکا راہ گیروں کا بھی سامنا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ ہماری رینج روور کو دیکھ کر خوفزدہ سے ہو جاتے پھر یہ جان کر مطمئن سے ہو جاتے کہ یہ کمیٹی کی گاڑی نہیں تھی۔

شہر سے نکلنے سے پہلے ہمیں مرجانی کے گھر تک کا خطرناک راستہ بھی طے کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ ہمارے لئے خریدے گئے جرمن مارکس گھر پر ہی بھول آیا تھا۔ سنسان گلیوں اور سڑک سے گزرتے ہوئے مجھے ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ہمیں راستے میں کہیں اچانک ہی روک نہ لیا جائے۔ اس طرح ہمارے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ شاہراہوں پر کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم کسی پریشانی کا سامنا کئے بغیر تقریباً سات بجے شیری کے مکان پر پہنچ گئے۔ شیری کو لینے کے کچھ ہی دیر بعد ہم مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے آذربائیجان کی طرف جانے والی شاہراہ پر نکل آئے۔ ہمیں اپنے فرار کے منصوبے کی تفصیلات کا قطعی علم نہیں تھا۔ ہماری قسمت کی ڈور ان دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں تھی۔

منگولوں اور قاچار سلطنت کے پایۂ تخت تبریز تک سات سو کلو میٹر سفر کے دوران کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ راستے میں اگرچہ کئی چیک پوسٹوں پر روکا گیا تھا لیکن ہم نے ہر جگہ ایک ہی کہانی سنائی تھی کہ ہم اپنے اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے گاؤں جا رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہر جگہ ہماری اس کہانی کو تسلیم کر لیا گیا اور ہم پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا گیا۔ اس ہائی وے پر لاتعداد چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں اور تقریباً چوبیس گھنٹے آمدورفت رہتی تھی۔ اس لئے ہر جگہ گاڑی کی سرسری چیکنگ کے بعد ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

تبریز سے نکلنے کے بعد صورت حال کچھ نازک ہو گئی تھی۔ ہم میں سے ہر ایک کے اعصاب پر تناؤ سا طاری ہو رہا تھا۔ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ آذربائیجان کے چار سو کلو میٹر طویل کوہ زاگرس کا یہ پہاڑی سلسلہ فرار کا بدترین راستہ تھا۔ کمیٹی کے مسلح اہل کار اس طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ تبریز سے سرحد کی طرف جانے والی سڑک بھی صرف ایک ہی تھی اور اسی لئے فرار ہونے والوں کو پریشانیوں کا سامنا رہتا تھا۔ تبریز میں مذہب کی پابندی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس شہر میں کہیں بھی کوئی عورت چادر کے بغیر نظر نہیں آ سکتی تھی۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے شیری نے چادر اوڑھ لی اور میں نے بھی بادلِ ناخواستہ بیگ میں سے وہ چادر نکال لی جو کسی ایسے ہی موقع پر کام آنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ شہر کے نواح میں داخل ہوتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارا یہ سفر اتنا آسان ثابت نہیں ہو گا' جتنا مرجانی نے بتایا تھا۔ کار ایک جگہ رک گئی تھی۔

"یہاں سے تم لوگوں کو دوسری کار پر سفر جاری رکھنا ہو گا" مرجانی نے کہا "اس سے آگے جانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ آگے ہمارے لئے خطرہ ہے" اس نے سیٹ کے نیچے چھپا ہوا ایک صندوقچہ نکال کر ہماری طرف بڑھا دیا "اس میں تم لوگوں کے پاسپورٹ اور غیر ملکی کرنسی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔"

"کیا مطلب؟" کمال نے اسے گھورا "یہ چیزیں تو ہمیں ترکی کی سرحد عبور کرنے کے بعد ملنی چاہئے تھیں۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ ایران کی حدود میں سفر کے دوران ان چیزوں کا ہمارے پاس ہونا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

ہمارے پاس بحث و تکرار کے لیے وقت نہیں تھا۔ اسی لمحے ایک پیکان ہمارے قریب آ کر رکی اور مرجانی ہمیں زبردستی اس کار میں ٹھونسنے لگا۔ اسی دوران وہ صندوقچہ کمال کے ہاتھ سے گر کر کھل گیا اور کرنسی نوٹ چاروں طرف بکھر گئے۔

"جلدی کرو" مرجانی چیخا "جلدی سے نوٹ سمیٹو اور کار میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

ہم سب سڑک پر بکھرے ہوئے کرنسی نوٹ جمع کرنے لگے۔ یہ رقم ترکی لیرے اور جرمن مارکس کی صورت میں تیرہ ہزار امریکی ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ رقم سمیٹنے کے بعد ہم مرجانی کو برا بھلا کہتے ہوئے پیکان میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دیئے بغیر کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔ شہر سے گزرنا ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی ایسے علاقے سے گزر رہے ہوں جہاں بارودی سرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر موڑ پر چیک پوسٹ تھی۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ پیکان کو ایسی گلیوں سے لے جا رہا تھا جہاں کسی چیک پوسٹ یا پیٹرولنگ کار کا سامنا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

"ہم اس طرح نہیں جا سکتے" کمال کہہ رہا تھا "ہمیں واپس جانا ہو گا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں شام سے پہلے پہلے سرحد پار پہنچا دیا جائے گا لیکن اچانک کاروں کی یہ تبدیلی۔ یہ کھلی بے ایمانی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے پاسپورٹ بھی

ہمارے ہاتھوں میں تھمادئے ہیں۔"

"ان لوگوں کا واقعی کوئی بھروسا نہیں" ڈرائیور نے بھی مرجانی کو برا بھلا کہتے ہوئے کہا "میں بھی انہیں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اگر آئندہ انہوں نے ایسی حرکت کی تو میں ان کے لئے کام نہیں کروں گا۔ پاسپورٹ اور غیر ملکی کرنسی کی موجودگی نے میری زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اگر مجھے کچھ ہوگیا تو میری بیوی اور کمسن بچے کو پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

تقریباً بیس منٹ تک ہم شہر کی تنگ اور کچی گلیوں میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں کمال اور ڈرائیور مسلسل ایک دوسرے سے بحث میں الجھے رہے تھے۔

"پاسپورٹ اور رقم کو اپنے لباس میں چھپالو" ڈرائیور نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "وہ لوگ خواتین کی چادر نہیں اترواتے اور نہ ہی جامہ تلاشی لیتے ہیں۔"

میں پاسپورٹ اور رقم کو جیکٹ میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی لیکن چھوٹے نوٹوں پر مشتمل رقم کی گڈیاں اتنی موٹی موٹی تھیں کہ جیکٹ کی زپ بھی بند نہیں ہورہی تھی۔ بالآخر میں نے جھنجلا کر یہ کوشش ترک کردی۔ خوش قسمتی سے ہمیں شہر میں کسی جگہ بھی نہیں روکا گیا۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد ہم اگرچہ کسی حد تک مطمئن ہوگئے تھے لیکن یہ سوال اب بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ میرے لئے واپس جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرہاد سے ہاتھ دھولوں، لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے دوسروں کی زندگیاں داؤ پر لگی رہیں۔ میں نے بہت کم زبان کھولی تھی اور دل ہی دل میں یہ دعا مانگتی رہی تھی کہ یہ لوگ سفر جاری رکھنے پر آمادہ رہیں۔ شہر سے باہر ہائی وے پر پہنچتے ہی ڈرائیور کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک مرسڈیز بڑی تیزی سے ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔ دونوں طرف کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی رائفلوں کی نالیں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

"میرے خدا! وہ ہمارا پیچھا کررہے ہیں" ڈرائیور کے منہ سے مردہ سی آواز نکلی۔ جیسے وہ کسی کنویں کی گہرائی سے بول رہا ہو۔ اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی تھی۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھ کپکپانے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہوکر لڑھک جائے گا۔ اس نے اچانک کار کی رفتار کم کردی۔

"رفتار کم مت کرو" میں نے چیختے ہوئے کہا "رفتار کم کرنے کی صورت میں انہیں مزید شبہ ہوگا۔"

لیکن ڈرائیور پر میرے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کار کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر ڈرائیور نے کار سڑک کے کنارے پر روک لی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اس دنیا سے رخصت ہونے کی تیاری کررہا ہو۔ میں نے ایک بار پھر غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ مرسڈیز تیزی سے فاصلہ سمیٹتی ہوئی قریب آرہی تھی۔ میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔ سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ دوسرے ہی لمحے ایک زناٹے کی آواز ابھری اور ہمارے تعاقب میں آنے والی کار اسی تیز رفتاری سے آگے نکل گئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ نئے ماڈل کی مرسڈیز تھی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر داڑھی والے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے رائفلیں سنبھال رکھی تھیں۔ وہ یقیناً کمیٹی کے اہل کار تھے لیکن قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے جس طرح ہماری طرف دیکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں ہم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرکے اسے چراگاہ کی طرف جانے والے کچے راستے پر ڈال دیا۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔ سڑک سے کافی دور نکل آنے کے بعد اس نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور ایک بار پھر مستقبل کے بارے میں بحث ہونے لگی۔

کمال تہران واپس جانے پر بضد تھا۔ تبریز شہر سے گزرتے ہوئے اس پر دہشت سی طاری ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے مرجانی پر بھی غصہ تھا جس نے حسب وعدہ سرحد پار کرانے کے بجائے انہیں آدھے راستے میں کسی اور کے سپرد کردیا تھا۔ کمال سے میری شادی کو اگرچہ چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن میں اسے کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ اس میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک سول سرونٹ میں ہونی چاہئیں۔ اسے طے شدہ اصولوں اور منصوبوں سے انحراف یا ان میں کسی قسم کی تبدیلی پسند نہیں تھی۔

شیری پُر سکون اور ٹھنڈے مزاج کی عورت تھی۔ خوف اگرچہ اس پر بھی طاری تھا لیکن وہ واپس جانے کے بجائے سفر جاری رکھنے اور متوقع خطرات کا رسک لینے کے لئے تیار تھی۔ اس نے کمال کو بھی سفر جاری رکھنے پر آمادہ کرلیا تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پاسپورٹ اور غیر ملکی کرنسی کہاں چھپائی جائے؟ کمال نے انجن کا ڈھکنا اٹھا کر بھی ہر جگہ کا جائزہ لے لیا تھا لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی جہاں یہ چیزیں چھپائی جاسکتیں۔ بالآخر رقم اور پاسپورٹ ایک خالی تھیلے میں ڈال کر انہیں پچھلی سیٹ ادھیڑ کر اسپرنگوں کے درمیان چھپا دیا گیا اور سیٹ کو پھر چڑھا دیا گیا۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر کسی چیک پوسٹ پر کار کی تلاشی بھی لی جاتی تو یہ چیزیں نظروں میں نہیں آسکتی تھیں۔

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ اس وقت میں اپنی سسرال والوں کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکی وہ آج دو بجے فرہاد کی

واپسی کی توقع کر رہے تھے لیکن اب فرہاد کی واپسی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ان میں اور فرہاد کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا لیکن ہم ابھی خطرات کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔ ترکی کی سرحد اب بھی چار گھنٹوں کے فاصلے پر تھی۔

مرجانی نے بتایا تھا کہ ہمیں سرحد سے کچھ فاصلے پر ایک خاص مقام تک کار میں سفر کرنا پڑے گا اس کے بعد پہاڑوں میں تین گھنٹوں کا راستہ گھوڑوں کی پشت پر طے کرنا ہوگا۔ بالآخر یہ گھوڑے ہی ہمیں ترکی کی سرحد پر پہنچا دیں گے۔ سرحد کے دوسری طرف ایک کار ہماری منتظر ہوگی جو ہمیں استنبول تک لے جائے گی۔ اس وقت مرجانی کا یہ پروگرام بہت ہی خوشگوار محسوس ہوا تھا لیکن اب میں محسوس کر رہی تھی کہ مرجانی نے ہمارے ساتھ بددیانتی کی تھی۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ایک کامیاب اسمگلر ہے۔ میرے خیال میں اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ واقعی کامیاب اسمگلر تھا۔ اس نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ تمام رسک فرار ہونے والوں کو لینا پڑے گا اور اس کی یہ بات غلط نہیں تھی۔ اب سرحد پار ہونے تک تمام رسک ہمیں ہی لینے تھے۔

ڈرائیور کے ذہن پر اب بھی یہ خوف طاری تھا کہ اگر کہیں ہم پکڑے گئے تو ہمارے ساتھ اسے بھی فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کردیا جائے گا۔ اس کے کہنے کے مطابق رضاییہ کے شمال مغرب میں تقریباً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر سرحد سے پہلے ایران کی آخری بڑی آبادی شاہ پور کے نواح میں پہنچ کر اس کی ڈیوٹی ختم ہوجائے گی اور ہمیں دوسری پارٹی کے حوالے کردیا جائے گا جو ہمیں سرحد تک لے جائے گی' اگر ہم قانونی طور پر ملک چھوڑ رہے ہوتے تو وہ ہمیں شاہ پور سے مزید اٹھارہ کلو میٹر آگے لے جاتا جہاں ہم بڑے اطمینان سے اپنے کاغذات دکھا کر سرحد عبور کرسکتے تھے لیکن ہمیں شاہ پور کی سرحدی چوکی کی طرف جانے کے بجائے بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر مڑ جانا تھا۔ اس سڑک پر کمیٹی کی مسلح پیٹرولنگ پارٹیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں۔ سڑک کے اس جنکشن پر ہمیں شام کو ٹھیک سات بجے پہنچنا تھا جہاں دوسری پارٹی ہماری منتظر ہوتی۔ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے ہمیں فی الحال کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہم راستے میں سڑک کے کنارے ایک ریسٹورنٹ میں بھی رکے تھے جہاں چائے پینے کے علاوہ کچھ دیر تک چہل قدمی کرتے رہے تھے۔

ڈرائیور کی ذہانت کے باعث ہمیں صرف ایک مرتبہ ایک چیک پوسٹ پر پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ کسی چیک پوائنٹ پر اس وقت پہنچتا جب نماز کا وقت ہوتا یا گاڑیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی ہوتی۔ چیک پوسٹ کے محافظ بوریت کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنے کا اشارا کردیتے۔ ایک موقع پر ڈرائیور نے کار ایک بہت بڑے مال بردار ٹرک کے عین پیچھے لگادی تھی اور جب محافظ ٹرک کو چیک کر رہے تھے' وہ بڑے اطمینان سے کار کو ٹرک کے پہلو سے نکال لے گیا تھا۔ اس نے محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح ہاتھ ہلایا تھا جیسے دوسرے محافظوں نے اسے کلیرنس دے دیا ہو۔

اس وقت ہم سڑک کے کنارے ریسٹورنٹ کے سامنے بچھی ہوئی میز پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ ایک اور گاڑی وہاں آکر رکی اور ایک پولیس والا کار سے اتر کا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ پولیس والا ہماری ہی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پائے ہوئے تھے لیکن ہمارا ڈرائیور بے تکلفی سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پولیس والا بار بار ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح چادر میں لپیٹ رکھا تھا مجھے خطرہ تھا کہ میں شناخت نہ کرلی جاؤں کیونکہ میری تصویریں ملک بھر کے پولیس اسٹیشنوں تک پہنچ چکی تھیں لیکن وہ پولیس والا چائے پینے کے بعد اٹھ گیا اور کاؤنٹر پر بل ادا کرکے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی کار حرکت میں آگئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہم نے میز چھوڑ دی۔ کمال جب بل دینے کے لئے کاؤنٹر پر پہنچا تو یہ انکشاف ہوا کہ ہمارا بل بھی اسی پولیس والے نے ادا کردیا تھا۔ اپنی کار میں بیٹھنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ پولیس والا کون تھا؟"

"وہ میرا دوست ہے" ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "وہ جانتا ہے کہ میں تم لوگوں کو اسمگل کرکے لے جارہا ہوں۔ اس نے تم لوگوں کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ سرکاری محکموں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ جنہیں حکومت کے ستائے ہوئے لوگوں سے گہری ہمدردی تھی۔ بہرحال اس پولیس والے کی ہمدردی کو میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گی۔ پورے دن میں فرہاد نے مجھ سے ابھی تک ایک سوال بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ غالباً سمجھ گیا تھا کہ ہم اس کی دادی کے گاؤں پکنک منانے نہیں جارہے تھے۔ ہماری بھاگ دوڑ اور دہشت زدہ کیفیت سے وہ غالباً یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ہم کس قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ اس لئے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ ہم پچھلے دو سال سے جن حالات کا شکار تھے۔ اس کا فرہاد نے گہرا اثر لیا تھا اور اس نے ہر قسم کی صورت حال سے سمجھوتا کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ گھر میں بھی اسی طرز عمل کا مظاہر کرتا تھا۔ کئی کئی گھنٹوں تک کھڑکی میں کھڑا خاموشی سے باہر دیکھتا رہتا' اور اب بھی میری گود میں خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر گزرتی ہوئی چراگاہوں اور کھیتوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے راستے میں کسی وقت بھی یہ نہیں پوچھا تھا

کہ وہ کیا چیز ہے' حالانکہ اس عمر کے بچے اپنے گرد و نواح کی ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ہم شاہ پور کے قریب پہنچ رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق شاہ پور سے کچھ پہلے ایک آدمی کو سڑک کے کنارے ہمارا منتظر ہونا چاہئے تھا لیکن سڑک دور دور تک سنسان نظر آرہی تھی۔ ڈرائیور نے کار کی رفتار کم کردی تھی اور متجسس نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب اس نے کار روک لی۔ اس آدمی کو درختوں کے اس جھنڈ کے قریب ہونا چاہئے تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ یہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے کار ایک کچے راستے پر اتارلی اور تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ایک باغ کی بیرونی دیوار کے قریب روک لی۔ ہمارے عین سامنے کچھ فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا۔ دریا اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن پانی کی روانی خاصی تیز تھی۔ ڈرائیور نے کار کا انجن بند کردیا۔

میں متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پروگرام کے مطابق پانچ کردوں کو گھوڑوں سمیت یہاں ہمارا منتظر ہونا چاہئے تھا لیکن دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈرائیور بھی بدحواس سا ہو رہا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہمیں کسی جال میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کی جارہی۔ سامنے دریا تھا اور آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پیچھے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہمیں پھانسنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ کمال اور شیری کے چہروں پر بھی انجانے خوف کے سائے رقص کرنے لگے تھے۔ بائیں طرف کچھ فاصلے پر دو آدمیوں کے ہیولے نظر آئے۔ وہ کھیتوں کے لئے ایک چھوٹی سی ندی کے پانی کا رخ تبدیل کررہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک یہ خیال ابھرا کہ کہیں وہ کمیٹی کے اہل کار تو نہیں جو بھیس بدل کر یہاں ہمارا انتظار کررہے تھے' یا لٹیرے تھے؟"

"تم لوگ دریا کی طرف چلتے رہو" کمال نے کہا "سوٹ کیس اٹھالو' میں سیٹ کے نیچے سے رقم اور پاسپورٹ نکالتا ہوں"۔

میں کمال کا مطلب سمجھ گئی تھی' اگر ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ہم دریا پار کرکے وقتی طور پر اپنی جان بچاسکتے تھے۔ شیری اور میں نے چادریں اتارلیں۔ اب یہ چادریں ہمیں بوجھ محسوس ہونے لگی تھیں۔ ڈرائیور بھی کردوں کی تلاش میں ایک طرف چلا گیا تھا۔ ہم ابھی کار میں سے اپنا سامان نکال ہی رہے تھے کہ وہ دو آدمیوں کے ساتھ واپس آتا ہوا نظر آیا۔ ہم اپنے اپنے بیگ اٹھا کر بھاگنے کے لئے تیار ہوگئے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے وہ دو آدمی بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے خدشات بے بنیاد نکلے۔ ڈرائیور کے ساتھ آنے والے وہ دونوں کرد تھے جنہوں نے ہمیں سرحد پار پہنچانا تھا۔ وہ قریب پہنچے تو انہیں دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں نوعمر لڑکے تھے جنہوں نے گہرے رنگ کے مخصوص پتلون نما پاجامے اور موٹے موٹے سویٹر پہن رکھے تھے۔ اپنی عمر کے برعکس وہ چہروں سے ایسے کاموں میں خاصے تجربے کار نظر آرہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہمارا چارج سنبھال لیا اور دریا کے کنارے کی طرف ہماری رہنمائی کرنے لگے۔

دریا کا پانی پنڈلیوں سے زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن بہاؤ خاصا تیز تھا۔ انہوں نے باری باری ہمیں دریا پار کروادیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر ان میں سے ایک نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آگے راستہ دشوار گزار ہے' تم لوگ اپنا سامان اٹھا کر نہیں چل سکو گے یہ مجھے دے دو۔"

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی جواب دیتا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے دونوں بیگ چھین لئے اور کچھ فاصلے پر گیہوں کے ایک کھیت کی طرف دوڑنے لگا۔

"احتیاط سے" میں نے چیخ کر کہا "میرا سب کچھ اسی بیگ میں ہے۔"

لیکن وہ کرد لڑکا میرے چیخنے کی پروا کئے بغیر دوڑتا چلا گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کمال نے ابھی تک دریا پار نہیں کیا تھا۔ شیری' فرہاد اور میں اس کنارے پر اکیلے تھے۔ چند منٹ بعد کمال بھی دوسرے کرد لڑکے کے ساتھ کنارے پر پہنچ گیا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پہلے لڑکے کے قریب پہنچ گئے اور گیہوں کے کھیت میں دوڑنے لگے۔ اس وقت اگرچہ آٹھ بج چکے تھے لیکن بہت ہلکی سی روشنی ابھی باقی تھی۔ کھیتوں کے تین اطراف میں زمین بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی اور ہمیں کسی بھی طرف سے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ہمارے گائیڈ ہمیں مسلسل جھک کر چلنے کی ہدایت دے رہے تھے تاکہ ہمیں کسی طرف سے دیکھا نہ جاسکے۔ ہم نے شہر میں استعمال ہونے والے جوتے پہن رکھے تھے جس کی وجہ سے کھیتوں میں دوڑنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہم بار بار ٹھوکریں کھا کر گر رہے تھے۔ دوڑتے ہوئے ہمارے سانس پھول گئے تھے لیکن ہمارے گائیڈ کہیں ایک منٹ بھی رکنے کو تیار نہیں تھے۔

"ہمیں اور کتنی دور جانا ہوگا؟" میں بار بار پوچھتی۔

"چند منٹ کا راستہ باقی ہے' بس تھوڑا سا فاصلہ۔ آگے گھوڑے ہمارے منتظر ہیں" مجھے ہر بار یہی جواب ملتا۔

راستے میں زیادہ تر میں اور شیری ان کردوں سے باتیں

کرتے رہے تھے کیونکہ ہم دونوں ترکی زبان روانی سے بول سکتے تھے جبکہ کمال اور فرہاد اس زبان سے قطعی نابلد تھے۔ ہمیں چھک کردوڑتے ہوئے اگرچہ چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس طرح دوڑتے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ اگر سیدھے ہونے کی کوشش کی گئی تو کسی انجانی سمت سے آنے والی گولی جسم میں پیوست ہو جائے گی۔

ایک موقع پر جب کمال میرے قریب آیا تو میں نے سرگوشیوں میں اسے اس کرد لڑکے کے پُراسرار رویے کے بارے میں بتایا جو میرا بیگ لے کر بھاگا تھا۔

"جیسے ہی کہیں رکنے کا موقع ملے گا۔ سب سے پہلے میں بیگ چیک کروں گی۔ میرا پرس بھی اسی بیگ میں موجود ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اس نے کوئی چیز غائب نہ کردی ہو" میں نے کہا۔

جب ہم کھیتوں کے کنارے پہنچے تو اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ یہاں سے آگے زمین بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔ بہت آگے بلند پہاڑوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔

"بس' اب یہاں رک جاؤ" ایک کرد لڑکے نے ہمیں رکنے کو کہا۔

یہاں بھی دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم اخروٹ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے چاروں طرف ویرانہ اور گہری تاریکی تھی۔ میرے ذہن پر ایک بار پھر خوف طاری ہونے لگا۔ دونوں کردوں میں سے ایک نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی۔ میں نے دوپہر کے کھانے میں سے کچھ سینڈوچ بچا رکھے تھے۔ ان میں سے ان دونوں کو بھی حصہ دینا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گھوڑوں کی ہلکی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ہم سب آواز کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد تین گھوڑے سواروں کے ہیولے نظر آئے۔ تین آدمی تھے اور وہ کردوں کے روایتی لباس میں تھے۔ لمبی' ڈھیلی ڈھالی قمیصیں' بیگی پتلونیں' چوڑے بیلٹ اور رنگ برنگی جیکٹیں۔ وہ خاصے لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ میرے تصور کے عین مطابق جو واقعی ہمیں سرحد پار کرواسکتے تھے۔

چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ روانگی کے لئے تیار ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے گھوڑے سے اترے بغیر بازو سے مجھے کھینچ کر اپنے سامنے گھوڑے پر بٹھالیا۔ فرہاد بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ شیری کو دوسرے سوار نے بٹھالیا اور کمال تیسرے گھوڑے پر سوار کے پیچھے بیٹھ گیا۔ گھوڑے ہلکی رفتار سے چل رہے تھے جبکہ وہ دونوں کرد لڑکے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ہم شاہ پور شہر کے متوازی چل رہے تھے۔ نیچے بہت دور نشیب میں شہر کی روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آرہی تھیں لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کرد نے اپنی زبان میں اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی راستہ بدل دیا گیا۔ گھوڑوں کی رفتار بھی تیز کردی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"کیا معاملہ ہے' تم اس طرح گھوڑے کو کیوں دوڑا رہے ہو" میں نے اپنے سوار سے پوچھا اور سر گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کمال کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس کا سوار اسے نہ جانے کس طرف لے گیا تھا۔

"میرا شوہر کہاں ہے؟" اس مرتبہ میں نے چیخ کر کہا "وہ شاید پیچھے رہ گیا ہے' اس کے آنے تک رک جاؤ۔"

"گھبراؤ نہیں' وہ ابھی آجائے گا" سوار نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سے غراہٹ تھی۔

میں اس پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ایک ان جانے سے خوف نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ ان کردوں نے ہمیں لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا اور کمال کو جان بوجھ کر ہم سے الگ کردیا گیا تھا لیکن تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب کمال دوبارا ہمارے ساتھ آن ملا تو مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔ میں اپنے سوار سے مسلسل یہ پوچھتی جارہی تھی کہ وہ کار کہاں ہے جس پر ہمیں اس مہم کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا۔

"تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچنے ہی والے ہیں" کرد ہر مرتبہ یہی جواب دیتا۔

خطرناک اور تاریک راستے پر گھوڑوں کی پشت پر سفر کرتے ہوئے ساڑھے تین گھنٹے بیت چکے تھے۔ ہم بتدریج بلندی کی طرف جارہے تھے۔ جھٹکوں سے میرا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور جسم بری طرح دکھنے لگا تھا۔

مرجانی نے بتایا تھا کہ گھوڑوں پر چار گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم ترکی کی سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ ساڑھے تین گھنٹے گزر چکے تھے لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہم پہاڑوں میں ایک ہی جگہ چکر کاٹتے پھر رہے ہوں۔ میں اپنے کرد سوار کو بار بار یہ یاد دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ ہمیں آج رات ہر حالت میں سرحد پار کرنی ہے لیکن میری باتوں کا جواب دینے کے بجائے اس نے مسلسل خاموشی اختیار کررکھی تھی۔ بالآخر ہم بلند پہاڑوں میں واقع ایک چھوٹے سے کرد گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے گھوڑے روک کر ہمیں اترنے کا حکم دیا۔

"ہم گھوڑوں کو بستی کے قریب نہیں لے جاسکتے" ایک کرد نے کہا "ہم نہیں چاہتے کہ گاؤں والے ہماری آمد سے آگاہ ہوجائیں۔"

وہ ہمارے ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگے۔ تاریکی میں ہمیں بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ یہ غالباً گیہوں کے کھیت تھے جن کے اختتام پر آبادی شروع ہوجاتی تھی۔ گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں دوڑتے ہوئے بالآخر ہم جھونپڑا نما ایک کچے مکان کے

سامنے رک گئے۔ ایک کرد نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اور وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے اندر ہو گئے۔ دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا اور ہلکی سی دستک محض اپنی آمد کی اطلاع کے لئے دی گئی تھی۔ یہ ایک وسیع کمرا تھا جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف لالٹین جل رہی تھی لیکن دھوئیں کی وجہ سے اس کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ فرش پر چٹائیاں اور گدے بچھے ہوئے تھے۔ چھ آدمی فرش پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اس کمرے کا ایک حصّہ کچن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جہاں چولھے میں آگ جل رہی تھی اور ایک عورت غالباً چائے تیار کر رہی تھی۔ ہماری طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ فرش پر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے سمٹ کر ہمارے بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ کچھ دیر بعد جب میری آنکھیں دھوئیں میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو پتا چلا کہ جھونپڑے میں چھ نہیں پندرہ سولہ افراد تھے۔ چھ تو کمرے کے وسط میں تھے اور باقی ادھر اُدھر دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

اپنے آپ کو اس صورتِ حال میں پا کر میں اپنی پوزیشن کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کن انکھیوں سے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ کرد عام طور پر طویل قامت اور سڈول جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی' بال گھنے' سبز آنکھیں' جن میں بے پناہ کشش پائی جاتی ہے۔ عورتیں ہر وقت زیورات پہنے رہتی ہیں۔ مویشیوں کے علاوہ یہ زیورات ہی دراصل ان کا کل سرمایہ ہوتے ہیں۔ کرد عام طور پر ایسے اثاثے کو ترجیح دیتے ہیں جسے آسانی سے کاندھے پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکے۔ کرد عورتیں دبلی پتلی ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو بھاری بھر کم ظاہر کرنے کے لئے وہ نیچے اوپر کئی کپڑے پہنے رہتی ہیں۔ سب سے اوپر پھولدار کپڑے کا ایپرن ضرور بندھا ہوتا ہے۔ جھونپڑے میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کا انداز دوستانہ تھا۔ پورے سفر میں پہلی مرتبہ میں نے کسی قدر طمانیت سی محسوس کی تھی۔ اس عورت نے دوسروں کے ساتھ ہمیں بھی چائے پیش کی اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ ہم باتیں کرتے رہے۔

ایک بوڑھے کرد نے ہماری صورتِ حال کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "یہ رات تم لوگوں کو اسی گاؤں میں گزارنی پڑے گی لیکن اس جھونپڑے میں تم لوگ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے آرام کر سکو گے۔ اس کے بعد تم لوگوں کو گاؤں سے باہر ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ یہاں کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ امام خمینی کے خصوصی مسلح دستے اس علاقے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس گاؤں کے بعض لوگ ان کے لئے جاسوسی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

کسی اور جگہ منتقل ہونے کی بات سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں آذربائیجان کے پہاڑی علاقوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان علاقوں میں زہریلے بچھو اور خوفناک سانپ بکثرت پائے جاتے تھے۔

"تم لوگ ہمیں باہر کھلی فضا میں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "باہر شدت کی سردی ہے اور زہریلے سانپوں کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

انہیں بھی شاید صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر وہی بوڑھا بولا۔ "مجھے یہ کہتے ہوئے شرم سی محسوس ہو رہی ہے کہ تم لوگوں کو کسی صورت میں بھی گاؤں میں نہیں رکھا جاسکتا لیکن ہم نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔ گاؤں سے باہر ہمارا ایک اصطبل خالی پڑا ہے۔ وہ جگہ تم لوگوں کے لئے ہر لحاظ سے محفوظ رہے گی۔"

ان کی یہ پیش کش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے ان کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور عورت نے کھانے کے بعد ہمیں ایک کمبل دے دیا تاکہ ہم کچھ دیر آرام کر لیں۔ اسی دوران میں' میں نے بیگ چیک کیا تو میرا پرس اور بہت سے ترکی لیرے غائب تھے۔ کمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اس نوجوان کرد سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا جس نے یہ چیزیں چرائی تھیں لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"خدا کے لئے کوئی ہنگامہ کھڑا مت کر دینا۔ صرف رقم ہی گئی ہے۔ لعنت بھیجو اس پر' بس یہ دعا مانگو کہ ہم زندہ ان کے شکنجے سے نکل جائیں۔"

بات شاید کمال کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ خاموش رہ گیا۔ ہم لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ کمال' شیری اور فرہاد فوراً ہی سو گئے لیکن میں جاگتی رہی۔ تھکن کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کن انکھیوں سے کردوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ لوگ بھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے ذہن پر عجیب سا خوف طاری تھا۔ ہم جس قسم کی صورت حال سے دوچار تھے۔ اس کے پیش نظر کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن بہرحال تھکن اور نیند خوف پر غالب آگئی اور کچھ دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں لیکن میں نیند میں بھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرتی رہی۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد انہوں نے ہمیں جگا دیا اور اس کے کچھ دیر بعد ہی وہ ہمیں جھونپڑے سے باہر لے آئے۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارے دماغوں پر نیند کا خمار طاری تھا اور ہمارے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اصطبل گاؤں سے تقریباً دو میل دور تھا اور وہ ہمیں مویشیوں کی طرح ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ جب ہم اصطبل کے قریب پہنچے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ یہ اصطبل دو حصوں پر مشتمل تھا۔

ایک حصہ تو کمرے کی طرح تھا جس میں لید اور غلاظت بھری ہوئی تھی۔ یہ کمرا غالباً ٹائلٹ کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ دوسرے حصے پر شیڈ پڑا ہوا تھا۔ فرش پر گھاس پھونس بکھری ہوئی تھی۔ ہم کمبل بچھا کر لیٹ گئے۔ نیند نے فوراً ہی ہم پر غلبہ پا لیا۔ ہم صبح آٹھ بجے تک سوتے رہے اس دوران میں دو کرد ہماری نگرانی کرتے رہے تھے۔

ہمیں اس کرد عورت نے جھنجوڑ کر جگایا جس نے گزشتہ رات جھونپڑے میں ہمیں کھانا وغیرہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو غالباً اس کی بیٹیاں تھیں۔ ان تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر ہمارے درمیان کسی قسم کے جملوں کا تبادلہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ ہمارے لئے ناشتا لے کر آئی تھیں جس میں ہمارے لئے گرم گرم چائے کے علاوہ دہی، پنیر اور روٹی شامل تھی۔

ایک تھرماس میں پانی بھی تھا لیکن یہ سن کر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ ہمیں پورا دن اس اصطبل میں گزارنا پڑے گا۔

"تم لوگوں کو اس اصطبل سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ باہر جھانکنا بھی خطرناک ہوگا۔ ان عورتوں کے ساتھ آنے والے ایک مرد نے کہا "آپس میں باتیں بھی سرگوشیوں میں کرو گے۔ اس بات کا خیال رہے کہ یہ بچہ شور نہ مچانے پائے گاؤں کے لوگ عام طور پر اس طرف نہیں آتے لیکن آوازیں سن کر انہیں شبہ ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کوئی صورت حال معلوم کرنے کے لئے اس طرف آ بھی جائے۔

"لیکن کار کہاں ہے؟ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہاں سے آگے ہم کار پر جائیں گے "میں نے اس طرح کہا جیسے میرے مطالبے پر ہمیں کار فراہم کر دی جائے گی "اگر میں نے آج ایران کی سرحد عبور نہ کی تو یقیناً پکڑی جاؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی سسرال کا خیال آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ پورا خاندان فرہاد کی تلاش میں پاگل ہو رہا ہوگا۔ ممکن ہے جمشید کے ذریعے کمال کے مکان کا پتا بھی معلوم کر لیا ہو اور انہیں معلوم ہو گیا ہو کہ مکان فروخت ہو چکا ہے۔ اس انکشاف کے بعد انہوں نے کمیٹی کو رپورٹ کی ہوگی اور کمیٹی نے ملک بھر کی چیک پوسٹوں کو میرے اور فرہاد کے بارے میں اطلاع دے دی ہوگی۔ ہر جگہ ہماری تلاش ہو رہی ہوگی جبکہ اصولی طور پر ہمیں اس وقت تک سرحد عبور کر لینا چاہئے تھی۔

"گھبراؤ نہیں "کرد نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "وہ لوگ تمہیں یہاں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ سرحد اب زیادہ دور نہیں ہے لیکن ہم شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکتے۔"

مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنے کے باوجود میں اس سے کوئی مفید معلومات حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اصطبل میں کسی نہ کسی طرح وقت گزارا جائے۔ شیری نے بیگ میں سے کیمرا نکال کر ان تینوں عورتوں کی تصویریں بھی کھینچی تھیں۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ان عورتوں کی تصویریں اتاری گئی تھیں اور وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھار ہم دروازوں کے تختوں کی جھریوں سے باہر جھانک لیتے۔ آسمان صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی۔ تاحد نظر سبزے پر کھلے ہوئے رنگ برنگے جنگلی پھول بڑا دلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان مرغزاروں میں دوڑتی پھروں لیکن میں قیدی تھی۔ اصطبل سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی۔

○☆○

دن بھر میں کئی کرد ہمارے محافظ اسمگلروں سے ملنے کے لئے آتے رہے تھے۔ وہ اپنی ہی زبان میں باتیں کرتے رہے تھے۔ تاہم ایک آدمی بہت دیر تک ترکی زبان میں مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ کمال چونکہ ترکی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے ہوئے بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ وہ یہاں سے روانگی میں تاخیر پر مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ فرہاد کی حالت اس سے قدرے مختلف تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھا پوری دلچسپی سے ہماری باتیں سنتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کبھی میرے چہرے کو دیکھنے لگتا اور کبھی اس نوجوان کرد کو جو مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ نوجوان کرد فرش پر بیٹھا امام خمینی کے گشتی دستوں سے اپنے معرکوں کے قصے سنا رہا تھا کہ ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کمیٹی والے گاؤں میں آئے ہیں اور تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں" وہ اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

نوجوان کرد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ گاؤں والے خوراک کے معاملے میں ایرانی حکومت کے محتاج ہیں۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لئے کوپن دیے جاتے ہیں لیکن کوپن حاصل کرنے کے لئے کمیٹی کے مقامی اہل کاروں کو پیدائش کا سرٹیفکیٹ دکھانا ضروری ہے۔

"برتھ سرٹیفکیٹ وہ ہم پر نگاہ رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں چونکہ خوراک کی ضرورت ہے، میں نے اپنا کارڈ اپنے والدین کو دے رکھا ہے لیکن کمیٹی والوں کا کہنا ہے کہ میں اب جوان ہو چکا ہوں۔ ایران کی فوج میں بھرتی ہو کر عراق کے خلاف جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتا"

وہ غالباً کمیٹی والوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ دن ہمارے ساتھ اصطبل میں ہی گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور عورت کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک بار

پھر تیز ہو گئی اگر کمیٹی والے اس کی تلاش میں ادھر آ گئے تو اس کے ساتھ ہمارا پکڑا جانا بھی یقینی تھا۔ ہم اتنی مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک اس لئے نہیں پہنچے تھے کہ کسی اور کی وجہ سے پکڑے جائیں۔ ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمیٹی کے اہل کار تقریباً چار گھنٹے تک گاؤں کے گھروں کی تلاشی لیتے رہے۔ اس دوران میں ہماری جان پر بنی رہی لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ اصطبل کی طرف نہیں آئے، اگر وہ اس طرف کا رخ کر لیتے تو ہم میں سے کسی کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ بالآخر اسی عورت نے آکر بتایا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں۔

وعدے کے عین مطابق شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ کرد اصطبل پہنچ گئے جن سے گزشتہ رات جھونپڑے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمیں اصطبل سے نکال کر اس جگہ لے گئے جہاں گھوڑے ہمارے منتظر تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ ہم ہلکے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر چند بوڑھے کردوں نے اپنے بھاری کوٹ اتار کر ہماری طرف اچھال دیے۔ بھیڑ کی کھال سے بنے ہوئے یہ کوٹ پہنتے ہی ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمیں وہاں سے روانہ ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم چند منٹ میں ہی پانی میں شرابور ہو گئے اور پناہ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ یہ پگڈنڈی بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی جس کی وجہ سے جلد ہی ہمارے سانس پھول گئے۔ شیری ہم سے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی ہمارے ساتھ ملنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بالآخر آدھے گھنٹے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں گھوڑے ہمارے منتظر تھے۔

تین گھوڑے اور تین آدمی ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ پہلے کی طرح ایک سوار نے مجھے اور فرہاد کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ فرہاد گھوڑے کی گردن پر تھا اور میں پیچھے تھی۔ ہمارے گھوڑے پر بیگ بھی لدے ہوئے تھے جن سے میری ٹانگیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

گھوڑے تیزی سے دوڑنے لگے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ گھوڑے یا سوار گہری تاریکی میں راستہ کس طرح دیکھ رہے تھے۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ تاریکی میں راستے کو دیکھنے کے بجائے اسے محسوس کر رہے تھے۔ ہمارے لئے یہ سفر کسی بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ مسلسل جھٹکے لگنے کی وجہ سے فرہاد خاصی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ وہ بار بار چیخ رہا تھا کہ اسے گھوڑے سے اتار دیا جائے۔

"اسے خاموش کراؤ" میرے گھوڑے کے کرد سوار نے غراتے ہوئے کہا "رات کے سناٹے میں آواز دور دور تک پہنچتی ہے۔ تم نے اسے خاموش نہ کرایا تو میں...."

اس کی دھمکی آمیز لہجے سے میں کانپ کر رہ گئی۔ میں اگرچہ خود خاصی تکلیف محسوس کر رہی تھی لیکن فرہاد کو خاموش کرانے کے لئے اسے تسلیاں دینے لگی۔

تاریکی میں وقتاً فوقتاً کمال کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے سوار سے بار بار کہہ رہا تھا "رک جاؤ۔ میرا سر پھٹ جائے گا.... میں تکلیف سے مرا جا رہا ہوں... میری ٹانگیں سُن ہو گئی ہیں.... خدا کے لئے مجھے اتار دو۔"

شیری اگرچہ خاموش تھی لیکن میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ تکلیف میں ہو گی۔ ساٹھ سال کی عمر کی ایک عورت کے لئے اس طرح گھوڑے پر سفر کرنا عذاب سے کم نہیں تھا۔

"ہم رک نہیں سکتے' خاموشی سے بیٹھے رہو" ہر کرد کا جواب یہی تھا۔ میں جب کار کے بارے میں استفسار کرتی تو گھوڑے کا سوار بھی ایک ہی جواب دیتا "کار زیادہ دور نہیں' صرف چند منٹ کی بات ہے۔"

ایک موقع پر گھوڑے نے اپنے سر کو پوری قوت سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ فرہاد کی ناک پر چوٹ لگی.... وہ تکلیف کی شدت سے بُری طرح چیخنے لگا۔ کرد اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے غرایا "میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ' ورنہ اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔"

"فرہاد پلیز!" میں نے پیار سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہم جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

کرد کی دھمکی سے فرہاد اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ دوبارہ اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی لیکن اس کی دبی دبی سسکیاں اور ہچکیاں راستے بھر میری سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ رات کے ڈیڑھ بجے ہم ایک جگہ رک گئے جہاں پانچ کرد چھ گھوڑوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ گھوڑوں اور ان کردوں کے صرف ہیولے ہی نظر آ رہے تھے۔ ان کردوں نے سروں پر بندھے ہوئے رومال چہروں پر بھی اس طرح لپیٹ رکھے تھے کہ صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔

اب تم لوگ ان کے ساتھ جاؤ گے "میرے گھوڑے کے سوار نے کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کار کہاں ہے؟" میرے لہجے میں کسی قدر تیزی تھی۔

"اس کے لئے تھوڑا اور آگے جانا پڑے گا" اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے اٹھا کر دوسرے گھوڑے پر منتقل کر دیا۔

اس مرتبہ گھوڑوں کی تعداد خاصی تھی۔ مجھے' فرہاد اور شیری کو تو دوسرے سواروں نے اپنے گھوڑوں پر بٹھا لیا' البتہ کمال کو ایک گھوڑا دے دیا گیا لیکن کمال نے کبھی گھڑ سواری نہیں کی تھی۔ وہ ویسے ہی سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا اور

بار بار ٹانگوں کے سن ہونے کی شکایت بھی کر رہا تھا لیکن کردوں نے اس کی ایک نہ سنی۔

"ہمیں اس کا خیال رکھنا پڑے گا' کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے" شیری نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ فرار کا منصوبہ میں نے بنایا تھا اور رابطہ بھی میں نے ہی تلاش کیا تھا۔ اس وقت ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ ہمیں راستے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی لیکن اب میری وجہ سے ساری زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ شیری اور میں گھوڑوں سے اتر آئیں اور سر سے پیر تک کمال کے جسم کی مالش کرنے لگیں تاکہ اس میں حرارت پیدا ہو سکے۔ کمال کی فکر میں' میں فرہاد کو بھی بھول گئی تھی حالانکہ اس کی ناک پر چوٹ لگی تھی۔ وہ راستے بھر سسکیاں بھرتا آیا تھا۔ کرد خاصے بے چین ہو رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے ہمیں گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دے دیا لیکن کمال اکیلا گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور چیخ کر بولا "میں نہیں جاؤں گا' تم لوگ چلے جاؤ... مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

کرد چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر دو کردوں نے اسے اٹھا کر گھوڑے پر لاد دیا اور گھوڑے کو ہانک دیا۔

"وہ ہمارا بہترین گھوڑا ہے" میرے سوار نے کہا "ہم کسی دوسرے آدمی کو اس گھوڑے پر بٹھانے کا رسک نہیں لے سکتے۔ اس طرح گھوڑے کی ٹانگیں دہری ہو جائیں گی۔"

میں نے انہیں پیش کش کی کہ وہ جتنی رقم چاہیں مجھ سے لے لیں اور کسی دوسرے سوار کو بھی اس کے ساتھ بٹھا دیں لیکن انہوں نے میری یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ ہمارا راستہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم گھوڑوں پر اس پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے جا رہے ہوں۔ وہ ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی جو بعض اوقات درے کی شکل اختیار کر لیتی اور بعض اوقات اس کے ایک طرف تاریک کھڈ نظر آتے۔ کسی بھی گھوڑے کی معمولی سی لغزش ہم میں سے کم از کم دو آدمیوں کے چراغ گل کر سکتی تھی۔ مجھے زیادہ فکر کمال کی تھی لیکن غنیمت تھا کہ اس کی طرف سے فی الحال کوئی پریشانی سامنے نہیں آئی تھی۔ کئی مرتبہ ہمیں تند رو ندیوں میں سے گزرنا پڑا تھا۔ ہمارے لباس پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور سردی کی شدت سے ہڈیوں کا گودا تک منجمد ہوا جا رہا تھا۔

راستہ مزید خطرناک ہو گیا تھا۔ سوار تو رکابوں میں پیر پھنسائے بیٹھے تھے لیکن ہم جھٹکوں سے بری طرح جھول رہے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے کوئی بھی نیچے گر سکتا تھا۔ میں اپنے سوار کو مجبور کرنے لگی کہ فرہاد کو بھی اپنے گھوڑے پر منتقل کر لیا جائے تاکہ اگر ہم کبھی گریں بھی تو میں کم از کم اسے سنبھالنے کی کوشش تو کر سکوں۔ میرے مسلسل اصرار سے تنگ آ کر میرے سوار نے اپنا گھوڑا اس گھوڑے کے قریب کر لیا جس پر فرہاد بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گھوڑا روکے بغیر فرہاد کو دوسرے گھوڑے سے اٹھا کر اپنے گھوڑے کی گردن پر بٹھا لیا۔

یہ میری زندگی کا خوفناک ترین سفر تھا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ یخ بستہ ہوا خنجر کی طرح ہمارے کپڑوں کو چیرتی ہوئی جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جب بھی بادلوں میں سے ستارے جھانکنے لگتے تو ان کی نہایت مدھم روشنی میں مجھے کمال کی طرف دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ ایک موقع پر تو میں اسے دیکھ کر سرتاپا کانپ اٹھی۔ وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور گھوڑے کو لگنے والی کوئی ٹھوکر یا معمولی سا کوئی جھٹکا اسے موت کی نیند سلا سکتا تھا۔

میں نے اسے آواز دی تو اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ خوش قسمتی سے اس کا گھوڑا سدھایا ہوا تھا اور وہ بڑی شرافت سے آگے والے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شیری اور میں نے اپنی چادریں گاؤں میں ایک عورت کو تحفے میں دے دی تھیں لیکن اب سردی کی وجہ سے ہمیں بڑی شدت سے ان چادروں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے خیال میں زاگرس کی بلندیوں پر اس سرد ترین رات میں وہ چادریں بھی ہمیں سردی سے نہ بچا سکتی تھیں۔

تنگ سے راستے کے دونوں طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ اگرچہ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ راستے پر پتھر بکھرے ہوئے تھے جس سے گھوڑوں کو ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ میں کرد سوار کے ساتھ چپکی ہوئی بیٹھی تھی اور اسے سختی سے اپنی باہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا تاکہ اگر گروں تو وہ بھی گھوڑے کی پشت پر نہ رہ سکے۔ اس نازک ترین صورتِ حال میں جب ہر شخص کی تمام تر توجہ زندگی بچانے پر مرکوز تھی' میرے گھوڑا سوار نے بڑی بے تکلفی سے میری ٹانگ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ نوکیلے دانتوں سے اس کی گردن ادھیڑ ڈالوں مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ میں اسے اس کی حرکت سے باز رکھنے کی جرات نہیں کر سکی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ اس طرح وہ مجھے اور فرہاد کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے البتہ وہ جب بھی ایسی حرکت کرتا میں آرام سے اس کا ہاتھ اپنی ٹانگ سے ہٹا دیتی۔

ایک موقعے پر انہوں نے گھوڑے روک لئے۔ نشیب میں بہت دور کسی چھوٹی سی بستی کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ تین کرد گھوڑے سوار اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے اور ہم دو کردوں کے ساتھ وہیں رہ گئے لیکن چند منٹ بعد ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا ان دونوں کردوں نے اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار نہیں کیا

تھا۔

کئی گھنٹوں کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے پھر چند منٹ بعد ہی چند گھوڑے سوار تاریکی میں کسی طرف سے نمودار ہو کر اچانک سامنے آگئے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل ایک بار پھر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ ان کے چہرے بھی پوری طرح چھپے ہوئے تھے۔ وہ چند منٹ تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر جس طرح اچانک نمودار ہوئے تھے اسی طرح اچانک ہی تاریکی میں غائب ہوگئے۔ یہ لوگ غالباً اس طرح ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہمیں ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ہمارے گائیڈ کون تھے۔ ہم ایسے لوگوں کے ساتھ سفر کررہے تھے کہ جن کے کوئی چہرے نہیں تھے اور اگر کبھی وہ کھلے چہروں کے ساتھ ہمارے سامنے آبھی جائیں تو ہم انہیں شناخت نہیں کرسکتے تھے۔

میرا گھوڑے سوار غالباً میری کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اس نے ان پراسرار لوگوں کی آمد و رفت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ دو ایرانیوں کو سرحد پار چھوڑ کر آئے ہیں۔ جانا تو ہم سب کو اکٹھے ہی تھا لیکن ہم دو گھنٹے لیٹ ہوگئے اور وہ ہم سے آگے نکل گئے۔"

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ زیادہ دشوار گزار اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ تیز رو ندیاں عبور کرنے کے لئے ہمیں گھوڑوں سے اترنا پڑا تھا۔ ہماری پتلونیں کیچڑ میں لتھڑ گئی تھیں۔ میں وقتاً فوقتاً فرہاد، شیری اور کمال کے نام پکار کر ان کی خیریت دریافت کرلیتی۔ وہ تاریکی میں مجھے نظر تو نہیں آرہے تھے لیکن ان کی آواز سن کر میری تسلی ہوجاتی۔ ہم صرف سرگوشیوں ہی میں ایک دوسرے سے بات کرسکتے تھے۔ ہمیں اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم رات بھر سفر کرتے رہے۔ صبح ساڑھے چھ بجے جب افق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ہمارے چاروں طرف برف کی تہیں بچھی ہوئی تھیں۔ دفعتاً ان لوگوں نے گھوڑے روک لئے اور ان میں سے ایک نے چیختے ہوئے کہا "پہنچ گئے۔ ہم ترکی کی سرحد پر پہنچ گئے۔"

میں نے ایک بار پھر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ میں نے گھوڑے پر جس کرد کے ساتھ سفر شروع کیا تھا یہ وہ نہیں تھا جس پر میں اس وقت سوار تھی۔ یعنی نہ تو گھوڑا وہ تھا اور نہ ہی سوار۔ کمال بھی اپنے گھوڑے پر نہیں تھا اس نے آخری آدھے گھنٹے کا راستہ پیدل ہی طے کیا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرا گھوڑا اور سوار کب تبدیل ہوئے تھے۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ راستے میں کئی جگہ ندیاں وغیرہ عبور کرنے کے لئے ہمیں گھوڑے سے اتارا گیا تھا اور غالباً یہ تبدیلیاں ایسے ہی موقعوں پر رونما ہوتی رہی تھیں۔ ہم خوف زدہ تو تھے ہی، حواس بھی پوری طرح کام نہیں کررہے تھے۔ وہ کم بخت ہمارے خوف، بدحواسی اور تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باری باری میرے جسم کے لمس سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ اس کرد کی آواز سن کر میں نے گھوڑے سے چھلانگ لگادی اور فرہاد کو بھی اتار کر اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور پاگلوں کی طرح اس کی پیشانی پر بوسے دینے لگی۔

"ہم آزاد ہیں فرہاد.... ! ہم ایران سے نکل آئے ہیں۔ اب تمہیں بھی دادی اور پھوپھیوں کی ڈانٹ نہیں سننی پڑے گی۔ ہم کسی بھی ملک میں آزاد زندگی گزار سکیں گے۔ اب کوئی مجھے گرفتار کرنے نہیں آئے گا۔"

ہم دو دن اور دو راتوں سے یہ جان لیوا سفر کررہے تھے اور اس دوران میں فرہاد نے ایک مرتبہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں لیکن اب اس نے زبان کھولی تو پہلا سوال یہ کیا "اس کا مطلب ہے ممی! کہ اب میں ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہوں گا اور مجھے پھوپھیوں اور چچا کے گھر نہیں بھیجا جائے گا۔"

"نہیں بیٹے!" میں نے کہا "کبھی نہیں، پہلے ہم یورپ جائیں گے اور پھر امریکا چلے جائیں گے۔ یاد ہے، میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟ ڈزنی لینڈ کی سیر کریں گے اور کینیڈا اور امریکا میں اپنے تمام رشتے داروں سے ملنے کے لئے جائیں گے۔"

برف سے ڈھکی ویران پہاڑی چوٹی پر کھڑے یہ باتیں کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، لیکن میں خوشی سے بے قابو ہوئی جارہی تھی۔ آزدی، آزاد ہوگئی تھی۔ اب نہ تو اسے امام خمینی کا خوف رہا تھا، نہ اس کی کمیٹی کا اور نہ ہی حجت الاسلام طباطبائی کا۔

میں نے ایک بار پھر صورت حال کا جائزہ لیا۔ ہمارے ساتھ دو ترکی کرد تھے۔ لمبے تڑنگے، کسرتی جسم کے مالک۔ ان کی سبزی مائل آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ بھوک، پیاس اور تھکن سے ہماری بری حالت ہورہی تھی۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح سرحد کے قریب پہنچا تو دیا گیا تھا لیکن میرے خیال میں کٹھن ترین مرحلہ ابھی باقی تھا۔ ہم سے کار کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن ان برف پوش پہاڑوں میں کسی سڑک کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس لئے کسی کار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میلوں دور تک کسی سڑک یا آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہمارے سامنے تاحدِ نگاہ ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی پر تھے اور اب ہمیں دوسری طرف اترنا تھا۔

☆☆☆

یہ ہمارے سفر کا خطرناک ترین مرحلہ تھا۔ ہمارے سامنے ڈھلوان راستے پر اس قدر پھسلن تھی کہ پیر جمانا مشکل ہورہا تھا ہم پیدل آگے بڑھنے لگے۔ وہ ترکی کرد جو عمر میں اپنے ساتھی سے بڑا تھا، ہم سے آگے تھا لیکن چند قدم ہی چلنے کے بعد کیچڑ میں اس کا پیر پھسلا اور وہ کئی گز تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ تو اس کی خوش

قسمتی تھی کہ وہ ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر رک گیا تھا ورنہ کھڈ میں جا گرتا اور اس کی ہڈیوں کا بھی پتا نہ چلتا۔ ہم اس خطرناک راستے پر پیروں پر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ کیچڑ میں بیٹھ گئے اور تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی طرح پھسل پھسل کر ڈھلان پر اترتے رہے۔ دفعتاً اپنے عقب میں شیری کی چیخ سن کر رک گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو شیری چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ رہی تھی "ختم ہو گیا۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔۔۔ اب میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا" وہ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میں ایک لمحے کو سن سی ہو کر رہ گئی، پھر آہستہ آہستہ پتھروں کا سہارا لیتی ہوئی دوبارا اوپر چڑھنے لگی۔ شیری بدستور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ رہی تھی۔ میں بڑی مشکل سے شیری سے اس طرح سر پیٹنے کی وجہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اس نے اپنی تمام نقدی اور قیمتی چیزیں کالے رنگ کے ایک بیگ میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بیگ اس نے ایک لمحے کو بھی اپنے سے جدا نہیں کیا تھا لیکن راستے میں کسی طرح بیگ کی زپ کھل گئی اور اس میں رکھا ہوا پرس کہیں گر گیا تھا۔ جس میں پاسپورٹ، دنیا بھر میں سفر کرنے کا ہوائی ٹکٹ اور پچیس ہزار ڈالر مالیت کی غیر ملکی کرنسی تھی۔ اس سفر میں یہی اس کا کل سرمایا تھا جو بدقسمتی سے کھو گیا تھا۔ اب اس کے پاس وہ تھوڑی بہت جیولری رہ گئی تھی جو بڑی احتیاط سے اسکرٹ کے بارڈر میں چھپا کر سلائی کر دی گئی تھی۔

"پاسپورٹ کے بغیر میں کہاں جا سکتی ہوں؟" اس نے روتے ہوئے کہا "مجھے یہیں چھوڑ دو تم لوگ جاؤ۔"

"احمق نہ بنو" نوجوان ترکی کرد نے کہا "ہم سرحد کے بالکل قریب ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا خطرے سے خالی نہ ہو گا، اگر ہم یہاں دیکھ لئے گئے تو کسی وارننگ کے بغیر گولی سے اڑا دیے جائیں گے۔"

میں شیری کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتی رہی کہ ترکی پہنچنے کے بعد ہم آپس میں مل ملا کر اس کا یہ مسئلہ حل کر دیں گے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بالآخر ایک کرد نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ واپس جا کر اس کا پرس تلاش کرلائے گا۔

"یہاں سے کچھ آگے سرحد کے قریب تازہ دم گھوڑے ہمارے منتظر ہیں۔ میں وہاں سے ایک گھوڑا لے کر تمہارے پرس کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا پرس مل جائے گا۔ اب یہاں رکنے کے بجائے آگے بڑھتی رہو۔"

اس امید افزا وعدے پر شیری ہمارے ساتھ آگے جانے پر آمادہ ہو گئی اور ہم ایک بار پھر بچوں کی طرح بیٹھ کر کیچڑ کی ڈھلان پر پھسلنے لگے۔ پھسلنے کا یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا اور بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ نوجوان کرد ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہو کر شیری کے پرس کی تلاش میں واپس چلا گیا جبکہ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ کمال کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہا ہو۔ فرہاد کی حالت بھی بہتر نہیں تھی لیکن وہ ارد گرد کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا اپنا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ ہر قدم اٹھاتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے یہ میرا آخری قدم ہو گا، اور شیری، اس میں اب وہ پہلے کی سی تیزی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک کرد کا دیا ہوا کمبل اوڑھے جھکی ہوئی چل رہی تھی۔ اس کے جوتوں کی ایڑیاں ٹوٹ چکی تھیں اور لباس کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسے تو مجھے شروع ہی سے امام خمینی سے نفرت رہی تھی لیکن اس وقت یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ امام خمینی ہی کی وجہ سے ہم پر یہ ساری مصیبتیں نازل ہوئی تھیں۔ صرف ہم ہی نہیں، ایران کا ہر شخص ان کے دیے ہوئے عذاب میں مبتلا تھا۔ اس شخص نے ایک ہنستے بستے ملک کو یوں ویران کر دیا تھا جیسے جن پھر گیا ہو۔ اب وہاں آسیبوں نے ڈیرے جما لئے تھے۔ ہر ذی ہوش شخص اس آسیب زدہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم تقریباً دو گھنٹوں تک خاموشی سے چلتے رہے، پھر دفعتاً فضا میں شیری کی نرم سی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں اسکول کے بچوں کا مقبول گیت گنگنا رہی تھی "تم کہاں سے آرہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ اپنی منزل پر کیسے پہنچو گے؟" مجھے شیری پر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی ہمت قابل داد تھی۔ یہ عمر آرام کرنے کی ہوتی ہے لیکن وہ برف پوش پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ وہ اپنے تمام اثاثے سے محروم ہو چکی تھی اور جلاوطنی کی زندگی گزارنے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے کوئی مستقبل نہیں تھا لیکن اس کی زندہ دلی قائم تھی لیکن اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ اس گیت کا ایک ہی مصرعہ بار بار دہرائے جا رہی تھی جیسے اس سے آگے کچھ یاد نہ رہا ہو۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ کرد نوجوان واپس آگیا جو شیری کے پرس کی تلاش میں گیا تھا۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے چیخ کر کہا "مجھے اس بڑھیا کا پرس نہیں ملا۔ شاید کسی کھڈ میں گر گیا ہو گا۔۔۔ تم لوگ چلتے رہو، میں آگے جا رہا ہوں تاکہ اگلی پارٹی کو بتا دوں کہ تمہارے لئے کار تیار رکھی جائے۔"

شیری اور میں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا "یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے میرا پرس مل گیا ہے۔ یہ اسے کہیں چھپا آیا ہے یا آگے جا کر کسی محفوظ جگہ پر چھپانا چاہتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتی تھی کہ شیری کا خیال درست تھا لیکن ظاہر ہے میں یا کوئی اور اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، اگر ہم ان کردوں پر شیری کے پرس کی واپسی

کے لئے کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے تو اندیشہ تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر غائب ہو جاتے اور ہم اس برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتے رہ جاتے۔ جس کا نتیجہ اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہ نکلتا۔

کچھ دیر بعد ہم ایک مختصر سے پتھریلے میدان میں پہنچ گئے۔ نیچے بہت دور نشیب میں ایک چھوٹی سی بستی نظر آ رہی تھی۔

"یہیں رک جاؤ" کرد نے کہا "کار یہیں آئے گی" یہاں سے دو ایرانی بھی تمہارے ساتھ سفر میں شامل ہو جائیں گے۔"

"کار یہاں آئے گی؟ کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی پر ہیں۔ کوئی چھوٹی سی پگڈنڈی بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ کار یہاں تک کیسے آئے گی؟"

"کار یہیں آئے گی" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اپنا سامان میرے حوالے کر دو تاکہ اسے کہیں چھپا دیا جائے اور تم لوگ زمین پر لیٹ جاؤ تاکہ نیچے گاؤں والے تمہیں نہ دیکھ سکیں۔"

اس وقت صبح کے نو بج چکے تھے۔ نشیب میں واقع گاؤں میں اور اس کے آس پاس نقل و حرکت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان، بھیڑ بکریوں کے گلوں کو ہانکتے ہوئے چرواہے اور بستی کے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ آسمان پر سورج چمک رہا تھا لیکن ہوا میں خنجر کی سی کاٹ ابھی تک برقرار تھی۔ ہم سردی سے بچنے کے لئے ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھ گئے۔ پرانا سا پھٹا ہوا کمبل ہم نے اوپر اوڑھ لیا تھا تاکہ تیز ہوا سے کچھ تو بچاؤ ہو سکے۔ کرد ہم سے کچھ دور بیٹھا گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میں کسی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھی، اس لئے سامان ہم نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد کرد نے ہمیں وہاں سے اٹھا دیا اور ہم دوسری طرف ایک ایسی جگہ پر آ گئے جہاں ہمارے سامنے چٹان کی ایک قدرتی دیوار سی اٹھی ہوئی تھی۔ یہاں سے وادی کا دوسری طرف کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ ہم نے بارش سے بچنے کے لئے کمبل اوڑھ لیا لیکن ظاہر ہے یہ پھٹا پرانا سا کمبل بارش سے بچانے میں ہماری کیا مدد کر سکتا تھا۔ لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ ہم بارش میں بھیگتے رہے، چار گھنٹے گزر گئے۔ بالآخر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

"سنو مسٹر! میں نے کرد گائیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سردی، بھوک، پیاس اور تھکن سے ہماری بری حالت ہو رہی تھی۔ پچھلے تین دنوں میں ہم ایک گھنٹا بھی نہیں سو سکے۔ اٹھارہ گھنٹوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ گاؤں میں کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر بھی ہم کار کا انتظار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں" کرد گائیڈ چیخا "ہم اسمگلر ہیں اور گاؤں میں جانا ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ یہیں بیٹھ کر انتظار کرو کار آنے ہی والی ہو گی" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا "میرا دوسرا ساتھی آ جائے تو اسے پانی لینے بھیج دوں گا۔"

دوسرا کرد تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس نے اتنی دیر تک غائب رہنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ نہ ہی اس نے کار کے بارے میں کچھ بتایا۔ اپنے ساتھی کے کہنے پر وہ پانی لینے چلا گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ پہلے ان دونوں کردوں نے پانی پیا، پھر المونیم کا گندہ سا جگ میری طرف بڑھا دیا۔ عام حالات میں، میں ایسے برتن میں اپنی بلی کو بھی پانی پلانا پسند نہ کرتی لیکن مجھے اس وقت ذرا سی بھی کراہیت محسوس نہیں ہوئی۔ پیاس کی شدت سے میرے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے برتن ہونٹوں سے لگا لیا۔ پہلا گھونٹ میرے اندر سنسنی کی ایک لہر سی دوڑاتا چلا گیا۔ میں پانی پیتی چلی گئی لیکن میری پیاس نہیں بجھی۔ اب میرا یہ شبہ یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ کار کے سلسلے میں ہم سے اب تک جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کسی کار کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم ہو گئی بادل چھٹ گئے اور آسمان پر سورج چمکنے لگا۔ میں نے فرہاد کے موزے اتار کر سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دئے۔ شیری اور کمال کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے موزے اتار کر سکھا لیں لیکن وہ دونوں اس قدر نڈھال ہو رہے تھے کہ اپنے طور پر کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ کچھ دیر بعد فرہاد اور کمال سو گئے۔ میں اور شیری جاگتی رہیں۔ میں بار بار فرہاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سوتے میں وہ کپکپا رہا تھا۔ میں اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا یا اس کی یہ کیفیت خوف کی وجہ سے تھی۔ اس کی پیشانی اور چہرے پر پسینہ ابھر آیا اور اس طرح کروٹیں لینے لگا جیسے تکلیف محسوس کر رہا ہو پھر اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں وحشیانہ انداز میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن لگتا تھا کہ جیسے آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ کچھ دیکھ نہ رہا ہو پھر دفعتاً وہ رونے لگا۔

میں گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گا... مجھے گھوڑے پر مت بٹھائیں... میں نہیں جاؤں گا... مجھے یہیں چھوڑ دیں" وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ اس کے چیخنے کی آواز پہاڑوں میں بازگشت سی پیدا کر رہی تھی۔ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ نیند میں تھا۔ دونوں کرد خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں فرہاد کو جھنجھوڑ کر نہیں جگا سکتی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر گیلا کپڑا پھیرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "فرہاد... میرے بیٹے...! تم گھوڑے پر نہیں ہو۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہو۔ اٹھو، دیکھو تم میرے پاس ہو..."

"میرے خیال میں اسے سویا رہنے دو" شیری نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا "یہ بہت زیادہ تھک چکا ہے۔ تھوڑی بہت نیند لے لے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم دونوں فرہاد کو تھپکتی رہیں۔ فرہاد کچھ دیر تک سسکیاں بھرتا رہا اور پھر گہری نیند سو گیا۔

○☆○

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے خوف میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آدھا دن انتظار میں گزر گیا تھا اور اب دوپہر ہو گئی تھی۔ خوف کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات جنم لے رہے تھے۔ یہ لوگ ہمیں یہاں کیوں روکے ہوئے تھے؟ کیا یہ لوگ شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ ہمیں قتل کر کے ہمارا سامان لے کر بھاگ جائیں؟ اب جبکہ دھوپ پوری طرح چمک رہی تھی' نشیب میں ایک سڑک دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ لوگ ہمیں وہاں کیوں نہیں لے جا رہے تھے؟ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شام کا اندھیرا پھیل جائے گا اور میں سوچ رہی تھی کہ نقطۂ انجماد سے نیچے درجۂ حرارت میں اس کھلی جگہ ہمارے لئے رات گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ بھوک سے ہماری قوت برداشت جواب دے رہی تھی' اگر ہم شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے سڑک پر پہنچ جائیں تو بچنے کی کوئی امید ہو سکتی تھی۔

اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے ان دونوں کردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر تم لوگ ہمیں نیچے نہیں لے جا رہے ہو تو ہم خود جا رہے ہیں۔ ہم یہاں مزید انتظار نہیں کر سکتے۔"

ہمارے تیور دیکھ کر دونوں کرد محتاط ہو گئے۔ کمال نے بھی پہلی مرتبہ انہیں آنکھیں دکھانے کی کوشش کی۔ دونوں کردوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان کا لیڈر چیختے ہوئے بولا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ابھی چلتے ہیں۔"

اس نے ہمارے بیگ اٹھا کر گھوڑوں کی پشت پر باندھنے شروع کر دیے۔ جس وقت ہم روانگی کی تیاری کر رہے تھے' آسمان دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ گاؤں کے قریب کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور چرواہے بھی گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے گائیڈ دونوں کرد ایک بار پھر کچھ نروس سے ہو گئے تھے۔

"اس طرف سے ہم نیچے نہیں جا سکتے" لیڈر نے کہا "ہمیں دوبارا کچھ اوپر جانا ہو گا۔ وہاں ایک پہاڑی غار ہے۔ ہمیں کچھ دیر تک اس غار میں رک کر انتظار کرنا پڑے گا تاکہ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ اس کے بعد ہی ہم نیچے اتریں گے۔"

غار اس قدر چھوٹا تھا کہ ہم لوگ بمشکل اس میں سما سکے تھے۔ شیری نے مجھے کمال کی طرف متوجہ کیا جو بری طرح کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ایک بار پھر اس کی مالش کرنے لگیں۔ وہ اس بری طرح کپکپا رہا تھا کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ غار میں کچھ لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں کمال کی جیب سے لائٹر نکال کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن لکڑیاں گیلی تھیں۔

میں نے ان دونوں کردوں کی طرف دیکھا جو غار سے باہر ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمال اور فرہاد کی حالت دیکھ کر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں غار سے نکل کر بارش میں بھیگتی ہوئی ان کردوں کے سامنے پہنچ گئی اور چیخ چیخ کر انہیں برا بھلا کہنے لگی جو ہمیں مرنے کے لئے یہاں لے آئے تھے۔ میرے چیخنے کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر پوری وادی میں بازگشت سی پیدا کر رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ گاؤں والے تمہاری آواز سن لیں گے" لیڈر نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے' ہم سردی سے مر رہے ہیں' اب ہم ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتے۔ ہم جا رہے ہیں" میں نے چیختے ہوئے جواب دیا۔

اس مرتبہ انہیں سنجیدگی سے صورتِ حال کا جائزہ لینا پڑا تھا کیونکہ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم پہاڑ سے اتر رہے تھے۔ ڈھلان خاصی خطرناک تھی۔ موسلا دھار بارش میں پہاڑ سے اترنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بار بار پیر پھسل رہے تھے لیکن ہم کسی نہ کسی طرح نیچے اترنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر وادی میں اس کچی سڑک پر پہنچ گئے۔ جس پر کوئی کار آسانی سے چل سکتی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا مگر کسی کار کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

"پروگرام کے مطابق کار کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی" کرد لیڈر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اگر تم لوگ دو ہزار ڈالر ادا کر دو تو میں کسی اور کار کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا "ہم معاوضے کی پوری رقم پہلے ہی ادا کر چکے ہیں ایگریمنٹ کے مطابق ہمیں استنبول تک کار پر بھیجا جانا تھا۔ اب تم مزید رقم کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو؟"

"میں ایگریمنٹ کو نہیں جانتا" کرد نے تلخ لہجے میں جواب دیا "اگر تم لوگوں کو کار چاہئے تو اس کے لئے مزید دو ہزار ڈالر ادا کرنا پڑیں گے۔"

پہاڑ سے اترتے ہوئے اس کرد نے ہمیں بتایا تھا کہ اگر کار سے سفر کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں ایک بڑے

قصبے تک پہنچ سکتے ہیں۔ عام حالات میں یہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ فرہاد اور کمال کی حالت کے پیش نظر ہم چند فرلانگ کا فاصلہ بھی پیدل طے نہیں کر سکتے تھے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ مجھے رقم کا مطالبہ پورا کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے رقم کم کرانے کے لئے کردوں سے بحث شروع کر دی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ وہ اپنے مطالبے کی رقم میں ایک پنس کم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بالآخر طویل بحث کے بعد لیڈر نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہاں دو ایرانی بھی منتظر ہوں گے۔ انہیں بھی ہم سے کچھ پہلے تہران سے اسمگل کر کے لایا گیا تھا۔ ان سے بات کی جائے تو ممکن ہے وہ آدھی رقم کا بوجھ برداشت کرنے کو تیار ہو جائیں

ہم گاؤں سے پہلو بچاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہمارے سامنے وسیع پتھریلا میدان پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑوں کو بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ شیری ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ میں شیری کا نام لے کر بار بار آوازیں دینے لگی لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر طرح طرح کے شبہات جنم لینے لگے۔ کیا شیری کہیں گھوڑے سے گر گئی تھی؟ یا ان کردوں نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی سازش شروع کر دی تھی، تاکہ باری باری ہم سے نجات حاصل کر لی جائے؟ میں ایک بار پھر شیری کو آوازیں دینے لگی۔ میرے گھوڑے کا سوار بار بار مجھے خاموش رہنے کو کہہ رہا تھا کیونکہ اس طرح چیخنے سے میری آواز گاؤں کے لوگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد شیری ہم سے آن ملی۔ اس وقت ہم پتھروں کے بنے ہوئے ایک ٹوٹے پھوٹے مویشی خانے کے قریب پہنچ رہے تھے۔ شیری نے ہم سے پیچھے رہ جانے کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ کہہ رہے تھے۔

یہ مویشی خانہ کسی زمانے میں آباد رہا ہو گا لیکن اس وقت اس کی شکستہ حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ بہت عرصے سے استعمال میں نہیں تھا۔ اس وقت مویشی خانے کے باہر چند تھکے ہوئے گھوڑے بندھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہمیں قریب پا کر گھوڑوں نے منہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں۔ مویشی خانے کے ایک دروازے سے دھواں نکلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اندر آگ جل رہی ہو گی۔ میں گھوڑے سے چھلانگ لگا کر دوڑتی ہوئی اس دروازے میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے میں دو ایرانی نوجوانوں کے علاوہ آٹھ ترکی کرد بھی موجود تھے جو آگ تاپ رہے تھے۔

"کیا تم لوگ قریبی شہر تک پہنچنے کے لئے ہمارے ساتھ کار میں حصے دار بن سکتے ہو؟" میں نے اپنا تعارف کرائے بغیر ایرانی نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ لوگ کار کے لئے ہم سے مزید دو ہزار ڈالر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کیا تم لوگ اس میں حصے دار بننا چاہتے ہو؟"

ان دونوں ایرانی نوجوانوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ٹھنڈے دماغ کے مالک تھے اور ان کی حالت بھی ہم سے کہیں بہتر تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر پاگل ہی سمجھے ہوں گے۔ بارش کے باعث میرے بھیگے ہوئے بال پیشانی اور گردن پر چپکے ہوئے تھے۔ میری جینز اور کردی جیکٹ کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد فرہاد، شیری اور کمال بھی اندر آ گئے۔ ہم سب کی حالت دیکھ کر ایرانیوں کی پیشانی پر سلوٹیں سی ابھر آئیں۔

"آگ کے قریب بیٹھ جاؤ" ان میں سے ایک نے کہا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا نام محمود تھا "ہم نے ابھی ابھی چائے بنائی ہے تم بھی پیئو۔ باہر بہت شدت کی سردی ہے۔"

"ہم اسٹوڈنٹ ہیں" دوسرے نے کہا۔ اس کا نام ثنا تھا۔ "ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ کار کا کرایہ ادا کر سکیں۔ ان سے ہمارا معاہدہ ہوا تھا کہ یہ لوگ ہمیں استنبول تک پہنچائیں گے یہ اپنے معاہدے کے پابند ہیں۔ ہم آدھی رقم انہیں ایڈوانس دے چکے ہیں اور باقی استنبول پہنچنے کے بعد دی جائے گی۔ اس مویشی خانے میں ہمارا قیام بہت مختصر ہو گا۔ کچھ دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

ہمارے دونوں کرد گائیڈ بھی اندر آ کر دوسرے کردوں کے ساتھ بیٹھ گئے اور اپنی زبان میں مشورے کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد آگ کی تپش سے میرے حواس کسی قدر بحال ہو گئے۔ میں نے اپنے بھیگے ہوئے جوتے اور موزے بھی اتار کر سوکھنے کے لئے ڈال دیئے۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔ میں ایرانی نوجوانوں سے فارسی میں گفتگو کرنے لگی تاکہ کرد ہماری باتیں نہ سمجھ سکیں۔

"میری بات ذرا غور سے سنو۔ میں ان سے یہ کہوں گی کہ ہم سب نے کار لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پیسے میں ہی دوں گی لیکن انہیں یہ پتا نہیں چلنا چاہئے کیونکہ میں ان سے کچھ بارگیننگ کرنا چاہتی ہوں۔"

دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں اس کرد کی طرف گھوم گئی جو ان کا لیڈر نظر آتا تھا اور ہم سے پہلے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو مسٹر! میں تمہیں دو ہزار ڈالر دینے کو تیار ہوں۔ اب تم جا کر کار لے آؤ" وہ اس طرح مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

"کیسی کار؟" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے ہمارے ساتھ آنے والے کردوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں کوئی

کارو غیرہ نہیں ہے۔ کچھ دیر یہاں رکنے کے بعد ہم دوبارا گھوڑوں پر ہی سفر شروع کریں گے۔"

اب یہ حقیقت بھی سامنے آگئی تھی کہ ہمارے گائیڈز کی نیتوں میں شروع ہی سے فتور تھا۔ وہ یقیناً ہمیں لوٹنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ شاید وہ کسی طرح دن گزارنا چاہتے تھے اور اس کے بعد رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ہمارا سامان لے کر غائب ہو جاتے لیکن اس وقت میرا چیخنا چلانا کام آگیا تھا۔ وہ یقیناً یہ سوچ کر ڈر گئے تھے کہ میری چیخوں کی آواز سن کر گاؤں کے لوگ وہاں پہنچ جائیں گے۔ مجبوری سے وہ ہمیں یہاں لے آئے تھے۔ یہاں پہلے سے موجود کرد بھی اسمگلر ہی تھے لیکن وہ ہمارے ساتھ آنے والوں کے مقابلے میں قدرے ایماندار ثابت ہوئے تھے۔ کچھ دیر آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ان کا لیڈر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ہمیں تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

گھوڑوں پہ سفر کے نام پر فرہاد ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ نتیجتاً اسے زبردستی گھوڑے پر بٹھانا پڑا۔ اس طویل سفر کے دوران مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ ہمارے ساتھ آنے والے اس کرد کا نام علی تھا۔ جس نے ہم سے دو ہزار ڈالر ہتھیانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک بہترین گھڑسوار تھا اور اس کا گھوڑا بھی سب سے اچھا تھا۔ اس کی بدنیتی کے باوجود میں بضد تھی کہ میں اور فرہاد اس کے ساتھ سفر کریں گے۔

تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے چاند یا ستاروں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ گھوڑوں کی سموں کی آہٹوں کے علاوہ کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمارا رخ ایک بار پھر سامنے والے پہاڑوں کی طرف تھا۔ بارش پھر شروع ہو گئی۔ بادلوں کی.... گھن گرج کے ساتھ کبھی کبھی بجلی بھی چمک رہی تھی۔

پہاڑوں سے آنے والا پانی سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔ کئی جگہ پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بن گئی تھیں۔ ہم پہلے بھی گھوڑوں سے اترے بغیر اس قسم کی ندیاں عبور کرتے آئے تھے۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی کوئی ندی راستے میں آتی 'علی کو آگے کر دیا جاتا کیونکہ اس کا گھوڑا سب سے اچھا تھا' اگر علی کا گھوڑا چھلانگ لگا کر ندی عبور کر لیتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ دوسرے گھوڑے بھی اسی طرح ندی عبور کر سکتے ہیں۔ چھلانگ لگانے سے پہلے گھوڑے اگلے پیر اٹھا کر تقریباً سیدھے ہو جاتے اور دوسرے کنارے پر آگے کی طرف جھک جاتے۔ بعض اوقات کیچڑ میں سنبھلنے کے لئے انہیں خاصی تگ و دو کرنی پڑتی۔

علی کے گھوڑے پر تین افراد کا بوجھ تھا۔ کسی جگہ ندی عبور کرنے میں اسے دشواری پیش آتی تو علی اسے دوبارا چھلانگ لگوا کر واپس لے آتا کیونکہ اس طرح یہ سمجھ لیا جاتا کہ دوسرے گھوڑے یہاں سے ندی عبور نہیں کر سکیں گے۔ ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جاتی جہاں سے تمام گھوڑے آسانی سے چھلانگ لگا سکیں۔ میں بار بار فرہاد کو سنبھل کر بیٹھنے کی ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی علی کے ساتھ لپٹ جاتی۔

اس رات ایرانی نوجوانوں اور کردوں سمیت تقریباً سب ہی باری باری کسی نہ کسی ندی میں گرے تھے لیکن میں 'فرہاد اور علی محفوظ ہی رہے تھے۔

جب وہ کرد ہمیں سرحد پر چھوڑ کر واپس جانے لگے تو علی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ایک بہادر عورت ہو۔ میں نے کبھی کسی عورت کو اس طرح گھوڑے پر سفر کرتے نہیں دیکھا" یہ میرے بارے میں اس شخص کے تاثرات تھے جس کی زندگی ان خطرناک پہاڑوں میں گھوڑے کی پشت پر گزری تھی۔

ہم رات بھر گھوڑوں کی پشت پر سفر کرتے رہے۔ کبھی کبھار میں کمال کو بھی دیکھ لیتی جو اپنے سوار کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے کوئی سہارا بھی نہیں لے رکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں نے اسے پکارا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس سے بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ سہارے کے لئے اپنے سوار کے کاندھے پر ہاتھ رکھے رہے لیکن اسے شاید اب کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ گھوڑے کے جھٹکوں کا عادی ہو چکا ہو۔

بالآخر پہاڑوں سے نکل کر ہم ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ کچھ فاصلے پر اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ تعداد میں کئی تھے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب پہنچ رہی تھیں 'پھر یکایک یوں محسوس ہوا جیسے انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔ ہر طرف سے بھونکنے اور خوفناک غراہٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بادل چھٹ گئے تھے۔ فضا میں غیر محسوس سا اجالا تھا۔ میں یہ دیکھ کر دہشت زدہ سی رہ گئی کہ درجنوں خوفناک کتے ہمارے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ وہ اچھل اچھل کر ہماری ٹانگیں اپنے بھیانک جبڑوں میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس وقت گھوڑے پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ کتوں سے بچنے کے لئے پیر اوپر اٹھا لینے سے غیر متوازن ہو کر گر جانے کا خطرہ تھا۔ میں اپنے پیروں کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ گھوڑے بھی خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ کئی کتوں نے گھوڑوں کی ٹانگوں پر منہ بھی مارا۔ گھوڑے بدحواس ہو کر دوڑتے رہے لیکن کتے کسی بھیانک عفریت کی طرح تعاقب کرتے رہے ۔۔۔ کوئی آدھے گھنٹے تک ہمارا تعاقب کرنے کے بعد انہوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔ نالبالان کی حدود ختم ہو گئی تھی۔ کتوں سے نجات ملنے کے بعد جب گھوڑوں کی رفتار کم ہوئی تو یہ سنسنی خیز انکشاف

ہوا کہ ایرانی نوجوان محمود ناصر اپنے گھوڑے پر موجود نہیں تھا۔ ہم سب دہشت زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ محمود کا دوست شاب کسی طرح آگے جانے کو تیار نہیں تھا۔

"میں واپس جا رہا ہوں۔" اس نے کہا "میں اپنے دوست کو ان خونخوار کتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

کرد بھی صورتِ حال کی نزاکت سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ کچھ دیر تک آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر علی نے مجھے اور فرہاد کو گھوڑے سے اتار دیا اور محمود کی تلاش میں واپس چلا گیا۔ اسے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ محمود بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم اتنی دیر تک وہاں رکے رہے جب تک محمود اپنی رام کہانی سناتا رہا۔ "کتوں کے خوف سے میرا گھوڑا اچانک پچھلے پیروں پر سیدھا کھڑا ہو گیا جس سے میں نیچے گر گیا۔ میں گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا رہا لیکن کتے ہم دونوں پر بار بار حملہ آور ہو رہے تھے۔ خوف کی وجہ سے گھوڑا مسلسل اچھل کود کر رہا تھا۔ میں کتوں کو دور رکھنے کے لئے ان پر پتھروں کی بارش بھی کرتا جا رہا تھا لیکن نہ تو گھوڑا میرے قابو میں آ رہا تھا اور نہ ہی کتے پیچھے ہٹنے کو تیار تھے۔ اب ان کے تیور کچھ اور بھی بگڑ گئے تھے' پھر میں نے علی کو آتے ہوئے دیکھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خونخوار کتے علی کے پہنچنے سے پہلے ہی میرا پوسٹ مارٹم کر ڈالیں گے۔ شکر ہے' علی ان کی اس کارروائی سے پہلے ہی پہنچ گیا۔"

کتوں سے بچ نکلنا واقعی محمود کی خوش قسمتی تھی۔ اس کی داستان ختم ہوتے ہی ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ کرد اب جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے کیونکہ بقول ان کے ہائی وے پر کار ہماری منتظر تھی' لیکن ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہو گا۔ فرہاد کو پیشاب لگ رہا تھا۔ وہ بار بار گھوڑا روکنے کو کہہ رہا تھا لیکن علی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی' پھر ایک موقع پر جب ہم دوسروں سے بہت آگے تھے' ایک ندی عبور کرنے کے بعد میرے مجبور کرنے پر علی نے گھوڑا روک لیا۔ میں فرہاد کو گھوڑے سے اتار کر کچھ دور لے گئی۔ اسے فارغ کرانے کے بعد ہم دوبارا گھوڑے پر بیٹھے ہی تھے کہ تاریک فضا میں شیری کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ وہ مجھے پکارنے لگی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں نے مڑ کر دیکھا لیکن گھپ تاریکی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر آئی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح شیری کی آواز کی سمت میں دوڑنے لگی۔ میں جیسے جیسے قریب پہنچ رہی تھی' پانی میں کسی گھوڑے کے مچلنے کی آواز نمایاں ہوتی جا رہی تھی' جیسے پانی میں گرا ہوا گھوڑا اپنے آپ کو سنبھالنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔

میں ندی میں اتر گئی۔ اس دوران میں کمال' ثنا اور محمود بھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر دوڑتے ہوئے قریب آ گئے تھے۔ شیری پشت کے بل پانی میں گری ہوئی تھی۔ اس کا صرف سر پانی سے باہر تھا۔ اس کا گھوڑا سوار اس کے اوپر تھا اور وہ پانی میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں گھوڑا اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا اور وہ بھی پیر مارتے ہوئے ندی سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کمال اور دونوں ایرانی نوجوانوں کی مدد سے شیری کو اٹھا کر ندی سے باہر نکالا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے گھوڑے کے گرنے کا سارا بوجھ شیری پر پڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دباتے ہوئے کراہ رہی تھی۔ اسے سانس لینے میں بھی خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ تمام کرد خاموش تماشائی بنے ایک طرف کھڑے رہے۔ ان میں سے کسی نے ہماری مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"لگتا ہے میری پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ خدا کے لئے میری مدد کرو سوسن!" شیری نے کراہتے ہوئے کہا۔

کیچڑ میں لت پت اس کا کردی لباس اور کوٹ جسم سے چپک گیا تھا۔ میں نے شیری کا کردی کوٹ اور بلاؤز وغیرہ اتار دیا۔ اس دوران میں محمود نے اپنے بیگ میں سے ایک جیکٹ نکال کر اور ثنا نے اپنے بیگ میں سے ایک پتلون نکال کر دے دی۔ کئی گھنٹے پہلے شیری کے جوتے ٹوٹ گئے تھے جو اس نے پھینک دیے تھے۔ میں نے اسے کمال کے جوتوں کا ایک جوڑا دے دیا۔ اس وقت افراتفری میں وہ جوتے بھی اس کے پیروں سے اتر کر کہیں گر گئے تھے' مگر فرہاد نے چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے ہوئے تاریکی میں وہ جوتے ڈھونڈ نکالے۔ شاید شیری کا دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہائی ہیل والے جوتے مانگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کردی لباس کے نیچے اپنا دوسرا لباس بھی اتارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی حرکات سے مجھے بہرحال یہ تسلی ہو گئی کہ اس کی پسلیاں نہیں ٹوٹی تھیں' اگر ایک آدھ پسلی میں ترخ جاتی تو وہ اپنے آپ آزادی سے اس طرح حرکت نہیں کر سکتی تھی' جو لباس وہ اتار رہی تھی اس میں اس کے قیمتی جواہرات سلے ہوئے تھے۔ سونے کی زنجیریں اور نیکلس شیری نے خود اپنے اس لباس میں سیئے تھے تاکہ کسی آزاد ملک میں پہنچنے کے بعد یہ قیمتی چیزیں کام آ سکیں۔

"شیری! یہ کپڑے مت اتارو۔" میں نے اس کے کان میں کہا تاکہ میری آواز کسی کرد کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ "تمہارا یہ لباس بہت قیمتی ہے۔ یاد ہے نا؟"

وہ میری بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے بیگ میں سے اپنے چپل شوز نکال لئے تھے جنہیں وہ پہننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود جب جوتے پیروں میں نہیں آئے تو اس نے انہیں ایک طرف ڈال دیا اور میری تنبیہہ کے باوجود اپنا وہ لباس بھی اتار کر

ایک طرف زمین پر ڈال دیا۔ کردوں کو یہاں رکنا خاصا گراں گزر رہا تھا۔ بالآخر وہ گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ ہم نے جلدی جلدی شیری کو دوسرا لباس پہنایا۔ اس وقت تک شیری کے حواس بھی کسی حد تک بحال ہو چکے تھے۔ وہ میرے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "سوسن! میرے اس لباس کا خیال رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ یہیں رہ جائے۔"

اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اندھوں کی طرح زمین پر ٹٹولنے لگی۔ اس کا ایک جوتا اور لباس میرے ہاتھ میں آگیا جسے میں نے اس کے بیگ میں ٹھونس دیا اور زپ بند کر کے بیگ اس کے گھوڑا سوار کرد کے حوالے کر دیا تاکہ اسے گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا جائے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شیری کو اگرچہ محمود نے اپنی ایک جیکٹ دے دی تھی مگر وہ سردی روکنے کے لئے قطعی ناکافی تھی۔ ہم بار بار کردوں سے التماس کر رہے تھے کہ ان میں سے کوئی اپنا ایک کوٹ (وہ سب دو دو کوٹ پہنے ہوئے تھے) شیری کو دے دے لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا' البتہ ہم نے وہ پرانا سا پھٹا ہوا کمبل شیری کو دے دیا جو ہمارے نیچے گھوڑے کی پشت پر پڑا ہوا تھا۔ ہمارا یہ سفر مزید تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ فرہاد بار بار پوچھ رہا تھا کہ ہم کب رکیں گے' پھر ایک جگہ اچانک کردوں نے گھوڑے روک لئے اور اعلان کیا کہ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ چاروں طرف تاریکی اور ویرانہ تھا۔ دور دور تک زندگی کے آثار مفقود تھے۔ کتوں یا کسی قسم کے پالتو جانوروں کی کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ قرب وجوار میں کوئی بستی ہو گی۔ جس جگہ ہم رکے تھے وہ ایک کچا سا راستہ تھا' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ بھیانک تاریکی اور اعصاب شکن مہیب سناٹا۔ کمال اور دونوں ایرانی نوجوان کردوں سے الجھ پڑے۔ ثنا اور محمود نے تو گھوڑوں سے اترنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم نہ صرف کمزور تھے بلکہ تعداد میں بھی کم تھے۔ ان کردوں نے ہمیں زبردستی گھوڑوں سے اتار دیا۔

"تم ایک قصبے سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہو۔ اس طرف چلے جاؤ۔ وہاں تک پہنچنے میں تم لوگوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔" علی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرد اب جلد سے جلد واپس چلے جانا چاہتے تھے تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جائیں اور گاؤں والوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ وہ رات بھر گاؤں سے غائب رہے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ان پہاڑوں میں رہنے والے تمام کرد بے ایمان اور اسمگلر نہیں تھے۔ راستے بھر اگرچہ ہمیں ہر جگہ مختلف حیلوں بہانوں سے لوٹا گیا تھا۔ جاتے جاتے بھی وہ اس سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ایرانی کردوں نے ہمیں سردی سے بچنے کے لئے اپنے کوٹ دیئے تھے اور اب یہ ترکی کرد ہم سے ان کوٹوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سردی اس غضب کی تھی کہ رگوں میں خون منجمد ہوا جا رہا تھا۔ شیری کی حالت تو بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ کمال نے کوٹوں کے بدلے کردوں کو رقم کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور زبردستی ہمارے جسموں سے کوٹ اتار لئے اس کے فوراً بعد انہوں نے مڑ کر گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں غائب ہو گئے۔ ہم اس تاریک ویرانے میں اکیلے رہ گئے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم واقعی ترکی کی سرحد میں تھے یا وہ بے ایمان کرد ہمیں ایران ہی کے پہاڑوں میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ کوٹ چھن جانے کے بعد سردی ہمارے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی اور ہم اس تاریک ویرانے میں کھڑے تھر تھر کانپتے رہے۔

سردی میں اس طرح کھڑے رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر علی کی بتائی ہوئی سمت میں چلنے لگے۔ کمال اور محمود نے شیری کو سہارا دے رکھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہم رک گئے۔ ہمارے لئے ایک قدم اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔ ہماری تمام امیدیں ختم ہو چکی تھیں اور ہر ایک نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ رات ہماری زندگی کی آخری رات ہو گی۔ قیامت کی یہ سردی ہمیں صبح کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھنے کا موقع نہیں دے گی لیکن عین اسی وقت جب ہم زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ تاریک فضا میں دور کہیں کسی ٹریکٹر کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ٹریکٹر کی یہ آواز ہمارے لئے دل پسند موسیقی کی مدھر تانوں سے کم نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں طرح طرح کے شبہات جنم لینے لگے۔ ممکن ہے وہ کوئی ترک ہو جو ہمیں پولیس کے حوالے کر دے اور ہمیں دوبارا ایران کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے جہاں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا یا ممکن ہے کوئی رحمدل کسان ہو جو ہم جیسے ستم رسیدہ لوگوں کی مدد کرنے پر تیار ہو جائے۔ ہمیں بہرحال خطرہ مول لینا تھا۔ اس ویرانے میں سردی سے ٹھٹھر کر مرنے سے بہتر تھا کہ ایک اور رسک لے لیا جائے۔

اس وقت ہم اس کچے راستے پر کھڑے تھے جس کے بارے میں ہمیں علی نے بتایا تھا کہ یہ راستہ ہمیں پانچ منٹ میں قصبے تک لے جائے گا۔ صرف شیری اور میں ترکی زبان جانتی تھیں۔ شیری اب کسی قابل نہیں رہی تھی۔ البتہ میں ابھی تک اپنی ہمت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ میں اس ٹریکٹر کو روکنے کی کوشش کروں گی جبکہ دوسرے لوگ راستے کے کنارے پر کھائی میں چھپ جائیں گے۔ میرا یہ فیصلہ خاصا خطرناک تھا۔ بعض دوسرے مسلم ممالک کی طرح ترکی کے بارے میں بھی یہ مشہور تھا کہ وہاں اکیلی عورت محفوظ نہیں رہ

سکتی تھی لیکن مجھے بہر حال' یہ خطرہ مول لینا تھا۔ ٹریکٹر کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ اسی طرف آرہا تھا۔ میں راستے کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ٹریکٹر ایک موڑ گھوم کر سامنے آگیا۔ اس کی سامنے والی صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ میں روشنی میں نہا گئی اور ٹریکٹر کی طرف رخ کرکے چیخ چیخ کر ہاتھ ہلانے لگی۔ ٹریکٹر میرے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں دوڑ کر ڈرائیور کی سائڈ پر پہنچ گئی۔ آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کے سامنے سے ہٹتے ہی احساس ہوا کہ ٹریکٹر پر ڈرائیور اکیلا نہیں تھا اور بھی کئی آدمی ٹریکٹر پر سوار تھے جو یقیناً کسان تھے اور اپنے گھروں سے دور کھیتوں پر جارہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ تین آدمی تو ٹریکٹر پر ہی چڑھے ہوئے تھے اور پانچ پیچھے ٹرالی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہائی وے یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے ڈرائیور سے پوچھا جو مجھے دیکھ کر پریشان سا ہوگیا تھا۔ "میں کسی بس یا وین تک پہنچنا چاہتی ہوں لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ ہائی وے یہاں سے کتنی دور ہے" میں ڈرائیور سے بات کررہی تھی کہ اس دوران میں میرے دوسرے ساتھی بھی کھائی سے نکل کر ٹریکٹر کے قریب پہنچ گئے۔ ڈرائیور کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ میرے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ کچھ خوفزدہ سا ہوگیا تھا۔

"ایک منٹ...." وہ کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے ہائی وے یہاں سے پینتالیس کلومیٹر سے کم نہیں ہوگا۔"

"اوہ! اس کا مطلب ہے کہ ہم پیدل وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ دیکھو پلیز! ہم مصیبت کے مارے ہوئے ہیں' کیا تم ہمیں وہاں تک لفٹ دے سکتے ہو؟"

ڈرائیور نے پہلے میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگا۔ بالآخر وہ دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ہم تو اپنے کام پر جارہے ہیں۔"

"تمہارے لئے جہاں تک ممکن ہو ہمیں پہنچا دو پلیز! انکار مت کرنا' ہمارے ساتھ ایک کمسن بچہ اور ایک بوڑھی عورت ہے۔ سردی ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔ خدا کے لئے ہماری مدد کرو۔" میں نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اس حد تک آمادہ ہوگیا کہ فرہاد اور شیری کو ہمارے سامان سمیت ٹریکٹر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی لیکن میں اب کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی تھی۔ میں شیری اور فرہاد کو اپنے سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان بیگز میں ہمارا سارا اثاثہ تھا۔ میں اس سے بھی ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی اور اس کے ساتھ ہی معجزاتی طور پر آنے والے اس ٹریکٹر کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے فارسی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ٹریکٹر پر چڑھ جائیں' پھر میں ڈرائیور کا اس طرح شکریہ ادا کرنے لگی جیسے اس نے ہمیں اجازت دے دی ہو۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہم ٹریکٹر پر چڑھ چکے تھے۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھی جو چہروں سے ترکی کرد لگتے تھے' الجھی ہوئی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر ڈرائیور نے مجبوری میں کاندھے اچکائے اور اس کے ساتھ ہی ٹریکٹر حرکت میں آگیا۔ تند و تیز ہوا میں ہم تقریباً دو گھنٹوں تک ٹریکٹر پر سفر کرتے رہے۔ ٹرالی پر کٹی ہوئی گیہوں کے گٹھے لدے ہوئے تھے جو پانی میں تر ہو رہے تھے۔ ہم انہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ محمود اور کمال نے شیری کو تیز ہوا سے بچانے کے لئے اپنے جسموں کی آڑ دے رکھی تھی۔

اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ٹریکٹر ایک جگہ رک گیا وہاں سے بائیں طرف ایک اور کچا راستہ پھوٹتا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ انہیں اس راستے پر مڑنا ہے۔ اس نے ہمیں ٹریکٹر سے اتارتے ہوئے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم پیدل چلتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں ہائی وے پر پہنچ جائیں گے۔ ڈرائیور کے انکار کے باوجود میں نے ایک معقول رقم اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمادی۔ اسی کی وجہ سے ہم زندہ بچ گئے تھے۔ رات کو درجۂ حرارت صفر ڈگری سے نیچے تھا۔ ان علاقوں میں خونخوار بھیڑیے شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر ٹریکٹر ڈرائیور ہماری مدد نہ کرتا تو وہ رات یقیناً ہماری آخری رات ثابت ہوتی ہم تین دن اور تین راتوں سے زندگی کی تلاش میں یہ صعوبتیں اٹھاتے پھر رہے تھے۔

اب جبکہ ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہماری ہمت جواب دے رہی تھی۔ ترکی کا سرحدی قصبہ وان وہاں سے صرف تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ شیری سے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ محمود اور ثنا اسے سہارا دے کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے چل رہے تھے۔ کمال تو شیری سے بھی زیادہ کم ہمت ثابت ہوا تھا۔ اس کے پاس اگرچہ صرف ایک بیگ تھا لیکن لگتا تھا جیسے اس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا اور بار بار ہم سے پیچھے رہ جاتا تھا۔ فرہاد نے میرا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور بڑی ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اپنا بیگ سنبھال رکھا تھا۔ فرہاد نے ایک مرتبہ بھی کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی ایسی چیز کی فرمائش کی تھی جسے فراہم کرنا میرے بس میں ہوتا۔ تین جگہوں پر ہمیں ندیاں عبور کرنا پڑی تھیں۔ فرہاد کو ندی عبور کرانے کے بعد ہر مرتبہ مجھے کمال کو لینے کے لئے واپس آنا پڑتا۔ کمال کی ہمت بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔ وہ ہر چند قدم کے بعد لڑکھڑا کر گر جاتا اور جب میں اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ مزید پھسل جاتا اور ضد کرتا کہ اسے وہیں چھوڑ کر ہم لوگ آگے چلے

جائیں لیکن میں اس کی ہمت بڑھا کر کسی نہ کسی طرح مزید چند قدم چلنے پر آمادہ کر لیتی۔ اگرچہ میں نے بھی دوسروں کی طرح اتنی ہی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ مجھے بھی ایک گھنٹے کے لئے سونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ گھوڑے پر سواری کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو گیا تھا، لیکن حیرت انگیز طور پر میں اپنے آپ میں ایک نئی قوت سی محسوس کر رہی تھی۔ جب بھی میری ہمت جواب دینے لگتی میں اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیتی۔

"ہمت سے کام لو سوسن! یہ مصیبت اب کٹنے ہی والی ہے ہم بہت جلد منزل پر پہنچ جائیں گے۔ گرم پانی سے غسل، لذیذ کھانے اور آرام دہ بستر ہمارے منتظر ہیں۔ ہم پیٹ بھر کر کھائیں گے اور جی بھر کر سوئیں گے۔" میری آواز دور دور تک پھیل جاتی اور میرے اندر ایک نیا عزم پیدا ہو جاتا۔

تقریباً بیس منٹ بعد جب ہم ہائی وے پر پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہی ہماری ہمت ایک بار پھر جواب دے گئی اور ہم مُردوں کی طرح سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ اب ہمارے اندر ہاتھ پیر ہلانے کی ہمت نہیں رہی تھی لیکن ذہن میں بہر حال یہ خوشگوار احساس بیدار ہو چکا تھا کہ اب ہم محفوظ تھے۔ ہم موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم اپنے لباس صاف کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ جب بس آئے تو ہماری حالت دیکھ کر ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جا سکے۔ شیری اپنا بیگ چیک کر رہی تھی۔ اس وقت ایک اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ گزشتہ رات میں نے عجلت میں جو لباس شیری کے بیگ میں ٹھونسا تھا وہ، وہ لباس نہیں تھا۔ جس میں اس کے جواہرات سلے ہوئے تھے اس کے بجائے میں نے بدحواسی میں وہ کردی لباس بیگ میں ٹھونس دیا تھا جو شیری نے اتار کر پھینکا تھا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہو چکی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنی حالت بگاڑ لی تھی۔ ہم سب اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن سب کچھ بیکار ثابت ہوا۔ فرہاد سڑک پر لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ وہ نیند میں بھی بے چین ہو رہا تھا اور غالباً ڈراؤنے خواب دیکھ رہا تھا کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کے منہ سے خوفزدہ سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر جب وہ بیدار ہوا تو سسکیاں لیتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ "پانی ممی! مجھے پانی چاہئے۔ بڑی شدت کی پیاس لگ رہی ہے۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

میں کانپ کر رہ گئی۔ دو دن سے فرہاد نے کچھ نہیں کھایا تھا اور شاید مزید کئی گھنٹوں تک کوئی چیز نہ مل سکے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس ویرانے میں کہیں بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دونوں طرف سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ ٹریکٹر کے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ یہاں سے ہمیں شہر جانے کے لئے بس مل جائے گی لیکن ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شہر کس طرف تھا اور بس کس طرف سے آئے گی۔ یہ سوچ کر کہ گروپ کی صورت میں کھڑے رہنے سے ہم پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا تھا، ہم دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ محمود اور ثنا ہم سے الگ ہو کر بہت دور چلے گئے۔ اس وقت سڑک پر اکا دکا کاروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی لیکن ہم کسی کار کو روکنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر ہم سے پوچھا گیا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں تو ہم کیا جواب دیں گے کیونکہ ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ہم کس علاقے میں کھڑے ہیں۔ صرف شیری ہی ایسی تھی جو کسی اہل زبان کی طرح ترکی زبان بول سکتی تھی۔ اس کے لہجے سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ ایرانی ہے۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ جس سے بھی سامنا ہو گا، شیری ہی اس سے بات کرے گی اور اپنے آپ کو ترک باشندہ ہی بتایا جائے گا۔ میرا تعارف اس کی بھانجی کی حیثیت سے کرایا جائے گا۔ جس کی زندگی کا بیشتر حصہ ایران میں گزرا تھا کیونکہ میرے ترکی زبان بولنے میں ایرانی لہجہ نمایاں تھا۔

"کمال! تم بہرے بنے رہو گے" شیری نے کہا "اور فرہاد یا تو سویا رہے گا یا بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھے گا۔ کسی کی کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔"

"لیکن میں بہرے آدمی کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔" کمال نے احتجاج کیا۔

"تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" اب مجھے کمال کی کم ہمتی پر غصہ آنے لگا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ایک کھٹارا سی چھوٹی بس آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ بس ایک سائڈ روڈ سے آئی تھی جو دو مسافروں کو وہاں اتار کر بائیں طرف چلی گئی تھی۔ ان مسافروں میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں سے آئے ہیں اور شہر جانا ہے۔ وہ بھی بس کے انتظار میں ہمارے قریب ہی رک گئے جس کا مطلب تھا کہ ہم سڑک کی صحیح سمت میں کھڑے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں اس آدمی سے معلوم ہو گیا کہ وہاں سے کچھ فاصلے پر پانی کا ایک چشمہ ہے۔ ہم بس کے آنے سے پہلے وہاں سے پانی پی کر واپس آ سکتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے لئے قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا لیکن ہم دس منٹ تک چلتے ہوئے چشمے پر پہنچ گئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہمارے لئے آب حیات سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔ جب ہم واپس پہنچے تو اس وقت بھی بس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ وہ جوڑا جلد ہی ہم سے بے تکلف ہو گیا۔ وہ ہم سے پوچھنا چاہتے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ہم اسی علاقے کے رہنے والے ہیں لیکن جب ہم کسی گاؤں یا بستی کا نام نہیں بتا سکے تو وہ دونوں مشتبہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اس آدمی نے جب کمال

سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو شیری نے بتایا کہ وہ بہرہ ہے۔
"بیچارہ!" عورت نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"کتنا خوبرو نوجوان ہے اور قدرت نے اسے قوت سماعت سے محروم کر رکھا ہے۔"
کمال کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے غصے کا اظہار کرتا۔ شیری نے اس آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"یہاں آس پاس تو کوئی فوجی چیک پوسٹ نہیں ہے نا؟"
"اوہ نہیں۔" مرد نے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چیک پوسٹ آگے یہاں سے بہت دور ہے۔"
ہم نے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اگر ہمیں چیک پوسٹ پر پکڑ لیا گیا تو ممکن ہے ہمیں ایران واپس بھیج دیا جائے۔ ہم نے ان دونوں کو اپنے بارے میں تھوڑے بہت حقائق سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
"میں ترک ہوں" شیری نے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن میرے یہ دوست ایرانی ہیں اور میں انہیں استنبول چھوڑنے جا رہی ہوں۔ چیک پوسٹ پر شناختی کاغذات تو نہیں دیکھے جاتے؟"
"یہ میری بیوی ہے" آدمی نے اپنی ساتھی عورت کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا "ہم دونوں کے پاس برتھ سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ میں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ اس نوجوان کو دے دوں گا اور میری بیوی کا سرٹیفکیٹ اس عورت کے کام آجائے گا۔ بچے کے بارے میں کوئی نہیں پوچھے گا اور تم اپنے بارے میں کہہ سکتی ہو کہ بوڑھی ہونے کے باعث تمہاری یادداشت کمزور ہو چکی ہے اور گھر سے نکلتے ہوئے تمہیں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ ساتھ لینا یاد نہیں رہا۔ ہم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا کیونکہ ہم اس علاقے کے رہنے والے ہیں اور اکثر شہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میری اس تجویز پر تم لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"
ہم میں سے بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان اجنبیوں نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بہت بڑی پیشکش کی تھی۔ ایسے لوگ اب اس دنیا میں بہت کم رہ گئے ہیں جو اپنے آپ کو خطرات میں ڈال کر دوسروں کی مدد پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اس کی پیشکش کو بخوشی قبول کر لیا لیکن اس دوران میں ایک اور مشکل پیدا ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہاں ایک کار آکر رکی تو شیری نے آگے بڑھ کر ان سے دریافت کیا کہ بس کتنی دیر میں آئے گی۔
"تم ....." ڈرائیور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم لوگ ایرانی ہو؟ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"
میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شیری سے ایک بہت بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ لوگ سادہ لباس میں پولیس والے تھے۔ شیری آہستہ آہستہ کار سے پیچھے ہٹنے لگی لیکن پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے تحکمانہ لہجے میں اسے رکنے کو کہا "ڈرو نہیں۔" ان میں سے ایک نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "ہم بھی ایرانی ہیں اور تمہاری طرح ایران سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ یہاں کی پولیس تم لوگوں کو گرفتار کرلے گی لیکن کچھ دیر بعد چھوڑ دیا جائے گا۔"
کار میں بیٹھے ہوئے ایک پولیس والے نے اس ایرانی نوجوان کو ڈانٹ کر خاموش کرا دیا اور اس کے ساتھ ہی کار تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ ہم حیران و پریشان کھڑے رہے۔ اس نئی صورت حال نے ہمیں بدحواس سا کر دیا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی فیصلہ کر سکتے ایک تیز رفتار ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا وہ ٹرک بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب رک گیا اور کئی فوجی کود کر نیچے اتر آئے۔ انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ان کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ان فوجیوں کو دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی' جو کچھ دیر پہلے ہم سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے' خوفزدہ ہو کر ایک طرف بھاگ نکلے اور سڑک کے کنارے کسی کھائی میں چھپ گئے۔ خوف و دہشت سے ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے موت رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ فوجیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ زندگی ایک بار پھر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔
"ٹرک میں بیٹھو۔" ایک فوجی نے حکم دیا۔ وہ اس دستے کا انچارج تھا۔
ہمارے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ آفیسر کے اشارے پر میں' شیری اور فرہاد آگے کیبن والے حصے میں بیٹھ گئے جبکہ کمال کو پچھلے حصے میں دوسرے فوجیوں کے ساتھ بیٹھا دیا گیا تھا۔ ٹرک تیز رفتاری سے چیک پوسٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ مایوسی کی دبیز دھند نے مجھے پہلی مرتبہ مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تین دن اور تین راتوں کے دوران خطرناک برف پوش پہاڑوں میں موت سے آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد ہم سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن امام خمینی کے لمبے ہاتھوں کی پہنچ سے اب بھی باہر نہیں نکل سکے تھے۔ اس اندیشے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سرحدی چوکی پر یہ ترک فوجی ہمیں ایرانیوں کے حوالے کر دیں گے اور کچھ پوچھے بغیر ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ شیری مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے کھوکھلے الفاظ میرے لیے اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ موت سے ہماری طویل جنگ ختم ہو گئی تھی اور ہم یہ جنگ ہار گئے تھے۔
چند منٹ بعد ہی ہم چیک پوسٹ پر واقع پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ پولیس کا مقامی کمانڈر دیر تک گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے سوال و جواب

کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ ہماری کہانی سننے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ میں سمجھ گئی کہ ہماری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے تھے۔ وہ میز کے پیچھے سے نکل کر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ اس کی نظریں باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں' پھر دفعتاً اس نے دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "میں آپ لوگوں کو اپنے ملک کی سرزمین پر خوش آمدید کہتا ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ "اب آپ لوگ محفوظ ہیں۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا یہ شخص' جس نے ہمیں گن پوائنٹ پر گرفتار کیا تھا' واقعی ہمیں اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہہ رہا تھا؟ میں اس قدر مایوس ہو چکی تھی کہ کسی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہمارے معزز مہمانوں کے لئے چائے لاؤ" اس نے اپنے ایک ماتحت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمیں ایرانیوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا؟" میں نے کمانڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کپکپاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' میں آپ لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔ سرحد کے اس پار جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا مجھے بے حد افسوس ہے" اس نے کہا۔

یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اب ہم واقعی محفوظ ہاتھوں میں ہیں' میں جذبات سے بے قابو ہو کر رونے لگی۔ راستے میں کئی ایسے مواقع آئے تھے جب میں نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کئے تھے۔ جب فرہاد نے پانی مانگا تھا اور میں اسے ایک گھونٹ پانی نہیں پلا سکی تھی۔ جب شیری بلک بلک کر رو رہی تھی اور جب کمال زندگی سے مایوس ہو کر چلتے چلتے گر پڑا تھا۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے آنسو روکے لیکن اب ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تھے اور میں ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

"اب تم لوگ بالکل محفوظ ہو' ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" کمانڈر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم محض رسمی کارروائی کے لئے تم لوگوں کو استنبول کے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جائیں گے۔ جہاں چند رسمی سوال پوچھے جائیں گے اور اس کے بعد تم لوگ دنیا میں کہیں بھی جانے کے لئے آزاد ہو گے اور ہاں......" اس نے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارا کیا "تمہارے دو ساتھی اس کمرے میں بھی موجود ہیں"

جب میں نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ محمود کپڑے دھو رہا تھا اور ثنا ایک طرف کھڑا شیو بنا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمیں اس ٹرک پر چیک پوسٹ سے چند میل دور وان نامی چھوٹے سے شہر میں پہنچا دیا گیا۔ ہماری رہائش کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ جہاں استنبول جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کے انتظار میں دو ہفتے رہنا پڑا۔ یہ ہوٹل دراصل ایران سے فرار ہو کر آنے والے ایرانیوں کے لئے ہی مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہاں دولت مند ایرانی بھی تھے اور وہ لوگ بھی جو صرف اپنی جانیں بچا کر لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پہلے دو دن تک ہم آرام کرتے رہے۔ ہمارا زیادہ وقت سونے میں گزرتا دو دن کے بعد ہوٹل میں مقیم مفرور ایرانیوں سے تعارف اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے فرار کی داستانیں سن سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ ایک فیملی پہاڑوں میں کمیٹی کے شکاریوں کے گھیرے میں آگئی تھی۔ ایرانیوں کے کرد گائیڈز اور کمیٹی کے شکاریوں میں کئی روز تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا' اور وہ لوگ تقریباً ایک مہینے تک ان خطرناک پہاڑوں میں بھٹکنے کے بعد ترکی کی سرحد پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ایک اور گروپ اپنے سامان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے کرد گائیڈز نے پہاڑوں میں ان کا سامان چھپا دیا تھا تاکہ خطرناک اور دشوار گزار راستہ آسانی سے طے ہو سکے۔ ان کا سارا اثاثہ اسی سامان میں تھا۔ کردوں نے وعدہ کیا تھا کہ دو چار روز میں ان کا سامان پہنچا دیا جائے گا لیکن چھ ہفتے گزرنے کے بعد بھی ان کردوں کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ان خطرناک پہاڑی راستوں سے فرار ہو کر آنے والوں میں ایک ایسی عورت بھی شامل تھی جو دو چار روز میں ایک نئی زندگی کو جنم دینے والی تھی۔ ایک ایسا بوڑھا تھا جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ عام حالات میں کسی سہارے کے بغیر اس کے لئے دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا لیکن جان بچانے کے لئے اس نے یہ صعوبتیں برداشت کر لی تھیں۔ فرار ہونے والوں میں کئی یہودی بھی تھے جن کے لئے امام خمینی کے ایران میں رہنا اب کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

ایک نوجوان عورت اپنے دو کمسن بچوں کو لے کر تہران سے فرار ہوئی تھی۔ ایک بچے کی عمر دو سال تھی اور دوسرا بمشکل تین مہینے کا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ اس کا شوہر پہلے ہی مغربی جرمنی جا چکا تھا۔ اب اس عورت کے لئے فرار کا یہ راستہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ کمیٹی کے شکاری اس کی تلاش میں تھے۔ کمیٹی کو دراصل اس کے شوہر کی تلاش تھی' وہ شوہر کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس عورت اور اس کے بچوں کو جیل میں بند کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کے شوہر کو ایران واپس آنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اس عورت نے بچوں کو ساتھ لے کر فرار ہونے کا فیصلہ کیا تھا خوش قسمتی سے اس کے گائیڈز ہمدرد انسان تھے اور اسے راستے کی دشواریوں کے سوا کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا

اب اس کا شوہر استنبول میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا تین ماہ کا بچہ سب سے کم عمر مفرور تھا جو امام خمینی سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا فرار ہونے والوں میں بہت سی ایسی عورتیں بھی شامل تھیں جو کچھ عرصے بعد ماں بننے والی تھیں۔ انہوں نے امام خمینی کی جیلوں میں بچوں کو جنم دینے کے بجائے زندگی کی یہ صعوبتیں برداشت کرنے کو ترجیح دی تھی۔

وان میں قیام کے دوران کمال زیادہ تر بیمار رہا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن سا آگیا تھا۔ ہر چیز کے بارے میں شکایت گویا اس کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ مجھ پر بھی بلاوجہ تنقید کرنے لگا تھا۔ جب تک ہم تہران میں رہے تھے۔ وہ فرہاد کو بے حد چاہتا تھا لیکن اب وہ فرہاد کو اپنے قریب بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ رات کو ہم تینوں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ لیکن اب کمال کا مطالبہ تھا کہ میں فرہاد کو کہیں اور سلایا کروں۔ مجبوراً میں فرہاد کو شیری کے کمرے میں سلانے لگی۔ بات صرف کمال تک ہی محدود نہیں تھی۔ گزشتہ واقعات نے ہم سب کو نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر بھی بیمار کر ڈالا تھا۔ گھوڑے کی برہنہ پشت پر مسلسل سفر کی وجہ سے میرے کولھوں کی کھال تک ادھڑ چکی تھی جن سے مجھے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ تھکن کے باعث بازوؤں اور ٹانگوں میں بھی چوبیس گھنٹے درد رہنے لگا تھا۔ جسم کے تمام اعضا شل ہو چکے تھے۔ دو ہفتے بعد کہیں تھکن کی اس تکلیف سے نجات مل سکی تھی۔

کمال نے تو اب اپنے کمرے ہی سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے پاس بھی کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ میں، فرہاد اور شیری شہر میں گھومتے رہتے۔ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند ہی چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔ چند صاف ستھرے ریسٹورنٹ بھی تھے۔ ہم تینوں بازاروں میں گھومنے کے بعد کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ جاتے، جہاں ایران سے بھاگے ہوئے اور بھی بہت سے لوگوں سے ملنے کا موقع مل جاتا۔ شیری بھی ابھی تک ذہنی طور پر اپ سیٹ تھی لیکن آرام، اچھے کھانوں اور سیرو تفریح سے اس کی ذہنی کیفیت سنبھلنے لگی۔ اس نے اپنے نقصان پر صبر کر لیا تھا اور اب مستقبل کے منصوبے بنا رہی تھی۔ اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ نئے پاسپورٹ کا حصول تھا۔ فرہاد تو گویا سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ دن بھر کھیلتا رہتا۔ اس نے بہت سے دوست بنا لئے تھے۔ پکڑے جانے کا خوف، پہاڑوں میں تین دن اور تین راتوں کے کٹھن ترین سفر کی صعوبتیں ہم سب کے لئے یہ ایک قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔

○☆○
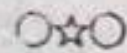
وان میں آخری روز تک میرے ذہن پر یہ خوف طاری رہا تھا کہ شاید ہمیں ایران کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ صرف میں ہی نہیں وان میں نظر آنے والا ہر خانماں برباد ایرانی اسی خوف کا شکار تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایرانیوں کے مہاجر کیمپوں میں نئی نئی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ ترک سمجھ رہے ہیں کہ ہماری تعداد ناقابلِ برداشت حد تک بڑھتی جا رہی ہے اور ہم ان پر بوجھ بنتے جا رہے ہیں..... آج انہوں نے ایرانی مہاجروں کے دو گروپوں کو ایران کے حوالے کر دیا ہے.... جب وہ ہم سے اکتا جائیں گے تو ہمیں ایرانیوں کے سپرد کر دیں گے.... آج واپس کئے جانے والے مہاجروں کے ایک گروپ کو ایرانی فوجیوں نے گولی سے اڑا دیا..... اس قسم کی افواہیں ہم سب کو بے چین کئے ہوئے تھیں اور ہم ہر وقت اپنے اردگرد ان جانے سے خطرات منڈلاتے ہوئے محسوس کر رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وان کی ترک پولیس ہر لحاظ سے ہماری مدد کر رہی تھی۔

بالآخر ایک روز انہوں نے ہماری روانگی کا اعلان کر دیا۔ استنبول تک اڑتیس گھنٹوں کے سفر کے لئے چالیس کاروں اور بسوں وغیرہ کا ایک قافلہ تیار کیا گیا تھا۔

استنبول تک کا یہ سفر بھی بڑا تھکا دینے والا ثابت ہوا لیکن اس سفر میں ہمارے ذہنوں پر کسی قسم کا خوف سوار نہیں تھا۔ استنبول پہنچتے ہی شیری نے وہاں رہنے والے اپنے رشتے داروں کو فون پر اطلاع دے دی اور وہ لوگ اسے اپنے گھر لے گئے۔ کمال کے اصرار پر ہم ہلٹن ہوٹل میں منتقل ہو گئے، جہاں دو کمرے کرائے پر لئے گئے تھے۔ اگرچہ میں اخراجات کے سلسلے میں بہت محتاط ہو رہی تھی۔ ایک کے بجائے دو کمرے کمال ہی کے اصرار پر لینے پڑے تھے۔ دراصل کمال، فرہاد کو اپنے کمرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور یہ صورتِ حال میرے لئے خاصی تشویشناک تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر فرہاد سے کمال کا یہی برتاؤ رہا تو زندگی کیسے گزرے گی۔ وان پہنچنے کے بعد فرہاد اگرچہ ہر چیز سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا لیکن بار بار رونما ہونے والی تبدیلیوں سے اب اس پر بھی بیزاری سی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی مستقل ٹھکانہ چاہتا تھا جسے وہ گھر کا نام دے سکے۔

استنبول یقیناً ایک خوب صورت شہر ہے۔ تنگ سی گلیاں اور بازار، مسجدوں کے گنبد اور فلک بوس مینار، نیلے آسمان کے پس منظر میں بڑا دلفریب منظر پیش کرتے ہیں لیکن استنبول میں تقریباً ایک ہفتہ قیام کے دوران ہمارا زیادہ وقت سوتے ہوئے ہی گزرا تھا۔ میں ابھی تک آزادی کی مہک محسوس نہیں کر سکی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے ابھی تک یقین ہی نہیں آیا تھا کہ میں آزاد ہوں۔ تہران میں، میں نے جو ویزے حاصل کئے تھے وہ اس وقت ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ تھے۔ استنبول کے تمام ہوٹل بدحال ایرانیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ ۱۹۸۳ء میں استنبول میں ایرانی مہاجرین کی تعداد کیا تھی لیکن ۱۹۸۷ء میں ترکی کے ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق

اس وقت پانچ لاکھ سے زیادہ ایرانی استنبول میں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی جو مستقبل کے راستے تلاش کر رہے تھے۔ استنبول میں کسی مغربی ملک کے سفارت خانے سے ویزا حاصل کرنے میں برسوں لگ سکتے تھے۔

ترکی میں رہنے والے ایرانی مہاجرین بدترین زندگی گزار رہے تھے۔ اخراجات کے معاملے میں کچھ لوگوں کو مغربی ممالک میں رہنے والے ان کے رشتے دار مدد دے رہے تھے اور جو لوگ کچھ قیمتی چیزیں اپنے ساتھ اسمگل کر کے لانے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ یہ چیزیں بیچ بیچ کر گزارا کر رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتی تھی کہ ہم لوگ اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے سے بچ گئے تھے۔ میں نے فرار سے پہلے تہران میں غیر ملکی کرنسی خریدنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔ ہمارے پاس ایک مغربی ملک کے ویزے موجود تھے۔ فی الحال اخراجات کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہم اطمینان سے جہاز پر سفر کر سکتے تھے۔ میں بہرحال اس مغربی ملک کے تہران میں واقع سفارت خانے میں کام کرنے والی اس خاتون کی بے حد شکر گزار تھی جس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر مجھے ویزے دے دیے تھے۔ بالآخر ایک روز ہم استنبول سے رخصت ہونے کے لئے ائرپورٹ پہنچ گئے۔ استنبول پولیس کا ایک آفیسر جو ہمارے قیام کے دوران ہم پر خاصا مہربان رہا تھا ہمیں ائرپورٹ چھوڑنے کے لئے آیا تھا۔ وشنگ اور پسنجرز لاؤنج کے رش سے نکال کر اس نے ہمیں جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچا دیا تھا۔ میں اس کے ہمدردانہ طرزِ عمل اور ہمیں الوداع کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔

جہاز جیسے ہی فضا میں پہنچا، میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی لیکن میری نظریں استنبول کے فلک بوس میناروں کو نہیں 'تہران کے نواح میں البرز کی برف پوش چوٹیوں' آذربائیجان کے مرغزاروں میں ہنستے ہوئے یاقوت جیسے ٹیولپ کے سرخ پھولوں' سرخ اینٹوں کے مکانوں اور سبز لون پر سائبان کی طرح سایہ کئے ہوئے نیلم جیسے شفاف آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ایران تھا۔ میری جنم بھومی' میرے آباؤ اجداد کی سرزمین' جس کی مٹی میں میرے بزرگوں کی ہڈیوں کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ آج بھی جب مجھے اپنا وطن یاد آتا ہے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

☆☆☆ — ☆☆☆

اب میں بھی لاکھوں دوسرے ایرانیوں کی طرح جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے ایرانی دنیا کے ہر ملک میں نظر آئیں گے۔ درمیانے طبقے کے وہ لوگ جن کے جوان بیٹے انقلابی حکومت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اب بھی اپنے زخموں کو سہلا رہے ہیں۔ وہ دولت مند ایرانی جو اپنا تھوڑا بہت سرمایہ ساتھ لے آنے میں کامیاب ہو گئے تھے کاروباری دنیا میں اپنے قدم جمانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ دانشور اور پیشہ ور ماہرین جو اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب بھی اپنی جان کے خوف سے بھاگے پھر رہے ہیں کیونکہ انقلابی حکومت کے حمایتی شکاری کتوں کی طرح ان کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ ترکی' اسپین' فرانس' سوئٹزرلینڈ' انگلینڈ' کینیڈا' امریکا اور دنیا کے دیگر بہت سے ملکوں میں ایرانیوں کی نو آبادیاں قائم ہو چکی ہیں اور ان نو آبادیوں میں رہنے والا ہر شخص زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

جہاں تک میرا' کمال اور فرہاد کا تعلق ہے تو ایران سے فرار ہونے کے بعد پہلے چھ مہینے ہمارے لئے خاصے ناخوشگوار ثابت ہوئے تھے۔ استنبول سے ہم پیرس آئے تھے جہاں کمال کے والدین رہائش پذیر تھے۔ ہم نے بھی ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا تھا۔ ہمیں پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب کمال نے پرانے ڈاک ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے ایک ڈیلر سے رابطہ قائم کیا۔ تہران میں کمال نے یہ ٹکٹ تین لاکھ ڈالر میں خریدے تھے اور اسے یقین دلایا گیا تھا کہ اگر دوگنا نہیں تو ڈیڑھ گنا قیمت پر ضرور بک جائیں گے لیکن یہاں ان کی قیمت صرف چھ ہزار ڈالر لگائی گئی تھی۔ ٹکٹوں کے معاملے میں کمال کو اس کے کزن نے دھوکا دیا تھا۔ پیرس پہنچنے کے چند ہفتوں بعد ایک اور دہشت ناک خبر ملی۔ میرے والد کو کمیٹی نے گرفتار کر لیا تھا اور ان کی تمام زمینیں اور جائداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔ تین ہفتے گزر گئے۔ میں اپنے والد کی طرف سے کسی نئی اطلاع کی منتظر رہی۔ مجھے یقین تھا کہ اب ان کی موت ہی کی اطلاع ملے گی لیکن تین ہفتے بعد یہ خوشخبری ملی کہ انہیں رہا کر دیا گیا تھا۔ لگتا تھا ایران سے نکلنے کے بعد بھی مجھے چین نہیں ملے گا۔ کچھ ہی عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ ماموں فائق کو کینسر ہو گیا تھا۔ اس کے چند ہفتوں بعد ان کے انتقال کی اطلاع بھی مل گئی۔

مجھے ایران سے کچھ اور سنسنی خیز اطلاعات بھی ملتی رہتی تھیں۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ ہمارے فرار والے روز جب فرہاد جمعے کے دن مقررہ وقت پر اپنی دادی کے گھر نہیں پہنچا تو ان کا پورا خاندان فوراً ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ کمیٹی کے اہل کاروں نے پورے شہر میں ہماری تلاش شروع کر دی جبکہ ملک سے باہر جانے والے تمام راستوں پر نگرانی قائم کر دی گئی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر تمام ہوائی اڈوں اور سرحدی چوکیوں پر میری اور فرہاد کی تصویریں فراہم کر دی گئی تھیں۔ میرے ماموؤں اور دیگر رشتے داروں کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ میرے رشتے داروں کو میری سسرال والوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ دنیا کے آخری سرے تک ہمارا تعاقب کریں گے اور ہمیں قتل کروا دیں گے۔ میں ان کی دھمکیوں کو مذاق سمجھ کر نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ آج بھی میں ان لوگوں سے اپنا پتا پوشیدہ رکھے ہوئے ہوں۔ میں

کبھی بھی اپنے آپ کو "سوسن آزادی" کی حیثیت سے متعارف نہیں کراتی، جو ان کے چنگل سے آزاد ہو گئی تھی۔ مجھے آج بھی یقین ہے کہ انہیں جب بھی میرے بارے میں پتا چلے گا، وہ مجھے اور میرے بیٹے کو قتل کرانے کی کوشش ضرور کریں گے۔

میری سسرال والے جو کچھ چاہتے تھے انہیں مل گیا تھا۔ میرا مکان، کیسپئن والا بنگلا، فرہاد کا کروڑوں ڈالر کا نقد سرمایہ اور بہت سی دوسری جائداد ان کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ کیسپئن والا بنگلا تو وہ اب بھی استعمال کرتے ہیں لیکن تہران والے مکان کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ کمیٹی نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا ہے۔ دونوں مالی اس مکان سے ملحق وسیع و عریض باغات پر قابض ہیں اور جلال آغا اور اس کی بیوی، جن کی غداری سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا، اب عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ہم تہران میں ٹھاٹھ دار زندگی گزارتے رہے تھے لیکن پیرس میں رہائش کے دوران ہماری زندگی بہت سادا تھی۔ تمام ٹھاٹھ خواب و خیال ہو کر رہ گئے تھے۔ یورپ میں اگرچہ فرہاد کے نام پر کئی اپارٹمنٹ، ولاز اور بنگلے موجود تھے لیکن مجھے انہیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ جائداد اب بھی ان ممالک کے قانون کی تحویل میں ہے اور اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے فرہاد بھی اپنی اس جائداد سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت فرہاد تیرہ سال کا ہو چکا ہے اور اپنی جائداد کا قانونی حق حاصل ہونے میں صرف پانچ سال باقی رہ گئے ہیں۔

مجھے ایران سے اسمگل کئے جانے والے قالینوں کی فروخت میں بھی خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ ایران سے فرار ہو کر آنے والا ہر ایرانی اپنے ساتھ کئی کئی قالین اسمگل کر کے لا رہا تھا۔ اس طرح یورپی منڈی میں ایرانی قالینوں کا سیلاب سا آگیا تھا جس سے قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ اس دوران میں کمال سے میرے ازدواجی تعلقات میں رخنہ آچکا تھا۔ اخراجات کی تنگی ہمارے گھریلو تعلقات پر مزید اثر انداز ہونے لگی۔ بہت سے دوسرے ایرانی مردوں کی طرح کمال بھی اپنے آپ کو اس نئی صورتِ حال سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے کوئی کام شروع کرنے میں بھی خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔

دراصل وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کام شروع کرنا چاہئے۔ تہران کے سنگین حالات، فرار اور پھر راستے میں پیش آنے والے واقعات نے اس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ بات بات پر لڑنے کو دوڑتا۔ اس کا زیادہ وقت گھر سے باہر ریستورانوں میں گزرتا جہاں وہ گھنٹوں بیٹھا خالی خالی نگاہوں سے لوگوں کے چہروں کو گھورتا رہتا۔ کمال کی ان حرکتوں کی وجہ سے میری زندگی بھی متاثر ہو رہی تھی لیکن میں بڑی مشکل سے ضبط کئے ہوئے تھی۔

فرہاد کو ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اس نے بہت جلد نئے ماحول سے سمجھوتا کر لیا تھا لیکن دن گزرنے کے ساتھ ساتھ میری مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنا وطن، شہر کے گلی کوچے، عزیز رشتے دار اور دوست بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے۔ ان کی یاد پر میں بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ جاتی۔ تہران میں رہتے ہوئے کفایت شعاری سے میں نے جو بھی بچت کی تھی وہ فرار ہونے سے پہلے ہی ملک سے باہر بھجوا دی تھی اور اب وہی رقم ہمارے کام آ رہی تھی۔ تمام جیولری میں نے تھیلیوں میں بند کر کے کچن کے اوون میں چھپا دی تھی کیونکہ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں جیولری چھپانے کے لئے مجھے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ضرورت پڑنے پر ان میں سے کچھ چیزیں نکال کر فروخت کر دوں گی۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ آج چکن روسٹ بنانا چاہئے۔ کمال اور فرہاد کو بھی یہ پسند تھا۔ چکن روسٹ اور دیگر لوازمات کی تیاری میں آدھا دن لگ گیا۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس روز کمال اور فرہاد نے شوق سے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ اس سے اگلے روز مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ چکن روسٹ تیار کرنے سے پہلے میں اوون میں سے جیولری نکالنا بھول گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں دوڑتے ہوئے کچن میں پہنچ گئی اور اوون کھولتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سونا پگھل کر بہہ گیا تھا اور موتی راکھ بن کر بکھر گئے تھے۔ چمڑے کی تھیلیوں میں رکھے ہوئے ڈائمنڈ بھی کوئلے کی طرح سیاہ ہو گئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ایک اور موقع پر، جب میں کچھ کاغذات کی فوٹو کاپی بنوانے گئی تھی تو دکان پر اپنا پاسپورٹ بھول آئی تھی۔ گھر پہنچ کر جیسے ہی مجھے یاد آیا میں بدحواس ہو کر دکان کی طرف دوڑی لیکن مجھے پاسپورٹ نہیں ملا۔ میرا پاسپورٹ یا تو دکان دار نے غائب کر دیا تھا یا کوئی اور گاہک اٹھا کر لے گیا تھا۔

شاہ کے دور کا ایران کا آخری وزیر اعظم شاہ پور بختیار پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ تہران میں رہتے ہوئے میرے اس سے قریبی تعلقات رہے تھے۔ جب میں نے اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کی سفارش پر فرانسیسی حکام نے مجھے شناختی کاغذات جاری کر دیئے، اگر میں اس مقصد کے لئے پیرس میں ایران کے سفارت خانے سے، جو مذہبی رہنماؤں کے زیر اثر تھا، رابطہ قائم کرتی تو شاید وہ لوگ فرانسیسی حکام سے سفارش کرتے کہ مجھے ملک ہی سے نکال دیا جائے۔ اس دوران میں کمال سے میرے تعلقات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ اس سے نباہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور فرہاد کو لے کر کینیڈا آ گئی جہاں ٹورنٹو

میں میرے ماموں اردشیر اور بھائی کیتی مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ اس کے ایک سال بعد مجھے کمال سے طلاق لینے کے لئے چند روز کے لئے پیرس جانا پڑا تھا۔

کینیڈا آنے کے بعد حامد اور صوفی سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک موقع پر انہوں نے بتایا کہ امریکا میں کاروباری لوگوں سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے لیکن اب وہی امریکی ان سے ملنے سے بھی کترا رہے تھے۔ اس کی وجہ ۱۹۷۹ء میں تہران میں پیش آنے والا وہ واقعہ تھا جب ایران کے انقلابی طلبا نے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر لیا تھا اور سفارت کاروں کو طویل عرصے تک یرغمالی بنائے رکھا تھا۔ میرے سارے دوست ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ شیری ترکی سے پیرس چلی گئی تھی۔ اس کے لئے پیرس کا ویزا بھی میرے کہنے پر شاہ پور بختیار ہی نے لے کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ پیرس میں رہنے کے بعد شیری امریکا چلی گئی تھی اور اب بھی وہیں ہے۔ شیری کا خیال تھا کہ تہران میں معذور افراد کے اسکول چلانے کے دوران غیر ممالک میں جن لوگوں سے اس کی دوستی ہوئی تھی یا جن بڑے بڑے اداروں نے ان دنوں اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی، اسے اب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کچھ مدد دیں گے لیکن اب وہ لوگ فون پر اس کا نام سنتے ہی فون بند کر دیتے۔ کوئی بھی غیر ملکی دوست اس کے کام نہیں آیا تھا۔ بے چاری شیری ان دنوں کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔

کمال سے میری شادی سے حامد میری طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے بھی شادی کر لی اور ان دنوں وہ کیلی فورنیا میں ہے جہاں وہ اپنا کاروبار جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ صوفی اپنی بیوی کے ساتھ یورپ میں ہے۔ اس سے اب بھی میرے تعلقات پہلے کی طرح ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی میرا سچا دوست ثابت ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وقتاً فوقتاً مجھ سے اور فرہاد سے ملنے کے لئے کینیڈا آتا رہتا ہے۔ فرہاد سے بھی اس کی گہری دوستی کا رشتہ قائم ہے۔

تہران میں ایک سفارت خانے کا میرا دوست پال اور اس کی بیوی اینا اپنے ملک آ گئے ہیں۔ کبھی کبھار ان سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ میرے پہلے شوہر کاشان کا بزنس پارٹنر جمشید بھی اپنی جان بچا کر ترکی کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس پر بھی قالینوں کی اسمگلنگ کا الزام تھا اور کمیٹی اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ جمشید ان دنوں شاید پیرس میں ہے۔ شولے اور درویش کیلی فورنیا میں ہیں۔ وہاں انہوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔ فیروزہ اور اس کا شوہر چھ مہینے انگلینڈ اور چھ مہینے امریکا میں گزارتے ہیں۔ وہ دو ایرانی نوجوان، محمود اور رضا جو فرار کے آخری مرحلے میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے، چند مہینے اسپین میں گزارنے کے بعد بالآخر امریکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ محمود تو اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ رضا ملازمت کر رہا ہے۔ محمود کے تمام اخراجات بھی وہی برداشت کر رہا ہے، ان کی مثالی دوستی کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اور فرہاد ایک لحاظ سے مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ میں زیورات کی ڈیزائننگ کا کام کرتی ہوں جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ عزت کی روٹی مل جاتی ہے۔ کینیڈا میں قیام پذیر کئی ایرانی مرد مجھ سے شادی کے خواہشمند ہیں۔ میں شادی ضرور کروں گی کیونکہ ظاہر ہے مجھ جیسی عورت کے لئے شادی کے بغیر پہاڑ جیسی جوانی گزارنا بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن اب میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں اس شخص سے شادی کروں گی جو میرے حقوق کی ضمانت دینے کے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کی تمام ترذمے داریاں بھی قبول کر لے۔ میرا خیال ہے ہمارے گروپ میں فرہاد ہی وہ واحد ہستی ہے جس نے فرار اور زندگی کی اذیت ناک تبدیلیوں سے کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ انگریزی روانی سے بولنے لگا ہے اور گزرے ہوئے واقعات کو فراموش کر کے اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر نئے ماحول میں ڈھال لیا ہے۔ اسے ایران سے نکالنے کا میرا فیصلہ درست ہی تھا اور میرا خیال ہے اب وہ کبھی ایران واپس جا کر اپنی وراثت کے حصول کا دعویٰ نہیں کر سکے گا۔

اب بھی جب میں کبھی اپنے ملک کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کتنے خاندان برباد ہوئے، کتنی بیویاں اپنے شوہروں سے محروم ہو گئیں، کتنی ماؤں سے اولاد چھین کر ان کی گود اجاڑ دی گئی۔ میں جب بھی اخبار اٹھاتی ہوں تو نئے واقعات کے بارے میں پڑھ کر دل دہشت سے کانپ اٹھتا ہے۔ یہ خبر بھی سننے میں آئی ہے کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن ایران کو ہتھیاروں کی فروخت کے اسکینڈل میں ملوث ہے۔

ہمارے طبقے کے وہ لوگ، جو غیر ممالک میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں یا اب بھی ایران میں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ اب وہ کبھی اپنے وطن واپس نہ جا سکیں گے کیونکہ امام خمینی اور ان کے جانشینوں نے ایسی کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ غیر ممالک میں ایران کا وقار ختم ہو چکا ہے۔ یہ جاننے کے بعد کہ ہم ایرانی ہیں، لوگ ہمارے سائے سے بھی دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میری بھی یہ امید اب دم توڑ چکی ہے کہ میں کبھی ایران واپس جاؤں گی۔ میں جب بھی ایسی کوئی بات سوچتی ہوں مجھے ایران کے مشہور شاعر ملا بیلی ویدادی کے یہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں۔

"ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تم اپنے گھر کے بارے میں سوچو گے تو تمہاری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلیں گے"

☆☆☆——☆☆☆

محی الدّین نواب

شہرت اور مقبولیت کے درمیان جو واضح فرق ہے وہی کسی شخص کا مقام و مرتبہ متعین کرتا ہے۔ مشہور ہونا اتنا مشکل نہیں جتنا مقبولیت حاصل کرنا ہے۔ محی الدّین نواب اُردو کے اُن چند خوش قسمت مصنّفین میں سے ایک ہیں جنہیں بہت سے دیگر مشہور مصنّفین سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ نواب صاحب کا قاری اُن سے والہانہ محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ چند سال پہلے کیے گئے ایک سروے کے مطابق وہ خواتین کے پسندیدہ رائٹرز کی فہرست میں بھی پہلے نمبر پر تھے۔ نواب کے چاہنے والوں میں ایسے افراد بھی دیکھنے میں آئے جو مُلک کے دُور دراز حِصّوں سے صرف نواب کو دیکھنے اور اُن سے ملنے کے لیے کراچی آتے تھے۔ ایک عاشقِ صادق نے تو کمال ہی کر دیا۔ اُس نے نواب صاحب کی طویل ترین کہانی "دیوتا" کے صفحات ہی نہیں، ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کو شمار کیا اور ثابت کیا کہ نواب صاحب دُنیا کی طویل ترین کہانی لکھنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف کی خواہش تھی کہ یہ اطلاع گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ کے مرتبین کو پہنچائی جائے مگر نواب صاحب ابھی تک اس کام کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔

نواب بیتی سیکڑوں کہانیاں سُنانے والے محی الدّین نواب کی اپنی کہانی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا ہی جیتا جاگتا انسان ہے جیسے دیگر بہت سی دوسری کہانیوں میں ہوتے ہیں جن کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور دل میں موجزن جذبات و احساسات کا وہی عالم ہوتا ہے جو بشریت کا تقاضا اور آدمیت و انسانیت کا طُرّۂ امتیاز رہا ہے۔

نواب بیتی اسی خاک کے پُتلے کی ازلی و ابدی آپ بیتی ہے جس نے جنت سے نکل کر بھی اپنے شرف و امتیاز کو برقرار رکھا۔ نواب صاحب نے اِسے اُسی جرأت و بے باکی سے تحریر کیا ہے جس کے لیے اُن کی جگ بیتیاں مشہور ہیں۔ اپنی کہانی میں اُنہیں جراحتِ دل کے جس مرحلے سے گزرنا پڑا ہے اُس کی داد صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہیں سچائی کی تلخیوں کا اندازہ ہے۔ اس منزل سے بڑے بڑے حق گو یہی کہتے گزر جاتے ہیں۔

ع سچ اچھا، پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
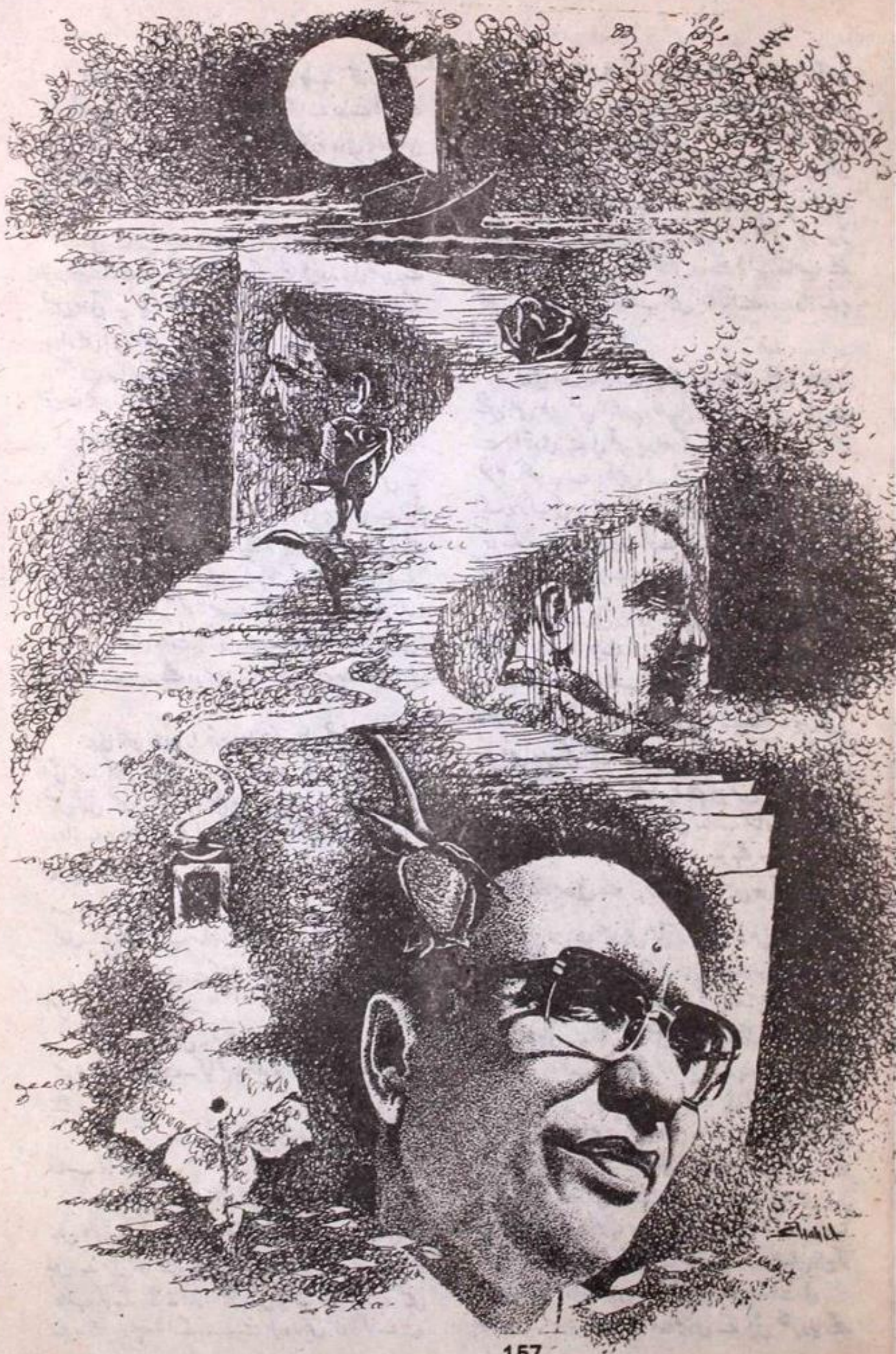
مجھے محبت چاہئے' جتنی ملے' اتنی چاہئے' قادر مطلق نے مجھے پیدا کرنے سے پہلے سمجھایا تھا "اے بندے! میرے اختیار میں سب کچھ ہے' تو جو کچھ مانگے گا وہ دوں گا۔ لیکن مانگنے کی ایک حد ہوتی ہے تو اپنی حد اور حیثیت سے زیادہ نہ مانگنا۔"

اسی لئے میں محبت مانگتا ہوں اگر تاج محل مانگتا تو میری حد اور حیثیت سے زیادہ ہوتا' محبت کے لئے مال و زر کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ ایک مسکراہٹ سے مل جاتی ہے۔ اس دنیا کے بازار میں اس کا بھاؤ نہ گھٹایا جاسکتا ہے نہ اپنی مرضی سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایک یہی چیز ہے جو' ہر امیر اور غریب کی حد اور حیثیت میں رہتی ہے۔

محبت کا فطری عمل یہ ہے کہ مرد چاہنے کے لئے ہوتا ہے اور عورت چاہے جانے کے لئے ہوتی ہے لیکن میں اس کے برعکس ہوں۔ اپنی زندگی میں آنے والی ہر ہستی سے توقع کرتا ہوں کہ وہ مجھے چاہے' وہ دیکھے تو مجھے دیکھے' سوچے تو مجھے سوچے' وہ لب کھولے تو زبان پر میرا نام آئے۔ اس کی "ہائے" دوسروں پر جائے مگر "آہ" میرے لئے ہو۔ دراصل میری والدہ مرحومہ نے میری عادت بگاڑ دی ہے۔ وہ مجھے اتنا چاہتی تھیں' اتنا چاہتی تھیں کہ مجھے دوسروں سے بھی چاہے جانے کی بیماری ہو گئی۔

میری اماں جان ذرا سخت مزاج کی حامل تھیں۔ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ میری کسی معاملے میں سبکی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ ایک بار نائی میرے بال کاٹنے آیا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر میرا نام لیا "نواب! اے نواب!"

اماں جان نے غصے سے دروازہ کھولا۔ پھر ساڑی کے آنچل کو کمر سے باندھتے ہوئے تڑخ کر بولیں "اے میرے بیٹے کو نواب کیوں کہتے ہو؟ نواب صاحب نہیں کہہ سکتے؟"

نائی نے عاجزی سے کہا "بیگم صاحب! یہ ابھی بچے ہیں اس لئے نواب کہہ دیا۔"

وہ ڈانٹ کر بولیں "تم بال کاٹنے والے نائی' تم کیا جانو' بڑا نام ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ کیا تم بادشاہ کو اے بادشاہ سلامت کہہ سکتے ہو؟"

"نہیں کہہ سکتا۔ غلطی ہو گئی بیگم صاحب! آئندہ نواب صاحب کہا کروں گا۔"

ہمارے ہاں آنے والوں میں سبزی والا یا دودھ والا ہو۔ ابا جان کا کوئی دوست ہو یا خاندان کا کوئی بزرگ ہو۔ سب ہی اماں جان کے مزاج کو سمجھتے تھے اس لئے مجھے نواب صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہمارا تعلق کسی نواب خاندان سے نہیں ہے۔ ہم دادا پردادا کے زمانے سے مزدور ہیں' روز کماتے ہیں' روز کھاتے ہیں۔ ہر ماں کا یہ خواب ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے۔ میری اماں جان کی بھی یہی خواہش تھی۔ جب میں پیدا ہوا تو ان کے پاس مجھے بڑا آدمی بنانے کا کوئی فارمولا نہیں تھا۔ تایا ابا نے میرا نام شیخ محمد محی الدین شریف رکھا اور اماں جان کو سمجھایا کہ یہ بہت بڑا نام ہے مگر ان کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ چاہتی تھیں سارے جہاں کے لوگ مجھے افضل اور برتر سمجھیں۔ لہٰذا اپنی سمجھ کے مطابق وہ مجھے نواب صاحب کہنے لگیں۔ جو مجھے نواب صاحب نہیں کہتا تھا اسے وہ دروازے پر قدم رکھنے نہیں دیتی تھیں۔

میری اماں جان نے علم نفسیات حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن اس طرز عمل کا مجھ پر نفسیاتی اثر ہوا۔ مجھ میں بچپن ہی سے بڑا آدمی بننے کی لگن پیدا ہو گئی۔ میں چاہتا تھا سب مجھے تعریفی نظروں سے دیکھیں اور مجھ سے محبت کرتے رہیں۔ ایک بزرگ کی یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ تم دنیا سے محبت کرو گے تو دنیا تم سے محبت کرے گی۔ تم لوگوں کی عزت کرو گے تو لوگ تمہاری عزت کریں گے۔

اس دن سے میں بزرگوں کا بے حد احترام کرنے لگا۔ اپنے ہم عمر دوستوں کو عزت سے مخاطب کرنے لگا۔ میں ہر ایک کے نام کے ساتھ "صاحب" کا اضافہ کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے تمام لوگ مجھے نواب صاحب کہنے لگے۔ یوں میں نے اماں جان کی ایک خواہش پوری کر دی لیکن اس خواہش کے پیچھے ایک جذبہ تھا' مجھے اپنے نام کی طرح افضل اور برتر دیکھنے کا جذبہ اگر میں کسی کو جمال صاحب کہتا تو وہ مجھے جواباً نواب صاحب کہتا تھا یعنی ہم برابر ہوتے تھے۔ اماں جان کی شدید ممتا کے مطابق مجھے برتری حاصل نہیں ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ بات سمجھ میں آئی کہ برتری دو طرح سے حاصل ہوتی ہے اگر ہم شہ زور ہیں تو کمزوروں کو لات اور جوتے مار کر یا دولت مند ہیں تو ضرورت مندوں کو اپنا محتاج بنا کر برتری حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ منفی انداز ہے جبکہ مثبت انداز یہ ہے کہ آدمی اپنے علم سے اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے برتری حاصل کرتا ہے یوں دوسروں کو اپنی ذات سے محبت کراتا ہے یہ محبت جبری نہیں ہوتی۔ لوگ اس برتری حاصل کرنے والے کو راضی خوشی چاہتے ہیں۔ میری اماں جان کی شدید ممتا نے مجھے اسی مثبت راہ عمل پر ڈالا ہے۔ آج میں تحریر کی دنیا کا نواب صاحب ہوں۔ کوئی مجھے جبراً نواب صاحب نہیں کہتا۔ میں اپنی دنیا اور اپنے معاشرے کے لئے چن چن کر لفظوں کے موتی فقروں کے نشتر اور موضوعات کی تاثیر لاتا ہوں۔ میری محنت اور صلاحیتوں کے پیش نظر دنیا مجھے

احترام سے، عقیدت سے اور محبت سے نواب صاحب کہتی ہے اور میری ماں کی چاہتی تھی۔

تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک اچھا پہلو پیش کیا ہے اس کا دوسرا پہلو کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں ساری دنیا کی محبت حاصل کرنے کی لگن میں اپنی ذات کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگا ہوں۔ میرے اندر ایک ڈھکی چھپی خود غرضی ہے اگر میں کسی کو ظفر صاحب کہتا ہوں تو دل سے اسے صاحب نہیں سمجھتا۔ میری ایک ہی غرض ہوتی ہے کہ وہ جواباً مجھے نواب صاحب کہتے رہیں۔ میں کسی کی تعریف کرتے وقت خوب سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے حلقے میں جاکر ضرور میری تعریف کرے گا چوں کہ میری فطرت میں چاہے جانے کی خواہش زیادہ ہے اور اپنی ذات کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اس لئے محبت ایسی عورتوں سے کرتا ہوں جو مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہوں اور میرے چاہے جانے کی خواہش کی تکمیل کرتی ہیں۔

آج سے کوئی چالیس برس پہلے میں نے پہلا عشق کیا۔ میں نوعمر جوان تھا، وہ بھی نوخیز تھی۔ جب وہ میرا انتظار کرتی تو میں مسرتوں سے بھر جاتا تھا وہ میرے لئے راتوں کو جاگتی تھی۔ ان دنوں ہم شمالی بنگال میں تھے۔ دارجلنگ کے پہاڑ برف سے ڈھکے رہتے تھے۔ ہمارے گھر سے کنچن چنگا کی بلند و بالا برفانی چوٹی دکھائی دیتی تھی۔ وہاں ایسی غضب کی سردی پڑتی تھی کہ کلیجہ کانپنے لگتا تھا۔ سرد و سفید اوس کے دھندلکے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں وہ آدھی رات کے بعد دبے قدموں آنگن میں آتی تھی اور ں کی طرف کا دروازہ کھول کر میرا انتظار کرتی رہتی تھی۔ جب میں آتا تو وہ سرگوشی میں کہتی: "کیسی مجبوری ہے میں اپنی بات بھی نہیں کہہ سکتی۔ ڈر لگتا ہے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔"

ہم باتیں نہیں کرسکتے تھے۔ فجر کی اذان تک ہماری محبت گونگی ہوتی تھی، پھر میں چلا آتا تھا۔ وہ میرے ماموں کی بیٹی تھی ہم دن میں ایک دوسرے کا سامنا کرتے رہتے تھے مگر کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ سوتیلی ماں کے سائے میں صبح سے رات گئے تک گھر کا کام کرتی رہتی تھی۔ میں سوچتا تھا، اسے سونے یا آرام کرنے یا کمر سیدھی کرنے کا موقع کب ملتا ہوگا؟ جب وہ دن رات کی محنت سے تھک کر چور ہو جاتی تھی اور آرام سے سونے کا وقت آتا تھا تو میرے ملن کی گھڑی آجاتی تھی۔ وہ میرے لئے اپنی آنکھوں سے نیند کو رخصت کردیتی تھی۔ اپنی تھکن کو بھول جاتی تھی۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ ایسی شدت سے چاہا جاؤں۔ میں محبت میں "کچھ" کروں تو وہ "بہت کچھ" کرتی رہے۔

ایک برس بعد ہماری شادی ہوگئی۔ میں شادی کے دن تک بے روزگار تھا، آمدنی کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ بچپن سے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ یہ شوق عمر کے ساتھ جوان ہوگیا تھا۔ میں نے ترقی پسند تحریک میں حصہ لیا، کبھی مولانا بھاشانی کی کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو کر ماؤزے تنگ کے ارشادات کا ترجمہ کیا اور کبھی روسی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو کر ان کے لٹریچر کا ترجمہ اردو زبان میں کرتا تھا۔ یہ سب بیکاری کے مشغلے تھے۔ گھر کا چولہا جلانے کے لئے کہیں سے ایک روپیہ بھی نہیں ملتا تھا، کبھی کوئی عارضی ملازمت ملتی تھی، وقتی طور پر خوشحالی نصیب ہوتی تھی پھر فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ میں، میری شریک حیات اور میرے بچے پچیس برس تک جہنمی زندگی گزارتے رہے۔ پچیس برس کم نہیں ہوتے۔ لوگ اتنے عرصے میں سلور جوبلی مناتے ہیں۔ میرے بچے جوان ہو کر فاقوں، بیماریوں اور دکھوں کی سلور جوبلی کرچکے تھے۔

مجھے شرم آتی تھی۔ میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ میری بیگم بھی دن رات کپڑے سلائی کرتی تھی، پھر بھی ہم بچوں کے لئے خوشحالی نہ لاسکے۔ میں لاہور اور کراچی سے شائع ہونے والے ڈائجسٹ اور ناول دیکھتا تھا کبھی کسی سے مانگ کر پڑھ لیتا تھا اکثر یہ سننے میں آتا تھا کہ ڈائجسٹوں میں لکھنے والے اور اپنے ناول شائع کرانے والے مصنفین ہزاروں روپے کماتے ہیں۔ ہر ماہ ایک کہانی لکھ کر دولت، شہرت اور عزت حاصل کرتے ہیں۔ میں تصور میں انہیں دیکھتا تھا۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں نظر آتے تھے۔ ان کے بچے کاروں میں بیٹھ کر مہنگے اسکولوں میں جاتے تھے اور وہ اپنی بیٹیوں کی شادیوں میں لاکھوں روپے کا جہیز دیتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میرا ایک مخلص دوست کہتا تھا: "ایسے آسمان کو کیا دیکھتے ہو۔ تمہارے پاس قلم کا ہنر ہے۔ کب تک ادبی محفلوں میں بیٹھ کر افسانے پڑھتے رہو گے اور خالی واہ واہ سمیٹ کر خوش ہوتے رہو گے۔ ایک بار سسپنس میں بھرپور کمرشل کہانی لکھ کر چھپواؤ، تمہارا بھی نام ضرور ہوگا۔ تمہارے بھی دن پھر جائیں گے۔"

وہ دوست واقعی مخلص تھا۔ مجھے سمجھاتا تھا: "زندگی کا راستہ بدل دو۔ آخر اس راستے پر کب تک چلتے رہو گے جہاں پچیس برس سے کانٹے چبھتے رہے ہیں؟"

اس کی باتیں دل کو لگتی تھیں لیکن میری کچھ مجبوریاں تھیں۔ لاہور یا کراچی ہزاروں میل دور تھا۔ وہاں جانے اور رہنے کے لئے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ ان دنوں ڈھاکا سے لاہور جانے والی فلائٹ کا کرایہ دو سو پچیس روپے تھا۔ میری

بیگم نے کہا "میں سلائی مشین بیچ دوں گی۔ لاہور کا کرایہ نکل آئے گا۔"

میرے ایک بزرگ رشتے دار نے مزید اخراجات کے لئے پانچ سو روپے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے باوجود حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے مستقبل سنوارنے کے لئے کبھی کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ کسی نئی جدوجہد کا آغاز کرتے ہی ناکامی کا خوف غالب آجاتا تھا۔ ڈھاکا سے لاہور جانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی پسماندہ ملک سے ترقی یافتہ ملک میں جا رہا ہو۔ میں اندر ہی اندر احساس کمتری میں جتلا ہو رہا تھا۔ میرے دوست نے پوچھا "جانے کے لئے رقم کا انتظام ہو چکا ہے' پھر پس و پیش میں کیوں ہو؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "وہاں رضا کے بک اسٹال پر لوگ باتیں کر رہے تھے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ڈائجسٹ میں بڑے بڑے رائٹر لکھتے ہیں' وہاں میری دال نہیں گلے گی اور یہ سچ ہے میرے لئے وہ شہر نیا ہو گا' وہاں کے لوگ اجنبی ہوں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا' میں اپنے لئے جگہ کیسے بناؤں گا۔"

میری عادت ہے کوئی محبت سے اپنی بات منوالے تو مان لیتا ہوں اگر کوئی مجھ سے اونچا ہو کر حکم دے تو کبھی نہیں مانتا۔ شاید اس لئے کہ مجھے اپنے آپ کو منوانے اور اپنی ذات سے محبت کروانے کی عادت ہے۔ اسی لئے میں نے آج تک کہیں ملازمت نہیں کی۔ کسی کو اپنا باس نہیں بنایا۔ میں ایک کمرشل آرٹسٹ بھی ہوں۔ کبھی فاقوں کی نوبت آتی ہے تو نوکری نہیں کرتا۔ تصویریں بنا کر کچھ نہ کچھ کما ہی لیتا ہوں۔ یہ سلسلہ ایک اجنبی شہر میں قائم رہے گا یا نہیں' اسی بات کی فکر تھی۔

میرے دوست نے کہا "تم وہاں پہنچ کر کسی ڈائجسٹ کے دفتر میں نہ جانا۔ مجھ سے چار ہزار روپے قرض لو۔ ایک ناول لکھو اور خود اسے شائع کرو۔ یوں اپنی کہانی شائع کرانے کے لئے کسی کی خوشامد نہیں کرنی ہو گی۔ اللہ نے چاہا تو ناولوں کی دنیا میں نام پیدا کر لو گے۔"

میرے اس مخلص دوست کا نام اسد اللہ ہے۔ میں آج بھی اس کا احسان مانتا ہوں اور مرتے دم تک مانتا رہوں گا۔ ان دنوں خواتین کے تحریر کردہ ناول ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے تھے۔ مرد حضرات کی تحریریں ڈائجسٹوں تک محدود تھیں۔ میں نے لاہور پہنچ کر ایک فرضی نام سے ناول لکھ کر شائع کیا۔ میں ابتدا ہی سے بڑے محتاط انداز میں پوری ذمے داریوں کے ساتھ لکھتا آیا ہوں۔ مجھے کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔ لیکن اس پہلے ناول کو جو شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھی۔ میرے آس پاس پبلشروں کی بھیڑ لگنے لگی۔ سب ہی مجھ سے ناول لکھوانا چاہتے تھے۔ میں مصنف کی حیثیت سے کامیاب تھا لیکن پبلشر کی حیثیت سے نقصان اٹھا رہا تھا۔ کاروبار کی اونچ نیچ اور ہیرا پھیری میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لہٰذا میں نے کاروبار سے ہاتھ اٹھا لیا۔ دوسرے پبلشروں کے لئے لکھنے لگا۔ اچھرا میں ایک مکان لے کر بیوی بچوں کو بلا لیا۔ ان دنوں بڑی تنگ دستی تھی۔ ایک ناول کا معاوضہ چھ یا سات سو روپے تھا۔ کبھی کوئی دل والا پبلشر ہزار روپیہ بھی دے دیتا تھا' پھر بھی گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادیاں بڑی تنگ دستی اور محتاجی کی حالت میں کیں۔ اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور سوچتا رہا۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ڈھاکا شہر میں رہ کر سنتا تھا۔ لاہور اور کراچی کے مصنفین ایئر کنڈیشنڈ کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ یہاں میں اچھرے کی ایک تنگ سی گلی کے مکان کا کرایہ باقاعدہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اور میرے بیوی بچے کبھی خوشحالی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ یونہی مٹی کے کیڑوں کی طرح رینگتے رینگتے دنیا سے گزر جائیں گے۔

لاہور میں ایک ناشر' جناب حلیم صاحب ہیں جو ادارہ گوشہ ادب سے دینی کتب شائع کرتے ہیں۔ رومانی اور معاشرتی ناول بھی فروخت کرتے ہیں۔ پانچوں وقت کے نمازی ہیں اور صحیح معنوں میں اللہ والے ہیں۔ ایک روز ہم آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے' اس دوران وہ بار بار میری پیشانی کو دیکھ رہے تھے پھر اچانک ہی انہوں نے کلمہ کی انگلی سے میری پیشانی کو چھو کر کہا "تین بیویاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "جناب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں ایک ہی بیوی کو نیا کپڑا خرید کر نہیں دے سکتا۔ آپ تین کی بات کر رہے ہیں۔"

انہوں نے کہا "مجھ سے کوئی بحث نہ کرنا۔ کوئی اور سوال نہ کرنا۔ وہ تینوں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک دولت ہے' دوسری عزت ہے اور تیسری شہرت۔"

میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اپنے مستقبل سے مایوس تھا۔ مجھے ان کی باتوں کا یقین نہیں تھا مگر ان کی بزرگی اور شخصیت متاثر کرتی تھی۔ میں ان کے سامنے مایوسی کا اظہار نہ کر سکا لیکن انہوں نے کمال کی پیشنگوئی کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یقین آیا کہ اللہ تعالیٰ غیب کی باتیں اپنے نیک بندوں کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ اس پیشنگوئی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد معراج رسول صاحب میرے ہاں تشریف لائے اور کہا "نواب صاحب! اگر آپ کراچی میں رہائش اختیار کرنا چاہیں تو میں انتظام کروں گا۔

کہانیوں کا معقول معاوضہ ملے گا۔ آپ جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ کے لئے لکھیں۔"

بس یہاں سے مجھے قلم کی سکندری مل گئی۔ میرے لئے سسپنس کے آخری صفحات مخصوص کئے گئے۔ ان دنوں ڈائجسٹوں میں جاسوسی اور دیومالائی کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ سماجی اور معاشرتی کہانیاں گاہے گاہے نظر آتی تھیں۔ میں نے سسپنس کے آخری صفحات میں اپنے سماج اور معاشرے سے چن چن کر طنزیہ کہانیاں پیش کیں۔ میٹھا زہر' لہو کے پھول' محبت کا عذاب' ایمان کا سفر اور کچرا گھر، جیسی ناقابل فراموش کہانیاں لکھیں "سدا سہاگن" جیسے اچھوتے موضوع پر نہ پہلے کبھی کسی نے قلم اٹھایا تھا اور نہ آج تک کسی نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ موضوعاتی کہانیاں مجھے شہرت کی طرف لے جارہی تھیں۔ میرے دن پھر رہے تھے۔ پہلے میں بیمار رہتا تھا۔ اب بیماریوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ چہرے پر رونق آگئی تھی۔ جسمانی اور دماغی صحت مندی کے پیش نظر آئینہ کہتا تھا کہ میں پینتالیس برس کی عمر میں پھر سے جوان ہوگیا ہوں۔

مجھ پر صحیح معنوں میں شباب اس وقت آیا' جب سسپنس کے صفحات میں دیوتا کا آغاز ہوا۔ اس تچی پیش گوئی کے مطابق تینوں بیویاں' میری زندگی میں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوگئی تھیں۔ فن کار اور ہنر مند کبھی راتوں رات دولت مند نہیں بنتے۔ ان کی سچی لگن اور انتھک محنت رفتہ رفتہ زیادہ آمدنی کی طرف لے جاتی ہے اور یہ دولت بیگم ہے کہ آتے آتے شرماتی ہے اور شرماتے شرماتے آتی ہے۔ آخر ایک روز اس کا ٹیلی فون آگیا۔ میں گہری نیند میں تھا۔ گھنٹی کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔
"ہے لو۔ کو۔ اون ہے ؟"

ایک گنگناتی ہوئی سی آواز سنائی دی "آپ پہلے جماہی لیں پھر بات کریں' آدمی کو ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہئے۔"

"نصیحت کا شکریہ۔ فرمایئے ؟"
"آپ محی الدین نواب ہیں ؟"
"جی ہاں' اتفاق سے میں ہی ہوں۔"

اتفاق کا مطلب کیا ہوا' جبکہ آپ ہیں ؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اتفاق سے اس دنیا میں ہیں' ورنہ اللہ کو پیارے ہوجاتے۔"

کمبخت بہت بولتی تھی۔ میں نے کہا "درست کہتی ہو کل ٹریفک کے حادثے میں بال بال بچا۔ جب تک ہم کراچی شہر میں ہیں' اتفاق سے زندہ سلامت ہیں۔"

وہ بولی "میں نے طنز کیا تھا۔ آپ نے اس بات کو تلخ حقیقت کی طرف موڑ دیا۔ واقعی آپ باتیں بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔"

میں نے پھر جماہی لی۔ اس نے پوچھا "کیا سچ مچ جماہیاں آرہی ہیں یا مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لئے ریسیور کے سامنے منہ کھول رہے ہیں ؟"

"کسی کو دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاتا ہے کہ پیچھا چھڑانا چاہئے یا نہیں۔"

"یعنی اب آپ مجھے دیکھنا چاہیں گے۔"

"اس کا انحصار تم پر ہے کہ تم کہاں تک دیکھنے دو گی۔"

وہ ذرا سخت لہجے میں بولی "آپ جیسے مصنف کی زبان سے ایسا سستا فقرہ سننے کی توقع نہیں تھی۔"

میں نے ایک اور مذہبی تاریخی فقرہ ادا کیا ہے۔ "حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے دید کی تمنا کی "اے رب جلیل! میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں" ندا آئی تو مجھے دیکھ نہیں سکے گا' تیری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ حوصلہ جواب دے جائے گا" حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے کہا "میرے معبود! تو میری قوت برداشت کو جانتا ہے۔ میں جہاں تک دیکھ سکوں وہاں تک دیدار کرادے" تب طور کے سینے پر ایک تجلی نمودار ہوئی۔ انہوں نے دیکھا اور دیکھتے ہی بیہوش ہوگئے۔"

میں نے ذرا توقف سے کہا "میں نہیں جانتا تمہارے دیدار کی حد کیا ہے۔ اسی لئے پوچھ بیٹھا' کہاں تک دیکھنے دوگی۔ دراصل لکھنے والا یا بولنے والا اپنی نیت سے بولتا ہے۔ پڑھنے والا یا سننے والا اپنی نیت سے کچھ اور سمجھ لیتا ہے۔"

"آپ واقعی باتیں بنانے کی کمائی کھاتے ہیں" یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ سوچ رہی ہوگی اور شرما رہی ہوگی۔ میری وضاحت کے باوجود بات وہی تھی جو سمجھ میں آرہی تھی۔ جب ایک مرد اور عورت کسی تعارف کے بغیر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں' ایک دوسرے کی

باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو مقصد یہی ہوتا ہے کہ بات اور آگے بڑھے۔ اس طرح بات بڑھتے بڑھتے دونوں کو حد سے آگے بڑھا دیتی ہے۔

میں بیوی بچوں سے دور سوسائٹی کے ایک مہنگے فلیٹ میں رہتا ہوں تاکہ تنہائی میں یکسوئی اور ارتکاز توجہ سے کہانی لکھ سکوں۔ کتنی ہی لڑکیاں اور لڑکے مجھے خطوط لکھتے ہیں۔ فون پر رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں' میں ہر ایک سے ملاقات کرتا تھا۔ جلد ہی سمجھ میں آیا کہ میرا وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔ اس میں صرف میرا ہی نہیں قارئین کا بھی نقصان ہے۔

کہانیاں دلچسپ اور معیاری نہیں ہوں گی تو ان کا وقت بھی برباد ہوگا اور جیب سے نکلی ہوئی رقم بھی ضائع ہوگی۔ یہ بات سمجھ میں آئی تو میں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ کسی کا فون آتا تو میں آواز بدل کر کہہ دیتا' نواب صاحب نے یہ فلیٹ چھوڑ دیا ہے۔ دروازے پر آنے والوں سے بھی میرا نیا ملازم یہی کہتا تھا اگرچہ یہ فعل اخلاقی تقاضوں کے منافی ہے لیکن اخلاقی تقاضہ یہ بھی ہے کہ وقت بے وقت کی ملاقاتوں سے کسی کے کام میں مداخلت نہ کی جائے' تخلیقی عمل میں رکاوٹ پیدا کرنا سب سے ناپسندیدہ عمل ہے۔

دوسرے دن پھر فون کی گھنٹی نے جگایا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر جماہی لیتے ہوئے کہا" ہے لو۔ کو۔ اون ہے؟"

وہی نغماتی آواز سنائی دی" توبہ ہے کل گیارہ بجے فون کیا تھا' آج بارہ بجے مخاطب کررہی ہوں۔ آپ کی جماہی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟ کیا آپ تمام دن سوتے رہتے ہیں؟"

"میں فجر کی اذان کے بعد سوتا ہوں اور دن کے ایک بجے تک نیند پوری کرتا ہوں۔"

"پتا ہے' رات کو کون جاگتا ہے؟"

میں سمجھ گیا' اس کا اشارہ الو کی طرف ہے۔ میں نے جواب دیا" میرے وطن کے سپاہی سرحدی محاذ پر تمام رات جاگتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قلم کے محاذ پر رات بھر میری آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور ذہن بیدار رہتا ہے۔"

"کمال ہے! میں کچھ اور کہنے جارہی تھی' آپ نے تو میری زبان بند کردی۔"

"بائی دی وے' تم کون ہو؟"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے آواز سے پہچانا نہیں ہے؟"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہاری آواز پہلے بھی سن چکا ہوں؟"

"آپ بہت بنتے ہیں۔ کوئی بھی کل کی سنی ہوئی آواز آج نہیں بھلا سکتا۔"

"اوہ سمجھا' کل تم نے محی الدین سے فون پر بات کی ہوگی۔"

"کیا آپ محی الدین نواب نہیں ہیں"

"میں نواب ہوں۔ محی الدین میرا دوست ہے۔ ہم دونوں ایک کہانی پر محنت کرتے ہیں جب وہ مکمل ہوجاتی ہے تو وہ دونوں کے مشترکہ نام یعنی محی الدین نواب کے نام سے شائع ہوتی ہے۔"

"یہ میں پہلی بار سن رہی ہوں' کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"تم جھوٹ کیوں سمجھ رہی ہو۔ کیا تم نے بھارتی فلموں کے موسیقار شنکر جے کشن اور پاکستانی فلموں کے موسیقار بخشی وزیر کے نام نہیں سنے ہیں؟ شنکر اور جے کشن دو دوست اور بخشی اور وزیر دو بھائی ہیں لیکن فلموں میں ان کے مشترکہ نام آتے ہیں۔"

"ہاں' یہ درست ہے لیکن موسیقی کی اور بات ہے۔ کہانیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"کیوں نہیں ہوتا۔ سپرہٹ فلم شعلے کے دو رائٹر ہیں۔ ایک سلیم دوسرا جاوید۔ فلم کے اشتہارات میں دونوں کا مشترکہ نام سلیم جاوید لکھا جاتا ہے۔"

"تعجب ہے' میں اب تک محی الدین نواب کو ایک ہی شخص سمجھتی رہی بلکہ میں کیا تمام پڑھنے والے یہی سمجھتے ہوں گے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میرے پڑھنے والے احمق نہیں ہیں۔ اس نے پوچھا" آپ سسپنس کے کسی شمارے میں وضاحت کیوں نہیں کرتے؟ جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سسپنس کے آخری صفحات کی ایک کہانی دو رائٹر لکھتے ہیں تو سب حیران رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا" ہم اپنے پڑھنے والوں کو کہاں تک حیران کریں۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔"

وہ حیرت سے تقریباً چیختی ہوئی بولی" کیا؟" پھر جھنجلا کر بولی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ آپ مجھے الو بنا رہے ہیں' کیا آپ مجھے دودھ پیتی بچی سمجھتے ہیں؟"

"نہیں سمجھوں گا اگر اپنی عمر بتادو۔"

"نہیں بتاؤں گی۔ آپ مجھے کسی طرح رائٹر نہیں لگتے۔ کیا ایک اچھا تخلیق کار اس طرح وقت ضائع کرتا ہے۔"

"میں آنکھ کھلتے ہی لکھنے یا سوچنے نہیں بیٹھتا۔ دماغ کو ہلکا پھلکا اور تروتازہ کرنے کے لئے بہترین شاعروں کی ایک آدھ غزل پڑھتا ہوں یا لتا منگیشکر کے میلوڈی گیت سنتا ہوں۔ کل سے تم میرے لئے تفریح مہیا کررہی ہو' شکریہ۔ اب میں ٹیلی فون اٹھا کر باتھ روم میں جارہا ہوں۔ میں اسی طرح تمہیں کلن سے لگائے رکھوں گا تم اتنی دیر تک بستر پر ساتھ رہیں' مجھے

یقین ہے کہ باتھ روم میں بھی ساتھ رہو گی۔"

اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا' تیسرے دن بھی وہ اسی وقت فون کرے گی اگر اس کے اپنے گھر میں ٹیلی فون ہوتا تو وہ جب چاہتی مجھے مخاطب کرتی۔ دن کے گیارہ بارہ بجے اسے کہیں سے فون پر لمبی گفتگو کرنے کی سہولت حاصل تھی۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ اس نے تیسرے دن ساڑھے گیارہ بجے مجھے مخاطب کیا' میں نے کہا۔

"تم نے صحیح وقت پر فون کیا اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو پھر مجھ سے کبھی رابطہ قائم نہ ہوتا۔"

اس نے پوچھا" ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟"

"میں ابھی بتاتا ہوں۔ تم کاغذ قلم نکالو۔ جلدی کرو۔"

میں نے اسے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چند سیکنڈ کے بعد بولی" میرے پاس کاغذ قلم ہے۔ آپ مجھے بتائیں تو سہی' آخر بات کیا ہے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ ایک پتا نوٹ کرو۔"

میں نے اسے اپنے فلیٹ کا پتا نوٹ کرایا۔ پھر کہا" ٹیلی فون والے تار کاٹنے آئے ہیں۔ میں نے تم سے بات کرنے کے لئے ایک منٹ کی مہلت مانگی ہے۔ یہ ایک منٹ بھی ختم ہو رہا ہے۔ آئندہ میرے فلیٹ میں فون نہیں ہو گا' اسی لئے میں نے اپنے فلیٹ کا پتا لکھوا دیا ہے اگر تم ....."

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ٹیلی فون کا پلگ ہٹا دیا۔ اب وہ ہیلو ہیلو پکار رہی ہو گی پھر یہ سمجھ لے گی کہ میرے فون کا تار کاٹ دیا گیا ہے۔ شاید وہ ابھی دوبارہ رابطہ قائم کرنا چاہے گی' پھر اگلے روز بھی کوشش کرے گی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میری ذات سے بہت دلچسپی لے رہی ہے اگر میں اس کا نام اور فون نمبر پوچھتا تو وہ شاید نہ بتاتی۔ اس سے ملاقات کرنا چاہتا تو وہ نخرے کرتی۔ ہو سکتا ہے کئی دنوں تک فون پر آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد راضی ہو جاتی۔ پتا نہیں وہ دن کب آتا؟ زندگی کا کیا بھروسا؟ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک لہٰذا میں نے زلف کو سر کرنے کا یہی راستہ نکالا۔ اسے اپنا پتا نوٹ کرایا اور فون کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب اس کے دل میں میرے لئے گرہ پڑتی رہے گی تو وہ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئے گی۔

جنوری ۷۷ء کی پندرہ تاریخ تھی۔ میں حسب معمول رات کے نو بجے لکھنے بیٹھ گیا۔ ایسے وقت میں تمام بتیاں بجھا دیتا ہوں۔ صرف ٹیبل لیمپ روشن رہتا ہے۔ کیسٹ ریکارڈ سے دھیمی دھیمی آواز میں گیت کے بول ابھرتے رہتے ہیں۔ میں کچھ کھاتا رہتا ہوں' کچھ پیتا رہتا ہوں اور لکھتا رہتا ہوں۔ اس رات دیوتا کی دوسری قسط لکھ رہا تھا۔ پہلی قسط فروری کے شمارے میں شائع ہونے کے لئے پریس میں جا چکی تھی۔ میں بڑی لگن اور بڑے جذبے سے لکھ رہا تھا۔ ایک اندازہ تھا کہ صبح چار یا پانچ بجے تک قسط مکمل ہو جائے گی لیکن وہ شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جاری تھی۔ پانچ بج گئے اور میرے سونے کا وقت ہو گیا۔ کسی بھی کہانی کے کلائمکس پر پہنچ کر میری حالت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ میں ایک جگہ سکون سے بیٹھ نہیں سکتا۔ کھانے کا وقت ہو تو کھا نہیں سکتا' سونے کا وقت ہو تو سو نہیں سکتا۔ کہانی کے تمام کرداروں کو' گزرے ہوئے تمام واقعات کو اور چھوٹے بڑے اہم پوائنٹس کو بیک وقت پیش نظر رکھ کر اسے اختتام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ خدا خدا کرکے صبح سات بجے قسط مکمل ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

اخبار والا روز اسی وقت آتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیرونی دروازے تک آیا۔ اخبار دروازے کے نیچے سے اندر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اخبار والا کسی سے کہہ رہا تھا" جی ہاں' نواب صاحب اسی فلیٹ میں رہتے ہیں۔"

میں نے تجسس میں آکر دروازہ کھولا۔ ایک سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی اسکول کے یونیفارم میں نظر آئی۔ اس کے شانے سے کتابوں کا بستہ لٹک رہا تھا۔ اخبار والے نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا" جناب! یہ آپ کو پوچھ رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ لڑکی نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ میں نے پوچھا" تم مجھ سے ملنے آئی ہو؟"

وہ چپ رہی۔ اس کا چہرہ حیا سے تمتما رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہئے۔ ویسے میرا سوال احمقانہ تھا۔ ایک لڑکی مجھے پوچھ رہی تھی' میرے دروازے پر آئی تھی اور میں نے سوال داغ دیا تھا کیا مجھ سے ملنے آئی ہو؟"

میں نے نیچے سے جانے والے اور اوپر سے آنے والے زینوں کو دیکھا پھر کہا" کوئی بھی آنے جانے والا ہمارے متعلق جانے کیا رائے قائم کرے گا۔ بہتر ہے اندر آجاؤ۔"

میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ اندر آگئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ ڈائننگ پورشن میں کھانے کی میز پر مسودے کے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ کیسٹ ریکارڈر خاموش تھا۔ ایک پلیٹ میں کچھ نمکین پھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بوتل آدھی خالی ہو چکی تھی۔ گلاس بالکل خالی تھا وہ پریشان ہو کر جھجکتے ہوئے بولی" آپ تنہا رہتے ہیں' میرا مطلب ہے' آپ کے بیوی بچے؟"

اس نے زبان کھولی تو سمجھ میں آیا۔ یہ وہی فون پر باتیں کرنے والی لڑکی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' وہ اسکول میں پڑھنے والی ایک کچی کلی ہو گی۔ فون پر پٹاخے کی طرح بول رہی

تھی۔ اسے سن کر اندازہ ہوا تھا کہ کوئی کالج اسٹوڈنٹ ہو گی۔ جوانی کے فائنل ایئر سے بول رہی ہو گی۔

میں نے پوچھا "اگر میرے یہاں تمہارے رہنے سے پریشان ہو تو بتاؤ میں کس طرح تمہاری پریشانی دور کر سکتا ہوں؟"

وہ منہ پھیر کر بولی: "میں جاؤں گی۔"

"آتے ہی چلی جاؤ گی تو وہ بات نہیں ہو سکے گی۔"

"کون سی بات؟"

"جس کے لئے تم آئی ہو۔"

"آ... آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میں کسی بات کے لئے نہیں آئی ہوں۔ میں تو... میں تو۔"

وہ بولتے بولتے اٹک گئی۔ میں نے کہا "تم میرے ساتھ پہلی بار ایسا سلوک نہیں کر رہی ہو۔ تم سے پہلے بھی کئی لڑکیاں آئیں، ان کا خیال تھا کہ میں اپنی کہانیوں کی طرح خوبرو اور بانکا چھیل چھبیلا ہوں۔ خیال اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چلو میں خیالی شہزادہ نہ سہی لیکن لڑکیوں میں اتنی مروت ہونی چاہئے کہ جب آتی ہیں تو دو گھڑی کے لئے بیٹھ جائیں۔ میں بھدا اور بدصورت ہوں، میری کہانیاں تو ایسی نہیں ہیں؟"

وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "میں نے آپ کو بھدا اور بدصورت نہیں کہا ہے۔"

"زبان سے نہیں کہا، مگر ایسا ہوں ضرور جسے دیکھتے ہی تم مایوس ہو کر جا رہی تھیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ بہت چالاک ہیں۔ بڑی چالاکی سے مجھے جانے سے روک دیا ہے۔"

"تم میرا نام جانتی ہو؟"

"نام کے ہجے بھی جانتی ہوں۔"

"میں بھی ہجے کرنا چاہتا ہوں۔ نام کیا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی، میں نے کہا "اپنے گھر والوں کی طرح تم ابھی تک سوچ رہی ہو کہ نام کیا رکھا جائے۔ ٹھیک ہے ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تمہارے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ نام کی ضرورت نکاح پڑھاتے وقت ہو گی۔"

اس نے میٹھی ناراضگی سے گھور کر دیکھا پھر بستے میں سے ایک کاپی نکال کر بڑھا دی۔ میں نے اسے لے کر دیکھا۔ اس کا نام تنویر ناز تھا۔ دسویں جماعت کی طالبہ تھی، ناظم آباد کے ایک اسکول کا پتا لکھا ہوا تھا۔ کاپیوں اور کتابوں پر پتا لکھنے کے باوجود لڑکیاں راستہ بھول جاتی ہیں، وہ بھی راستہ بھول کر آ گئی تھی۔

میں نے کاپی کھول کر دیکھی۔ ایک صفحے پر لکھا تھا، میرے محبوب! میرے ہاتھوں کی چوڑیاں، ہر رات کروٹ کروٹ تجھے پکارتی ہیں۔"

میں نے داد دی "واہ، تم نے کتنا خوبصورت فقرہ لکھا ہے۔ انتظار اور جدائی کو ایک چھوٹے سے جملے میں بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔"

اس نے جھکی جھکی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا "یہ میں نے نہیں، آپ نے لکھا ہے۔ یہ آپ کی ایک کہانی "دیوانہ پروانہ" کا ایک فقرہ ہے۔ کیا آپ خود لکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں؟"

کوئی بھی لکھنے والا اپنی کہانیوں کی ایک ایک سطر یاد نہیں رکھ سکتا۔ میں نے کاپی کا ورق الٹ کر دیکھا۔ دوسرے صفحات پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ تنویر نے کہا "آپ کی جتنی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں، ان میں سے خوبصورت، معلوماتی اور سبق آموز فقرے چن چن کر لکھ لئے ہیں۔"

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی "میں گھر میں رہوں یا اسکول میں، یہ کاپی ہر جگہ میرے ساتھ رہتی ہے، تنہائی میں جب بھی موقع ملتا ہے۔ میں اسے کھول کر پڑھتی ہوں، سوچتی ہوں آپ چونکا دینے والی باتیں کیسے لکھ لیتے ہیں؟ دل میں اتر جانے والی باتیں آپ کے دماغ میں کیسے آتی ہیں؟ میں آپ سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی مگر یہاں آتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔ تمام راستے سوچتی آئی ہوں، نہ جانے آپ میرے بارے میں کیسی رائے قائم کریں گے۔"

"کوئی کسی کے متعلق ایک ہی ملاقات میں رائے قائم نہیں کر سکتا، پھر بھی میں نے تمہیں کسی حد تک سمجھ لیا ہے۔"

اس نے جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا "میں نے جو سمجھا ہے اسے آج نہیں دوسری ملاقات میں بیان کروں گا۔"

"آپ مجھ میں تجسس پیدا کر کے دوسری ملاقات کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔"

"اسی بات کو دوسرے انداز میں سوچو، میں تمہارے یہاں آنے کا جواز پیدا کر رہا ہوں۔ تم میری تحریر کے ایک ایک لفظ کو موتی کی طرح چنتی ہو۔ انہیں بڑے جتن سے کبھی اسکول کے بستے میں اور کبھی تکیے کے نیچے چھپا کر رکھتی ہو۔ جب کوئی نہیں ہوتا تب میرے الفاظ اور میرے فقرے تم سے باتیں کرتے ہیں۔ تم باتیں سنتی ہو اور کروٹیں بدلتی ہو۔ کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ، یوں تمہارے ہاتھوں کی چوڑیاں مجھے کروٹ کروٹ پکارتی ہیں۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ بیٹھے بیٹھے دوسری طرف گھوم گئی۔ اسکول یونیفارم کے ساتھ مختصر سا دوپٹہ ہوتا ہے۔ جو ڈوری کی شکل میں سینے پر پڑا ہوتا ہے۔ اس

میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ وہ اسے گھونگھٹ بنالیتی یا چاروں طرف سے بدن کو چھپالیتی۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ موسم سرما کی بارش میں بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ وہ میرے دسترس میں تھی میں ہاتھ بڑھاتا تو ہاتھ آجاتی۔ اس کے چور جذبے مجھ میں آگئے تھے اور سمجھنے کے لئے کچھ رہا نہیں تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ جب سے آئی تھی مجھے نشے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی سمجھتی ہوگی کہ ایسی حالت میں بہکتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ دیر تو میں کر رہا تھا۔ مستی اور مدہوشی کے باوجود اس کی کم سنی مجھے روک رہی تھی۔ میں پینتالیس برس کا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ میں نے ناگواری سے بوتل کی جانب دیکھا۔ پچھلی رات سے اب تک آدھی بوتل خالی کرنے کے باوجود میرے اندر تھوڑی سی شرم اور شرافت رہ گئی تھی اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔ ایسی مدہوشی کس کام کی کہ سنبھلنے کا ہوش رہ جائے؟

میں نے بوتل کے پاس آکر اسے کھولا' گلاس میں تھوڑی سے آگ انڈیلی پھر اس آگ کو حلق سے اتارا۔ اس آگ کی تھوڑی سی کمی نے مجھے شریف اور بزدل بنایا ہوا تھا۔ یہ کمی پوری ہوئی تو نشہ تیزی سے بولنے لگا۔ میرے فلیٹ کی چار دیواری نے کہا' یہاں کوئی تیرا نہیں آئے گا جو تیرے سامنے ہے اس کی عمر کا حساب نہ کر۔ یہ خود اپنی عمر سے بہت پہلے چلی آئی ہے۔ تو کہانیاں لکھتا رہا اور کہانیوں کی صورت میں کچی کلی کو پتھر مارتا رہا۔ آخر یہ شاخ سے ٹوٹ کر تیرے بند کمرے میں آگری ہے۔ اب کچھ سوچنا نہیں ہے۔ ہوس کے پنجوں سے اسے نوچنا ہے۔

میں آگے بڑھا' ذرا لڑکھڑایا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پریشان ہو کر بولی "آپ بہت سمجھدار ہیں' پھر ایسی حرام چیز کو منہ کیوں لگاتے ہیں؟"

میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا "میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے' مجھے کوئی منہ نہیں لگاتا اگر تم لگاؤ تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو گرفت میں لیا۔ وہ گھبرا کر بولی "یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوڑیئے' مجھے چھوڑ دیجئے۔"

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کمزور تھی لیکن نشہ مجھے اس سے زیادہ کمزور بنا رہا تھا۔ میں ڈگمگا رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا' میں توازن قائم نہ رکھ سکا پیچھے کی طرف صوفے پر گر پڑا۔ وہ مجھ سے دور ہو کر دیوار سے لگ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا "خدا کے لئے آپ مجھے غلط نہ سمجھیں' میں محبت سے آئی ہوں' جذبات میں اندھی ہو کر نہیں آئی ہوں۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہتی جا رہی تھی مگر میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ در و دیوار گھوم رہے تھے۔ وہ نگاہوں کے سامنے ڈوب رہی تھی۔ دھندلا رہی تھی۔ میں شاید پوری طرح صوفے پر نہیں تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ فرش کی طرف لڑھک گیا تھا اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

ہم کسی سے زبردستی محبت نہیں کرا سکتے لیکن جب میرے نام تعریفی خطوط آتے ہیں' فون پر کتنے ہی اجنبی مجھے داد دیتے ہیں' مجھ سے عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں تو میں یقین کرلیتا ہوں کہ میں محبت کئے جانے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں میری تخلیقات پڑھنے والوں اور مجھ سے آکر ملنے والوں پر یہ لازم ہوگیا ہے کہ مرد میری عزت کریں اور عورتیں مجھ سے محبت کریں۔ خود پرستی اور خوش فہمی کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے پاس آنے والیاں محبت سے آتی ہیں' جذبات میں اندھی ہو کر نہیں آتیں۔

جب مدہوشی اور گہری نیند سے جاگا تو اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے اوپر چھت کا پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر یونہی لیٹا سوچتا رہا پھر مجھے سر کے نیچے تکیے کا احساس ہوا۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا تو وہ یاد آئی میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ اسے آواز دی "نوری!"

میں نے فرش پر گرنے سے پہلے سامنے والی دیوار کے پاس اسے دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی اور یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ شاید وہ دوسرے کمرے میں گئی ہوگی۔ میں نے پھر آواز دی۔ کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ میں نے رسٹ واچ کو دیکھا۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ میں تمام دن گہری نیند سوتا رہا تھا اور وہ تمام دن میرے سرہانے بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ میرے سر کے نیچے تکیہ رکھ گئی تھی۔

مجھے ندامت سی ہو رہی تھی۔ ایک لڑکی مجھ پر اعتماد کرکے تنہا یہاں آئی تھی اور میں اسے بیڈ روم میں آنے والی لڑکی بنا دینا چاہتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں اور مردوں کے درمیان زبردست فاصلہ ہے صرف اسی عورت کو نیک اور پارسا تسلیم کرتے ہیں جو نکاح کے بعد یہ فاصلہ طے کرکے آتی ہے۔ باقی عورتوں کے متعلق یقین کرلیا گیا ہے کہ وہ اخلاقی تقاضے پورے نہیں کرسکتیں۔ ادبی' ثقافتی اور تہذیبی رابطوں کا تقدس قائم نہیں رکھ سکتیں۔ روز اول ایک عورت نے اپنے مرد کو جنت سے نکلوایا تھا تب سے طے ہوگیا کہ یہ جب بھی ہماری تنہائی میں آئے۔ ہم اس کے ادبی اور تہذیبی فریب میں نہ آئیں' اسے پہلی فرصت میں شرم و حیا کی جنت سے محروم کردیں۔

میں باتھ روم میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا' پھر حیرانی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری ہو گئی تھی اور سلیقے سے اپنی اپنی جگہ نظر آ رہی تھی۔ ایک ہفتے پہلے ملازم کام چھوڑ کر چلا گیا تھا تب سے فلیٹ کی ہر چیز گرد آلود ہو رہی تھی۔ آج ہر چیز اپنی اصلی صورت میں نکھر آئی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بدل گئے تھے' یہ دھلے ہوئے صاف پردے الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تنویر نے الماری کھولی تھی۔ میں نے چونک کر میز کی جانب دیکھا' جس ٹیلی فون کو میں نے الماری میں چھپا کر رکھا تھا اب وہ میز پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس کا پلگ بھی لگا ہوا تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر صوفے میں دھنس گیا۔ وہ ناراض نہیں تھی۔ میں نے جو حرکت کی' وہ اسے اتنی بری نہیں لگی جتنا میں سوچ رہا تھا۔ تعجب ہے اس نے برا بھی نہیں مانا اور سہم کر دور بھی ہو گئی تھی۔ میرے اندر کے فن کار نے سمجھایا "ارے نادان! وہ اپنی خاموش اداؤں سے 'اس گھر کی صفائی اور سلیقے سے سمجھا گئی ہے کہ وہ غلاظت پسند ہے' وہ پیار میں بیہودگی نہیں سلیقہ چاہتی ہے۔"

میں نے باتھ روم میں آ کر شاور کو پوری طرح کھولا' پھر ٹھنڈے پانی کی پھوار میں کھڑا ہو گیا۔ ہم جو اپنی کہانیوں میں دور کی کوڑیاں لاتے ہیں' اپنے ہی قریب اپنی ہی ذات میں بعض اوقات صفر ہوتے ہیں۔ ایک کم سن لڑکی حسن ادا سے بتا دیتی ہے کہ عمر کا حساب مہینے اور سال سے نہیں ہوتا۔ ذہانت کا حساب کہانیوں کے تخلیق کمال سے نہیں ہوتا۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے اندر کے شیطان کو پہچانے اور دوسروں کو اس شیطان سے بچائے رکھے۔

میں نے غسل خانے سے نکل کر لباس تبدیل کیا۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں ہوٹل جا کر پیٹ بھرنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دن رات کتنے ہی لوگ فون کرتے رہتے ہیں لیکن دل کہہ رہا تھا۔ تنویر بلا رہی ہے میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک شخص نے میرے فون نمبر کی تصدیق کی پھر کہا "کیجئے بات کیجئے۔"

میں سمجھ گیا' وہ کسی پبلک ٹیلیفون سے رابطہ قائم کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ہیلو۔ ہیلو تنویر! یہ تم ہو نا؟ ہیلو۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ میں نے پھر آواز دی۔ "دیکھو کوئی ایک بار ٹھوکر کھا کر گرے تو اسے گرا ہوا نہیں سمجھنا چاہئے۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر معلوم تو ہو کہ یہ تم ہو۔ ایک بار اپنی آواز سنا دو۔ ہیلو۔ ہیلو....."

دوسری طرف مسلسل خاموشی تھی۔ مجھے اسی شخص کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "بی بی! خاموش کیوں ہو بات کرو۔"

میں نے جلدی سے کہا "ہاں باتیں کرو۔ کچھ بولو۔ ہیلو' ہیلو۔ کیا تم میری آواز نہیں پہچان رہی ہو؟ میں نواب بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے اس شخص نے کہا "جناب کے مخاطب کر رہے ہیں' وہ تو چلی گئیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "چلی گئی؟"

"جی ہاں۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ میں نے اپنے ریسیور کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا' جیسے جانے والی کا ہاتھ پکڑ رہا ہوں۔ اس سے پوچھ رہا ہوں "بتاؤ اس پراسرار خاموشی کا مطلب کیا ہے؟ جب کچھ بولنا نہیں تھا تو میرے فون پہ دستک کیوں دی؟ کیا صرف میری آواز سن کر یقین کرنا چاہتی تھیں کہ میں زندہ ہوں' مدہوشی اور بے حیائی نے مجھے مارا نہیں ہے۔" بڑبڑانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے ریسیور کو حسرت سے دیکھا پھر اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ آدمی کتنا ہی ناکام اور مایوس ہو' روٹی ضرور کھاتا ہے۔ میں نے ہوٹل جانے کے لئے دروازہ باہر سے بند کیا پھر فرسٹ فلور سے نیچے آیا۔ فلیٹ کے سامنے ہی ہوٹل تھا۔ اچانک خیال آیا۔ تنویر نے شاید فلیٹ میں میری موجودگی معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا اس نے میری آواز سنی ہے اور اطمینان کر لیا ہے کہ وہ یہاں آئے گی تو مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔ یعنی وہ آئے گی۔ فون کرنے کا کوئی تو مقصد ہو گا۔ وہ ضرور آئے گی۔

اب میں ہوٹل میں بیٹھ کر نہیں کھا سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ کب آ جائے۔ میرا فلیٹ میں رہنا ضروری تھا۔ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر اپنے فلیٹ میں کھانا پہنچانے کے لئے کہا پھر واپس آ کر دروازے کو ذرا کھلا چھوڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تاکہ وہ آئے تو دروازہ کھلا ہوا پا کر اندر آ جائے۔ میں انتظار کے دوران سوچتا رہا۔ کس طرح اس کے سامنے شرمندگی کا اظہار کروں گا۔ وہ نفرت سے نہیں گئی تھی' صرف ناراض تھی اور اسے ناراض ہونے کا حق تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا روٹھنے والی کو کس طرح جی جان سے مناؤں گا۔

ہوٹل کا لڑکا کھانا لے کر آیا۔ میں نے کھا لیا' چائے بھی پی لی۔ رات کے نو بج گئے' نہ وہ آئی نہ فون آیا۔ میں کبھی دروازے کو کبھی ٹیلی فون کو دیکھتا تھا۔ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے دل کو سمجھایا' گھر والوں کی پابندی میں رہنے والی لڑکی بھلا کیسے آئے گی؟ وہ تو صبح اسکول جانے کے لئے نکلی تھی اور میرے پاس آ گئی تھی کل صبح اسے پھر موقع ملے گا' وہ پھر کتابوں کا بستہ اٹھائے آئے گی۔

میں لکھنے بیٹھ گیا تاکہ وہ میرے اندر زیادہ بے چینی پیدا نہ کرے۔ انسان کی خواہشات کسی عمر میں کمزور نہیں پڑتیں بلکہ بڑھاپے میں اور جوان ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنی بیگم کے ساتھ خاصی عمر گزاری تھی۔ وہ نیک بخت میری چاہے جانے والی فطرت کو خوب سمجھتی تھی۔ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی شادی کے چند برسوں تک میں یہ تسلیم کرتا رہا کہ میں اسے ایک پل کے لئے چاہتا ہوں' وہ مجھے ہر پل چاہتی ہے۔ صبح بیدار ہونے سے رات گئے سونے تک میرا ہر طرح خیال رکھتی ہے' پھر رفتہ رفتہ اس کی توجہ اور محبت معمول کے مطابق فرض بن گئی۔ میں نے سوچا' بیوی تو محبت کرے گی مجھ سے نہیں کرے گی تو اور کس سے کرے گی وہ تو دن رات میری خدمت کرے گی' میری نہیں تو اور کس کی کرے گی۔ نکاح نامہ ایک ایگریمنٹ ہے' جس کی رو سے میں اسے اپنی محنت کی کمائی اور چار دیواری کا تحفظ دیتا ہوں اور وہ اپنی محبت' توجہ اور خدمت دیتی ہے چونکہ بیوی سے تحریری سمجھوتا ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے محبت تو ہوتی ہے' رومانس نہیں ہوتا۔

میں جیسی بات کہتا ہوں' ویسی سب نہیں کہتے۔ میں جیسا ہوں ویسے سب نہیں ہیں۔ اس کے باوجود مجھ جیسے لوگ جگہ جگہ پائے جاتے ہیں جس کے مزاج میں دوسروں کو چاہنے سے زیادہ خود کو منوانے اور خود سے محبت کرانے کی شدید خواہش ہوگی۔ وہ گھر میں بیوی سے محبت کرے گا اور باہر نئی چاہتوں کی رومان پرور جستجو میں رہے گا۔

مجھے جب بھی نئی چاہت ملتی تھی تو میری نظروں میں خود اپنی اہمیت بڑھ جاتی تھی۔ ان دنوں میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اپنے لئے اڑتے ہوئے آنچلوں کو خواہشات کی حرم سرا میں صرف اپنی ذات کے لئے پابند کر سکتا آج میرے حالات اجازت دے رہے تھے اور میں تنہا ایک فلیٹ میں ایک نئی چاہت کا منتظر تھا۔ اس کے انتظار میں ایک نئی کہانی لکھ رہا تھا۔ اس طرح میں نے صبح کر دی۔ بالکونی میں آکر باہر دیکھنے لگا کتنی ہی لڑکیاں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں کتابوں کا بوجھ اٹھائے جا رہی تھیں۔ یہ سوسائٹی کا علاقہ تھا۔ تنویر ناظم آباد کے ایک اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں سے یہاں تک آنے میں وقت لگ سکتا تھا وہ پچھلے روز صبح ساڑھے سات بجے آئی تھی۔ آج بھی اسی وقت آسکتی تھی گھڑی کے کانٹے اپنی رفتار سے رینگ رہے تھے وقت رینگتا ہے اور رینگتے رینگتے صدیاں گزار دیتا ہے' میری منتظر نگاہوں کے سامنے سے بھی صدیاں گزر گئیں۔ دن کے ایک بجے اسکول کی چھٹی کا بھی وقت ہو گیا۔ دو بج گئے پھر تین بج گئے' پھر شام ہو گئی لیکن وہ نہیں آئی۔ میری ساری خوش فہمی خاک میں مل گئی۔

ایسے میں جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ جب اسے نہیں آنا تھا تو آنے کے آثار کیوں پیدا کئے؟ میرے گھر کو ترتیب اور سلیقے سے سجا کر میری زندگی میں بے ترتیبی پیدا کر دی۔ میں کسی ضروری کام سے بھی باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جانا ضروری ہو جاتا تو سارا دھیان اپنے فلیٹ کی طرف رہتا کہ وہ کہیں آکر نہ چلی جائے۔ میں نے کئی بار غصے سے سوچا۔ آتی ہے تو آئے' جاتی ہے تو جائے۔ میں ایک سانولی سی لڑکی کے لئے اتنا بے چین کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا وہ بڑی چالاکی سے دور رہ کر اپنا بھاؤ بڑھا رہی ہے؟ میری سوچ میں اہمیت اختیار کر رہی ہے؟ اور میرے خاموش مطالبے میں شدت پیدا کر رہی ہے؟

اس رات میں خوب پیتا رہا۔ صبح تک اپنے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے سامان کو اور ڈیکوریشن کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا کھڑکیوں کے پردے نوچ کر پھینک دیے۔ نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "اے کالی کلوٹی' الو کی پٹھی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ کیا میں تیرا دیوانہ ہوں؟ ارے ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ میری دیوانی ہے۔ تو ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے۔ گیٹ آؤٹ' میری زندگی سے گیٹ آؤٹ' تم جاؤ اور دوسری کو آنے کا لائن کلیئر دو۔"

میں نے ریسیور کو پٹخ کر کہا۔ "خوب کھری کھری سنا دی ہے اس میں تھوڑی سی بھی غیرت ہوگی تو اب میرے دروازے پر کبھی نہیں آئے گی۔ خس کم جہاں پاک' اب مجھے کسی کا انتظار نہیں ہوگا۔ میں آرام سے سویا کروں گا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ بیڈ روم کے بستر پر جا کر سونے کا ارادہ تھا مگر میں اپنے آپے میں نہیں تھا۔ خود نہیں جانتا تھا کہ بیڈ روم تک جا سکوں گا یا نہیں؟ تب وہ نظر آئی یہ فریب نظر یا نشے کی شرارت ہو سکتی تھی۔ وہ اسکول یونیفارم میں تھی' کتابوں کا بستہ شانے سے لٹک رہا تھا۔ شرابی نگاہوں کے سامنے بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ڈگمگا کر دیوار کا سہارا لیا پھر کہا۔ "اچھا تو وہ کلوٹی چلی گئی اور تمہیں لائن کلیئر مل گئی۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ وہ بہت پریشان کر رہی تھی' مجھے اپنے پیچھے دوڑا رہی تھی۔ تنویر کا مطلب ہے روشنی' اجالا حسن اور اس میں حسن نام کی کوئی چیز نہیں تھی اسی لئے میں نے کہہ دیا' گیٹ آؤٹ۔ میں نے اسے دھکے دے کر اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ مجھے سہارا دو۔ میں تنہا گرنا نہیں چاہتا' میری عادت ہے۔ میں سہارا دینے والے کو ساتھ لے کر گرتا ہوں۔"

وہ کتابوں کا بستہ ایک طرف رکھ کر تیزی سے آئی۔ میں نے سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ وہ مجھے سنبھال کر بیڈ روم کی طرف چلنے لگی میں نے کہا۔ "آہ! تمہیں چھو کر معلوم ہوتا ہے جیسے وہ میرے پاس آگئی ہے۔ میں' میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ میں اسے جسمانی طور پر آنے سے روک سکتا ہوں مگر اس کی

"آج سے نو سو سال قبل، مشہور سلجوقی حکمران ملک شاہ نادر کے زمانے میں ہرات میں مشہور طبیب، عالم، فلسفی حکیم اسمٰعیل رہا کرتا تھا۔ جس کے علم و حذاقت کی دور دور شہرت تھی۔ ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے حکیم اسمٰعیل نے دیکھا کہ ایک نوجوان قصاب، ہاتھ ڈال کر بکرے کی چربی نکالتا ہے، بھونتا ہے اور کھاجاتا ہے۔ حکیم اسمٰعیل نے یہ دیکھ کر سامنے والے مکان دار سے کہا: "مجھے اس قصاب کی صحت کے بارے میں تشویش ہے کہ یہ کسی سخت مرض میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بہرحال جب بھی اس کا وقتِ آخر آئے تو مجھے ضرور مطلع کیا جائے اور میرے معائنے کے بغیر تدفین نہیں کی جائے۔" اس واقعے کے چھ ماہ بعد کا ذکر ہے کہ اہل محلّہ نے اس خبر کو حیرت و دہشت سے سنا کہ رات کو قصاب اچھا بھلا سویا اور صبح کو مردہ پایا گیا۔ دکان دار کو حکیم اسمٰعیل کی بات یاد تھی۔ وہ دوڑ کر اس کے گھر پہنچا اور اس کو مطلع کیا۔ حکیم اسمٰعیل پر بظاہر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اس کے اندازے سے زیادہ دن جیا۔ بہرحال وہ اپنی چھڑی ہلاتا ہوا قصاب کے گھر پہنچا، کفن سرکا کے اس کا چہرہ دیکھا، نبض کو محسوس کیا اور مزید معائنہ کرنے کے بعد حاضرین کو حکم دیا کہ اس کے پاؤں کی مالش کریں۔ اس کی تشخیص تھی کہ یہ شخص مرا نہیں بلکہ فالج کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ تین دن تک انتہائی طبی توجہ اور علاج کے بعد قصاب کو ہوش آگیا اور اس واقعے کے سالہا سال بعد تک یہ شخص مفلوج حالت میں زندہ رہا..."

☆☆ ڈاکٹر سید اسلم کی کتاب "جسم و جاں" سے ایک اقتباس ☆☆

یادوں کو روکنے کا دروازہ ابھی اس دنیا میں نہیں بنا ہے۔"

"آپ نشے میں بہت بولتے ہیں۔"

وہ مجھے بستر کے پاس لے آئی۔ میں وہاں چاروں شانے چت ہو گیا۔ وہ بولی: "ادھر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ جائیں۔"

میں جہاں گر پڑا تھا، وہاں سے اٹھنے کا ہوش نہیں تھا اور وہ مجھے اٹھا کر تکیے تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے کہا میں ادھر لیٹ جاؤں یا ادھر لیٹ جاؤں، میں جس کروٹ جاتا ہوں وہ آجاتی ہے۔ سانولے رنگ میں بڑا نمک ہوتا ہے۔ وہ بڑی نمکین لڑکی ہے اس پر گوری گوری ہزاروں لڑکیاں قربان۔ ہش خبردار! اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا، نہیں تو وہ سر پر چڑھے گی، پھر نخرے دکھائے گی۔ جاؤ، دروازہ لاک کردو نہیں تو وہ اندر آجائے گی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں میں کب تک بڑبڑاتا رہا اور کب غافل ہو گیا۔ وہ اسکول کے وقت پر آئی تھی پھر چھٹی کا وقت ہونے سے پہلے چلی گئی۔ سہ پہر کو میری آنکھ کھلی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا، میرے فلیٹ کا حسن لوٹ آیا تھا۔ اس نے ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر پھر سلیقے سے رکھ دیا تھا۔ کھڑکیوں کے پردوں کو دوبارہ اچھی طرح لگا دیا تھا۔ باتھ روم کی صفائی کی تھی۔ کچن میں ہمیشہ گرد جمی رہتی تھی کیونکہ مجھے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ ملازم ہوتا تو پکا کر دیتا اور کچن کو صاف ستھرا رکھتا میں آج کل ہوٹل میں کھا رہا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے کچن کی بھی اچھی طرح صفائی کی تھی۔

مجھے کچھ کچھ یاد آرہا تھا کہ وہ صبح آئی تھی۔ اس چار دیواری کی سجاوٹ اور سلیقہ دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ وہی آئی تھی۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ آہ! نشے کی زیادتی کے باعث پھر اسے کھودیا تھا میرا جی چاہتا تھا ابھی اس کی تلاش میں نکل پڑوں۔ مجھے اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ میں نے اسکول دیکھا تھا لیکن تین بج چکے تھے۔ اسکول بند ہو چکا ہوگا اور اسکول کے وقت تو وہ میرے ہاں تھی۔ میں نے فون کی جانب دیکھا، وہی ایک رابطے کا ذریعہ رہ گیا تھا لیکن وہ یکطرفہ تھا، وہ چاہتی تو اپنی آواز سناتی، ورنہ میں انتظار کرتا رہ جاتا۔ ویسے اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسکول کے وقت ضرور آئے گی۔ صرف ایک روز کسی مجبوری کے باعث نہیں آئی تھی اور میں نے غم غلط کرنے کے لئے خوب پی لی تھی۔ محبت سے آنے والی کو پھر مایوس کیا تھا۔

اس رات میں نے بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ صوفے پر تمام سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا، دماغ میں وہی گھوم رہی تھی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے آتی تھی، یوں لگتا تھا جیسے سچ مچ فلیٹ کے اندر آگئی ہے۔ پچھلی صبح جب وہ آئی تھی تو فلیٹ کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے بعد میں سوچا وہ مقفل دروازے سے کیسے چلی آئی تھی۔ چابیوں کا گچھا توجہ سے دیکھنے سے معلوم ہوا۔ دروازے کی دو چابیوں میں سے ایک غائب تھی وہ پہلے ہی دن ایک چابی لے گئی تھی۔ ایک میرے لئے چھوڑ گئی تھی، رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے دروازہ مقفل تھا مجھے یوں آواز سنائی دی جیسے چابی سے اسے کھولا جا رہا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر وہاں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کے پاس آیا، وہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ دوپٹے میں چھپی ہوئی چوکھٹ سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے حیرانی

سے پوچھا "تم ہو؟"

میں قریب پہنچا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا' کلائی میں چوڑیاں نہیں تھیں' ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے زخم تھے' جہاں سے قطرہ قطرہ لہو ابھرا ہوا تھا۔ اس نے سہارے کے لئے دوسرا ہاتھ چوکھٹ پر رکھا تو وہ بھی زخمی تھا۔ یں نے گھونگھٹ کی طرح پڑے ہوئے دوپٹے کو ہٹایا تو چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ اس کی پیشانی اور ناک سے رسنے والا لہو خشک ہو رہا تھا۔ دنوں ہونٹ موٹے ہو گئے تھے' چہرہ سوج گیا تھا۔ میں نے چہرے کو چھو کر پوچھا "یہ کیسے ہوا؟ تمہاری یہ حالت کس نے بنائی ہے؟"

میرے چھونے پر وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ پتا نہیں یہاں تک کیسے آئی تھی۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "چھوڑ دیں' پلیز چھوڑ دیں۔ میں' میں ابھی چلی جاؤں گی۔"

میں نے اسے بستر پر لٹادیا۔ ایک چادر اس پر ڈال دی۔ بخار سے سارا بدن جل رہا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کر فریج سے برف نکالی۔ اسے آئس بیگ میں ڈالا اچانک اس نے چیخ ماری میں دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "چھوڑ دو' مجھے چھوڑ دو کمینو! کتو! میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔ ایک ایک کرکے آؤ۔ میں تمہاری صورتیں بگاڑ کے رکھ دوں گی......"

وہ بول رہی تھی اور ہاتھ پاؤں جھٹک رہی تھی۔ بستر پر یوں تڑپ رہی تھی جیسے خود کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے کی جدوجہد کررہی ہو۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ کر کہا "خاموش ہوجاؤ۔ یہاں تم محفوظ ہو' چپ چاپ لیٹی رہو۔"

وہ ذرا شانت ہوئی پھر بھی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر آئس بیگ رکھا۔ ایسے شدید بخار کو کم کرنے کا یہی طریقہ تھا کوئی آدھا گھنٹے بعد افاقہ ہوا وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ بخار ابھی تھا مگر تشویشناک نہیں تھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر نہیں آسکتا تھا اگر آبھی جاتا تو مجھ پر شبہ کرتا کہ میں نے اس لڑکی کو لہولہان کیا ہے۔

میں ناکردہ جرم کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا اور اس کی مرہم پٹی بھی ضروری تھی۔ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ بخار کم ہو چکا تھا لیکن معقول علاج اور دواؤں کے بغیر نہ بخار ختم ہو سکتا تھا نہ زخم بھر سکتے تھے۔ میں اسے بیڈ روم میں چھوڑ کر فلیٹ سے باہر آیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کیا پھر سوسائٹی کے ایک ڈے اینڈ نائٹ میڈیکل اسٹور میں پہنچا۔ وہاں سے فرسٹ ایڈ کا ضروری سامان خریدنے کے بعد دکاندار سے کہا "مریضہ کو تیز بخار ہے۔ اتنی رات کو ڈاکٹر نہیں مل سکتا کوئی زود اثر دوا دیجئے لیکن اسپرین اور ڈسپرین جیسی دوا نہ دیں۔"

"ہمارے پاس ایسی زود اثر ٹکیاں ہیں اگر حالت زیادہ تشویشناک ہے تو آپ مریضہ کو اسپتال لے جائیں۔"

میں نے مجبوراوہ ٹکیاں خرید لیں۔ وہاں سے واپس آیا' وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے پانی گرم کیا' پھر اس کے زخموں سے خشک لہو پونچھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگی تھی میں نے سر کے زخم پر مرہم لگایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا' جب اسے یقین ہوا کہ وہ میرے فلیٹ میں ہے اور میں اس کے بہت قریب ہوں تو وہ اٹھنے لگی۔ میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا "چپ چاپ لیٹی رہو۔ یہ دو ٹکیاں کھالو۔ اتنی رات کو ڈاکٹر نہیں مل سکتا ورنہ دوائیں لے آتا۔"

میں نے ایک گلاس میں پانی دیا۔ اسے سہارا دے کر بٹھایا وہ دو گولیاں کھانے کے بعد گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں بہت مجبور ہو کر آئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہاں جانا چاہئے۔ بس پریشان ہو کر آگئی۔ ذرا طبیعت سنبھلے گی تو چلی جاؤں گی۔"

"رات کا ایک بجا ہے۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ یہ خیال دل سے نکال دو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "لوگ کیا سوچیں گے؟ آپ میرے بارے میں غلط رائے قائم کریں گے۔"

"میں لوگوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ اپنی بات کہتا ہوں کہ اندھا نہیں ہوں۔ تمہیں بری طرح زخمی حالت میں دیکھ رہا ہوں تم پریشان حال' بخار میں پھنکتی ہوئی آئی ہو۔ تم کسی کے ہاں بھی پناہ حاصل کرنے کی حقدار ہو۔ ایسی حالت میں کوئی بھی تمہارے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کرے گا۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا "آرام سے لیٹ جاؤ زخموں پر مرہم لگانے دو۔"

"آپ زحمت نہ کریں۔ میں خود لگالوں گی۔ پٹیاں بھی خود ہی چپکالوں گی۔"

"کیا اس لئے انکار کررہی ہو کہ اس طرح میں تمہیں ہاتھ نہ لگاسکوں۔"

"آپ برا نہ مانیں' ہمارے درمیان فاصلہ ہونا چاہئے۔ رہ گئی مرہم پٹی کی بات تو یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی بہت زخم کھائے ہیں اور خود ہی اپنے زخموں کی مرہم پٹی کی ہے۔"

"کون تمہیں زخم دیتا ہے؟ آج کن لوگوں نے تم پر ظلم

کیا ہے ؟"

وہ چپ رہی، میں نے کہا "مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں اتنا تو سمجھ گیا ہوں کہ تم دشمنوں کے مقابلے میں زبردست ہو۔ اگر وہ ایک ایک کر کے آتے تو تم ان کی صورتیں بگاڑ دیتیں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم بخار کی حالت میں بڑبڑا رہی تھیں۔ میں نے کچھ سنا ہے، کچھ سمجھا ہے، باقی تم سے سمجھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اس کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا تاکہ وہ آئینہ دیکھ کر اپنی مرہم پٹی کر سکے پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا، پھر آئینے کے سامنے مرہم پٹی شروع کرتے ہوئے بولی۔ "نشہ آدمی کو شیطان بنا دیتا ہے۔ میں آپ کو برا نہیں کہتی۔ جب میرے اپنے گھر میں برائی ہے تو کسی اور کو بولنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ میں یہاں بھائی اور بھابی کے رحم و کرم پر ہوں۔ دو بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی ہیں ایک میں رہ گئی ہوں۔ بھابی مجھے بوجھ سمجھتی ہیں۔ بھیا کو جس روز چرس نہیں ملتی وہ اپنا غصہ مجھ پر اتارتے ہیں کیونکہ بھابی سے وہ دبتے ہیں۔ مجھ سے رقم مانگتے ہیں۔"

"یہ تو بے غیرتی ہے۔ تم کہاں سے رقم دے سکتی ہو؟"

"میں اسکول سے آ کر کپڑے سلائی کرتی ہوں۔ اپنی محنت سے تعلیم حاصل کرتی ہوں۔"

"اور تمہارے والدین ؟"

"میرے والد بنگلہ دیش میں ہیں۔ ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میری والدہ گھر گھر جا کر بچوں کو کلام پاک پڑھاتی ہیں۔ وہاں سے جو رقم ملتی ہے، بھیا اسے بھی نشے کے لئے چھین لیتے ہیں میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو۔"

"آپ کہانیاں لکھ کر اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ مہنگی شراب پیتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ کسی وجہ سے کہانیاں نہ لکھ سکیں اور آمدنی بالکل گھٹ جائے تو آپ نشہ کیسے کریں گے؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں کسی بھی عادت کو خود پر غالب نہیں ہونے دیتا۔ جب برا وقت آئے گا تو پینا چھوڑ دوں گا۔"

وہ بولی "ڈھاکا میں آج بھی ہماری لاکھوں کی جائداد ہے۔ بھیا مکتی باہنی کے خوف سے بھاگ آئے تھے۔ ان کی جائداد پر قبضہ ہو گیا ہے۔ میری والدہ بھیا سے پوچھتی تھیں۔ جب یہ دولت نہیں ہو گی تو نشہ کہاں سے کرو گے؟ بھیا بھی یہی جواب دیتے تھے کہ وہ نشے کی طلب میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے بلکہ نشہ کرنا چھوڑ دیں گے۔ آج وہ پیسے پیسے کے محتاج ہیں۔ ہمیشہ شہزادوں جیسی زندگی گزارتے آئے ہیں اس لئے کہیں نوکری نہیں کرتے۔ کوئی ہنر آتا نہیں ہے۔

مشہور

مشہور تجریدی مصور الفریڈ شلز ایک مرتبہ شراب خانے میں اداس بیٹھا تھا۔ اس کے کسی دوست نے اس کی اداسی کا سبب پوچھا تو بولا "مجھے مصوری کے پیشے میں ایک عمر گزارنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ میں مصوری کی ابجد بھی نہیں جانتا۔"

"تو کیا ہوا؟" اس کا دوست بولا "تم کوئی اور پیشہ اپنا لو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے" شلز بولا "اب تو میں بے حد مشہور ہو چکا ہوں۔"

سٹہ کھیلتے ہیں اور مقدر کو آزمانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اب مہنگی شراب نہیں پی سکتے لہٰذا چرس کی سگریٹوں پر گزارہ کرتے ہیں۔"

اس نے بولتے بولتے سر کو تھام لیا پھر تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ "نشے کی طلب پوری نہ ہو تو آدمی اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کے آنچل سے رقم کھول کر لے جاتا ہے۔ آپ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ برے دنوں میں نشے کی عادت چھوڑی جا سکتی ہے آپ پر برا وقت نہیں آیا ہے، ہم پر آیا ہے۔ آپ خواہ کتنے ہی دانشمند اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں، میری ایک اصولی بات تسلیم کر لیں کہ اچھے وقتوں میں بری عادت چھوڑی جا سکتی ہے اور اچھی عادتیں برے وقت کی عمر کم کر دیتی ہیں۔"

"تم چاہو تو میری یہ بری عادت چھڑا سکتی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھ سے دوستی کر لو۔"

"ہمارے سماج میں، کسی لڑکی سے دوستی نہیں، شادی کی جاتی ہے۔"

"شاید تمہیں نہیں معلوم، میری ایک بیوی، دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "آپ یہاں آرام کریں۔ میں ڈرائنگ روم میں رات گزار لوں گی۔"

"میں ڈرائنگ روم میں رات گزاروں گا۔ کیا ابھی تمہارے بھائی نے لہولہان کیا تھا؟"

"بھیا اکیلے ہوتے تو میں انہیں لہولہان کر دیتی۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ جب وہ کسی غلطی کے بغیر بھابی کے ساتھ مل کر

مجھے گالیاں دیتے ہیں تو میں بھی خوب گالیاں سناتی ہوں۔ وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں تو پہلے وار تنگ دیتی ہوں۔ نہیں مانتے ہیں تو ان کے ساتھ بھابی کو بھی لکڑی لے کر دوڑاتی ہوں۔"

"پھر آج یہ کیسے ہوگیا؟"

"پرسوں بھیا نے اپنی طلب پوری کرنے کے لئے میری سلائی مشین بیچ دی، جو میری آمدنی کا ذریعہ تھی اسے ہی ختم کردیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا میں نے بھیا اور بھابی کو خوب سنائیں۔ رات بھر جھگڑا ہوتا رہا۔ میں نے دونوں کی اچھی مرمت بھی کی، وہ صبح تک میرے پیچھے پڑے رہے کہ میں ان کے گھر سے نکل جاؤں، میں نے کہا سلائی مشین لاؤ۔ میں کہیں بھی جاکر عزت سے چار پیسے کمالوں گی۔ وہ مجھے گھر سے نہ نکال سکے آج بھابی اپنے دو غنڈے بھائیوں کو لے آئی تھیں بھیا نے ان کے ساتھ مل کر میری یہ حالت بنادی۔ مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں اپنی بہن کے گھر لالو کھیت گئی۔ وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ دوسری بہن کے ہاں لانڈھی گئی ہوئی ہیں میں اس حالت میں اتنی دور نہیں جاسکتی تھی۔ اس لئے یہاں آکر آپ کو پریشان کررہی ہوں۔"

میں نے کرسی سے اٹھ کر کہا "یہاں آرام سے سو جاؤ۔ میں ڈرائنگ روم میں جارہا ہوں۔ کیا اپنا ہاتھ دوگی، میں بخار دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ بخار زیادہ نہیں ہے۔"

"میں کیسے یقین کرلوں؟ پلیز مجھے دیکھنے دو۔"

اس نے منہ پھیر کر ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے کلائی تھام لی۔ نبض کی رفتار دیکھی بدن پھر پہلے کی طرح جل رہا تھا۔ میں نے آئس بیگ کا پانی پھینک کر دوسری برف ڈالی، پھر اسے دیتے ہوئے کہا "بخار تشویشناک ہے۔ آرام سے لیٹ کر اسے سر پر رکھو۔ افاقہ ہوگا۔"

میں بیڈ روم سے آگیا۔ رات کے دو بجے تھے۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ یوں بھی جاگنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ جی میں آیا کہ دو گھونٹ پی لوں۔ پھر میں نے اس خواہش کو کچل دیا۔ آج میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر بستر پر پہنچایا تھا۔ وہ بخار کی حالت میں آنکھیں بند کئے بھیا اور بھابی سے جھگڑ رہی تھی۔ بستر سے اٹھنا چاہتی تھی تب میں نے اسے پکڑ کر بلکہ جکڑ کر جبراً سلایا تھا اس تمام عرصے میں اس کی قربت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ اب تنہائی میں خیال آرہا تھا کہ میں نے بے خیالی میں اس کے بدن کو بڑی حد تک دریافت کیا ہے۔ یہ نشہ کچھ کم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے بوتل کو ہاتھ نہیں لگایا۔

میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین بجے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر پوچھا "ہاں بولو۔ میں جاگ رہا ہوں۔"

میں نے دروازے سے کان لگا کر سنا، وہ کچھ بولتی جارہی تھی۔ میں نے اسے دروازہ کھولنے کو کہا لیکن وہ بستر سے اٹھ کر نہیں آرہی تھی۔ میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک تھا میں نے اپنی چابیوں کے گچھے سے ایک چابی کے ذریعے اسے کھولا پھر بیڈ روم میں آیا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی میں نے پیشانی چھو کر دیکھی، بخار تیز تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا الماری کے پاس آیا۔ اس میں سے کمبل نکال کر اس پر ڈال دیا۔ میرے اندر گڑبڑ شروع ہوگئی تھی۔ دماغ میں سنسناہٹ ہورہی تھی۔ اس کی قربت یاد آرہی تھی۔ حالات کہہ رہے تھے اچھا موقع ہے۔ مجھے قریب جانا چاہئے یہ اچھا بخار تھا، ادھر اسے ادھر مجھے جلا رہا تھا۔

وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہی تھی۔ میں سننے کے لئے قریب آگیا۔ جب قریب آیا تو دور نہ جاسکا بلکہ قریب رہ کر دور تک جاتا رہا بڑی دیر تک بخار کا درجہ حرارت محسوس کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کسمسا رہی تھی اور یوں کمزور سی جدوجہد کررہی تھی جیسے خیالی دشمنوں سے تھک رہی ہو، ہار رہی ہو۔ ایک آدھ مرتبہ اس کی آنکھیں کھلیں پھر بند ہوگئیں۔ سنا ہے، بخار جب تیزی سے اترتا ہے تو آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ بعض اوقات مسیحائی مہنگی پڑتی ہے۔ اچھا کرو تو برا ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں نے تھوڑی دیر اسے رونے دیا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگا "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ پہلے ہی دن سے مجھے دیوانہ بناتی آرہی ہو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی محبت کرتا رہوں گا۔ ہم تمام عمر ایک دوسرے سے وفا کریں گے اور زندگی بھر دوستی نبھاتے رہیں گے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پوچھا۔ "دوستی؟"

"ہاں، دوستی میں پائیداری ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک گھر دوں گا۔ گھر کی تمام خوشیاں دوں گا۔ تمہاری ہر ضرورت کو پورا کروں گا۔ تم جس طرح چاہوگی، تمہارے تحفظ کی ضمانت دوں گا۔"

"اگر آپ کی دوستی میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اور آپ تمام عمر وفاداری کی ضمانت دینا چاہتے ہیں تو دنیا والوں کے سامنے ہماری دوستی کا اعلان کردیں۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا مذہب اور قانون ایک مرد اور عورت کو دوستی کی اجازت نہیں دیتا ہے اور جو عورت مذہب اور قانون کی ضمانت حاصل کئے بغیر دوستی کرتی ہے وہ داشتہ کہلاتی ہے۔ کیا آپ مجھے گالی نہیں دے رہے ہیں؟"

میرے وہم و گمان میں بھی یہ گالی نہیں تھی۔ میں نے

یہ بات محض محبت اور دوستانہ جذبے سے کی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ جوان اولاد کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے سے سنجیدگی اور بزرگی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔"

"ٹھیس تو پہنچ گئی۔ کیا جو کام اولاد کی لاعلمی میں ہو‘ اس سے بزرگی اور سنجیدگی قائم رہ جاتی ہے؟ یہ تو گناہ بھی ہے اور اولاد سے فریب بھی۔ مذہب اور قانون کے مطابق قدم اٹھاتے ہوئے شرمندگی نہیں ہونی چاہئے۔"

میں کسی سے ہار نہیں مانتا اگر غلطی پر رہوں تب بھی لفظوں کے ہیر پھیر سے اپنی بات کو درست تسلیم کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس رات یقین ہو گیا کہ وہ بہت تیز طرار ہے۔ اس کے بدترین حالات نے اسے عمر سے زیادہ سمجھدار بنا دیا ہے۔ میرے لفظوں کی بازی گری اور فقروں کی جادوگری اس پر نہیں چلے گی‘ وہ بستر سے اتر کر بڑے سے دوپٹے کو اپنے اطراف لپیٹنے لگی۔ میں نے پوچھا "کیوں اٹھ گئیں؟ تمہیں بستر سے نہیں اٹھنا چاہئے۔"

"مجھے کس رشتے سے بستر پر رہنا چاہئے؟"

میں نے پلنگ سے اتر کر کہا "تم یہاں تنہا آرام کرو گی تو کسی رشتے کا سوال پیدا نہیں ہو گا۔"

اب تک ہمارا کیا رشتہ تھا؟"

"اوہ نو ڈیر! جو کچھ ہو چکا ہے اس پر بعد میں بحث کر لینا ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"جو ہو چکا ہے‘ وہ میرے لئے قیامت سے کم نہیں ہے میری سمجھ میں نہیں آتا میں یہاں صبح کیسے کروں گی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ الجھے ہوئے موضوعات کو سلجھا کر کہانیاں لکھنے والا اپنے ہاں پناہ دے کر لوٹ لیتا ہے "تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنی غلطی کی تلافی کس طرح کروں۔"

"جب تک آپ سوچتے رہیں گے‘ میں یہاں آنے کی سزا پاتی رہوں گی۔"

وہ بیرونی دروازے کے پاس جا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ میں نے تیزی سے قریب آ کر کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ فرش ٹھنڈا ہے‘ بخار پھر تیز ہو جائے گا۔"

"ہونے دیں۔ میں یہیں بیٹھوں گی صبح ہوتے ہی دروازہ کھول کر چلی جاؤں گی۔"

"تم بچوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو۔"

"آپ بڑوں جیسی حرکتیں کر چکیں ہیں۔ اب تو میرے حال پر مجھے چھوڑ دیں۔"

میں پریشان ہو کر اس سے ذرا دور ہو گیا پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی اور تکلیف مجھے ہو رہی تھی۔ یوں تو وہ سانولی سلونی لڑکی پہلے ہی دن سے میری آنکھوں میں اور میرے دل میں سما گئی تھی پھر آج کی قربت نے میرے دل میں بے انتہا محبت پیدا کر دی تھی۔ کسی جھوٹ اور فریب کے بغیر میں اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ رہا تھا۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ کیسے ہو گا‘ ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے پوچھا "آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟" میں یہاں سے جانے کے بعد کسی کے سامنے آپ کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔ آپ میرے آئیڈیل رائٹر ہیں۔ میں آپ کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔"

"تو پھر دنیا والوں سے کیا کہو گی کہ رات کہاں گزاری تھی؟"

"دنیا والے نادان نہیں ہیں۔ وہ سمجھ لیں گے کہ جوان لڑکی جہاں سے بھی رات گزار کر آئی ہے۔ خیریت سے نہیں آئی ہے۔ ابھی ہماری زمین پر ایسا کوئی گھر نہیں ہے‘ جہاں لڑکی پناہ لینے جائے اور فجر کی نماز پڑھ کر آئے۔"

"ہاں ایسا کوئی گھر نہیں ہو گا۔ یہ بھی تو سمجھو‘ انسان خطا کا پتلا ہے۔ وہ گناہ کرتا ہے تو پچھتاتا ہے‘ توبہ بھی کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک گناہ کا پچھتاوا اسے آئندہ دوسرے گناہوں سے بچاتا ہے۔ وہاں سے اٹھو اور بستر پر جاؤ۔ مجھے سوچنے‘ سمجھنے اور تمہارے حق میں کوئی مناسب قدم اٹھانے کی مہلت دو۔"

"میرے یہاں سے جانے کے بعد آپ کو مہلت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ ہمیشہ کے لئے مجھ سے نجات حاصل ہو جائے گی۔"

اسے مجھ پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ ایسی گھریلو شریف زادیاں بھی ہوتی ہیں جو راضی خوشی خود کو پیش کرتی ہیں اور اپنی عزت کو مسئلہ نہیں بناتیں اور ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی عزت اور شرم کے نازک سے شیشے کو ٹوٹنے نہیں دیتیں اگر وہ ٹوٹ جائے تو خود بھی ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں پھر جوڑے نہیں جڑتیں۔ محبت اور انسانیت پر سے ان کا اعتماد ہمیشہ کے لئے اٹھ جاتا ہے اسی لئے وہ مجھ پر بھروسا نہیں کر رہی تھی۔ میرے بستر پر مسرتوں کے ایسے پھول کھلے تھے۔ جو اب کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اس لئے وہ دروازے کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

فجر کی اذان ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دن نکلنے والا تھا۔ وہ جانے والی تھی۔ مجھے یقین تھا پھر وہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔ کہیں میرا نام نہیں لے گی۔ میں محض ایک شکاری ہوتا تو اسے جانے دیتا۔ اس کے بعد کوئی دوسری آ جاتی۔ میں اپنی زندگی میں بہت سی غلطیاں کرتا ہوں لیکن جب قلم اٹھاتا ہوں تو غلطیوں سے دامن بچانے والا قلم کار بن جاتا ہوں۔ ایسے وقت معاشرے کے کسی کردار پر طنز کرتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے‘ مجھے طعنے دیتا ہے۔ میرا محاسبہ کرتا ہے۔ مجھے سچ لکھنے

کے لئے پہلے سچا بننا پڑتا ہے۔ اور سچا بننے کے لئے لازمی تھا کہ پہلے تنویر سے انصاف کرتا اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے اندر بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں مصنف نہیں ہوں، بگڑی ہوئی تہذیب کا دلال ہوں۔

دن نکل آیا۔ وہ فلیٹ سے نکلی۔ میں نے بھی باہر آ کر دروازے کو لاک کیا۔ وہ آگے جا رہی تھی۔ میں تیزی سے قدم بڑھا کر اس کے برابر ہو گیا۔ پھر بولا۔ "کیا اپنی بہن کے پاس لانڈھی جاؤ گی؟"

وہ خاموش رہی۔ مین روڈ پر دو رکشے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک سے لانڈھی چلنے کو کہا پھر پیچھے بیٹھ گئی۔ رکشا اسٹارٹ ہوا تو میں بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ زبان سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی اگر پوچھتی تو رکشے والا بھی پوچھتا کہ میں کیوں ایک لڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ وہ منہ پھیر کر بیٹھی رہی۔ لانڈھی تک بڑا لمبا راستہ تھا۔ رکشا بھی جھٹکے کھا کھا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچے۔ اس نے ایک جگہ رکشا روکنے کو کہا میں نے اس سے پہلے میٹر کے مطابق کرایہ ادا کر دیا۔ رکشا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے پوچھا "آپ میرا کہاں تک ساتھ دیں گے؟"

"جہاں تک یہ دل تمہارے لئے دھڑکتا رہے گا۔ جب یہ دھڑکنا بند کر دے گا تو میں ساتھ چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

وہ ایک طرف چلتے ہوئے بولی۔ "آپ مکالمے لکھتے بھی خوب ہیں، بولتے بھی خوب ہیں۔ مجھ جیسی لڑکیاں بڑی آسانی سے دام میں آ جاتی ہیں۔"

"تمہاری آپا کا گھر کتنی دور ہے؟"

"آپ وہاں تک جائیں گے تو آپ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

"میں نہ جاؤں تب بھی پوچھا جائے گا کہ تم رات بھر کس کے ساتھ تھیں؟ ہو سکتا ہے، مجھے دیکھ کر تمام سوالات ختم ہو جائیں۔ بات سب کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

"میں کسی سے آنکھ نہیں ملا سکوں گی۔"

"تمہارے گھر والے کسی سے آنکھ نہیں ملا سکیں گے کیونکہ تم گھر سے نکلی نہیں تھیں، نکالی گئی تھیں۔"

وہ ایک مکان کے دروازے پر رک گئی۔ پھر بولی "یہ میری آپا کا مکان ہے۔ توبہ ہے، آپ کیسے حلیے میں آئے ہیں۔ کیا مجھے فلیٹ میں بتا نہیں سکتے تھے کہ میرے ساتھ یہاں آئیں گے۔"

"اگر بتا دیتا تو کیا دولہا بنا کر یہاں لاتیں؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا پھر دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھلنے تک میں اسے دیکھتا رہا اور وہ نظریں چراتی رہی پھر ایک صاحب نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر تنویر کو دیکھ کر کہا "اچھا تو ہماری سالی صاحبہ آئی ہیں۔"

تنویر نے میرا نام بتایا۔ ہمارا تعارف کرایا پھر کہا۔ "بھائی جان! آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائیں گے؟"

"بھئی یہ میرا گھر نہیں ہے۔ جب سے شادی کی ہے، نصف درجن سالیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ تم حکم دے رہی ہو، انہیں ضرور کمرے میں بٹھاؤں گا۔"

میں اس کے بہنوئی کے ساتھ ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بہنوں کے پاس چلی گئی وہاں کل سے اب تک کی روداد سنا رہی ہو گی۔ اس کا بہنوئی باتوں ہی باتوں میں مجھ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری اور تنویر کی جان پہچان کیسے ہوئی؟ اور ہم صبح سویرے کہاں سے آ رہے ہیں؟ میں اس کی باتوں کا گول مول جواب دے رہا تھا تاکہ ہمارے متعلق اسے اپنے ہی گھر والوں سے معلوم ہو سکے۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک خاتون نے بہنوئی صاحب کو بلایا۔ وہ چلے گئے پھر آدھے گھنٹے کے بعد ہی واپس آئے۔ تنویر کی دو بڑی بہنیں بھی تھیں۔ بہنوئی صاحب نے شرمندگی سے کہا۔ "ہمارے بڑے سالے صاحب، ہمیں دنیا والوں کے سامنے شرمندہ کرنے اور ہمارے سر جھکانے کے سلسلے میں بڑے فراخدل ہیں۔ کل رات جوان بہن کو گھر سے نکال کر انہوں نے پورے کراچی شہر کو دعوت عام دی کہ جس کا جی چاہے بہن کو ہوس کے جہنم میں ساتھ لے جائے۔"

دونوں بڑی بہنوں نے جھینپ کر مجھے دیکھا۔ ایک بہن نے اپنے شوہر کو ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "کیا آپ اسی بات کو سیدھے سادے انداز میں نہیں کہہ سکتے؟"

دوسری بہن نے کہا "اور یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نواب صاحب سے کوئی بات چھپی نہیں ہے اگر یہ نہ ہوتے تو پتا نہیں تنویر کیسے کیسے ہاتھوں میں پہنچ جاتی۔ نواب صاحب! ہم آپ کا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ آپ دنیا کو کیسے یقین دلائیں گی کہ آپ کی بہن نے کسی فرشتے کے ہاں پناہ لی تھی یا آئندہ بھی وہ گھر سے بے گھر کی جائے گی تو اسے پھر کوئی فرشتہ صبح تک اپنے پاس رکھے گا۔"

ایک بہن نے کہا "آپ کی باتیں کڑوی گولیوں کی طرح ہم نگل رہے ہیں۔ ویسے آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ تنویر اب میرے ہاں رہے گی۔"

میں نے کہا "تنویر کو باپ کا سایہ نصیب نہیں ہے۔ بے غیرت بھائی کے ہاں وہ رہ نہیں سکتی آپ بہنیں خود اپنے میکے سے پرائی ہو کر اپنے سسرال میں کب تک ایک جوان بہن کا

بوجھ اٹھائیں گی۔ سیدھی سی بات کہتا ہوں، تنویر کو ان حالات میں اپنا گھر بسانا چاہئے اگر آپ لوگوں کو منظور ہو تو میں تنویر کے ساتھ ایک نیا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ میں جیسا بھی ہوں، آپ لوگوں کے سامنے ہوں اور جو کچھ بھی ہوں اس سلسلے میں معلومات کی جاسکتی ہیں۔"

میں نے بہت جھجکتے ہوئے شادی کی بات کہہ دی۔ ایسی بات زبان پر لانا مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔ میری ایک خدمت کرنے والی بیوی اور محبت کرنے والے جوان بچے تھے میں دو بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا۔ ان کی گود بھر گئی تھی۔ میں نانا بن چکا تھا۔ اب بیٹے کی شادی ہونے والی تھی، کچھ عرصے بعد دادا بننے والا تھا۔ میری اور تنویر کی عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ فرق تنویر کے بہنوئی اور بہنوں کے سامنے واضح تھا۔ میں نے صاف صاف اپنے بیوی بچوں کے متعلق بتادیا تھا۔ وہ سب سوچ میں پڑ گئے تھے۔ آپس میں مشورہ کرنے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

کل سے اب تک تنویر کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے پیش نظر فیصلہ ہمارے حق میں ہونے والا تھا اور یہ تو پرانی کہاوت ہے کہ میاں بیوی راضی ہوں تو تمام مخالفتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ تنویر کی چھوٹی بہن میرے لئے پر تکلف ناشتا لائی۔ پتا چلا اس کی دو اور بہنیں شادی کے لئے بیٹھی ہیں۔ جس گھر میں لڑکیاں زیادہ ہوں، وہاں مردوں کی عمر نہیں دیکھی جاتی اگر وہ اچھا کمانے کھانے والا ہو تو لڑکی اس کے پلے باندھ دی جاتی ہے

☐

واپسی پر تنویر میرے ساتھ باہر آئی۔ ہم ٹیکسی اسٹینڈ تک جانے لگے اس نے کہا "میری بڑی آپا اور چھوٹی آپا کو اعتراض نہیں ہے۔ بھائی جان (بہنوئی) بھی راضی ہیں لیکن میری ایک اور بہن اور بہنوئی ہیں، بھیا اور بھابی ہیں یہ لوگ خواہ مخواہ رکاوٹیں پیدا کریں گے۔"

میں نے کہا "ایسا ہو گا تو ہم بھاگ کر دنیا کے اس کنارے چلے جائیں گے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ میں نے کہا "گھر جا کر آئینہ دیکھ لینا چہرے پر رونق آگئی ہے۔"

"آپ نے مجھے اتنی خوشیاں دی ہیں کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ آج کا دن میں کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔"

"تمہیں یہ بھی نہیں بھلانا چاہئے کہ جب تک زخم نہیں بھریں گے، بخار چڑھتا اترتا رہے گا۔ ابھی کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چلو۔"

"میں چلی جاؤں گی۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ باقاعدہ علاج کرالو گی۔"

"میں آپ کے لئے زندہ اور صحت مند رہنا چاہتی ہوں۔ آپ نے ایک بار ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا ہے، یہ میرے لئے ایک حکم ہے۔ آندھی طوفان آئے تب بھی میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔"

"اور آندھی طوفان آئے تب بھی تم کل صبح ملنے کے لئے آؤ گی۔"

وہ مسکرانے لگی۔ اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے سوجانا چاہئے تھا مگر میں اچھی طرح سوچنا اور سمجھنا چاہتا تھا کہ میں کیا اچھا کر رہا ہوں؟ اور کیا برا کر رہا ہوں؟ پہلا سوال تھا، کیا میں اپنے بیوی بچوں کے حقوق چھین رہا ہوں اور انہیں نقصان پہنچا رہا ہوں؟

میری کمائی میری محبت اور میرا نام صرف ایک بیوی کے لئے تھا۔ اب دوسری حصے دار بن کر آرہی تھی۔ اس کی آمد مذہبی قوانین کے مطابق تھی۔ یہ مرد کے انصاف پہ ہے کہ وہ دونوں کو برابر حقوق دیتا ہے یا نہیں؟ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی بھی آزمائشی مرحلہ میں کسی کی حق تلفی نہیں کروں گا اور حتی الامکان پہلی بیوی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میں اپنے فیصلے پر کہاں تک قائم رہوں گا۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا ویسے گنتی کے چند ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے فیصلوں، قسموں، وعدوں اور معاہدوں پر قائم رہتے ہیں۔ شادی بھی ایک مذہبی اور اخلاقی معاہدہ ہے۔ میں نے معاہدہ کیا تھا کہ اپنی بیگم کے ساتھ تمام زندگی محبت اور وفا کروں گا۔ محبت اب بھی کرتا ہوں مگر وفا بدل گئی ہے۔ تنویر سے بھی یہی مذہبی اور اخلاقی معاہدہ ہونے والا تھا۔ حقیقتاً ہماری قسموں، وعدوں اور معاہدوں میں لچک ہوتی ہے۔ اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ہم وقت ضرورت نئی عورت کو تنہائی میں دریافت کرنے کا جواز پیدا کرلیتے ہیں۔

۲۸ر جنوری ۱۹۷۷ء کو تنویر میری دلہن بن کر میرے فلیٹ میں آگئی۔ مرد عموماً اپنی شادی کی تاریخ بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ تاریخ اس لئے یاد ہے کہ دو دن کے بعد جو سسپنس شائع ہوا اس میں دیوتا کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ ہماری شادی میں تنویر کی دو بہنیں اور دو بہنوئی شریک ہوئے میری طرف سے چند خاص دوستوں نے شرکت کی تھی۔ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کوئی اپاہج، مجبور اور بے بس بیوی ہی اپنے لئے گڑھا کھودے گی۔ صحت مند اور تعلیم یافتہ عورتیں علیحدگی اختیار کرلیتی ہیں یا مرجاتی ہیں لیکن شوہر کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں نے شوہرانہ سیاست سے کام لیا تھا میاں بیوی میں تھوڑے بہت اختلافات ہوتے ہی ہیں میں اپنے اختلافات کے دوران دوسری شادی کرنے کی دھمکی دینے

لگتا تھا کہ عورت کی زندگی میں سوکن کا ذکر شروع ہو جائے۔ وہ ذرا سہم کر سوکن کے خواب دیکھے اور خیالوں میں اس سے لڑتی رہے۔ یہ نفسیاتی ٹوٹکا ہے اس طرح وہ لاشعوری طور پر تسلیم کرلیتی ہے کہ باہر آزادی سے رہنے والا کسی بھی عورت کے دام میں آسکتا ہے اور ایک سوکن لاسکتا ہے شعوری طور پر نہیں مانتی کہ اس جیسی خدمت گزار بیوی اور پیارے پیارے بچوں کے ہوتے ہوئے میاں صاحب اتنا بڑا اقدام اٹھائیں گے میں نے بیگم کی یہ خوش فہمی ختم کرنے کے لئے دوستوں سے کہا کہ وہ بیگم کے کانوں میں میری دوسری شادی کی بات پھونکتے رہیں۔ بیگم نے ایک دن مجھ سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟ آپ کے دوست بشیر صاحب فرما رہے تھے کہ آپ نے دوسری شادی کی ہے؟"

میں نے کہا "بشیر صاحب تو دوستوں کے گھروں میں آگ لگاتے رہتے ہیں۔ میں ان کا یہاں آنا بند کرادوں گا۔"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ دنیا والے جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

"بکواس مت کرو۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔"

پہلے دن میں غصہ دکھا کر چلا آیا۔ بیگم میرے رویے اور دنیا والوں کی باتوں کے درمیان الجھی رہی۔ یقین کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں جلا رہی۔ پہلے میں دھمکیاں دیتا تھا، پھر دوستوں کے ذریعے یہ بات پہنچائی۔ میں جانتا تھا کہ اب خاندان کی عورتیں اور بڑی بوڑھیاں اپنا اپنا تجربہ بیگم کو سنائیں گی۔ اسے اپنے حقوق کے لئے لڑنے کو کہیں گی آخر میں تان یہیں آکر ٹوٹے گی کہ عورت کو صبر کرنا چاہئے اور اپنے جائز حقوق حاصل کرکے بچوں میں خوش رہنا چاہئے۔

دوسری بار میرے دو عزیزوں نے مجھے تنویر کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ بیگم تک یہ بات پہنچی لیکن تصدیق نہیں ہوئی کہ جس لڑکی کو میرے ساتھ دیکھا گیا ہے وہ دوسری بیوی ہو سکتی ہے لیکن ایسے ایسے طریقہ کار سے میں نے دوسری شادی کا اعتراف کئے بغیر اپنی بیگم کے اندر سوکن کے لئے تھوڑی بہت قوت برداشت پیدا کردی تھی۔ آخر وہ سراغ لگاتے ہوئے ایک دن تنویر کی بہن کے ہاں پہنچ گئی۔ اس کے بعد شبے کی گنجائش نہ رہی۔ وہ گھر آکر بیمار پڑ گئی۔ شاک پہنچنے کا اثر سب پر ہوتا ہے۔ ایسے وقت بچے اور گھر کے بزرگ سب ہی شکایتیں کرتے ہیں۔ تنویر کا ایک بہنوئی جو ہماری شادی کی مخالفت کر رہا تھا میری پہلی بیوی کا ہمدرد بن گیا کہنے لگا۔ "بھابی آپ عدالت سے رجوع کریں۔ آپ نے دوسری شادی کی اجازت نہیں دی ہے یہ شادی غیر قانونی ہے۔"

عورت اپنی سوکن کی جتنی دشمن ہوتی ہے۔ اتنی ہی اپنے شوہر کی دوست ہوتی ہے وہ صدمات سے چور ہو کر غصے میں شوہر کے خلاف خوب بولتی ہے لیکن کسی طرح بھی اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔ وہ ایسا محبت سے بھی کرتی ہے اور مصلحت سے بھی کمانے والے اور پورے گھر کا بوجھ اٹھانے والے مرد کو نقصان پہنچا کر اپنی اولاد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔

جب وہ رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتا کرلیتی ہے تو اس کے تمام جھوٹے سچے ہمدرد بھی خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔

مخالفتوں کا سامنا کرتے کرتے تنویر کے روپ میں ایک نئی عورت مجھے مل گئی۔ وہ اتنی کم سن تھی کہ میری آدھی عمر سے بھی کم تھی۔ اتنی کم عمر لڑکی میری ملکیت تھی، میری دیوانی تھی۔ دن رات میری تمنا کرتی تھی اور میری قربت کا بہانہ ڈھونڈھ لیا کرتی تھی۔ میں اس کا مطلوب تھا۔ وہ میری طالب تھی۔ یوں میرے چاہے جانے کی خواہش کی تکمیل کرتی تھی بعض باتیں جو آج ہماری سمجھ میں نہیں آتیں انہیں برسوں بعد وقت سمجھا دیتا ہے۔ برسوں بعد جب تنویر میرے چار بچوں کی ماں بن گئی تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ میری زندگی میں داخل ہوتے وقت کم سن نہیں تھی اور نہ ہی میں اس کے مقابلے میں بہت عمر والا تھا۔ دراصل ہماری تمہاری اور سب ہی کی خواہش کم سن ہوتی ہے یہ خواہش کبھی سولہ برس سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس لئے ہم بوڑھوں کو جب چاہے جوان بنا دیتی ہے۔ ہمارے اندر پارے کی طرح مچلتی ہے۔ ہمیں اپنی عمر کا حساب کرنے کی مہلت نہیں دیتی۔ جوانوں کی رگوں میں لہو دوڑتا ہوگا۔ ہماری رگوں میں خواہش دوڑتی رہتی ہے۔

میں اپنی دانست میں دونوں بیویوں کے حقوق انصاف سے ادا کرتا رہا ویسے ہم شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلا سکتے ہیں لیکن دو سوکنوں کو ایک گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ میں نے تنویر کے ساتھ ایک الگ گھر بسایا تھا۔ یہ بھی میرے حق میں برا ہوا۔ ایک بیگم کے پاس بیس انچ کا رنگین ٹی وی ہوتا تو دوسری چوبیس انچ کے رنگین ٹی وی کا مطالبہ کرتی تھی۔ کسی کو مجھ پر بھروسا نہیں تھا۔ پہلی سمجھتی تھی۔ میں دوسری کو زیادہ رقم دیتا ہوں۔ دوسری شکایت کرتی تھی "آپ پہلی کو زیادہ رقم کیوں دیتے ہیں۔ وہاں جوان کمانے والے بچے ہیں۔ آپ اپنی عمر کا حساب کریں۔ آپ کے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟"

میں نے بارہا سمجھایا کہ جو کماتا ہوں، دونوں میں انصاف سے بانٹ دیتا ہوں۔ ہفتے میں ایک دن یہاں اور ایک دن وہاں رہتا ہوں باقی دن فلیٹ میں رہ کر سکون سے لکھتا رہتا ہوں لیکن بے اعتمادی انہیں جاسوسی پر مجبور کرتی تھی۔ دونوں میں سے کوئی نہ کوئی اچانک فلیٹ میں پہنچ جاتی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ پہلے ایک آجاتی اس کے پیچھے دوسری پہنچ جاتی تو میرے متعلق یہی رائے قائم ہوتی کہ میں ایک کو چپ چاپ بلا کر دوسری کا حق مارتا ہوں۔ میں نے پریشان ہو کر وہ فلیٹ چھوڑ دیا دوسرے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ نئے فلیٹ کا پتا معلوم کرنے کے لئے وہ آئے دن مجھ سے جھگڑتی رہیں لیکن میں

نے صاف کہہ دیا "ایک شریف آدمی کے ہاں پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتا ہوں۔ وہاں دو بیویوں کے درمیان تماشا نہیں بننا چاہتا لہٰذا مجھے تلاش نہ کیا جائے اور نہ مجھ سے پتا معلوم کرنے کی توقع کی جائے۔"

وہ کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔ "اس شریف آدمی کے ہاں کتنے فیملی ممبر ہیں؟ اور کتنی جوان لڑکیاں ہیں؟ لڑکیاں پر کٹی ہیں، پردہ کرتی ہیں یا جہاں تہاں پر تولتی ہیں؟"

دونوں کو فکر لاحق ہو گئی تھی۔ دونوں کہتی تھیں۔ "آپ دوسری کرسکتے ہیں تو تیسری بھی کرسکتے ہیں۔ ذرا اپنی عمر کا حساب کریں۔ دنیا والے مذاق اڑائیں گے۔"

عمر کا حساب کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ دونوں نے میرے گھریلو ماحول کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ کسی کے بھی گھر میں جانے سے پہلے معلوم ہوتا تھا کہ کس طرح میرا محاسبہ کیا جائے گا اور طرح طرح کے سوالوں سے گھریلو ماحول میں ناگواری پیدا کی جائے گی۔ ان حالات میں میرے اندر پھر کم سن خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ مجھے پہلی بیگم کی وہ کنواری دیوانگی چاہئے تھی، جب وہ سردی کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں دروازہ کھول کر میرا انتظار کیا کرتی تھی، میرے ساتھ صبح تک جاگتی تھی۔ محبوبہ بیوی بننے کے بعد بھی رات بھر نہیں جاگتی۔ مجھے دوسری بیوی کی وہ کنواری محبت چاہئے تھی، جب وہ میری کمائی کو اور میری چاہت کو سوکن کے ترازو میں رکھ کر نہیں تولتی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک دعا مانگتی تھی۔ اللہ کرے آپ کی کہانیوں کا معیار گر جائے۔ کوئی آپ کی تحریر پسند نہ کرے۔ خصوصاً کوئی لڑکی کہانیوں سے سحر زدہ ہو کر آپ کی تنہائی میں نہ آئے۔"

دوسری کی دعا تھی "یا اللہ! میرے میاں کی آمدنی میں اضافہ نہ ہو بلکہ کمی ہوتی رہے۔ ہم روکھی سوکھی کھالیں گے، تنگی سے گزارہ کرلیں گے اگر آئے دن آمدنی بڑھتی رہے گی تو تیسری ضرور آئے گی۔"

ستارہ عروج پر ہو تو بددعا کام نہیں آتی۔ دیوتا کی عمر پانچ برس ہو گئی تھی۔ میرے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ میری کہانیوں کا معاوضہ بڑھتا جارہا تھا اور تیسری کے امکانات روشن ہوتے جارہے تھے۔ میں ایسی محبت اور رومانس چاہتا تھا جس میں اپنا وقت، اپنی توجہ اور اپنی کمائی بانٹنے کا حساب کتاب نہ ہو اور میری بیویوں کا دعویٰ تھا کہ میری زندگی میں اب کوئی بھی عورت آئے گی تو وہ محض میری شہرت اور دولت دیکھ کر آئے گی کیونکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری شخصیت میں بزرگی ہے، جوانوں جیسی تیزی اور تڑپ نہیں ہے۔ مرد اوپر سے ڈھیلا نظر آئے تو عورت اسے گھاس بھی نہیں ڈالتی۔

میں بار بار آئینہ دیکھتا تھا۔ مجھ میں کہیں سے بڑھاپا نہیں جھلکتا تھا۔ آئینہ بدنام ہے کہ وہ بدصورت کو خوبصورتی کا اور بوڑھے کو جوانی کا فریب دیتا ہے لیکن میں آئینے کے سامنے فریب نہیں کھاتا تھا۔ یہ تو میں دیکھتا تھا اور دنیا بھی کہتی تھی کہ میرے سر کا ایک بال بھی سفید نہیں ہے۔ میں اتنا صحت مند ہوں کہ آخری بڑے سائز کا شلوار سوٹ میرے بدن پر آتا ہے میرا وزن دو من دس سیر ہے۔ میں پورے چھ فٹ کا نہ ہو سکا، پانچ انچ کی کمی رہ گئی ہے پھر بھی درمیانہ قد رکھتا ہوں۔ اچھی صحت کے باعث دراز قد دکھائی دیتا ہوں۔ میں آدھی صدی سے اوپر تین برس گزار چکا ہوں۔ میرے دانت ابھی سلامت ہیں۔ میں دانتوں سے اخروٹ توڑتا ہوں۔ کبھی اوپنر نہ ہو تو کوک اور سیون اپ کی بوتلیں دانتوں سے کھول دیتا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ محبت کرنے والیاں دولت نہیں دیکھتیں، دانت دیکھتی ہیں کہ انہیں چبانے والا کیسا ہے؟

ایک روز ایک ادھیڑ عمر کا آدمی میرے پاس آیا اس کے چہرے پر کئی روز کا شیو بڑھا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "فرمائیے، آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"جناب! مجھے کل رات ہی معلوم ہوا کہ آپ ہمارے علاقے میں رہتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اتنا بڑا رائٹر اورنگی میں رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کو یقین کیوں نہیں آیا، کیا اورنگی میں شریف اور معزز حضرات نہیں رہتے؟"

"بے شک رہتے ہیں لیکن ......"

میں نے بات کاٹ کر کہا "میرے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ بہت دولت مند رائٹر ہوں۔ مجھے ڈیفنس میں رہنا چاہئے۔"

"جی ہاں۔ آپ کے متعلق یہی سوچا جاتا ہے۔"

"غلط سوچا جاتا ہے۔ میں دولت مندوں کے درمیان نہیں غیرت مندوں کے درمیان رہتا ہوں۔ جب سے اورنگی ٹاؤن آباد ہوا ہے تب سے کوئی یہ ثابت نہیں کرسکا ہے کہ یہاں کوئی بھکاری رہتا ہے۔ یہاں غریب ضرور رہتے ہیں۔ روز کماتے ہیں، روز کھاتے ہیں، ایک دن بیمار پڑجائیں تو باہر کسی کو خبر نہیں ہونے دیتے کہ گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا ہے اگر خبر ہو جائے تو لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ضرور ہوتے ہیں۔ مجھے اس جگہ سے محبت ہے۔ میں یہاں بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لئے نہیں، محبت حاصل کرنے کے لئے رہتا ہوں اب آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

اس نے پوچھا "آپ شاید کہیں باہر جارہے ہیں؟"

"جی ہاں، ایک کام سے جارہا ہوں۔"

"چلئے، راستے میں باتیں ہو جائیں گی۔"

اس نے راستے میں پوچھا "جناب ایک حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ آپ صحیح جواب دیں گے۔ کیا ٹیلی پیتھی حقیقتاً ایسا علم ہے کہ ہم اسے حاصل کرکے کسی کے

بھی ڈھکے چھپے خیالات پڑھ سکتے ہیں ؟"

"جی ہاں۔ ایسا علم ہے۔ ماضی میں اولیاء کرام کو کشف و کمال حاصل تھا۔ وہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے دل کی باتیں بیان کر دیتے تھے۔ یورپ اور امریکا میں اس علم کے متعلق بڑے پیمانے پر تحقیقات جاری ہیں۔ اس سے دلچسپی رکھنے والوں کو باقاعدہ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ لوگ روحانیت کی حد تک دلی سکون اور دماغی اطمینان کے لئے خاصا علم سیکھ لیتے ہیں لیکن اس میں کسی کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "یہ قریب ہی میرا مکان ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں اگر آپ گھڑی بھر کے لئے میرے ہاں چلنا پسند کریں تو آج کا دن میرے لئے یادگار دن بن جائے گا۔"

اس نے بڑی عاجزی سے کہا تھا۔ میں انکار نہیں کر سکا۔

اس نے راستہ بدل دیا مجھے ایک کشادہ سی گلی میں لے آیا۔ ایک شکستہ سے مکان کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک گنگناتی ہوئی آواز نے پوچھا۔ "کون ہے ؟"

اس شخص نے کہا۔ "شبو! میں ہوں۔ دروازہ کھول۔ آج ہمارے گھر دیوتا آئے ہیں۔ ہمارے نصیب جاگ رہے ہیں۔"

میں اس کی بات پر جھینپ رہا تھا۔ اس کی آواز آس پاس کے مکانوں میں گئی ہوگی۔ جانے لوگ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ مجھے سلسلہ وار کہانی دیوتا سے بے حد لگاؤ ہے لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں کبھی تعریفی انداز میں دیوتا کہلانا پسند نہیں کروں گا۔ میں نے کہا۔ "آپ میری شان میں کچھ زیادہ ہی قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ ویسے آپ کون ہیں ؟ اور کیا کرتے ہیں ؟"

"یوں تو میرا نام محمود الحق ہے لیکن جوانی میں پہلوانی کرتا تھا، یار دوستوں نے مجھے گاے کہنا شروع کیا تو یہی نام پڑ گیا۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ نگاہوں کے سامنے کیچڑ تھی، کیچڑ میں کنول تھا، کنول میں حسن تھا اور حسن میں جوانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اور گورے گلابی چہرے پر کیچڑ لگی ہوئی تھی جس کے باعث جلد کی رنگت اور نکھر آئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنی حالت پر جھینپ گئی تھی۔ گاے نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ؟"

"وہ ابا! وہ میں ... میں مٹی کا چولہا بنا رہی تھی۔"

یہ کہتے ہی وہ بھاگتی چلی گئی۔ اس نے شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کمبخت جاہل کی بچی ہے۔ کتنی بار سمجھایا ہے گھر آنے والوں کو سلام کرنا چاہئے۔ آیئے تشریف لایئے۔"

میں اس کے ساتھ آنگن میں آیا پھر ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا۔ وہ کمرا سامان سے خالی تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی تپائی تھی جس پر ایک موم بتی بجھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک ڈبے میں اور بہت ساری موم بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دوسرے کمرے سے ایک بہت ہی پرانی سی کرسی لے آیا، پھر بولا۔ "تشریف رکھئے۔"

میں نے کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "اس خالی کمرے اور اتنی موم بتیوں کا مطلب کیا ہے ؟ کیا آپ یہاں عبادت کرتے ہیں ؟"

وہ فرش پر میرے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ "جی ہاں، عبادت ہی سمجھئے اگر آپ میری کچھ مدد کریں گے تو مجھے عبادت کا صلہ ضرور ملے گا۔"

"میں نہیں سمجھا، بھئی عبادت کا صلہ ضرور ملتا ہے مگر یہ صلہ میری مدد سے کیسے ملے گا ؟"

"جناب! علم حاصل کرنا بھی ایک عبادت ہے۔ میں ٹیلی پیتھی کا علم حاصل کر رہا ہوں۔ اسی لئے یہ کمرا خالی کر دیا ہے۔ روز شام کو موم بتی جلا کر شمع بینی کی مشق کرتا ہوں۔ جب بہت دیر تک اس کی لو پر نظریں جمائے رہتا ہوں تو مجھے ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میری بیٹی سر مالش کرتی ہے پھر مجھے نیند آجاتی ہے۔ میں شمع بینی کی مشق جاری نہیں رکھ سکتا۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ یہ مشق جاری رہ سکے۔"

میں بے زاری سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ شمع بینی کی صبر آزما مشقوں سے نہیں گزر سکے گا۔ اگر میں اس سے یہ بات کہتا تو وہ اسے دل سے نہ مانتا، جو لوگ کچھ حاصل کرنے کے لئے تڑپتے ہیں، وہ اپنی کوئی کمزوری تسلیم نہیں کرتے۔ میں نے پوچھا۔ "تم یہ علم حاصل کیوں کرنا چاہتے ہو ؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں۔ میں بہت غریب ہوں، ایک وقت کھاتا ہوں تو دوسرے وقت کی روٹی کی فکر پڑ جاتی ہے۔ ایک جوان بیٹی ہے، اس کی شادی کے لئے چار پیسے جوڑ نہیں سکتا۔ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے دنیا کا سب سے دولت مند شخص بننا چاہتا ہوں۔"

"تم فی الحال کیا کرتے ہو ؟"

"کوئی ڈھنگ کا کام ملتا نہیں ہے۔ گھر میں ہاضمے کا چورن بناتا ہوں اور بسوں میں گھوم گھوم کر بیچتا ہوں۔"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے ؟"

"بس کنڈیکٹر تھا۔"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے ؟"

"ایک دفتر میں چپراسی تھا۔"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے ؟"

"ایک اسپتال کے مردہ خانہ کا واچ مین تھا۔ آپ پوچھیں گے اس سے پہلے کیا کرتا تھا لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

"میں ٹیلی پیتھی کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا!" وہ خوش ہو گیا۔

میں نے کہا "اس علم کو حاصل کرنے کے لئے آدمی کو مکار، تیز طرار اور کسی حد تک نشے کا عادی ہونا چاہئے۔"

"اچھا!" وہ پہلے تو خوشی سے کھل گیا پھر بے یقینی سے بولا "لیکن جناب! دیوتا میں فرہاد صاحب کبھی نشہ نہیں کرتے ہیں۔"

"ہم کہانیاں لکھنے والوں پر کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک پابندی یہ ہے کہ ہم کہانیوں کے ہیرو کو شرابی یا چرسی بنا کر نہیں پیش کر سکتے۔ کیا تم نے مختلف مزاروں پر ملنگ بابا جیسے فقیروں کو نہیں دیکھا، وہ مراقبے میں جانے کے لئے چرس کا دم لگاتے ہیں۔ مراقبہ ہو یا شمع بینی، کسی ایک طرف لو لگانے، اپنی توجہ صرف ایک مرکز پر قائم رکھنے کے لئے ساری دنیا کو بھولنا ضروری ہے اور ساری دنیا کو بھلانے کے لئے نشہ ضروری ہے۔"

وہ میرے پاؤں پکڑ کر بولا "میں سمجھ گیا جناب! نشہ ضروری ہے۔ میں آپ کی ناراضگی کے خوف سے چھپا رہا تھا، میں ہر طرح کا نشہ کر لیتا ہوں۔ آپ شمع بینی کے لئے جو نشہ کہیں گے، وہ کروں گا۔"

"شاباش! مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ بہتر ہے، ابھی گھر میں نشے کی کوئی چیز ہے تو استعمال کرو۔ آدمی سرور میں آ کر دلیر بن جاتا ہے۔ تم میں دلیری آئے گی تو تم کچھ چھپائے بغیر اپنے اندر کی باتیں فرفر بولنے لگو گے۔"

"میں تو حکم کا غلام ہوں مگر گھر میں نشے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ آج کل کڑکی میں ہوں اگر کچھ روپے ہوتے تو آدھے گھنٹے میں چرس لے آتا۔"

میں نے جیب سے پچاس روپے نکال کر دیے۔ وہ جھجکتے ہوئے بولا "نہیں جناب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میرے گھر میں آپ پہلی بار مہمان آئے ہیں۔"

"بھئی تم قرض سمجھ کر لے لو۔ ٹیلی پیتھی سیکھنے کے بعد دولت ملے گی تو میرے پچاس روپے واپس کر دینا۔"

اس نے پچاس روپے لیتے ہوئے پوچھا "کیا آپ بھی نشہ کریں گے؟"

"جس دن ٹیلی پیتھی سیکھنا ہو گی، نشہ کر لوں گا۔ فی الحال ارادہ نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ بیٹھیں۔ میں شبو سے چائے کے لئے کہہ دیتا ہوں۔ جب تک آپ چائے پئیں گے، میں چرس لے کر آجاؤں گا۔"

وہ شبو کو آواز دیتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ وہ کہہ رہا تھا "گدھے کی بچی! تجھے کب عقل آئے گی۔ ہمارے ہاں نواب صاحب آئے ہیں۔ نواب صاحب۔ ڈائجسٹ میں لکھتے ہیں، بہت دولت مند ہیں۔ جلدی سے ایک کپ چائے بنا دے۔"

"وہ کیسا دولت مند ہے، اس کے پاس ایک کپ چائے کا پیسہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صبح سے چولہا نہیں جلا ہے، چائے کہاں سے بنا کر دوں۔"

"اری ذرا آہستہ بول، میں ہوٹل سے چائے لے آتا ہوں۔ تیرے لئے کچھ کھانے کو بھی لے آؤں گا۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ گامے چلا گیا تھا۔ کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا، وہ سامنے آگئی۔ اس بار لباس بدلا ہوا تھا، چہرہ دھل کر گلاب ہو گیا تھا، وہ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی اس نے دونوں ہاتھوں کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ طنزیہ انداز میں بولی "کیا میں حسین نہیں ہوں، میری تعریف نہیں کرو گے؟"

"تمہاری کیا تعریف کروں۔ تعریف اس خدا کی ہے، جس نے تمہیں بنایا ہے۔"

وہ تعجب سے بولی "کیا سچ مچ میری تعریف نہیں کرو گے؟ ابا باہر گئے ہیں، میں اکیلی ہوں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ کیا مجھے نہیں پھانسو گے؟"

میں نے بڑی معصومیت سے کہا "کسی اکیلی غریب لڑکی کو پھانسنا بری بات ہے۔ اللہ میاں گناہ دیتے ہیں اور جہنم میں پھینک دیتے ہیں۔"

وہ اطمینان کی گہری سانس لے کر دونوں ہاتھ سامنے لے آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چپل تھی، دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

وہ بولی "باپ کوئی کام نہ کرتا ہو۔ دن رات نشہ کرتا ہو تو گھر میں آنے والے اس کے دوست، سو پچاس کے نوٹ دوستی میں نہیں دیتے، اس کی جوان بیٹی کو دیکھ کر دیتے ہیں۔ تم نے ابا کو پچاس روپے کیوں دیے؟ ایک ہفتہ پہلے ایسے ہی ایک دوست نے ابا کو روٹی اور چرس لانے کے لئے روپے دیے۔ ابا رقم دیکھ کر بیٹی کو بھول جاتا ہے۔ اس کے باہر جاتے ہی وہ دوست مجھ سے عشق کرنے لگا۔ میں نے یہ چاقو لیا پھر چپل سے مارتے ہوئے بولی۔ چپ چاپ مار کھا لے، نہیں تو چاقو سے مار مار کے مردہ کر دوں گی۔ میرا ہاتھ پکڑے گا تو شور مچاؤں گی پھر محلے والے تیرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی، پھر ہنستے ہنستے بولی "وہ چپ چاپ مار کھا کے جو گیا ہے تو پلٹ کر نہیں آیا۔ میں سمجھ رہی تھی، تمہارے عشق کا بھی بھوت اتارنا ہو گا مگر تم تو بالکل سیدھے ہو کیا تم کسی بھی لڑکی کو نہیں چھیڑتے ہو؟"

"نہیں، میں نہیں چھیڑتا۔ لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں، مگر میں نے قسم کھائی ہے۔ میں صرف ایک لڑکی سے محبت کروں

گا۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"میں کیسے بتاؤں، ابھی تک وہ میری زندگی میں نہیں آئی ہے۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی "میں تو اردو پڑھنا بھی نہیں جانتی۔ مجھے اپنا نام لکھنا بھی نہیں آتا۔ میرے باپ کے پاس اردو کی پہلی کتاب پڑھانے کے پیسے کبھی نہیں ہوئے، ماں اسی دکھ میں مرگئی۔ میں بچی سے جوان ہوگئی۔ اب کوئی پڑھنے کی بات کرتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ میں ابا سے لڑتی ہوں۔ اس کے دوستوں کو مار کے بھگاتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے، میں سب سے لڑتی رہوں، سب کو گالیاں دیتی رہوں، سب کے منہ پر تھوکتی رہوں۔ جب میں کسی کے ساتھ ایسا کرتی ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، اس روز مجھے بہت بھوک لگتی ہے۔ اس رات بہت گہری نیند آتی ہے۔"

میں اس کے حسن و شباب کو دیکھ رہا تھا اور افسوس کر رہا تھا۔ اس کے باپ کی بدحواسی نے اس کے مزاج کو منفی بنادیا تھا۔ میں نے کہا "اگر تم دوسروں سے لڑتے رہنا اور گالیاں دیتی رہنا چاہتی ہو تو یہ کوئی اچھی بات نہیں اگر گامے تمہیں بھوکا رکھتا ہے، اس نے تمہیں ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی تو اسے اور اس کے دوستوں کو گالیاں دینے سے تمہاری محرومیوں کا علاج نہیں ہوجائے گا۔ ہمارے ملک میں کتنی ہی ان پڑھ لڑکیاں ہیں لیکن وہ طرح طرح کے ہنر سیکھ کر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح عزت اور مقام حاصل کرتی ہیں۔ اگر تم آئندہ بھی گالیاں دینا چاہتی ہو، تو میرے سامنے سے چلی جاؤ۔ میں تمہیں بہت ہی پیاری اور میٹھی زبان والی سمجھ کر باتیں کر رہا تھا۔ پلیز یہاں سے چلی جاؤ، اچھی بن کر اچھی باتیں سمجھو پھر یہاں آؤ۔"

باہر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد گامے ایک پیالی میں چائے لے کر آیا، پھر بولا "آپ چائے پیتے رہیں، میں ذرا کھانے پینے کا سامان اور چرس لے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ پھر چلا گیا۔ ہم پھر تنہا رہ گئے۔ ایک کمرے میں، میں تھا، دوسرے میں وہ تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اس کمرے میں آنے سے منع کردیا تھا۔ دراصل یہ نفسیاتی حربہ تھا۔ جس لڑکی کے حسن و شباب کی بہت تعریفیں کی جاتی ہوں لوگ اس کے سامنے آہیں بھرتے ہوں، اسے نظر انداز کیا جائے تو وہ تمام چھچھورے عاشقوں کی تعریفیں بھول کر نظر انداز کرنے والے کے متعلق سوچنا شروع کردیتی ہے۔ مجھے یقین تھا، وہ میرے ہی بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ میرا سماجی رابطہ ہمیشہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے ساتھ رہا ہے۔ ذہین لڑکیاں غیر شعوری طور پر نفسیاتی عمل کا ردعمل ضرور ظاہر کرتی ہیں۔ شبو جیسی جاہل گنوار لڑکی پتا نہیں کس انداز میں ردعمل ظاہر کرنے والی تھی۔ مجھے وہاں تنہا بیٹھے ایک گھنٹا گزر گیا۔ ایک گھنٹا بہت ہوتا ہے۔ گامے واپس آنے ہی والا تھا۔ میں خواہ مخواہ ماہر نفسیات بن کر شبو کے حسین نظاروں سے محروم ہوگیا تھا۔

آخر اس کی آواز سنائی دی "ارے اس طرح کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ میرا باپ بھی موم بتی جلا کر اس کے سامنے الو کی طرح بیٹھا رہتا ہے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی آواز آئی "مجھے اس طرح کیا دیکھ رہا ہے۔ نظریں جھکالے ... مجھے نہ دیکھ۔ میں بہت بری لڑکی ہوں۔ گالیاں بکتی ہوں۔ میری زبان پر چھالے پڑیں گے۔ تو اسی طرح دیکھتا رہے گا تو تیری آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔"

میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ آنگن کی ایک دیوار پر بلا بیٹھا ہوا تھا۔ شبو دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس سے کہہ رہی تھی "ٹھیک میرے باپ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ کیا تو بھی ٹیلی پیتھی سیکھ رہا ہے؟ میں کہتی ہوں نظریں جھکالے۔ نہیں تو گالی ... ل..."

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر کھڑکی کی طرف پلٹ کر دیکھنے والی تھی۔ میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی "دیکھو گالیاں دینا بری بات ہے مگر میں تمہیں پتھر مار کر بھگا تو سکتی ہوں۔"

اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھالیا لیکن پتھر کھانے سے پہلے ہی بلا بھاگ گیا۔ میں پھر کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی "اتنی سی بات پہلے سمجھ میں نہیں آئی۔ دشمن کو گالیاں دے کر منہ خراب نہیں کرنا چاہئے۔ پتھر اٹھا کر مارو تو وہ دم دبا کر بھاگ جائے گا۔"

اس نے ہاتھ پر پتھر اچھالتے ہوئے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر مجھے دیکھتے ہوئے پتھر کو اچھالتے ہوئے قریب آئی، مجھ سے بولی "ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہاری باتوں نے الجھادیا تھا۔ تم بلے سے بول رہی تھیں، یوں لگا جیسے روئے سخن میری طرف ہے۔"

"یہ روئے سخن کیا ہوتا ہے؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں تمہیں سمجھا نہیں سکوں گا۔"

"کیوں نہیں سمجھا سکوگے؟ کیا یہ کوئی پڑھی لکھی گالی ہے؟"

"جس بری بات کے لئے میں تمہیں منع کرتا ہوں، وہی خود کیسے کرسکتا ہوں۔ ویسے میں سمجھ گیا ہوں، تم سمجھ دار ہو۔ میں نے تمہیں ایک اچھی بات سمجھائی اور تم سمجھ گئیں۔ اب تم میرے سامنے آسکتی ہو۔"

اس نے گھور کر دیکھا پھر پوچھا "کیا تم اجازت دوگے تو

آؤں گی ورنہ نہیں آسکتی۔ تم ہوتے کون ہو روکنے ٹوکنے والے؟ میرا ابھی دماغ خراب ہوگیا ہے' تم نے کہا سامنے نہ آنا' میں ایک گھنٹے تک نہیں آئی۔ یہ میرا گھر ہے' میں کیوں نہیں آؤں گی۔ تم مجھے منع کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

"میں منع نہیں کررہا ہوں' میں تو کہہ رہا ہوں' سامنے آسکتی ہو۔"

"تمہارے کہنے سے بھی نہیں آؤں گی۔ یہیں کھڑی رہوں گی۔"

میں مسکرانے لگا۔ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر سر کھجاتے ہوئے بولی "مگر میں تو سامنے ہی کھڑی ہوں' پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں جو کرنا نہیں چاہتی وہی کر بیٹھتی ہوں اور جو کرنا چاہتی ہوں' وہ کر نہیں پاتی۔ تم باتیں گھما پھرا کر کرتے ہو۔ تمہاری باتیں ہوتی کچھ ہیں' ان کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ تم آخر کون ہو؟ اور کرتے کیا ہو؟"

"میں باتیں بنانے کی کمائی کھاتا ہوں۔"

"اچھا' جیسے میرا ابا بسوں میں باتیں بنا کر چورن بیچتا ہے۔"

"ہاں' مگر اتنا خیال رکھتا ہوں کہ میرے چورن سے واقعی ہاضمہ درست ہو جایا کرے۔"

گامے پونے دو گھنٹے بعد آیا۔ وہ چلتے وقت ذرا ڈگمگا رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں کھڑکی کی آڑ سے دیکھ رہا تھا وہ بیٹی سے بولا "ہماری تقدیر پھوٹ گئی ہے۔ میں پچاس روپے لے کر گیا تھا۔ کچھ کھانے پکانے کا سامان لانا چاہتا تھا مگر کیا بتاؤں' وہ پچاس کا نوٹ اوپر کی جیب میں رکھا تھا۔"

شبو نے کہا "اس کے آگے مجھے معلوم ہے' کسی نے جیب کاٹ لی۔"

"ارے واہ' جب بھی میری رقم جیب سے چوری ہوتی ہے یا کہیں گر جاتی ہے یا کوئی چھین کر لے جاتا ہے۔ تمہیں بتانے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہیں پڑھایا لکھایا نہیں ہے مگر تم ماں کے پیٹ سے پڑھی پڑھائی آئی ہو۔"

"ابا! تم یہاں کسی کو بٹھا کر گئے تھے' کچھ یاد ہے؟"

"آں... ہاں' یاد کیوں نہیں ہے" وہ سرور میں جھومتا ہوا کمرے میں آیا' مجھے دیکھ کر بولا "نواب صاحب! معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ذرا دیر ہوگئی۔"

"ذرا سی دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ اب دیر نہ کرو' تم زبردست موڈ میں ہو۔ فوراً موم بتی جلاؤ اور شمع بینی شروع کردو۔"

اس نے جھک کر میرے پیروں کو چھونا چاہا' نشے میں توازن قائم نہ رکھ سکا' اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھنے کے لئے سہارا دیا' اس نے کہا "آپ میرے گرو ہیں۔ آپ کا ہاتھ میرے سر پر رہے گا تو میں ٹیلی پیتھی سیکھ لوں گا۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالی' ایک موم بتی جلائی اسے ایک تپائی کے اوپر رکھا پھر اس سے کچھ فاصلے پر آیا اور وہاں فرش پر پالتھی مار کر بیٹھ گیا' میں نے کہا "موم بتی کی لو کو غور سے دیکھتے رہو اور میری باتوں کا سچ سچ جواب دیتے رہو۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر موم بتی کی لو کو تک رہا تھا۔ میں نے کہا "جھوٹ بولو گے تو ٹیلی پیتھی نہیں آئے گی۔ بولو' تم نے بس کنڈیکٹری کیوں چھوڑ دی؟ کیا اس میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے؟"

"ہاں' کنڈیکٹر کو صبح سے شام تک چلتی بس میں اترنا چڑھنا پڑتا ہے۔ میں نے استاد سے ڈرائیوری سیکھی۔ ایک روز استاد نے مسافروں سے بھری ہوئی بس چلانے کو دی۔ میں نے ایک دکان میں لے جاکر ٹھونک دی۔ دو دن حوالات میں اور چھ مہینے جیل میں رہا۔ واپس آیا تو کسی بس مالک نے مجھے نوکری نہیں دی۔"

"تم اس سے پہلے کسی دفتر میں چپراسی تھے؟"

"ہاں' ہیڈ کلرک کے حکم سے رشوت لیتا تھا۔ ہیڈ کلرک مجھے رشوت کا دس فی صد دیتا تھا۔ ایک دن میں نے انجانے میں ایک پولیس افسر سے رشوت مانگی' مجھے اتنے جوتے پڑے کہ میں گنتی بھول گیا۔ ہیڈ کلرک کا کچھ نہ بگڑا میری ملازمت چلی گئی۔"

"اور اسپتال کی نوکری کیسے گئی؟"

"وہاں دواؤں کے اسٹور کا ایک انچارج تھا۔ وہ مجھے نیند کی گولیاں اور مارفیا کے انجکشن وغیرہ بیچنے کے لئے دیتا تھا۔ میں میڈیکل اسٹور وغیرہ میں انہیں آدھی قیمت پر بیچتا تھا۔ اسٹور کا انچارج بھی مجھے کمیشن دیتا تھا۔ ایک دن اسپتال سے باہر جاتے وقت میری تلاشی لی گئی۔ میرے لباس کے اندر سے چوری کا مال نکلا۔ مجھے پولیس والے تھانے لے گئے۔ وہاں بڑی مشکل سے رشوت دے کر سزا سے بچ گیا مگر نوکری چلی گئی۔"

"تم جس طرح نشہ کرتے ہو اور جتنے کارناموں کا ذکر کرچکے ہو' اس کے پیش نظر تمہیں کوئی شیطانی علم سیکھنا چاہئے' شمع بینی کی مشقیں روحانیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے لیے قلبی اور جسمانی پاکیزگی لازمی ہے۔ تم بھی....."

میں آگے نہ کہہ سکا۔ وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا تھا پھر چاروں شانے چت ہوگیا تھا۔ میں نے قریب جاکر دیکھا۔ نشہ اس پر غالب آگیا تھا۔ شبو درمیانی دروازے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی نظر بچا کر سو روپے کا ایک نوٹ گامے کی جیب میں رکھ دیا پھر واپس آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "آدمی کو کم از کم اپنی جوان بیٹی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ میں ایک اجنبی ہوں۔ یہ مجھے تمہارے ساتھ تنہا چھوڑ کر گہری غفلت میں ڈوب گیا ہے۔"

وہ چپ رہی۔ میرا خیال تھا وہ کچھ کہے گی، پھر میں نے ہی اٹھتے ہوئے کہا "میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ محلے والے باتیں بنائیں گے، میں جا رہا ہوں۔ آنگن کا دروازہ بند کر لو۔"

میں کمرے سے باہر آیا پھر آنگن سے گزر کر دروازے تک پہنچا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے آرہی تھی۔ میں نے کہا "مجھے معلوم ہے، تم نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہوں گا تو تم میری نیت پر شبہ کروگی اگرچہ میں نے تمہارے باپ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ دیکھا ہے۔ دس روپے میں ہوٹل سے سالن اور روٹیاں آسکتی ہیں، گھر کا راشن نہیں آسکتا اگر میں تمہیں یہ سو روپے....."

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اس نے دروازے کو ایک دھڑاکے سے بند کردیا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ لیکن جو صورت دل میں اتر جائے وہ تصورات کی دنیا کو روشن کرتی رہتی ہے۔ اس روز میں بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ ایسے وقت اپنا محاسبہ ضرور کرنا چاہئے۔ کم از کم اپنی عمر کا حساب کرنا چاہئے۔ میری عمر کے لوگ کام کاج سے ریٹائر ہو کر گھر کی ذمے داریاں جوان اولاد کو سونپ کر گوشۂ تنہائی میں تسبیح لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لیکن دنیاوی خواہشات میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں میں کوئی پسلا بد معاش بوڑھا نہیں ہوں۔ اس پیری میں بہت سے دیوانے جو اوپر سے بزرگی کا بھرم رکھتے ہیں اور اندر سے ہوس کی کمین گاہ میں بیٹھے کمینی خواہش کا چارہ پھینکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی پکڑا بھی جاتا ہے۔ باقی معصوم رہتے ہیں لیکن مجھ جیسے لوگ حقیقت کو جھٹلانا یا اسے مصلحتاً چھپانا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے میں اپنی آپ بیتی میں دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنے پڑھنے والوں کو نہ پہلے دھوکا دیا۔ نہ اب دینا چاہتا ہوں۔ اکثر فن کاروں میں کچھ کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں، وہ فن کے اعتبار سے خالص دودھ کے مانند ہوتے ہیں لیکن کردار کا کوئی پہلو ایسا ہوتا ہے، جہاں سے گٹر کا پانی نکل کر دودھ میں مل جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو فن کار بھی انسان ہوتے ہیں۔

اس روز مجھے یاد نہیں ہے کہ میں کتنی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا جتنی دیر کھڑا رہا، مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔ آئینے کے طلسم میں غریب شبو کی دولت مند جوانی انگڑائیاں لیتی رہی۔ اس نے میرے منہ پر ایک دھڑاکے سے دروازہ بند کرکے سمجھا دیا تھا کہ وہ بخیل ہے، اپنی دولت کو چھپا کر، سنبھال کر رکھتی ہے، اسے خرچ ہونے نہیں دیتی لیکن آئینے میں وہ سخاوت پر اتر آئی تھی، میں ہاتھ پھیلا کر کہہ رہا تھا "تم اتنا حسن لے کر کیا کروگی۔ خدا کے نام پر خیرات دے دو" اور وہ بڑی فراخ دلی سے دولت لٹا رہی تھی۔

میں نے پریشان ہو کر آئینے سے منہ پھیر لیا۔ کسی کو پالینے کا یقین ہونے سے پہلے اتنی دور تک سوچنا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا دانش مندی نہیں تھی۔ میں اس کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ اس نئے راستے پر کتنی انگلیاں اٹھیں گی؟ کتنی مخالفتوں کا سامنا ہوگا؟ اور جتنی بھی مخالفتیں ہوں، انہیں بھگتنے کے بعد وہ ملے گی یا نہیں؟ میں اپنے فطری تقاضے کے مطابق محبت میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری تمنا کرتی ہوئی میرے پاس آئے اور محبت سے دن رات میرا مطالبہ کرتی رہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ وہ میری طرف مائل ہو۔ میرے منہ پر دروازہ بند کرنے والی آئندہ میری ہلکی سی آہٹ پر بھی دروازہ کھولنے دوڑی چلی آئے۔

دوسری صبح گامے پھر میرے پاس آیا۔ شرمندگی کا اظہار کرنے لگا "جناب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ کل پہلی بار میرے گھر آئے اور میں نشے میں سوگیا۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔ آپ کی خدمت نہیں کروں گا تو کبھی یہ علم نہیں سیکھ سکوں گا۔"

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سو کا جو نوٹ میں نے اس کی جیب میں ڈالا تھا وہ شبو تک پہنچا یا نہیں؟ میں نے کہا "نشہ کرنا تمہارا ذاتی فعل ہے مگر اس کے لئے تم جوان بیٹی سے فاقے کراتے ہو۔ میں نے جو رقم دی تھی، تم اس سے کھانے پینے کا بھی سامان لا سکتے تھے۔"

"جناب! آپ کے قدموں کی برکت سے میرے ہاں چار دن کا راشن آگیا ہے۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا "کہاں سے آگیا ہے؟"

"کل میں نے شبو سے جھوٹ کہا تھا کہ پچاس روپے میری جیب سے چوری ہوگئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پورے پچاس کی پڑیاں خرید لی تھیں۔ میری یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ ... رات کو ہوش میں آنے کے بعد میں نے گھر میں ڈھیر سارا راشن دیکھا تو شبو نے بتایا۔ میری جیب میں دس روپے تھے۔ اس نے پرچون والے کے بقایا دس روپے ادا کئے اور پچاس روپے کا ادھار راشن لے آئی۔ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ چار چھ دن کی فکر سے نجات مل گئی ہے۔"

مجھے اطمینان ہوگیا۔ کل گامے کی جیب میں دس کا نہیں سو کا نوٹ تھا۔ میری پہلی رشوت اس کی جوان بیٹی کی ہتھیلی پر پہنچ گئی تھی۔ یوں اس ہتھیلی کی لکیریں میرے حق میں بدل رہی تھیں۔ میں نے کل اس سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا اس کے باپ کی جیب میں دس کا نوٹ ہے۔ اس نے جیب

سے سو کا نوٹ حاصل کیا۔ باپ سے جھوٹ کہہ دیا کہ دس کا نوٹ ملا ہے تاکہ یہ بات باپ کے ذریعے مجھ تک پہنچے۔

اب یہ سمجھنے کی بات تھی کہ اس نے میرے ہاتھ سے سو کا نوٹ نہیں لیا تھا۔ میں نے دینا چاہا تو اس نے میرے منہ پر دروازہ بند کردیا۔ وہی رقم اس نے باپ کی جیب سے قبول کرلی، وہ لاکھ ان پڑھ اور نا سمجھ سہی 'اتنا تو سمجھ گئی ہوگی کہ میں کسی کی جیب میں دس کا چارہ ڈال کر اسے سو پیش کررہا ہوں اگر گاے کے پاس پہلے سے سو روپے ہوتے تو وہ گھر کے لئے راشن ضرور لاتا' پچاس روپے کی چوری کا بہانہ نہ کرتا۔

میں اس بات کو ہر پہلو سے سمجھنا چاہتا تھا۔ میں شبو سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے ایک بار میری رقم قبول کی ہے لہٰذا آئندہ مجھ سے لین دین رکھنا چاہئے۔ وہ صاف انکار کردیتی، ...کیونکہ رقم کہیں سے بھی آئی ہو' اس نے باپ کی جیب سے حاصل کی تھی اور یہ اس کا حق تھا۔ فی الحال یہی تدبیر مناسب تھی کہ وہ آئندہ بھی گاے کے ذریعے امداد حاصل کرے اور دل ہی دل میں میری عنایات کو تسلیم کرتی رہے۔ گاے نے کہا "کل میں نے کچھ زیادہ ہی دم لگالیا تھا یوں مجھ پر نشہ غالب آگیا تھا میں شمع بینی نہ کرسکا۔ آپ مصروف رہتے ہیں مگر مجھے تھوڑا سا وقت دیجئے۔ میں چرس کا صرف ایک سگریٹ پیوں گا اور موم بتی کی لو کو دیکھتا رہوں گا۔ کیا آپ میرے ہاں چلیں گے؟"

میرا دل ادھر کھنچا جارہا تھا۔ شبو کا روشن روشن مہکتا ہوا حسن اور دھڑکتا ہوا شباب میرے اندر چیخ رہا تھا۔ میں نے انکار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ گھر سے نکل پڑا۔ تمام راستے وہ نگاہوں کے سامنے مسکراتی رہی۔ گاے مجھ سے باتیں کررہا تھا۔ اس کی کوئی بات میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں صرف "ہوں' ہاں" کہتا جارہا تھا۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ بند دروازہ میرے صبر کا امتحان لینے لگا۔ حسن ہو' محبت ہو یا خوش نصیبی یہ آنے میں ہمیشہ دیر کرتی ہیں مگر آتی ضرور ہیں۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ایک لمحہ کے لئے حسن کی چکاچوند ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر جلدی سے دوپٹے میں منہ چھپاتی ہوئی چلی گئی۔ ہم آنگن میں آئے۔ میں نے دور تک دیکھا۔ وہ حسن ایک کمرے میں غروب ہوگیا تھا۔ گاے نے غصے سے کہا "اس نے آج بھی آپ کو سلام نہیں کیا' اب میں اسے گالیاں دوں۔"

"کل تم نے اسے گدھے کی بچی کہا تھا۔ اس کے ساتھ تم خود کو بھی گالیاں دیتے ہو۔ بہتر ہے غصہ تھوک دو۔"

ہم اسی خالی کمرے میں آگئے۔ جہاں موم بتیوں کا خاصا اسٹاک رکھا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ فرش پر بیٹھ کر چرس کا ایک سگریٹ سلگانے لگا۔ میں اسے صاف طور سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ قیامت تک یہ علم حاصل نہیں کرسکے گا لیکن وہ اسے حاصل کرنے کے شوق میں ہی مجھے اپنے گھر میں بلاتا تھا۔ شبو سے قریب ہونے کا یہی ایک بہانہ تھا۔ اس نے آدھا سگریٹ پھونکنے کے بعد کہا "آدمی نشے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"ہاں کسی کو اقتدار کا نشہ ہے' کسی کو دولت کا' کسی کو شراب کا اور کسی کو شباب کا۔"

"جناب! یہ نشہ آخر ہوتا کیا ہے؟ کمبخت دیوانہ بنادیتا ہے۔"

"نشہ دراصل کھجلی کی بیماری ہے۔ یہ بدن کے کسی بھی حصے میں ہو تو ہم اس حصے کو بے اختیار بار بار کھجاتے ہیں۔ نہ کھجانا چاہیں تو بے چینی ہوتی ہے۔ ہم سکون سے.... نہیں رہ سکتے۔ دماغ کچھ کام نہیں کرتا۔ خواہ کتنا ہی اہم کام ہو' ہم کھجلی مٹائے بغیر نہ وہ کام کرسکتے ہیں' نہ ذہانت سے کوئی مسئلہ حل کرسکتے ہیں۔ آدمی کے اندر جو کھجلی ہوتی ہے' اس کا علاج صرف روحانیت ہے۔ جو قوت ارادی سے اپنے نفس کو مارتا ہے' وہ ہر خواہش پر غالب آجاتا ہے' ہر کھجلی کو مٹادیتا ہے۔ اس کی زندگی میں دولت' عورت اور نشہ بھی تہلکہ نہیں مچاتے۔"

"آپ کی باتیں بہت اچھی ہیں مگر رنگ نہ ہو' نور نہ ہو' حسن نہ ہو' حسن کے جلووں کی تابانی نہ ہو' کسی کے لئے تڑپنے تڑپانے اور اسے حاصل کرنے کا جذبہ نہ ہو تو زندہ رہنے کا مزہ کیا خاک آئے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اسی کو کھجلی کہتے ہیں۔"

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر کہا "ایک سگریٹ سے نشہ نہیں ہوتا۔ بس ہلکا سا سرور ہوتا ہے۔ ارے میں تو چائے کے لئے پوچھنا ہی بھول گیا اور پوچھنا کیا ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ ہوٹل سے گرما گرم چائے لے آتا ہوں۔"

میں چائے کے لئے انکار کرنے والا تھا۔ جب معلوم ہوا' وہ ہوٹل کی طرف جائے گا تو میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہ کیتلی لے کر آنگن کے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔ میں پھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پچھلے روز وہ پندرہ منٹ میں ہوٹل سے چائے لے آیا تھا۔ میں نے پانچ منٹ تک بڑی بے صبری سے انتظار کیا۔ وہ کچھ بول سکتی تھی' مجھ سے نہ بولتی' دیواروں سے بولتی' کسی بہانے اپنی رس بھری آواز تو سناتی۔ میں بے چین ہوکر کرسی سے اٹھ گیا۔ ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا درمیانی دروازے تک آیا۔ وہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک چارپائی پر اس کی ایک رنگین قمیص پڑی تھی

پاس ہی ایک ٹین کا ڈبا کھلا ہوا تھا۔ اس میں سوئی، دھاگا، مختلف قسم کے بٹن اور سینے پرونے کی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے قمیص میں بٹن ٹانک رہی ہوگی، اب کسی کام سے باورچی خانے کی طرف گئی ہوگی۔ میں نے دروازے کو پوری طرح کھول کر دیکھا، وہ نہیں تھی۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے چند لمحوں تک سوچا، پھر کمرے میں آیا۔ جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے۔ انہیں سینے پرونے کے سامان کے ساتھ ٹین کے کھلے ہوئے ڈبے میں رکھا۔ وہ دور سے اپنی جھلک دکھا سکتے تھے۔ میں واپس کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ وہ چائے لے کر نہیں آیا۔ میں بری طرح اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے ابھی تک وہ رس بھری آواز نہیں سنی تھی البتہ دوسرے کمرے میں اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس نے درمیانی دروازے کو بند کر دیا تھا۔ مجھے اس حرکت پر غصہ بھی آرہا تھا اور مایوسی بھی ہو رہی تھی۔ کمبخت میرے سامنے دروازہ بند کر دیتی تھی۔ گامے کو یہاں سے گئے پچاس منٹ گزر گئے۔ نہ وہ آیا، نہ کوئی بہار کا جھونکا آیا۔ میں مایوس ہو چلا تھا۔ تب ہی وہ رس بھری آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی "بس ایسے ہی بیٹھے رہنا، کبھی منہ سے نہ پھوٹنا، ارے اللہ میاں نے اس لئے منہ نہیں دیا کہ چپ کا روزہ رکھ کے بیٹھ جاؤ۔ توبہ توبہ میں گھر میں بیٹھنے والی تجھے سمجھاتی ہوں اور تو گھر گھر ہانڈی سونگھنے جاتا ہے مگر میں تیری سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ کل والے بلے کے گلے میں رسی بندھی ہوئی تھی اور اس کا دوسرا سرا شبو کے ہاتھ میں تھا۔ بلے نے "غاؤں غاؤں" کی آواز نکالی۔ وہ خوش ہو کر بولی "واہ رے میرے شیر! اتنی دیر میں بول رہا ہے۔ کچھ تو بول رہا ہے مگر کچھ لوگ تو کچھ بولنا ہی نہیں جانتے۔"

اس نے "غاؤں غاؤں" کی آواز نکالی پھر اچھل کر آنگن کی دیوار پر چلا گیا لیکن گلے سے رسی بندھی ہوئی تھی، وہ بولی۔ کہاں بھاگ کر جائے گا، میں نے تجھے گرفتار کر لیا ہے۔ شاید تجھے میری ضرورت نہیں ہے مگر مجھے تیری بہت ضرورت ہے۔ جب تو نہیں آیا تھا تب اس گھر میں کتنے ہی چوہے آتے تھے، مجھے بہت پریشان کرتے تھے۔ میں ابا سے شکایت کرتی تھی مگر نشہ کرنے والا بیٹی کی پریشانی کو نہیں سمجھتا۔ تو بھی نہیں سمجھتا لیکن تیرے آنے سے تمام چوہے دم دبا کر بھاگ گئے ہیں۔ میں تجھے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں اور تو ہے کہ بھاگ رہا ہے۔ میں نے کہا نا، میں دن رات تیرا خیال رکھوں گی، تجھے گوشت کھلاؤں گی، دودھ پلاؤں گی اور اپنے پاس سلایا کروں گی، بے شرم! اب تو نیچے آجا....."

میں اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ میری کہانیوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے، میں ایک کی بات دوسرے پر رکھ کر بولتا ہوں۔ اس طرح مجھ پر یہ الزام نہیں آتا کہ میں نے کسی خاص کردار کو ٹارگٹ بنا کر وہ بات کہی ہے لیکن یہ تو تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگوں کی مخصوص تکنیک ہے۔ کیا وہ ان پڑھ، الھڑ، نادان لڑکی بھی یہی تکنیک استعمال کر رہی تھی یا میں سمجھنے میں غلطی کر رہا تھا؟ ہو سکتا ہے، اس گھر میں واقعی چوہے آکر پریشان کرتے ہوں اور اب ایک بلے کی موجودگی میں بھاگ گئے ہوں ایسا تو ہوتا ہی ہے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ کتنے ہی منچلے جوان گامے کے پیچھے پیچھے آتے تھے۔ اسے چرس کے لئے رقم دیتے تھے اور شبو کو پھانسنے کی کوشش کرتے تھے۔ کل سے میں آرہا تھا گامے نے دوسروں کے لئے دروازے بند کر دیے تھے۔ شبو کو تمام چھچھورے عاشقوں سے نجات مل گئی تھی۔ ان حالات میں بلے سے کہی جانے والی باتیں ذو معنی لگ رہی تھیں۔

گامے ہاتھ میں کیتلی لٹکائے واپس آیا۔ کیتلی خالی تھی مگر وہ نشے سے بھرا ہوا تھا۔ دروازے سے لڑکھڑاتا ہوا آنگن میں آیا۔ پھر شبو سے بولا "تو کیا سمجھتی ہے میں بھول گیا ہوں؟ مجھے یاد ہے میں نے نواب صاحب کو یہاں چائے پلانے کے لئے بٹھایا ہے۔ آہ! مگر کیا کروں؟ شہر کے تمام پاکٹ مار میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کسی جیب کترے نے میری جیب سے چائے کے پیسے نکال لئے۔ میں شرم سے نہیں آرہا تھا کہ نواب صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا، کیسے چائے پلاؤں گا؟ میں نے غم غلط کرنے کے لئے چرس کا دوسرا سگریٹ پھر تیسرا سگریٹ پیا۔ نشے میں بڑی طاقت ہے۔ یہ جب دماغ پر چھا جاتا ہے، تو سچ بولنے کا حوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ میں نواب صاحب سے سچ بولنے آیا ہوں کہ میری جیب کٹ گئی ہے۔ مجھے ایک روپیہ پچیس پیسے دو، میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔"

میں نے آنگن میں آکر شبو کو دیکھا پھر کہا "گامے! تمہاری بیٹی مجھ سے اتنی میٹھی باتیں کرتی رہی کہ چائے کی مٹھاس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں جا رہا ہوں۔"

گامے نے کہا "ارے استاد! کہاں جا رہے ہو؟ ابھی تو میں موم بتی جلاؤں گا، تمہارے قدموں میں بیٹھ کر ٹلی پیٹتی....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں آنگن سے باہر آگیا۔ ایک ذرا پلٹ کر دیکھا۔ شبو دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموشی سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ میں منہ پھیر کر چلا آیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بظاہر نادان اور بے حس ہے مگر میری حکمت عملی نے اسے اندر ہی اندر میری طرف مائل کر دیا ہے۔ دوسرے دن میرا یقین کچھ اور مستحکم ہو گیا۔

گامے پھر میرے پاس آیا، کہنے لگا "میں بہت ذلیل اور کمینہ ہوں۔ میں بہت چھوٹی ذات کا آدمی ہوں، کل آپ کو

ایک پیالی چائے نہ پلاسکا۔ آپ مجھے جوتے ماریں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں نے خود چائے پینے سے انکار کیا تھا۔"

"آپ نے اس لئے انکار کیا تھا کہ میں خالی کیتلی لیے آیا تھا۔ آپ مجھے شرمندگی سے بچانا چاہتے ہیں تو جوتے ماریے یا آج رات کا کھانا میرے ہاں کھائیے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ مجھے کھانے پینے کا تکلف پسند نہیں ہے۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں' میرے ہاں کھانا پسند نہیں کریں گے لیکن جوتے تو مار سکیں گے؟"

"یہ کیا احمقانہ ضد ہے؟"

"شبو بہت ہی لذیذ کھانے پکاتی ہے۔ وہ ابھی سے پکانے کی تیاری میں لگ گئی ہے۔ مجھے خوب باتیں سنا رہی تھی' کہہ رہی تھی' میں آپ کو آج رات کھانے پر ضرور بلاؤں۔"

"کیا شبو کہہ رہی تھی؟"

"جی ہاں' میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ آپ کو ضرور کھانے پر لاؤں گا۔ آپ نہیں آئیں گے تو آپ کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔"

میں نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا' پھر کہا۔ "ایک شرط پر شام کو آؤں گا' تم آج کوئی ستانشہ نہیں کرو گے۔"

"جناب! آپ بہت بڑا امتحان لے رہے ہیں' میں فیل ہو جاؤں گا۔"

"آج میں تمہیں وسکی پلاؤں گا۔"

اس کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ "آپ وسکی پلائیں گے؟"

"ہاں امپورٹیڈ چیز پلاؤں گا' تمہاری شبو کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"وہ کون ہوتی ہے' اعتراض کرنے والی؟ وہ کیا اس کے باپ کا گھر ہے مگر جناب! ایک بات ہے۔ آپ پہلے آدمی ہیں' جس کے آنے پر اس نے منہ نہیں بنایا بلکہ کھانے پر خود ہی بلایا ہے۔ ورنہ آج تک جتنے دوست آتے رہے' انہیں کبھی باتیں سناتی رہی اور کبھی تو گالیاں بھی دیتی رہی ہے۔"

میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ اس علاقے کے معززین میں میرا شمار ہوتا ہے۔ لوگ چہرے سے یا میرے نام سے مجھے پہچانتے ہیں۔ پچھلے دو دنوں میں ایک عورت' دو بوڑھوں اور دو جوانوں نے سلام کلام کے دوران یہ جتا دیا کہ انہوں نے مجھے گامے کے ہاں جاتے آتے دیکھا ہے۔ ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے مجھے کوئلے کی کان میں جاتے دیکھا ہو یا نہ بھی دیکھا ہو تو واپسی میں میرا کالا منہ دکھائی دے رہا ہو۔ میں دونوں گھروں سے دور رہ کر تنہا فلیٹ میں رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک ایک دن دونوں گھروں کے بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ میں پچھلے تین دنوں سے اورنگی والے گھر میں تھا۔

پہلے دن شبو کو دیکھنے کے بعد پاؤں میں زنجیر پڑ گئی تھی۔ روز صبح گامے پہنچ جاتا تھا اور مجھے شبو کے دیدار کا بہانہ مل جاتا تھا۔ تنویر بیگم نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ مجھ سے اور میرے بچوں سے کیا زیادہ محبت ہو گئی ہے؟ کیا آپ یہاں زیادہ سے زیادہ رہا کریں گے؟"

"تم جانتی ہو' میں تنہائی میں سکون سے بیٹھ کر لکھتا ہوں آج کل ایک نئی کہانی کا تانا بانا بن رہا ہوں۔ اس کے اہم پوائنٹس نوٹ کر رہا ہوں۔ جب لکھنا شروع کروں گا تو فلیٹ میں چلا جاؤں گا۔"

تنویر بیگم نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا "یہاں کسی کے ساتھ کوئی چکر تو نہیں چل رہا ہے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ بھلا چکر کیا چلے گا۔ تم عورتوں کو کسی کروٹ چین نہیں آتا۔ ہفتے میں ایک دن کے لئے آتا ہوں تو یہاں زیادہ وقت نہ گزارنے کی شکایت ہوتی ہے اور زیادہ دن رہ جاؤں تو مجھ پر شبہ کیا جاتا ہے۔"

میں نے بیگم کا شبہ کسی قدر کم کر دیا لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ نیا عشق مجھے اپنے علاقے میں بدنام کر دے گا۔ دانش مندی یہی تھی کہ میں ایک نئے حسن' نئے شباب اور نئی نئی دلربا اداؤں کے حصول سے باز آجاؤں یا بدنامی سے بچنے کی تدابیر پہلے ہی سوچ لوں۔ میں بعد میں پچھتانے والا کام کرنے سے ڈرتا ہوں لیکن میرا شوق مجھے کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ آدمی ازل سے سدا جوان رہنے کی تمنا کرتا آیا ہے مگر بوڑھا ہو جاتا ہے اور جب بڑھاپے میں کوئی جوانی پیچھے سے آواز دیتی ہے تو وہ تڑپ کر ادھر جاتا ہے' مانا کہ اسے اپنی جوانی نہیں ملتی' دوسری تو مل جاتی ہے۔

میں شام کو ایک بریف کیس لے کر وہاں پہنچا۔ گامے نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "آپ آگئے ہمارے گھر میں' کیا خدا کی قدرت ہے۔ کبھی ہم آپ کو کبھی بوتل کو دیکھتے ہیں' مگر بوتل نظر نہیں آرہی ہے۔"

اس نے اپنی دانست میں کوئی شعر پڑھا تھا۔ میں نے بریف کیس کو تھپک کر کہا "اس میں ہے۔"

آنگن میں پانی چھڑکا ہوا تھا۔ سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں میں مٹی کی سوندھی مہک شامل ہو گئی تھی۔ آج اس آنگن کی اچھی طرح صفائی کی گئی تھی۔ ہم اس خالی کمرے میں پہنچے' جہاں صرف موم بتیاں ہوا کرتی تھیں' آج وہ کمرا خالی نہیں تھا۔ وہاں چھوٹی سی میز کے اطراف چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ریڈیو کیسٹ پلیئر بھی تھا۔ یہ سب کچھ وہ محلے پڑوس والوں سے مانگ کر لایا تھا۔ جب مجھے یہ

بات معلوم ہوئی تو میں نے کہا "گامے! کیا تم نے محلے والوں کو یہاں میری آمد کے متعلق بتادیا ہے؟"

"جناب! مجھے بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں بس کے پاس سامان مانگنے گیا' اس نے میرے کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ہم جانتے ہیں آج کل تمہارے ہاں نواب صاحب آتے ہیں۔ وہ تو کتنی ہی غریب لڑکیوں کی شادیاں کراتے رہتے ہیں۔ شبو کے بھی نصیب جاگ رہے ہیں۔"

مجھے یقین تھا کہ محلے والوں نے ایسا طنزیہ نہیں کہا ہے۔ میں غریب والدین کو ان کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے چھوٹی بڑی رقمیں دیتا رہتا ہوں اور بھی جو مدد مجھ سے بن پڑتی ہے' وہ میں کرتا ہوں۔ محلے والے شبو کے سلسلے میں بھی مجھے فرشتہ سمجھ رہے تھے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ فرشتوں کو خدا نے پیدا کیا ہے اور ہم انسانوں کو خدا کی پیدا کی ہوئی عورتوں نے پیدا کیا ہے ہم عورتوں کی دنیا میں جیتے ہیں اور عورتوں ہی کی دنیا میں مرتے ہیں۔ ہزار نیکیاں کرتے کرتے فرشتوں کی مانند ہو سکتے ہیں مگر فرشتے نہیں ہو سکتے۔ حسین عورتیں کیلے کے چھلکے کی طرح ہوتی ہیں۔ ہم فرشتوں کے پاؤں کسی نہ کسی چھلکے پر پڑ ہی جاتے ہیں۔ میں نے گامے سے کہا "یہ بہت برا ہوا' مجھے پہلے ہی سمجھنا چاہئے تھا۔ لوگ اندھے نہیں ہوتے ہیں کتنی ہی آنکھوں نے مجھے یہاں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

گامے نے کہا "دیکھئے دو' یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کے آنے سے ہماری عزت بڑھ گئی ہے۔ پہلے کوئی ایک چونی ادھار نہیں دیتا۔ اب تو لوگ اپنے گھر کا سامان تک دے دیتے ہیں۔"

میں نے بریف کیس کو کھولا۔ اس میں ایک بوتل اور نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گامے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بوتل اس کے سامنے رکھی' پھر بریف کیس کو بند کرتے ہوئے کہا "میں یہاں بیٹھ کر ایک گھونٹ بھی نہیں پیوں گا۔ کوئی بھی کسی بہانے مجھ سے ملنے آسکتا ہے اور نہ آئے تب بھی یہاں سے جاتے وقت لوگ میری مدہوشی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بہت کچھ سمجھ لیں گے۔"

"آپ خواہ مخواہ لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ بھئی زیادہ نشہ ہو جائے تو یہاں سے نہ نکلنا' یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ صبح نشہ ٹوٹنے کے بعد جا سکتے ہیں۔"

وہ بوتل کھول کر دو گلاسوں میں ایک ایک پیگ بنانے لگا میں نے حیرانی سے پوچھا "کیا تمہیں شبو کی بدنامی کا خوف نہیں ہے؟"

"آپ کی نیک نامی سب کے منہ پر تالے ڈال دے گی' ویسے بھی مجھے دنیا والوں کی پروا نہیں ہے۔"

اس نے اپنا گلاس اٹھا کر چیئرز کہا' پھر پینا شروع کر دیا۔ میں کشمکش میں رہا۔ مجھے پینا چاہئے یا نہیں؟ آج میں پینے اور پی کر بہکنے آیا تھا۔ لیکن چاروں طرف سے نادیدہ لوگوں کی نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے ایک طویل عرصے کی محنت اور لگن سے لکھتے لکھتے جو شہرت حاصل کی ہے' وہ اب خاک میں مل سکتی تھی۔ گامے دوسرا پیگ بنا رہا تھا۔ میں نے کہا "یہ پوری بوتل تم رکھ لو میں جا رہا ہوں۔"

میں اٹھ کر جانے لگا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا "جناب! یہ نہیں ہو سکتا' شبو صبح سے آپ کے لئے گھر کی صفائی کر رہی ہے۔ آپ کے لئے کھانے پکا رہی ہے۔ آپ کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"اگر مجھے کھانے کے لئے روکو گے تو میں تمہیں پینے نہیں دوں گا۔ تمہاری مدہوشی مجھے اور شبو کو بدنام کر دے گی۔"

وہ الجھن میں پڑ گیا' شاید وہ اب تک دیسی پیتا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مہنگی ولایتی شراب مل رہی تھی۔ اس نے عاجزی سے کہا "اس کے بعد دو پیگ اور پی لینے دو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں' مجھے نشہ نہیں ہوگا۔"

وہ گلاس کو منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ شبو نے درمیانی دروازے پر آکر کہا "ابا' باہر سے آنے والے کو میری عزت کا خیال ہے مگر تجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔ کیا تو چاہتا ہے کہ' میں کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں؟"

وہ تیسرا پیگ بناتے ہوئے بولا "تجھے شرم نہیں آتی' مجھ جیسے شریف آدمی کی بیٹی ہو کر گھر سے بھاگنے کی بات کرتی ہے ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔ میں نے نواب صاحب سے وعدہ کیا ہے' صرف دو گلاس ہی پیوں گا۔ صرف دو' پھر بوتل بند کر دوں گا۔"

میں شبو کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی گرفت کے باوجود بھری بھری پنڈلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ریشمی بدن پر ململ کا کرتا کہیں چپک رہا تھا' کہیں ہوا کی چھیڑ خانی سے لرز رہا تھا۔ موتیے کی کلیاں چوٹی کے ساتھ گندھی ہوئی تھیں۔ کان کے قریب سیاہ بالوں میں زرد رنگ کا پھول یوں لگ رہا تھا جیسے کالی رات میں سورج نکل آیا ہو۔ آنکھوں میں کاجل کی دھار تھی۔ لبوں کی قدرتی گلابی رنگت اور رخساروں کی لالی' سب ہی مل کر میری جان کھینچ رہی تھیں۔

میں آہستہ آہستہ اس کے قریب کھنچا چلا آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے کی دھڑکنوں پر رکھ لئے۔ ذرا سا سمٹ گئی۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں جا رہا ہوں۔"

اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں' مجھے دیکھا' پھر انکار میں سر ہلانے لگی۔ اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی' وہ سر کے اشارے سے روکنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "میں تمہارے ایک اشارے پر رک سکتا

ہوں۔ کیا تم بدنامی پسند کرو گی؟"
اس نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔
"میں تم سے باہر ملنا چاہتا ہوں۔"
اس نے پھر چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "کل صبح دس بجے صابری چوک کے پاس سفید رنگ کی کار میں تمہارا انتظار کروں گا۔"
اس نے جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں نے کہا "عورت کی شرم سمجھ میں آتی ہے لیکن اقرار یا انکار کی ادا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے مگر تم اتنا سمجھ لو، آئندہ میں یہاں نہیں آؤں گا۔ تم چاہو تو یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہوگی۔"
یہ کہتے ہی میں تیزی سے پلٹ کر قدم بڑھاتا ہوا کمرے سے باہر آیا، آنگن سے گزرتے ہوئے میں نے گاے کی آواز سنی۔ وہ مجھے روکنے آ رہا تھا مگر لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ میں نے دروازے سے نکلتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی پھر چلا آیا۔ دوسری صبح دس بجے صابری چوک پہنچا۔ کتنی ہی عورتیں بسوں کے انتظار میں کھڑی تھیں، ان میں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں دور تک نظر دوڑانے کے لئے کار سے باہر آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک برقعے والی میرے قریب آ گئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے آہستگی سے پوچھا "شبو؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی میں دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگا، وہ بولی "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"
"مجھ سے ڈر لگ رہا ہے تو گاڑی روک دیتا ہوں۔ دنیا سے ڈر رہی ہو، تو تم اکیلی نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
"ابا سو رہا تھا، میں گھر کھلا چھوڑ کر آئی ہوں۔"
"کیا تم کبھی گھر سے تمام دن باہر نہیں رہی ہو؟"
"جب ماچس فیکٹری میں کام کرتی تھی تب صبح نو بجے گھر سے جاتی تھی، شام کو پانچ بجے واپس آتی تھی۔"
"پھر ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ شام کو جا کر کہہ دینا کہیں ملازمت کرنے لگی ہوں۔"
"شام کو؟ کیا میں شام کو جاؤں گی؟ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"
"اپنے گھر۔"
"کیا تمہارا اور بھی کوئی گھر ہے؟"
میں اسے فلیٹ میں لے آیا۔ وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "یہ میرا تیرا گھر ہے۔ اب تک تمہارے بغیر خالی تھا۔ آج آباد ہو رہا ہے۔"
وہ فلیٹ شام تک آباد رہا۔ وہ شادی کی بات کرتی رہی۔

میں صرف دوستی قائم رکھنے کے فائدے سمجھاتا رہا۔ اس نے پوچھا "تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"
"اس لئے کہ تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تم نے لیلیٰ مجنوں کی کہانی پڑھی ہے۔"
"میں پڑھنا نہیں جانتی۔ ہاں فلم دیکھی ہے۔"
"وہ سچی محبت کرتے تھے، ان کی شادی کبھی نہیں ہوئی۔"
وہ بولی "بیچاروں کے ساتھ مجبوری ہو گئی تھی۔"
"جتنے سچی محبت کرنے والے ہوتے ہیں، ان کے ساتھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں، رومیو جولیٹ اور بہت سے محبت کرنے والوں کی مثالیں موجود ہیں۔ تم پڑھنا نہیں جانتیں میں تمہیں پڑھ کر سنا دوں گا۔ ان سچے عاشقوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کبھی شادی نہیں کریں گے، کبھی بچے پیدا نہیں کریں گے، اپنے ملک کی آبادی نہیں بڑھائیں گے۔ دنیا والے اس بات پر ان سے ناراض ہو گئے کہنے لگے، اولاد خدا کی دین ہے۔ یہ عطائے خداوندی کے منکر ہیں، کافر ہیں لہٰذا انہیں بے موت مار دیا گیا۔"
"دنیا والے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہماری پڑوسن کے دس بچے ہیں۔ وہ کہتی ہے، جتنے بچے ہوتے ہیں، مرد کی محبت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔"
"محبت نہیں، مصیبت بڑھتی ہے۔ مرد ایک محبت کرنے والی کے لئے آٹھ گھنٹے محنت کرتا ہے۔ چار چھ بچے ہوں تو دن رات محنت کرنی پڑتی ہے۔ مرد کو اپنی عورت سے محبت کرنے کا وقت نہیں ملتا کیا۔ تم چاہتی ہو مجھے تم سے محبت کرنے کا وقت نہ ملا کرے۔"
میں گھما پھرا کر ایسی باتیں کر رہا تھا، جس کا وہ جواب نہیں دے پا رہی تھی، وہ میری ذہانت اور قابلیت سے متاثر تھی اور ان پڑھ ہونے کے باعث میری باتوں کو تھوڑی بحث کے بعد تسلیم کر لیتی تھی۔ میں نے آخر میں کہا "یہ دیکھو، میں نے دو شادیاں کی ہیں اور دو بیویوں کو دھوکا دے کر تم سے دوستی کر رہا ہوں۔ ایسی شادی کا کیا فائدہ کہ عورت بیوی بن کر خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ میری کسی بیوی کو اس فلیٹ کا پتا معلوم نہیں ہے۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ اس لئے تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔ تم دوست کی حیثیت سے جب بھی آؤ گی مجھے اپنے انتظار میں پاؤ گی۔ مجھے بچوں سے محبت کرنے والی بیوی نہیں بلکہ اپنی ذات سے محبت کرنے والی محبوبہ کی ضرورت ہے۔"
وہ روز صبح آنے اور شام کو جانے لگی۔ اپنے باپ سے اور محلے پڑوس والوں سے کہہ دیا۔ ایک سلائی کے کارخانے میں کام کرتی ہے۔ میں اسے روز اپنے رنگ میں رنگتا رہتا تھا۔ اسے جو الٹی سیدھی بات سمجھاتا تھا، وہ میری محبت میں اسے

درست مان لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ وہ میرے دل و دماغ پر اپنا سکہ جمارہی تھی۔ جو چال میں چل رہا تھا' اس چال سے خود مات کھا رہا تھا اگر وہ بیوی بن جاتی' دن رات ساتھ رہتی تو شاید میں یکسانیت سے بیزار ہو جاتا لیکن وہ شام کو چلی جاتی تھی یعنی جب رات کو ساتھی کی ضرورت ہوتی تھی تو ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ میں بے دھیانی میں صبح تک اس کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ محلے پڑوس والوں کے سامنے جھوٹ نباہنے کے لئے وہ جمعہ کے دن نہیں آتی تھی کیونکہ جمعہ کو تمام فیکٹریاں بند رہتی ہیں۔ اس روز میں ایک بیوی کے ہاں جاتا تھا۔ ہفتے کو دوسرے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یوں ہفتے میں دو دن شبو سے ملاقات نہیں ہوتی تھی' پھر چھٹیوں کے دن بھی آجاتے تھے۔ دفاتر اور کارخانے بند ہوتے تھے۔ کبھی شہر میں ہنگامے ہوتے کبھی رکشے ٹیکسیوں کی ہڑتال ہوتی۔ کبھی کرفیو نافذ ہو جاتا۔ غرض یہ کہ حالات ہمیں جدا کرتے رہتے تھے اور جدائی ایسی ظالم ہوتی ہے کہ وصال کا لمحہ آنے تک انتظار میں تڑپ اور محبت میں شدت پیدا کرتی رہتی ہے۔ میں شبو کو دوست بنا کر دیوانگی کے راستے پر چل پڑا تھا۔ ایسے وقت تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عشق بے لگام بنا دیتا ہے اور شادی' مرد اور عورت کو نارمل رکھتی ہے۔

میرے ساتھ والے فلیٹ میں ایک شخص بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس سے میری اچھی دوستی تھی۔ وہ کبھی کبھی میرے فلیٹ میں آکر پینے میں شریک ہو جاتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا "ان فلیٹوں میں رہنے والے اور نیچے دکان داری کرنے والے تمہارے اور شبو کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کسی دن پولیس والے تم دونوں کو یہاں سے گرفتار کر کے لے جاسکتے ہیں۔ بہتر ہے اب یہ کھیل بند کردو۔"

یہ کھیل ہوتا تو بند کردیتا۔ وہ آتی تھی تھوڑی سی قربت کا جادو جگا کر چلی جاتی تھی' سمندر سے پیاسے کو شبنم ملتی تھی۔ نتیجے میں اور پیاس بڑھ جاتی تھی۔ وہ تمام دن فلیٹ کی صفائی کرتی' میرے کپڑے دھوتی اور استری کرتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی جب تک رہتی نگاہوں کے سامنے سے کبھی کچن میں' کبھی باتھ روم میں اور کبھی بیڈ روم میں جاتی آتی رہتی تھی اور آتے جاتے مختلف زاویوں سے نظارہ ہائے حسن کو ہائے ہائے کے انداز میں پیش کرتی جاتی تھی۔ یہ کھیل نہیں تھا۔ نگاہوں کے سامنے زندہ شاعری تھی۔ شاعر حضرات بڑھاپے میں بھی حسن وشباب کے بچے بیان کرتے ہیں۔ یہ رعایت صرف شاعروں کو نہیں ہمیں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ جانِ غزل ان کے خیالوں میں آتی ہے' میری زندگی میں آرہی تھی۔ وہ خیالی عیاشی کرتے ہیں' اس کے حسن وشباب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر گھر گھر پہنچاتے ہیں اور میں اسے صرف اپنے گھر تک محدود رکھتا ہوں۔ میں اس کا دیوانہ ہوں اور اسے اپنائے رکھنے کے لئے مستحکم دلائل پیش کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ محلے پڑوس میں بدنامی سے بچنے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کے لئے اس سے نکاح پڑھوانا ہوگا۔

مشکل یہ ہے کہ محبوبہ کو بیوی بناؤ تو وہ بچے پیدا کرنے کی ضد کرتی ہے۔ میرے دونوں گھروں میں پیارے پیارے پھول جیسے ہنستے کھیلتے بچوں کی کمی نہیں ہے۔ میں بچوں کا بازار لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لئے شادی سے کتراتا تھا۔ میں شبو کو یہ بات سمجھاتا تو وہ قسمیں کھاتی' وعدے کرتی کہ شادی کے بعد ماں بننے کی خواہش نہیں کرے گی لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہ ہوتا۔ بیاہتا عورت جب ماں نہیں بنتی تو دوسری عورتوں کے سامنے خود کو کمتر سمجھتی ہے خصوصاً جاہل عورتیں ایک دوسرے سے رازدارانہ انداز میں کہتی ہیں۔ فلاں بی بی کا میاں اسے پسند نہیں کرتا ہے اسی لئے بچے نہیں ہوتے گویا بچے مرد کی محبت کا اشتہار ہوتے ہیں ورنہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ فلاں عورت سے اس کا مرد نفرت کرتا ہے۔ شبو جاہل تھی ایسی باتوں کا اثر لے سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ بدنامی نہ ہو اور وہ میرے پاس مذہبی اور قانونی پابندیوں سے آزاد رہ کر آتی جاتی رہے۔

اس کے لئے نکاح نامہ ہر حال میں ضروری تھا۔ ہم صرف جنت میں جانے کا اجازت نامہ حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ باقی اس دنیا میں ہر طرح کا اجازت نامہ حاصل کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور انسان کو کسی نہ کسی طرح خریدا جاسکتا ہے۔ اسکول یا کالج کا سرٹیفکیٹ ہو ڈومیسائل' شناختی کارڈ یا پاسپورٹ ہو' چند لال نوٹوں کا چارا ڈالتے ہی لال بتی بجھ جاتی ہے۔ سبز بتی ممنوعہ دروازے کو کھول دیتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے فراڈ ہیں جو ایمان والوں میں شامل ہو کر رجسٹرڈ قاضی بن جاتے ہیں میں سراغ لگاتا ہوا ایسے ہی ایک قاضی تک پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ پر دو ہزار روپے رکھے۔ اس نے شبانہ عرف شبو کے ساتھ جعلی نکاح نامہ تیار کردیا۔ دوسرے دن اس نکاح نامہ پر سرکاری مہر لگوا کر لے آیا۔ اب کوئی میرے اور شبو کے تعلقات پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

میں نے شبو کو سمجھایا' جعلی کاغذات کے مطابق ہم میاں بیوی ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے اگر تم بچے پیدا کرنا چاہو گی یا میری شریک حیات ہونے کا دعویٰ کرو گی تو میری دوسری بیویاں عدالت میں جعلی نکاح نامے کا پول کھول دیں گی۔"

"میں صرف تمہاری محبت چاہتی ہوں۔ تمہارا نام ملے نہ ملے۔ میں تمہارا ہی نام لے کر زندگی گزار دوں گی۔ بس اتنا

کرو میں تمہارے ساتھ صرف دن نہیں رات بھی گزار سکوں۔"

"دن رات گزارنے کے لئے مجھے تمہارے گھر آنا ہوگا۔ یا تم راتوں کو بھی میرے پاس آیا کرو گی۔ اس طرح تمہارے علاقے کے لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو جائے گا۔ تنویر بیگم بھی اس علاقے میں رہتی ہیں' یہ بات ان سے چھپی نہیں رہے گی۔"

"تم صرف ابا سے جھوٹ کہہ دو کہ ہماری شادی ہو گئی ہے کیونکہ تم اپنے گھر والوں سے مجھے چھپا کر رکھنا چاہتے ہو۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر تم کہیں دور ایک مکان کرائے پر لے کر میرے ساتھ وہاں رہ سکتے ہو۔ اس اجنبی علاقے میں تم اپنا اصلی نام نہیں بتاؤ گے اس طرح تمہارے گھر والوں تک یہ بات بھی نہیں پہنچے گی کہ میرے ساتھ گھریلو ازدواجی زندگی گزار رہے ہو۔"

میں نے اس کے منصوبے پر غور کیا۔ وہ اپنا تن' من اور اپنی تمام محبتیں مجھے دیتی تھیں۔ اس کے عوض میرے ساتھ ایک چھت کے نیچے دن رات رہنا چاہتی تھی اور یہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہوئے ایسا چاہتی تھی اور قسمیں کھا رہی تھی کہ ہمیشہ ساتھ رہنے کی ضد نہیں کرے گی۔ میں جب چاہوں گا اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ دن رات گزارنے جاؤں گا۔ اس سلسلے میں وہ جھگڑا نہیں کرے گی۔ وہ چاہتی تھی۔ میں جہاں بھی جاؤں واپس اسی کے پاس آؤں۔ میں نے کہا "اچھی بات ہے' میں کل تمہارے باپ سے ملاقات کروں گا۔"

"ابا سے چار دن بعد ملاقات ہوگی۔"

"کیا وہ شہر سے باہر گئے ہیں؟"

وہ پریشان ہو کر اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "تم نے ٹیلی پیتھی سکھانے میں ان کی مدد نہیں کی اب وہ جنات کو قابو میں کرنے کے لئے چلے میں بیٹھے ہیں۔ وہ دن رات قبرستان میں رہتے ہیں۔ چھتیس دن ہو چکے ہیں اور چار دن کے بعد واپس آئیں گے تو ان کے دعوے کے مطابق ایک آدھ جن ان کے قابو میں ہوگا۔"

"تمہارے باپ کی جگہ کسی پاگل خانے میں ہے۔"

میری زبان سے نکلی ہوئی یہ بات درست ہوئی' وہ کسی پاگل خانے میں تو نہیں گیا مگر پاگل ہو گیا۔ چالیسویں رات کے بارہ بجے وہ اچانک ہی چیخ مار کر بیہوش ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اسے قبرستان سے اٹھا کر لائے تھے۔ آنکھیں کھلنے کے بعد وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا اور اس کے متعلق رائے قائم کی جا رہی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ میں دوسرے دن اسے دیکھنے کے لئے گیا۔ وہ آنگن کی دیوار سے ٹیک لگائے آسمان کو تک رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے دیدے گھما کر مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے پوچھا "کیا مجھے بھول گئے ہو؟"

اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ دانت پر دانت جمائے پھر چیخ کر کہا "میں تجھے بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں تجھے قابو میں کرنے کے لئے قبرستان جاتا ہوں۔ آج بھی جا رہا ہوں اور روز جاؤں گا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

وہ اچھل کر کھڑا ہو گا۔ وہاں محلے کی کچھ عورتیں اور مرد تھے۔ ایک جوان نے اسے پکڑتے ہوئے کہا "چاچا جی! گھر میں آرام سے رہو۔ زندہ انسانوں میں کچھ تو محبت اور ہمدردی ملے گی۔ قبرستان میں کچھ نہیں ملے گا۔"

وہ خود کو چھڑانے لگا۔ ایک بوڑھے نے کہا "اسے جانے دو۔ دن کے وقت حرج نہیں ہے۔ البتہ رات کو اسے قبرستان نہ جانے دیا کرو۔"

اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہ دوڑتا ہوا آنگن سے باہر چلا۔ میں نے سر گھما کر شبو کو دیکھا۔ وہ عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی "میں یہ مکان چھوڑ رہی ہوں۔ ابا کو ایسی جگہ لے جاؤں گی جہاں قبرستان قریب نہ ہو۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ ہم نے شہر کے ایک دور افتادہ علاقے میں کرائے کا مکان حاصل کیا۔ شبو نے سابقہ مکان چھوڑتے وقت پڑوسیوں سے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ لاہور جا رہی ہے۔ میں نے منصوبے کے مطابق نئے علاقے میں اپنا نام فرضی نہیں بتایا۔ یہ سراسر حماقت تھی۔ خدانخواستہ محلے پڑوس میں چوری ڈکیتی یا خون خرابہ ہوتا اور پولیس والے مجھ سے شناختی کارڈ طلب کرتے تو میں پھنس جاتا اور اگر جعلی شناختی کارڈ بنواتا تو ایسا غیر معروف بھی نہیں ہوں کہ کسی معاملے میں تھانے پہنچ کر پہچانا نہ جاتا۔ اس لئے میں نے اصلی نام کے ساتھ شبو کے ساتھ وہاں رہائش اختیار کر لی۔

اگر میں باقاعدہ نکاح پڑھوا لیتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ تو میری شریک حیات کے تمام حقوق حاصل کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہتی تھی۔ بس ایک ہمارے ٹی وی کے ذریعے کی جانے والی خاندانی منصوبہ بندی کی نصیحت تھی جو ہمارے کام آ رہی تھی۔ اب میں اس عمر میں اولاد نہیں چاہتا تھا۔ زندگی کا کیا بھروسا کب ساتھ چھوڑ دے۔ اس زندگی سے زیادہ بے وفا اور کوئی نہیں ہوتا۔ ہم اسے قائم رکھنے کے لئے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہیں' ورزش کرتے ہیں' جان بناتے ہیں۔ اسے دودھ پلاتے ہیں' مکھن کھلاتے ہیں۔ پھر بھی یہ ایک دن اچانک ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا شبو سے ہونے والی اولاد میرے سائے سے محروم ہو جائے۔

میں نے شبو کو سمجھایا' اسے کچھ پڑھنا لکھنا اور کچھ ہنر سیکھ لینا چاہئے تاکہ میرے بعد اس کے کام آئے لیکن وہ اس

معاملے میں بہت ہی پھوہڑ ثابت ہوئی۔ وہ گھر گرہستی کے کام کر لیتی تھی یہی بہت تھا۔ وہ پکانے، کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کا کام بڑی پھرتی سے کرتی تھی تاکہ جلد سے جلد تمام کاموں سے نمٹ کر میرے قریب رہ سکے وہ ہمیشہ مجھ سے لگ کر رہنا چاہتی تھی اگر میں پلنگ پر نیم دراز ہو کر کہانی کی پلاننگ کرتا رہتا تو وہ میرے پاس آکر لیٹ جاتی تھی اگر میں لکھتا یا کہانی ریکارڈ کرتا رہتا تو وہ چپکے سے آکر میرے شانے پر سر رکھ دیتی تھی۔ میں کہتا، مجھے تنہا چھوڑ دو تو وہ ناراض ہو جاتی۔ دور جا کر لیٹ جاتی یا بیٹھ جاتی مگر پاؤں پھیلا کر میرے پاؤں سے ملا دیتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے لگ کر رہتی تھی۔ خواہ اسے ایک انگلی ہی میرے جسم سے لگا کر رکھنے کا موقع ملے، وہ اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

اس کے باپ نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ کبھی دن کو کبھی آدھی رات کو زور زور سے بڑبڑاتا تھا یا کسی رات غائب ہو جاتا تھا۔ وہ اس علاقے کے قبرستان تک پہنچ گیا تھا۔ جب بھی وہاں جاتا تھا، کسی ٹوٹی ہوئی قبر سے مردے کی کوئی ہڈی اٹھا کر لے آتا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑی وحشت ہوتی تھی۔ شبو اسے دھکے دے کر گھر سے نکالتے ہوئے کہتی تھی "یہ کس کی ہڈیاں اٹھالاتے ہو؟ کیوں نحوست پھیلا رہے ہو، جاؤ یہاں سے اسے کہیں دور پھینک کر آؤ۔"

اس کی حرکتیں میرے دماغ پر بوجھ بن جاتی تھیں۔ ہم اسے گھر سے بے گھر نہیں کر سکتے تھے۔ اسے پاگل خانے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کوئی خطرناک پاگل نہیں تھا۔ اکثر ہوش وحواس میں رہ کر کھاتا پیتا اور باتیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی کھوپڑی الٹ جاتی تھی اور وہ قبرستان سے مردوں کی ہڈیاں لا کر ہمارے گھر کے کسی کونے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ شبو صفائی کے دوران ان ہڈیوں کو دیکھ کر چیخ پڑتی تھی اور میں اپنی کسی کہانی کے ماحول سے نکل آتا تھا۔ یہ تیرا گھر آباد کر کے عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

پہلے میں شبو کے ساتھ گھر سے باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ شاپنگ کے لئے ضد کرتی تھی، کبھی رو رو کے کہتی تھی "گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئی ہوں۔ کیا تفریح کے لئے کسی پارک وغیرہ میں لے جا نہیں سکتے؟"

وہ صرف روتی نہیں تھی۔ جھگڑا بھی کرتی تھی۔ میں اسے محبت سے سمجھا کر اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے چپ کرا دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ظلم کر رہا ہوں اسے کھلی فضا میں گھومنے پھرنے اور تازہ ہوا میں سانس لینے سے روک رہا ہوں، پھر محلے کی عورتیں اس سے پوچھتی تھیں "تمہارا میاں تمہیں گھر میں قیدی بنا کر کیوں رکھتا ہے؟ اپنے ساتھ کہیں گھمانے پھرانے کیوں نہیں لے جاتا؟"

میں رفتہ رفتہ مجبور ہو گیا۔ اسے کبھی کبھی شاپنگ کے لئے یا تفریح کے لئے گھر سے باہر لے جانے لگا۔ ایک روز تنویر بیگم نے پوچھا "پچھلے اتوار کو آپ کے ساتھ برقعے والی کون تھی؟ شاپنگ کرا رہے تھے۔"

"میں شاپنگ نہیں کرا رہا تھا۔ وہ میری ایک فین ہے اچانک شاپنگ سینٹر میں مل گئی تھی۔ میری پسند کے کپڑے خریدنا چاہتی تھی۔ میں صرف اپنی پسند بتا رہا تھا۔ وہ اپنے پاس سے رقم خرچ کر رہی تھی۔"

"اگر میں وہاں ہوتی تو دیکھتی اس کے پرس میں رقم کہاں سے آئی ہے۔"

"تم خوامخواہ مجھ پر شبہ کر رہی ہو۔"

"میں شبہ کر کے کیا بگاڑ لوں گی۔ آپ تو آزاد پنچھی ہیں۔ جب چاہیں گے جہاں چاہیں گے، کسی کے ساتھ نیا گھونسلا بنا لیں گے۔"

"جب یہ جانتی ہو کہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکو گی تو پھر جھگڑا کیوں کر رہی ہو؟"

"عورت کے تمام حقوق چھین لینے کے بعد ایک جھگڑا کرنے کا حق تو رہنے دیں۔"

"جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارا شبہ غلط ہے۔"

"اللہ کرے غلط ہو لیکن میں چین سے نہیں رہوں گی۔ اس برقعے والی کا پتا ٹھکانا ضرور معلوم کروں گی۔"

میرا سکون برباد ہو رہا تھا۔ مجھے کسی گھر میں اطمینان سے بیٹھ کر سوچنے اور لکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پہلی بیگم کے ہاں بھی یہ بات جانے کیسے پہنچ گئی تھی کہ میں کسی تیسری کے ساتھ رہنے لگا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں بیویوں نے اپنے اپنے جاسوس میرے پیچھے لگا دیے ہیں۔ رفتہ رفتہ بات کھل رہی تھی۔ ان کا شبہ یقین میں بدل رہا تھا۔ جوان بچے خاموش رہتے تھے۔ ان کی خاموشی میں کچھ تو باپ سے لگاؤ ہوتا تھا، کچھ بزرگی کا احترام ہوتا تھا۔ پہلی بیگم کو تیسری کے متعلق تجسس تھا لیکن وہ کسی طرح کا اعتراض نہیں کر رہی تھیں کیونکہ وہ پہلے ہی ایک سوکن کا صدمہ اٹھا چکی تھیں۔ نئے صدمے کو چپ چاپ برداشت کرنا آگیا تھا لیکن تنویر بیگم کسی تیسری کا وجود برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تیسری سے اولاد نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لئے مکان نہ خریدا جائے اور ماہانہ اخراجات کے لئے اسے محدود رقم دی جائے۔

میری بیگمات میں ایک تنویر بیگم ایسی تھیں جو میری کہانیوں کا اور ان سے ہونے والی آمدنی کا حساب رکھتی تھیں۔ میں اس بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ مجھے فضول خرچی کی عادت نہیں تھی بیگم زیادہ سے زیادہ بچت کرتی تھیں اور زمین

جائداد اپنے نام کرالی رہتی تھیں چونکہ وہ میرے بچوں کے لئے ہی ایسا کرتی تھیں۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ وہاں اولاد نہیں ہوگی اور ماہانہ اخراجات کے لئے اسے محدود رقم دیا کروں گا۔

شبو کے ساتھ چار برس گزر گئے۔ اب وہ میرے کانوں میں یہ بات پھونکنے لگی تھی کہ محلے پڑوس کی عورتیں اس کے ہاں نہ بچنے پر طرح طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ میں نے سختی سے کہا "انہیں باتیں کرنے دو۔ اس محلے میں ایسے درجنوں گھر ہوں گے جہاں بچے پیدا نہیں ہوتے۔ ان میں ایک ہمارا گھر بھی ہے۔"

"ہماری بات اور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ میری سوکنوں کے ہاں بچے ہیں۔ عورتیں یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی بانجھ ہے۔"

"انہیں نہ ماننے دو۔ میرا دماغ نہ خراب کرو۔"

میں غصہ دکھا کر اس مسئلے کو ٹال دیا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے گھر آکر دیکھا شبو کے بال بکھرے ہوئے تھے چہرے اور بازوؤں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں' لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ روتے ہوئے بولی "کچھ نہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ یہ حلیہ بتا رہا ہے کہ تم نے کسی سے جھگڑا کیا ہے۔"

اس نے بتایا' ہماری گلی کے پانچویں مکان میں جو مطلقہ عورت رہتی ہے' اس نے شبو سے باتوں ہی باتوں میں کہا تھا' بیوی بہت کم سن ہو اور شوہر بہت بوڑھا ہو تو اولاد نہیں ہوتی۔ شبو سے یہ بات برداشت نہ ہوئی اس نے تڑ سے جواب دیا۔

"میرا میاں بوڑھا ہے یا جوان' اپنے گھر بلا کر آزمالے مگر میرا میاں بھی رنگ رنگیلا چھیل چھبیلا ہے۔ تیرے جیسی گھسی پٹی' طلاق لینے والی عورتوں کو منہ نہیں لگاتا۔"

اس بات پر دونوں میں ہاتھاپائی شروع ہوگئی۔ اس عورت نے شبو کا حلیہ بگاڑ دیا۔ شبو نے پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ محلے کی عورتیں بیچ بچاؤ نہ کراتیں تو اور زیادہ خون خرابہ ہوتا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی "میں نے اسے پتھر مارا تھا' تم کیوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہو۔"

میں نے کہا "تم دنیا کی بدترین جاہل عورت ہو۔ تم ایک لفظ پڑھنا نہیں جانتی ہو' تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کہانیوں کے ذریعے مجھے کتنی عزت اور شہرت حاصل ہو رہی ہے۔ مجھ جیسے معروف رائٹر کی بیوی محلے کی عورتوں سے لڑتی رہتی ہے لوگ میرے متعلق کیا سوچتے ہوں گے۔ تمہیں میری عزت اور نیک نامی کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟ کوئی تمہیں بوڑھا کہے تو میں برداشت کرلوں؟"

میں تمہارے مقابلے میں بہت عمر رسیدہ ہوں۔ حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے۔"

"دنیا والے جب تمہیں بوڑھا کہتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ ایک طرف عورتیں طعنے دیتی ہیں' دوسری طرف محلے کے جوان مجھے آتے جاتے مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ جب تم نہیں ہوتے تو ادھر سامنے چبوترے پر بیٹھے رہتے ہیں آج میرے دو چار بچے ہوتے تو کوئی ذلیل کمینہ میرے پیچھے نہ پڑتا مگر تمہاری ضد ہے کہ یہاں اولاد نہ ہو اور تمہاری ضد نے ہی لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ تم تو آتے ہو' عیش کرتے ہو اور چلے جاتے ہو۔ بھگتنا تو مجھے ہی پڑتا ہے۔"

میری الجھنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ آدمی جہاں گھر بساتا ہے' وہاں اس کا ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے۔ محلے کے لوگ ہوتے ہیں۔ لوگ اچھی باتوں کو سراہتے ہیں اور غلط باتوں پر تنقید کرتے ہیں۔ جو معاملہ بحث کے قابل ہوتا ہے اس پر سبھی اپنے اپنے طور پر بحث کرتے ہیں اور دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ شبو سے یہ دور کی کوڑیاں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ وہ دروازے پر کھڑی ہو کر ننگی ننگی گالیاں دیتی تھی اور کہتی تھی۔ یہ گالیاں ان کے لئے ہیں جنہیں میرے لاولد ہونے کی فکر کھائے جارہی ہے۔"

وہ رفتہ رفتہ چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی جارہی تھی۔ کوئی اسے اچھی بات سمجھاتا تو وہ اسے اپنے لئے طعنہ سمجھتی تھی۔ گھر کے سامنے تھوڑے فاصلے پر نیم کا گھنا درخت تھا۔ درخت کے سائے میں پختہ چبوترہ تھا۔ محلے کے جوان وہاں بیٹھ کر لوڈو اور کیرم وغیرہ کھیلتے تھے۔ اکثر جوانوں کی نظریں میرے گھر کے دروازے پر رہتی تھیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شبو ان کے ہاتھ نہ آئی تو وہ انتقاماً اسے بدنام کریں گے۔ لومڑی نے بھی انگوروں کو کھٹا کہہ کر بدنام کیا تھا۔ ان حالات میں میرے اندر یہ بات پکنے لگی کہ شبو کی گود میں بچہ ہونا چاہئے۔ جب ہم میاں بیوی کی طرح گھریلو ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں تو پھر ایک بچے پر اعتراض کیوں ہے؟

ایک بار ایک محفل میں ایک عالم دین سے ملاقات ہوگئی صاحب خانہ نے ہمارا تعارف کرایا۔ عالم دین نے پوچھا۔ "آپ کے پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ کیا آپ اپنے قلم کے ذریعے دین ایمان کی باتیں سمجھاتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "میری یہی کوشش ہوتی ہے۔ میں مذہبی ہدایات اور قانونی احکامات کی حد سے باہر جاکر کہانیاں نہیں لکھتا۔ آج کل ایک کہانی لکھ رہا ہوں اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میں شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) کی روشنی میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔"

انہوں نے کہا "فرمائیے' میں اپنے علم کی حد تک مشورہ ضرور دوں گا۔"

"جناب! میری کہانی کا ایک کردار زید' دو بیویوں کا شوہر ہے

دس بچوں کا باپ بھی ہے۔ وہ ایک اور عورت پر مائل ہو جاتا ہے لیکن وہ نہیں چاہتا کہ اس سے شادی کرے اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ لہٰذا وہ فراڈ قاضی کو رشوت دے کر ایک نکاح نامہ تیار کرا لیتا ہے تاکہ اس عورت کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے پر دنیا والے اعتراض نہ کر سکیں۔"

انہوں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو ایسے جھوٹ اور فریب سے محفوظ رکھے۔"

میں نے کہا "آمین" پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ دھوکا بھی دیتے ہیں اور ہر دعا کے بعد آمین بھی کہتے ہیں۔ بہر حال زید کے حالات پلٹا کھاتے ہیں تیسری بیوی کی حیثیت سے رہنے والی عورت اولاد کی خواہش کرتی ہے۔ اس کی یہ خواہش ضد میں بدلتی جاتی ہے۔ زید کو احساس ہوتا ہے کہ وہ اسے ماں بننے سے روک کر ظلم کر رہا ہے۔ دوسری طرف وہ ناجائز بچہ نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس عورت سے باقاعدہ نکاح نہیں پڑھایا گیا تھا۔ وہ ایک روز مسجد میں جا کر نماز پڑھتا ہے اور گڑگڑا کر دعا مانگتا ہے کہ اسے موجودہ الجھن سے نجات مل جائے۔ وہ اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے توبہ کرتا ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ جس کی سزا اس کی معصوم اولاد کو ملے۔ جناب! میں کہانی کے اس کردار کو ان الجھنوں سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ کیا دوسری بار ان کا باقاعدہ نکاح پڑھایا جا سکتا ہے؟"

عالم دین نے دریافت کیا "کیا وہ قاضی سرکاری طور پر رجسٹرڈ تھا؟"

"جی ہاں"

"کیا وہ نکاح نامہ کے کاغذات سرکار کی طرف سے جاری کئے گئے تھے؟"

"جی ہاں، سرکار کی طرف سے جاری کردہ تھے۔"

کیا اس نکاح نامہ میں زید اور اس عورت کے اصل نام صحیح ولدیت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں؟"

"جی ہاں، نام اور ولدیت درست ہے اور ان کے دستخط بھی درست ہیں۔"

"کیا ان کاغذات پر نکاح کی سرکاری تصدیقی مہر لگی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں، تصدیقی مہر لگی ہوئی ہے اور گواہوں کے دستخط بھی ہیں۔"

"کیا دلہن وہاں موجود تھی۔"

"وہ موجود نہیں تھی۔"

"وہ پہلا نکاح نامہ ہی درست ہو سکتا ہے اگر زید اپنی عورت کے ساتھ چند گواہوں کو لے کر اس قاضی کے پاس جائے۔ پہلے اسے احساس دلائے کہ سرکاری طور پر جو دینی ذمے داریاں اس پر عائد کی گئی ہیں۔ وہ ان سے سبکدوش ہو جائے یا توبہ کرے کہ آئندہ وہ نکاح ناموں کو عیاشی کا پروانہ نہیں بنائے گا اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسے قانون کے محافظوں کے حوالے کرے اگر توبہ کرلے تو اسے کہا جائے کہ پہلے نکاح نامہ میں جو کمی رہ گئی ہے اسے شریعت محمدیؐ کے مطابق پورا کرے۔"

عالم دین کی ہدایات سن کر دل پر سے بوجھ اتر گیا اگرچہ دنیا والے میرا اور شبو کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ ہمیں غلط ازدواجی زندگی گزارنے کی سزا کوئی نہیں دے سکتا تھا لیکن اپنا ضمیر بھی کچھ ہوتا ہے اور اولاد کے معاملے میں تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ جب ہم ایک غلط کام کو آسانی سے درست کر سکتے ہیں تو ہمیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔ میں دوسرے ہی دن اس فراڈ قاضی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی غصے سے کہا۔ "چلے جاؤ، دور ہو جاؤ میری نظروں سے، میں تم جیسوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔"

میں نے پوچھا "جناب! میری ذات سے آپ کو کیا تکلیف پہنچی ہے؟"

"تم جیسے دھوکے باز شریف گھرانوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔ میرے پاس آکر کسی شریف زادی کے ساتھ جھوٹا نکاح نامہ بنواتے ہیں۔ کچھ عرصہ اس کے ساتھ عیاشی کرتے ہیں پھر اس لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "تعجب ہے۔ آپ نے مجھ سے دو ہزار روپے لیتے وقت ایسا کیوں نہیں سوچا؟"

"ایسی رشوت اور بے ایمانی سے خدا محفوظ رکھے۔ ہم انسان ہیں، غلطی کرتے ہیں، پھر کوئی ایمان افروز لمحہ ہمیں غلطی کا احساس دلاتا ہے اور ہم توبہ کرتے ہیں۔ میں نے ماضی میں جو غلطیاں کیں، انہیں دنیا سے چھپاتا ہوں لیکن تم جیسوں سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ جن سے پردہ نہیں ہے ان کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہ واقعہ سناتا ہوں جس سے ہمیں اور تمہیں عبرت حاصل ہوتی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "دو برس پہلے اسی علاقہ کا ایک آوارہ نوجوان میرے پاس آیا تھا۔ وہ دو بار جیل جا چکا تھا۔ میں نے پوچھا "یہاں کیوں آئے ہوئے؟ مجھ سے کیا کام ہے؟

اس نے کہا دھندا کرنے والوں کو ایک دوسرے سے کام پڑتا ہی ہے۔" اس نے سو سو کے دس نوٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے پھر رازداری سے کہا۔ "میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ اس کا نکاح نامہ بنا دیجئے۔"

"میں پہلے نکاح پڑھاؤں گا دو چار روز میں نکاح کے کاغذات پر تصدیقی مہر لگے گی پھر تمہیں نکاح نامہ ملے گا۔"

"میں اتنا جھمیلا نہیں مانگتا۔ نکاح نامہ ابھی تیار کر دو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا"

اس نے مزید دو ہزار روپے رکھ دیے۔ مجھے تین ہزار

روپے مل رہے تھے۔ ایک ماہ بعد میری بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے رقم لے کر کہا۔ "ایسے نکاح ناموں کے کاغذات پر میں اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھتا۔ میرا ایک معاون ان کاغذات کی خانہ پری کرے گا اور وہی کل تک تصدیقی مہر لگوا کر لے آئے گا۔"

اس نے کہا "آپ کے معاون سے میری بات ہو چکی ہے آپ کاغذات مجھے دیجئے اور معاون کو نکاح پڑھانے کا اجازت نامہ لکھ دیجئے۔"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علاقے کا قاضی بیمار ہو جائے یا اسے ایک ہی دن میں کئی جگہ نکاح پڑھانا ہو تو وہ اپنے معاون کو ایک اجازت نامہ لکھ کر دیتا ہے جس کی رو سے وہ معاون نکاح پڑھانے کا مجاز ہوتا ہے۔ وہ نوجوان مجھ سے اجازت نامہ لکھوا کر لے گیا۔ دوسرے دن میرے معاون نے آکر بتایا کہ اس نوجوان کا کام ہو گیا ہے۔ تیسرے دن میری شریک حیات نے رو رو کر بتایا کہ ہماری جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اس قاضی کے منہ سے آہ نکلی "آہ! بیٹی کے بھاگنے کی خبر سن کر بھی میں سمجھ نہ سکا کہ میرے ساتھ کیا چکر چل گیا ہے۔ اس وقت بدنامی کے خیال سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں تھانے میں رپورٹ نہیں لکھوا سکتا تھا۔ رشتے داروں میں کینہ پرور افراد ہوتے ہیں۔ ہم ان سے بھی فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ میں نے اپنی بہن اور شریک حیات سے کہا کہ وہ ایک ایک رشتے دار کے گھر سلام دعا کے بہانے جا کر بیٹی کا کھوج لگائیں' پھر خیال آیا اتنی بے شرمی سے گھر چھوڑنے والی' خالی ہاتھ نہیں جائے گی۔ میں نے سامان کی تلاشی لی تو پانچ ہزار روپے نقد اور سات ہزار روپے کے زیورات غائب تھے۔ میں چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

ہم نے بڑی خاموشی سے اسے تلاش کیا۔ اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ دوسرے دن وہ آوارہ نوجوان میرے پاس آیا' میں نے پوچھا "اب کیا لینے آئے ہو' جاؤ یہاں سے' میں بہت پریشان ہوں۔"

وہ بولا "میں آپ کی پریشانی دور کرنے آیا ہوں۔ آپ کی صاجزادی نے شادی کر لی ہے۔ اپنا گھر بسا لیا ہے۔"

"یہ کیا بکتے ہو؟"

اس نے ایک نکاح نامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے پڑھ لیجئے۔"

میں نے اسے لے کر دیکھا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میرے اعمال میرے سامنے آرہے تھے۔ نکاح نامے میں اس غنڈے کے ساتھ میری بیٹی کا نام مع ولدیت لکھا ہوا تھا۔ نکاح پڑھانے والا میرا معاون تھا۔ اس نکاح نامہ پر سرکاری تصدیقی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا "غنڈے بدمعاش تو... نے مجھے دھوکا دیا ہے' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بڑے میاں! آپ نے نہ جانے کتنی شریف زادیوں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کر دیا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا ہے۔ پھر آپ چیختے کیوں ہیں؟"

میں نے اپنے معاون کو بلوایا۔ جب وہ آیا تو میں نے پوچھا "تم نے میری بیٹی کا نکاح اس سے کیوں پڑھایا؟"

وہ حیرانی سے بولا "آپ کی بیٹی؟ کیا آپ کی صاجزادی کا نام نورالنساء ہے اگر ہے تو آپ نے کبھی یہ نام بتایا نہیں اور میں نے پوچھا نہیں۔"

میں نے کہا "نورالنساء کی ولدیت کے طور پر میرا نام لکھا ہے۔ کیا تم میرا نام بھی نہیں جانتے ہو؟"

"آپ کا نام قاضی محمد اقبال ہے اور نکاح نامے پر محمد اقبال لکھا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں علامہ اقبال سے عقیدت رکھنے والے اپنی اولاد کا نام اقبال رکھتے ہیں۔ کراچی شہر میں پانچ چھ ہزار محمد اقبال ہوں گے اور پنجاب کے تو ہر تیسرے چوتھے گھر میں ایک اقبال ضرور ہوتا ہے' پھر مجھے کیسے شبہ ہوتا کہ اس نکاح نامے والے محمد اقبال آپ ہیں۔"

اس غنڈے جوان نے کہا "آپ کی بیٹی پرسوں رات سے میرے پاس ہے۔ آپ غصہ تھوک کر اپنی عزت اور نیک نامی قائم رکھنے کی بات کریں۔ یہاں معزز لوگوں کو بلا کر ہمارا باقاعدہ نکاح پڑھا دیں۔ میں نورالنساء کو دلہن بنا کر لے جاؤں گا تو آپ کی عزت رہ جائے گی۔"

مجھے یہی کرنا پڑا' اگر نہ کرتا تو بیٹی گھر آکر عزت سے رخصت نہ ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میں اس غنڈے کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس تصدیقی مہر کے ساتھ نکاح نامہ موجود تھا' پھر میری بیٹی بھی اس کے ساتھ راضی تھی۔"

میں نے قاضی محمد اقبال کی روداد سن کر کہا "قدرت نے آپ کو سزا دی۔ ایک غنڈا آپ کا داماد بن گیا۔ چلئے کوئی بات نہیں' آپ کی بیٹی تو خوش ہے؟"

"کیا خاک خوش ہے' وہ آئے دن نشے میں اسے مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ جب وہ ایک بچے کی ماں بن گئی تو اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ میرے گھر آگئی' میں داماد کو سمجھا کر بیٹی کو اس کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک قتل کے کیس میں اندر ہو گیا ہے۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے جیل میں اس سے ملاقات کی اور کہا' تمہیں اگر سزائے موت نہ ہوئی تب بھی لمبی مدت تک جیل میں رہو گے۔ بہتر ہے میری بیٹی کو طلاق دے کر آزاد کر دو۔ اس نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' مقدمہ کتنے عرصے تک چلتا رہے گا جب تک اسے لمبی سزا نہیں سنائی جائے گی تب تک اس

سے طلاق لینے کا جواز پیدا نہیں ہوگا۔ میں نے جو کیا اس کی سزا میرے ساتھ میری بچی کو بھی مل رہی ہے۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! خدا کا شکر ہے کہ وقت سے پہلے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ میں نے جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کے لئے آیا ہوں۔ میں شبانہ کو چند گواہوں کے ساتھ یہاں لاؤں گا۔ آپ میرے ساتھ باقاعدہ اس کا نکاح پڑھا دیں۔"

"خدا تمہیں اور نیک ہدایت دے' میں ضرور نکاح پڑھاؤں گا۔"

میں نے شبو کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ مارے خوشی کے مجھ پر قربان ہونے لگی۔ میں نے دوسرے دن اپنے چند خاص دوستوں کو نکاح میں شریک کیا اور اسے باقاعدہ دلہن بنا کر لے آیا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے قدرت کی طرف سے کوئی سزا پانے سے پہلے اپنی غلطی درست کرلی۔ ویسے یہ بہت بڑی غلطی تھی جو شبو کے ساتھ چار برس سے ہوتی آرہی تھی۔ ہم ایک عجیب و غریب دنیا میں رہتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑی غلطی' بعض اوقات غلطی نہیں سمجھی جاتی۔ یہ دوسروں کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ جب تک میں نے شبو سے شادی نہیں کی' میری دوسری بیویاں مطمئن تھیں کہ چلو میاں دل بہلا رہے ہیں۔ تیسری سے اولاد نہیں ہوگی اور وہ میری کمائی میں اور جائداد میں برابر کی حق دار نہیں ہوگی لیکن مذہب اور قانون کے مطابق شادی کرتے ہی میں غلط کار کہلانے لگا۔ ایسا کرکے میں نے دونوں بیویوں اور بچوں پر ظلم کیا تھا۔ اس ظلم کا ردِ عمل شروع ہوگیا۔ کوئی بیوی مجھ پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ میں دوسری کو زیادہ رقم دیتا ہوں۔ اس بے اعتمادی کے نتیجے میں ایک بیگم نے کہا۔ "منگائی بڑھ گئی ہے' گھر کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اس لئے انہیں زیادہ رقم دی جائے۔ دوسری بیگم نے کہا..

"بڑھاپے میں دماغ زیادہ کام نہیں کرتا' میری تخلیقی صلاحیتوں کا زوال شروع ہونے والا ہے لہٰذا بچوں کے مستقبل کا پہلے خیال کیا جائے۔ ان کے لئے بیمہ کرایا جائے کسی کاروبار میں رقم لگائی جائے۔ ایک برس بعد شبو نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سوالات کئے "میرا کیا بنے گا' میں تو جاہل' ان پڑھ ہوں' خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہوگیا تو میں بچے کی پرورش کیسے کرسکوں گی؛ ہمارے لئے کوئی مکان خریدیں اور کسی کاروبار میں رقم لگائیں۔ کم از کم بینک میں میرے نام سے اکاؤنٹ ہی کھول دیں۔"

میں ان کے جائز مطالبات پورے کرتا تھا لیکن وہ بے اعتمادی قائم رہتی تھی کہ میں کسی دوسری کے زیادہ مطالبات پورے کررہا ہوں۔ وہ حالات سے مجبور تھیں اور یہ حالات میں نے پیدا کئے تھے۔ مجھے عورتوں سے چاہے جانے کی تمنا تھی۔

اس چاہت کے لئے میں نے زندگی کی البم میں تین عورتوں کو سجالیا تھا۔ جو بھی سنتا تھا حیران ہوتا تھا کہ میری تین بیویاں ہیں ان کی حیرانی کے پیچھے یہ اعتراف ہوتا تھا کہ میں تین چاہنے والیوں کا محبوب ہوں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کو حیران کرنے کے لئے حرم سرا آباد کرتے ہیں۔ گھر میں بیویوں کی حرم سرا میں کنیزوں کی تعداد بڑھاتے رہتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا رشک کرتی ہے کہ اس ایک بندے کی بے شمار چاہنے والیاں ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ بھانت بھانت کی عورتوں سے چاہنے کی بیماری صرف مجھے نہیں ہے۔ یہ ایک عام بیماری ہے۔ جب تک یہ بیماری عام رہے گی' عورتیں ہم سے کتراتی اور چھپتی رہیں گی۔ ہماری دانست میں وہ شرماتی ہیں جبکہ ہماری بے شرمی پر انہیں شرم آتی ہے۔ میں اپنے حالات کے مطابق یقین سے کہتا ہوں کہ انسان اپنے عمل سے خود پر "برا وقت لاتا ہے۔ میں بے شک محبت کا سکندر ہوں۔ جس محبت کو چاہا فتح کرلیا۔ علاقے فتح کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ ان علاقوں میں نظم و ضبط قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً تین سوکنوں کے درمیان ہم خیالی اور ہم مزاجی قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں ان کے درمیان رفتہ رفتہ دماغی مریض بنتا جارہا تھا۔

گامے نیم پاگل تھا۔ میرا بھی کچھ یہی حال ہورہا تھا۔ جس گھر میں جاتا وہاں خلاف مزاج کوئی نہ کوئی بات سننے میں آتی تھی میں ایک حد تک برداشت کرتا تھا پھر غصے میں طنطناتا ہوا گھر سے نکل جاتا تھا۔ روز روز کے غصے' جھنجلاہٹ اور لڑائی جھگڑے کا اثر میرے دماغ پر پڑ رہا تھا۔ دو چار برسوں میں میری یادداشت کمزور ہوگئی۔ اب میں کسی بھی بیگم کے پاس محبت کی تمنا میں نہیں جاتا تھا کیونکہ محبت تو ملتی ہی تھی اس کے ساتھ پرانے مسائل نئی صورتوں میں سامنے آتے تھے اور دماغ میں زلزلے پیدا کرتے تھے۔ میں کئی بار ان بیگمات سے دور شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ دور رہ کر تینوں گھروں کے اخراجات پورے کرتا رہا لیکن ایسا ہمیشہ نہیں کرسکتا تھا۔ بچوں کی محبت پھر کھینچ لاتی تھی۔ تینوں بیویاں محبت سے سمجھاتی تھیں کہ مجھے بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر بھاگنا نہیں چاہئے۔ کچھ دنوں تک تینوں گھروں میں نئے مہمان کی طرح مجھے آرام ملتا تھا پھر گڑے مسائل اکھڑ اکھڑ کر سامنے آتے تھے اور میرے دماغ کو پھوڑا بناتے رہتے تھے۔ میری حالت یہ ہوتی تھی کہ گھر سے نکلتے وقت لباس پہننے کی حد تک ہوش میں رہتا تھا لیکن باہر جاکر پتا چلتا تھا کہ چپل یا جوتے پہننا بھول گیا ہوں۔ ننگے پاؤں چلا آیا ہوں۔ رات کو بستر پر جاتا تو خیال آتا تھا' میں نے صبح برش نہیں کیا تھا۔ کسی سے ملاقات کرنے جاتا تو بڑی دیر بعد یاد آتا کہ شیو کرنا بھول گیا ہوں۔ گامے کی طرح اب مجھے بھی تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ جب گامے باہر سے آتا تو شبو اسے

دروازے پر روک کر اس کی تلاشی لیتی تھی کیونکہ وہ قبرستان
سے کبھی کسی مردے کی ہڈیاں چن کر یا قبر کے سرہانے سے
پودے اکھاڑ کر لے آتا تھا۔ یہ چیزیں باہر پھکوانے کے بعد
اسے گھر میں آنے دیا جاتا تھا اور جب میں گھر سے باہر جانے والا
ہوتا تو شبو مجھے چیک کرتی تھی۔ کبھی میرے بال بکھرے
ہوتے تھے، کبھی میرے لباس کی زپ اور بٹن کھلے ہوتے تھے
اور کبھی میں لکھنے پڑھنے کی چیزیں ساتھ لے جانا بھول جاتا تھا۔

دو برس بعد شبو نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ دونوں بیگمات کی
زبان پر ایک ہی بات آئی "کیوں جی! آپ تو پوری طرح ہوش
وحواس میں نہیں رہتے پھر یہ بیٹی کیسے پیدا ہو گئی؟"

میں نے کہا "تم نے بیٹی کی خبر سنی۔ یہ نہیں سنا کہ بچی
بہت کمزور ہے۔ اس سال دیوتا کی کئی قسطیں کمزور گئیں۔
پڑھنے والے شکایت کرتے رہے۔ میں شکایت کا جواب کیا
دوں؟ انسان جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند ہو تو اس کے نہ
بچے کمزور ہوتے ہیں، نہ کہانی۔ یہ باتیں تم عورتوں کی سمجھ میں
نہیں آئیں گی۔ میں تم تینوں کو سمجھا نہیں سکتا البتہ اپنے
قارئین کی شکایت دور کرنے اور دیوتا کو نئے موڑ پر لانے کے
لئے فرہاد علی تیمور کے جوان بیٹوں کے کارنامے پیش کر رہا ہوں
تم عورتیں میرے حال پر رحم کرو گی تو میں فرہاد اور سونیا کو پھر
نئے حسن اور نئے بھیسوں کے ساتھ پیش کروں گا۔"

لیکن جو شخص اپنی عورت کا اعتماد کھو دیتا ہے پھر اس کی
کسی بات میں وزن نہیں رہتا۔ میں بیمار رہنے لگا۔ اس سلسلے
میں بیگمات کو شکایت تھی "آپ میرے پاس آکر بیمار ہو جاتے
ہیں۔ کیا میں نہیں جانتی، آپ کل شام اپنی چہیتی کو شاپنگ
کرا رہے تھے۔"

"کل میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ یہ تم عورتوں کی عادت
ہے، اپنے مرد کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہیں، اسی بہانے شاپنگ
بھی کر لیتی ہیں۔ میری جان پر بنی ہے اور تم طعنے دینے سے باز
نہیں آتی ہو۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اپنے سکون کے لئے اور
یکسوئی سے کہانیاں لکھنے کے لئے کہاں جاؤں۔ گھر سے کئی بار
بھاگ کر دیکھ چکا تھا۔ رشتوں کی زنجیریں بہت مضبوط تھیں۔
میں انہیں توڑ نہیں سکتا تھا۔ اب کسی فلیٹ میں تنہا رہ کر کام
کرنا نہیں چاہتا تھا، فلیٹ کی تنہائی پھر مجھے ڈبو سکتی تھی، کوئی
چوتھی کسی اور ڈرامائی انداز میں آسکتی تھی۔ آخر بہت سوچ
سمجھ کر میں نے قبرستان کا رخ کیا۔ اس شہر خموشاں میں سکون
ہی سکون تھا۔ وہاں کوئی حسین عورت اپنی زندگی میں نہیں
آتی۔ اس پر الزام ہے کہ وہ جنت سے بھی نکال لاتی ہے لیکن
یہ الزام نہیں ہے کہ کسی قبرستان سے نکال کر اپنی بانہوں میں
لایا ہو۔

میں صبح دس بجے جاتا تھا۔ خاموش سونے والوں کے
درمیان بیٹھ کر کہانی ریکارڈ کرتا رہتا تھا، پھر شام چھ بجے تک
واپس آجاتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر طرح طرح کے خیالات آتے تھے
میری چاہنے والیوں نے مجھے جیتے جی قبرستان پہنچا دیا تھا۔
آدمی موت سے نہیں ڈرتا، نہ ڈرے لیکن یہاں آکر کچھ تو
خاموش رہنا سیکھ لے۔ لوگوں نے دن رات بولتے بولتے اپنی
دنیا میں کتنا شور اور گونجتی ہوئی آوازیں پیدا کر دی ہیں۔ یہاں
بیٹھ کر پتا چلتا تھا کہ میرے تینوں گھروں میں کتنی آوازیں بھر گئی
ہیں۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ مجھے اور میری کہانیوں کو مردہ
انسانوں کے درمیان پناہ مل رہی تھی اور میرا نام اور میری
کہانیاں زندہ انسانوں میں جا رہی تھیں۔ یہ میں نے اپنی
آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مردے --- بھی زندگی بخشتے ہیں۔
آپ بھی آکر دیکھیں کتنے ہی مردوں کے سرہانے گلاب کھلتے
ہوئے دکھائی دیں گے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میری زندگی کا چراغ بجھنے کی
طرف مائل ہے۔ آئے دن چھوٹی بڑی بیماریوں کے حملے
ہونے لگے تھے۔ آخر میں شدید کھانسی نے مجھے جکڑ لیا تھا۔
میں جتنا علاج کرتا تھا۔ اتنی ہی کھانسی بڑھتی جاتی تھی، جیسے
کھانسی کو میری دواؤں سے اور احتیاطی تدابیر سے بیر ہو گیا تھا۔
اس کی شدت نے میری قوتِ گویائی میں کمی پیدا کر دی تھی۔
اب میں کہانی ریکارڈ نہیں کر سکتا تھا۔ قبرستان کے سناٹے میں
لکھتا رہتا اور کھانستا رہتا تھا۔ کبھی کبھی گاما پاس آکر کہتا تھا۔
"میں تیری کھانسی کی آواز سن کر چونک جاتا ہوں۔ تیری آواز
قبروں کے اندر سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تو زندہ ہے
یا مردہ؟ قبر کے اندر ہے یا باہر؟"

میں نے کہا "فی الحال باہر ہوں اور یہاں سے تجھے کسی کی
ہڈی لے جانے نہیں دوں گا۔"

اس نے پتھر اٹھا کر کہا "مار دوں گا۔ یہ میرا قبرستان ہے۔
بھاگ جا یہاں سے۔"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا "مجھے مارے گا تو شبو تیرا سر
توڑ دے گی۔ جس طرح تو میرے گھر میں رہتا ہے اسی طرح
میں تیرے قبرستان میں رہوں گا۔"

وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا پھر بولا "مجھے چھ انگلیوں والا
ایک ہاتھ مل جائے گا تو پھر کسی قبر سے ہڈی نہیں نکالوں گا۔
مجھے اس ہاتھ سے ایک عمل کرنا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چھ
انگلیوں والا ہاتھ تلاش کرو۔ ہم دولت مند ہو جائیں گے۔ میں
چالیس دنوں تک منتر کا جاپ کروں گا۔ ان چھ انگلیوں کو
قبرستان کے چاروں طرف گھماؤں گا، یہاں سے تمام ہڈیاں
غائب ہو جائیں گی اور تمام قبروں میں سونا بھر جائے گا۔"

"بیوقوف! چھٹی انگلی میں کبھی ہڈی نہیں ہوتی۔ جب

کھال اور گوشت گل جاتا ہے تو اسی چھ انگلیوں والے ہاتھ میں پانچ استخوانی انگلیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی نے تمہیں الو بنایا ہے۔ نہ کبھی چھ انگلیوں والا ہاتھ ملے گا' نہ کبھی تم عمل کر سکو گے۔"

وہ میری بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں تمام دن اس کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ قبرستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو کر ٹوٹی ہوئی ۔روں میں جھانکتا پھرتا تھا۔ دو ماہ بعد میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ دن رات بستر پر بیٹھا کھانستا اور بلغم تھوکتا رہتا تھا۔ میری حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ تینوں بیگمات کو اب آگے دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ وہ عارضی طور پر آپس کے اختلافات بھول گئی تھیں۔ میں تنویر بیگم کے پاس تھا۔ پہلی اور تیسری بھی وہاں آگئی تھیں۔ آج تک کسی بیگم نے اپنی کسی سوکن کے ہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ مجبور ہو کر آئی تھیں۔ تنہائی میں موقع ملتا تو شکایت کرتی تھیں "آپ میرے ہاں آ کر بھی بیمار پڑ سکتے تھے۔ کیا مجھے خدمت کرنی نہیں آتی ہے؟"

میں نے کھانستے کھانستے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا' تینوں کے ساتھ کس طرح انصاف کرنا چاہئے۔ ایسا کرو ایک اسٹامپ پیپر منگواؤ۔ میں ہوش و حواس میں رہ کر لکھ دیتا ہوں کہ میرے تین ٹکڑے کر دیے جائیں۔ تاکہ تینوں کو میری خدمت کرنے کا برابر کا موقع ملے۔ اس طرح اپنے اپنے علاقے کے قبرستان میں تم تینوں اپنی اپنی پسند کی قبر بنا سکو گی اور اس قبر کے ساتھ اپنے لئے بھی جگہ ریزرو کرا سکو گی"

کوئی اپنی توہین برداشت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تنویر کے ہاں بیمار ہو کر اس گھر کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ میری عیادت کے لئے جو عورتیں آتی تھیں' وہ جاتے جاتے کہہ جاتی تھیں "بہن! عید ہو برات ہو' دکھ ہو یا بیماری ہو' نواب صاحب دوسری ہی کے پاس رہتے ہیں۔"

ایک بیگم نے کہا "میں اپنے میاں کو چیسٹ اسپیشلسٹ کے پاس لے جاؤں گی۔"

تنویر بیگم نے کہا "اتنی عقل مجھے بھی ہے۔ میں جس اسپیشلسٹ سے علاج کرا رہی ہوں۔ وہ صرف نبض دیکھنے کے دو سو روپے لیتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن سیکڑوں روپے کی دوائیں آجاتی ہیں۔ میرے میاں یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔"

ایک بڑی بی نے کہا "اے بنی! ایسا نہ کہو۔ تم تینوں کے حقوق برابر ہیں۔ بیمار کو تینوں کے ہاں ایک ایک دو دو دن رکھا جا سکتا ہے۔"

شبو نے روتے ہوئے کہا "انہیں جہاں لے جا کر رکھا جائے گا' میں وہاں جا کر رہوں گی۔ ہم صرف تین سوکنیں نہیں ہیں۔ ہم سب کے گیارہ بچے ہیں یہ بچے ایک دن کے لئے بھی باپ سے دور رہنا نہیں چاہیں گے۔ جب یہاں سب موجود ہیں تو پھر ایک بیمار کو ادھر سے ادھر لے جا کر پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک عورت نے پوچھا "تم رو کیوں رہی ہو؟ ابھی تو تمہارا سہاگ سلامت ہے۔"

اپنے نصیب پر رو رہی ہوں۔ صبح سے میاں کی پائنتی بیٹھی ہوں۔ سرہانے آ کر دو باتیں کرنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ میاں نے محبت کرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھا لی ہے کہ میں قطار میں کھڑی ہو کر بھی ان کے سرہانے نہیں پہنچ سکوں گی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میرے گیارہ بچوں میں چار ابھی چھوٹے اور ناسمجھ تھے۔ میرے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے کسی نے کہا بھی کہ نواب صاحب کو کھانسی کا دورہ اچانک ہی پڑتا ہے۔ بچوں کو ہٹا لیا جائے۔ ایک بیگم سوچتی تھی' وہ اپنے بچے کو اٹھالے گی تو سوکن کے بچے کو مجھ سے لگ کر زیادہ سے زیادہ محبت حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا۔ دوسری بیگم نے اپنے بچے کو اٹھا کر کہا "آجا میری گڑیا! دیکھو تمہارے ابو کو تنہائی اور آرام کی ضرورت ہے۔ تم ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ اللہ میاں ابو کو اچھا کر دیں گے۔ باپ کی گود میں سوار رہنے سے بیماری اچھی نہیں ہوگی بلکہ بڑھے گی۔"

وہ اپنی بچی کو اٹھا کر دوسری بیگمات کو طعنے دے گئی کہ وہ بیگمات اپنے بچوں کے ذریعے میری بیماری بڑھا رہی ہیں۔ اب تک کسی نے میرے لئے ایک معصوم بچی سے دعا کرانے کی بات نہیں سوچی تھی۔ اس معاملے میں بھی دوسری بیگم سبقت لے گئیں۔ وہاں میرے آس پاس یہی ہو رہا تھا۔ وہ تینوں اونچی آواز میں لڑتی نہیں تھیں لیکن ایک دوسرے پر بھرپور خاموش حملے کرتی تھیں۔ ان تمام حرکتوں کا ردِ عمل گھر کے ماحول پر اور میرے دماغ پر ہو رہا تھا' سب کی سب مجھے چاہتی تھیں۔ میری خدمت کرنے میں پیش پیش رہتی تھیں لیکن ان کی محبت اور خدمت گزاری مجھے وقت سے پہلے دنیا سے گزار رہی تھی۔

ڈاکٹر آتے تھے' میرا معائنہ کرتے تھے۔ میری تشویشناک حالت کو دیکھ کر یہ تاکید کر جاتے تھے کہ مریض کے پاس بھیڑ نہ لگائی جائے اور کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے مریض کو صدمہ یا پریشانی ہو' میری ہر بیگم کا خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں اور رشتے داروں کے ساتھ بھیڑ نہیں لگا رہی ہے۔ ایک خیال کے مطابق باہر کے لوگ جمع ہوں تو بھیڑ لگتی ہے۔ اپنوں سے تو محبت کا میلہ لگتا ہے۔ ان کی دانست میں وہ ایسی کوئی بات نہیں کہتی تھیں جس سے میرے دل کو تکلیف پہنچتی ہو۔

ایک رات میری حالت بہت ہی تشویشناک ہو گئی۔
سب کی سب رونے لگیں، کسی نے جوڑا کھول دیا، کسی نے دوپٹہ نوچ کر پھینک دیا، کوئی چھاتی پیٹنے لگی، مجھے فوراً ہی ہسپتال پہنچایا گیا۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ جب آدمی اپنی ذات سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر اسے دنیا کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر ہی سہی، اسے دماغی اور جسمانی تکالیف سے نجات مل جاتی ہے مگر پتا نہیں میں کس عالم میں تھا۔ وہاں میں اپنی تینوں بیگمات کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ میں ایک زبردست پہلوان ہوں، میں نے اکھاڑے میں پہنچ کر ایک پہاڑ جیسے پہلوان کو مار مار کر اس کا بھرتا بنا دیا ہے پھر اسے پچھاڑ کر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ ریفری نے میرے ایک ہاتھ کو فاتح کے انداز میں اٹھا دیا ہے لوگ تالیاں بجا رہے ہیں اور داد دے رہے ہیں۔ اچانک اکھاڑے میں پہلی بیگم آئی اس نے چیلنج کے انداز میں مجھے دیکھا پھر اپنے جوڑے میں سے ایک پھول نکال کر مارا، پھول لگتے ہی، میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ ریفری نے میری بیگم کے ہاتھ کو فاتحانہ انداز میں اٹھا دیا۔
دوسری بار میرا مقابلہ دو زبردست پہلوانوں سے ہوا۔

میری عمر زیادہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ مجھے پچھاڑ دیتے۔ اچانک تنویر اکھاڑے کے سرے پر آ گئی۔ اس نے مسکرا کر دیکھا تو مجھ میں جوانی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دونوں پہلوانوں کو یکے بعد دیگرے چاروں شانے چت کر دیا۔ ہر طرف تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ تنویر نے اپنے گریبان سے ایک پھول نکالا۔ مجھے چیلنج کے انداز میں دیکھا پھر وہ پھول کھینچ مارا۔ میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔ ریفری نے تنویر کے ایک ہاتھ کو فاتحانہ انداز میں اٹھا دیا۔
تیسری بار تین پہلوانوں سے مقابلہ ہوا۔ اس بار شبو نے آ کر مجھے پھول مارا۔ آخر کار مجھ سے شکست کھانے والے تمام پہلوانوں نے میرے سامنے آ کر کہا۔ "ہم موت ہیں، انسانوں کی زندگی میں مصیبت، بیماری یا بلا بن کر آتے ہیں اور پہلوان بن کر انہیں موت کے اکھاڑے میں پچھاڑ دیتے ہیں۔ ہم چاہتے تھے تم بھی ہم سے مردانہ وار مقابلہ کرتے کرتے ایک دن مر جاؤ مگر تم زنانہ وار مرنا چاہتے ہو، جاؤ مرو۔"
تمام پہلوان چلے گئے۔ مجھ پر پھولوں کی بارش ہونے لگی میں نے گھبرا کر دیکھا۔ تینوں محبت کرنے والیاں تین سمتوں میں کھڑی ہوئی مجھے باری باری پھول مار رہی تھیں۔ میں تکلیف سے چیخ کر کہنا چاہتا تھا، مجھے نہ مارو، لیکن میری قوتِ گویائی ختم ہو گئی تھی۔ پھول نزاکت سے آ کر لگ رہے تھے۔ محبت سے مجھے چھو رہے تھے، حسن سے چوم رہے تھے۔ میرے آس پاس ڈھیر ہو رہے تھے۔ مجھے اپنے درمیان چھپا رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ سر سے اونچے ہو گئے۔ ہوا بند ہو گئی۔ میں ذرا تڑپا، ذرا پھڑپھڑایا۔ پھولوں کے کفن میں سانس لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ میرا دم نکل گیا۔ میں مر گیا۔ ایک دم سے سکوت چھا گیا۔ زندگی کی شور مچانے والی مشین اچانک ٹوٹ گئی شور ختم ہو گیا۔ ابدی سناٹا چھا گیا۔ مجھے بورا یقین ہے کہ میں وفات پا چکا ہوں۔ میں جب اپنی اس آپ بیتی کا اختتام کروں گا تو یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ میں نے نیند کی حالت میں اپنی موت کا خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی پتا چلا، میں زندہ ہوں، جی نہیں میری آنکھ نیند سے نہیں، موت کے ہاتھوں سے بند ہوئی ہے اب یہ آنکھ کبھی نہیں کھلے گی۔

آپ بیتی وہ ہے جو آپ پر بیت رہی ہوتی ہے اور صرف زندگی ہی میں نہیں بیت جاتی، زندگی کے بعد بھی وہ بیتنے کو رہ جاتی ہے۔ موت کے بعد جو عبرتناک بیتی ہے اس کا ذکر آپ نے آسمانی کتابوں میں پڑھا ہے۔ معتبر بزرگوں سے قبر اور مردے کا حال سنا ہے تو پھر اس مصنف سے بھی کیوں نہ سنیں، جس نے جذب کے عالم میں اپنی حیات بعد ممات دیکھی ہے

نواب بیتی کی یہی انفرادیت ہے۔ نواب کے بعد بھی اس پر بہت کچھ بیت رہی ہے اور آپ پر بھی بیتنے والی ہے۔

آہ۔ آخر یہ دنیا میرے لئے مر گئی۔ جب تک زندگی کا لہو دوڑتا رہتا ہے ہمیں یقین نہیں آتا کہ ہم بھی مر سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کی موت دیکھتے ہیں ان کے جنازوں کو کاندھا دیتے ہیں ہمیں لگتا ہے کہ ہم دنیا میں یہ تماشا دیکھنے آئے ہیں اور ہمیشہ دیکھتے رہیں گے۔ غیر شعوری طور پر ہمیں اپنے اندر خدائی کا گمان ہوتا ہے کہ ہمیں فنا نہیں ہے۔ آج میرا یہ گمان منوں، مٹی تلے دبا ہوا ہے۔
میں نے زندگی میں بڑی محنت کی۔ محنت سے بہت کمایا اور کمائی سے تین گھر بسائے۔ عام مردوں کی طرح میں بھی سوچتا تھا کہ میری بیویاں اور تمام بچے میرے محتاج ہیں۔ میرے بعد ان کا کیا بنے گا؟ یہ کیسے زندگی گزاریں گے؟ یہ پہلے بھی خدا جانتا تھا۔ اب بھی خدا جان رہا ہو گا اگر زندگی میں یہ ایمان رہتا کہ وہ عالم الغیب ہے اور وہی داتا ہے تو میں اتنی فکر نہ کرتا اور کھانستے کھانستے نہ مرتا۔ انسان کی بھی کیا زندگی ہے اور کیا موت ہے۔ جب تک زمین پر ہوتا ہے اس کے اوپر دنیا کا بوجھ ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اس پر زمین کا بوجھ آ جاتا ہے۔
میں اپنے مردہ اور بے وقعت جسم پر مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی زمین کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ اب میں اس قدر گھٹیا ہو گیا ہوں کہ مجھے کیڑے کھا رہے ہیں۔ میں بے دست و پا ہوں، انہیں روک نہیں سکتا۔ ہم زندگی میں مچھر اور کھٹمل کا ظلم برداشت نہیں کرتے

انہیں جراثیم کش دواؤں کے ذریعے مار ڈالتے ہیں لیکن جب ہمارے ہاتھ پاؤں کسی کام نہیں آتے اور جب ہم حرکت نہیں کر سکتے تب ہمیں اپنے جسم کی سلامتی کے لئے زبردست حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعجب ہے، اتنے ذہین انسان نے آج تک کوئی انتظام کیوں نہیں کیا۔ اس کے برعکس قبر میں اتارنے سے پہلے لوگ اچھی طرح غسل دیتے ہیں تاکہ کیڑوں کو صاف ستھری خوراک ملے۔

اف، آہ۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے نہ کھاؤ۔ جتنا کھانا تھا، میری عورتوں نے کھا لیا ہے۔ بے شک مجھے چاہے جانے کا شوق تھا میں چاہتا تھا، ساری دنیا مجھے پسند کرے۔ یہ بھول گیا تھا کہ ساری دنیا میں تم مردار خور کیڑے بھی ہو۔ مجھے اتنا پسند کر رہے ہو کہ میرے جسم کے تمام حصوں سے چمٹ گئے ہو۔ وقت وقت کی بات ہے۔ میں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے پہلے اپنے لباس پر بہترین خوشبو اسپرے کرتا تھا۔ تمہارے پاس آنے سے پہلے میرے کفن پر گلاب چھڑکا گیا تھا لیکن گلاب زمین کے اوپر اور دل کے اندر کھلتے ہیں۔ زمین کے اندر صرف بیج پنپتے ہیں اور جڑیں پھیلتی ہیں۔ باقی ہر چیز مر جاتی ہے، سڑ جاتی ہے، گل جاتی ہے۔ اوہ خدایا! میں تحریر کی خوشبو لٹانے والا محی الدین نواب ہوں۔ میں سڑ رہا ہوں، میں گل رہا ہوں، کیا مجھے نجات نہیں مل سکتی؟ اگر نہیں تو کیوں نجات نہیں مل سکتی؟ خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون کی لاش آج تک محفوظ ہے۔ کیڑے اسے نہیں کھاتے، ہمیں کیوں کھا جاتے ہیں؟

یہاں دن ہوتا ہے نہ رات ہوتی ہے۔ اس لئے وقت کا حساب نہیں ہو سکتا۔ پتا نہیں کتنے دن اور کتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ پتا نہیں کب قیامت آئے گی اور قبر کی تاریکی سے کب نجات ملے گی۔ ویسے اب کبھی کبھی قبر کی اندرونی مٹی جھڑنے لگتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ڈھیلے گرنے لگے تھے۔ ایک روز تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ ہلکی سی روشنی اندر آئی اور شگاف پڑتے جا رہے تھے۔ مردار کھانے والے چوہوں نے جھانک کر دیکھا پھر اوپر سے رینگتے ہوئے، پھسلتے ہوئے مجھ پر آ گئے۔ ایک میرے سینے کے اندر گھس کر پسلیوں کے درمیان سے باہر آ گیا۔ دوسرا میری ایک آنکھ میں سر ڈال کر اندر جھانکنے لگا۔ سب ہی میرے اندر اور باہر دوڑتے پھر رہے تھے لیکن انہیں کھانے کی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ میری کھال اور گوشت کی صورت میں جتنا راشن تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے چاٹ جانے والے کیڑے مکوڑے بھی نابود ہو گئے تھے۔ آخر وہ چوہے مایوس ہو کر قبر سے باہر چلے گئے۔

ایک اندھیری رات کا ذکر ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بارش کا پانی بہتا ہوا اندر آ رہا تھا۔ قبر پہلے ہی دھنسی ہوئی تھی۔ پانی کے ریلے سے اور دھنس رہی تھی۔ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی لپکتی روشنیوں میں پتا چل رہا تھا کہ قبر کافی حد تک کھل گئی ہے۔ ایسے ہی وقت "چھپ چھپ" کی آواز سنائی دی۔ کوئی پانی اور کیچڑ میں قدم رکھتا آ رہا تھا "چھپ چھپ" پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے قدم قریب آ گئے۔ قبر کے اوپری حصے میں ایک دراز قد شخص نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ گھٹنے ٹیک کر جھک گیا۔ قبر کے اندر جھانک کر دیکھنے لگا، پھر اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ "ہاہاہا! ہی ہی ہی، ہاہاہا۔"

اچانک بجلی زوردار آواز سے کڑک کر ادھر سے ادھر گئی۔ اس کی گرماتی ہوئی روشنی میں آنے والے کا بھیانک چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور پیلے پیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا "ہاہاہا کیوں فرہاد علی تیمور! یہاں لیٹا ہوا خیال خوانی کر رہا ہے۔ خود غرض انسان! اگر تو مجھے ٹیلی پیتھی سکھا دیتا تو تیرا کیا جاتا؟ کمبخت! تیرے بعد میں دیوتا کی داستان جاری رکھتا، معراج رسول مجھے بھی تین شادیاں کرنے والا معاوضہ دیتا۔ مگر تو نہیں چاہتا تھا یہ سلسلہ قائم رہے۔ تیرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اب مجھے یہ علم سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ہاہاہا!"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے قبر میں اتر گیا پھر اس نے جھک کر میری دو آنکھوں میں دو انگلیاں ڈال دیں۔ اس کے بعد کہا۔ تو ان آنکھوں سے ہپناٹائز کرتا ہے۔ اپنے معمول کی آنکھوں میں جھانک کر دماغ میں چھپے ہوئے خیالات پڑھ لیتا ہے۔ تیری یہ آنکھیں بہت کام کی ہیں۔ میں ان دونوں آنکھوں میں موم بتی روشن کروں گا۔ تیری آنکھیں شمعوں کی طرح روشن ہو جائیں گی۔ ان آنکھوں میں نور ہو گا، پھر میں اس نور سے آنکھیں ملا کر شمع بینی کروں گا۔ تیرے اندر کی تمام ٹیلی پیتھی کھینچ کر اپنے اندر لے آؤں گا۔ ہاہاہا۔ وہ ہنستے ہوئے مجھے دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ مجھے کیچڑ میں لٹا دیا۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا، وہ بھیگ رہا تھا۔ آنکھوں پر سے پانی پونچھتے ہوئے دور تک دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی ہمیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ طوفانی ہواؤں کے سبب بارش نے دور تک ماحول کو دھندلا دیا تھا۔ اس نے پہنی ہوئی برساتی اتاری پھر اس برساتی میں مجھے اچھی طرح چھپا کر دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس کے بعد تیز قدموں سے ایک طرف جانے لگا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مجھے اورنگی کے ایک قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ وہاں سے میرا مکان تقریباً تین سو قدم کے فاصلے پر تھا اور وہ میرے مکان کی طرف ہی جا رہا تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آدمی مرنے کے بعد قبرستان سے

گھر واپس آیا ہو۔ شاید پہلی بار میرے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔ میں اپنے گھر کے احاطے والے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گامے نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ آواز اندر نہیں گئی۔ تیز بارش اور آندھی کی وجہ سے بجلی گئی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ پتا نہیں رات کے کتنے بجے ہوں گے۔ جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بار بار دروازے کو کھٹکھٹایا۔ آخر میرے بیٹے عامر کی آواز سنائی دی۔ وہ بارش کے شور میں چیخ کر پوچھ رہا تھا "کون ہے؟" گامے نے کہا "میں ہوں میں' دروازہ کھولو میں آیا ہوں"۔

میرے بیٹے عامر کو تنویر بیگم نے جنم دیا تھا۔ وہ میرے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھی۔ عامر کی آواز سنائی دی۔ وہ ماں سے کہہ رہا تھا۔ "امی! بگے نانا آئے ہیں۔"

تنویر کی آواز سنائی دی "شبو! تمہارے ابا آئے ہیں۔ دروازہ کھول دو۔"

یہ تعجب کی بات تھی کہ شبو تنویر کے گھر میں تھی۔ میری زندگی میں وہ آگ اور پانی تھیں۔ میرے مرنے کے بعد شاید کوئی انقلابی تبدیلی آئی تھی۔ دونوں سوکنیں بیوگی کی زندگی ایک ہی چھت کے نیچے گزار رہی تھیں۔ احاطے کا گیٹ کھل گیا۔ شبو کی گنگناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ باپ سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا تو قبرستان سے آ رہا ہے؟ یہ تو نے برساتی میں کیا لپیٹ رکھا ہے؟"

وہ احاطے میں داخل ہو کر بولا۔ "تو ہمیشہ دھکے دے کر نکال دیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے مردوں کی ہڈیاں کہیں پھینک کر آؤں تو گھر میں آنے دے گی۔ آج تو پھینکنے کے لئے نہیں کہے گی۔ میں تیرا سہاگ واپس لایا ہوں۔"

وہ چھتری اور لالٹین سنبھالتی ہوئی بولی۔ "ابا تیرا تو مغز پھر گیا ہے۔ تجھے کیا سمجھاؤں۔ موت کے ظالم پنجے سے کسی کا سہاگ واپس نہیں آتا۔"

اس کی باتوں کے دوران وہ مجھے بازوؤں میں اٹھائے مکان کے برآمدے میں آ گیا تھا۔ تنویر نے پوچھا۔ "چاچا! یہ کیا اٹھا لائے ہو؟ وہیں رک جاؤ' ابھی اندر نہ جانا۔"

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی ایک دیوار پر میری ایک بڑی سی مسکراتی ہوئی تصویر لگی ہوئی تھی۔ گامے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے آنسو پونچھنے آیا ہوں۔ جب سے نواب صاحب چھوڑ کر گئے ہیں' تم انہیں یاد کر کے روتی رہتی ہو اب نہیں روؤ گی۔ میں نواب صاحب کو واپس لے آیا ہوں۔"

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ تنویر اور شبو کو حیرانی میں مبتلا کر کے تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا' پھر ایک بیڈ روم کی طرف جانے لگا۔ شبو نے لپک کر کہا "اے ابا رک جا' پہلے ہمیں دیکھنے دے آخر تو یہ کیا اٹھائے ہوئے ہے۔"

شبو کے ساتھ تنویر بھی گامے کے پیچھے آئی۔ اتنی دیر میں وہ خواب گاہ کے اندر پہنچ گیا تھا اور مجھے ایک کشادہ پلنگ پر لٹا رہا تھا۔ مجھ پر سے برساتی ہٹتے ہی تنویر اور شبو مارے دہشت کے چیختی ہوئی پلٹ کر بھاگتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئیں وہاں سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔ میں اپنے بستر پر آرام سے چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ ان کی چیخیں سن کر میری دو چھوٹی بیٹیاں بلی اور پینا اٹھ گئی تھیں اور رو رہی تھیں شبو دوڑتی ہوئی گئی پھر ایک ڈنڈا اٹھا کر لاتے ہوئے بولی۔ "ابا! آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی اور اس ڈھانچے کو توڑ کر باہر پھینک دوں گی۔"

وہ غصے سے ڈنڈا اٹھائے میری طرف آئی۔ گامے نے کہا "خبردار! یہ نواب صاحب ہیں۔ کیا تو اپنے شوہر کو ڈنڈے سے مارے گی؟"

شبو کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی پھر اس نے سوالیہ نظروں سے تنویر کو دیکھا۔ تنویر نے کہا "چاچا! یہ تم کیا بک رہے ہو؟ کیا آج تم نے نواب صاحب کی قبر کھودی ہے؟"

"مجھے کھودنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ قبریں تو ایک دن آپ ہی آپ دھنس جاتی ہیں۔ اندر تک کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ اس طوفانی بارش میں تمہارے میاں کی قبر اوپر سے کھل گئی تھی تمام مٹی بہہ گئی تھی۔ میں انہیں اٹھا کر یہاں لے آیا ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔ پتا نہیں کس کا ڈھانچہ اٹھا لائے ہو۔ اسے لے جاؤ فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ بچے دیکھ کر سہم جائیں گے۔ ان کے دل و دماغ پر برا اثر پڑے گا۔"

گامے نے کہا "شرم کرو بیٹی! بچے اپنے باپ کو دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہوتے۔ تم سکی جا رہی رہو۔ ذرا سوچو' یہ کیسی خود غرضی ہے۔ تم دونوں اس طوفانی بارش میں بچوں کے ساتھ یہاں مضبوط چار دیواری میں ہو اور تمہارا مجازی خدا قبر میں تنہا بھیگ رہا تھا۔ بارش کا تمام پانی اس کی قبر میں بھرتا جا رہا تھا۔ میں وقت پر نہ پہنچتا تو یہ ڈوب ہی جاتا۔"

وہ شبو کے قریب آ کر بولا "لے مار۔ مجھے مار۔ ڈنڈے سے میرا سر توڑ دے مگر میں اسے واپس نہیں لے جاؤں گا۔ مجھے ایک الگ کمرا رہنے کے لئے دے۔ میں اسے اپنے کمرے میں رکھوں گا اور اس کی دونوں آنکھوں میں موم بتی جلا کر تیلی پیتی سیکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ بارش تھم گئی تھی۔

تنویر نے مجھے دور ہی سے پریشان ہو کر دیکھا پھر پوچھا۔ شبو! کیا یہ درست ہے؟ کیا کیا یہ نواب صاحب ہیں؟"

شبو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "مم میں کیا بتاؤں؟ میرا دل کہتا ہے۔ یہ وہ نہیں ہیں۔" تنویر نے میری خواب گاہ کے دروازے کو باہر سے لاک کیا۔ شبو کو بلا کر کہا کہ وہ بچوں کو تھپک کر سلادے، پھر وہ دوسری گلی سے اپنے دونوں بھائیوں کو بلا کر لے آئی۔ خواب گاہ کا دروازہ کھول کر کہا "دل پر ایک عجیب طرح کا بوجھ ہے۔ گاہے چاچانے ہمارے اوپر پہاڑ لاکر رکھ دیا ہے۔ ہم اس ڈھانچے کے خلاف کچھ کہہ نہیں سکتے، ہو سکتا ہے یہ نواب صاحب کا ڈھانچہ ہو۔"

تنویر کے دونوں بھائی مجھے اتنے غور سے دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک نے کہا "ڈھانچے سے پہچاننا ممکن نہیں ہے۔"

دوسرے نے کہا "قبرستان جاکر معلوم کیا جاسکتا ہے اگر بھائی جان کی قبر کھلی ہوگی اور وہ خالی ہوگی تو پھر یہ بھائی جان ہی ہوں گے۔"

تنویر نے کہا" وہ قبر خالی ہو یا نہ ہو۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

بڑے بھائی نے کہا "میں۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

تنویر نے چھوٹے بھائی کو دیکھا وہ بولا " آپا! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

شبو نے کہا " آپ ہاتھ نہ لگائیں۔ قبرستان تک جا کر کسی گورکن کو لے آئیں۔ بارش تھم گئی ہے۔ وہ آکر اسے لے جائے گا۔"

"ہم اس اندھیری رات میں قبرستان نہیں جائیں گے۔ یوں بھی رات کو گورکن وہاں نہیں رہتے۔ صبح سے پہلے کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"کیا ہم رات بھر اسے یہاں رکھ کر جاگتے رہیں گے؟"

سب خاموش رہے۔ مجھے ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے، کوئی میرے قریب آنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے اور خصوصاً انسانی کھوپڑیاں کالے جادو کے لئے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ شیطانی عمل کرنے والے ان کھوپڑیوں سے باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ ان ہڈیوں کے ڈھانچوں میں جان ہوتی ہے اور یہ ڈھانچے کالے عمل سے حرکت میں آتے ہیں۔ میرے متعلق بھی یہی اندیشہ تھا۔ بڑا بھائی میری زندگی میں میرا دشمن بنا رہا اب اس کے اندر کا خوف کہہ رہا تھا کہ میں اچانک حرکت کروں گا اور اٹھ کر گردن دبوچ لوں گا۔ اس نے برآمدے میں آکر گاہے سے پوچھا "یہ کیا مصیبت لے آئے ہو۔ چلو اٹھو اور اسے قبرستان میں چھوڑ کر آؤ۔"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شبو تیزی سے چلتی ہوئی آئی پھر اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی "کیوں ہماری جان کا عذاب بنا ہوا ہے۔ تنویر آپا نے مجھے یہاں پناہ دی۔ یہاں مجھے اور میرے بچوں کو عزت سے دو روٹیاں مل جاتی ہیں۔ تو چاہتا ہے میں گھر سے بے گھر ہو جاؤں۔ اپنے بچوں کے ساتھ بھیک مانگتی پھروں۔ خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم کر۔ اس ڈھانچے کو قبرستان میں چھوڑ آ...."

وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا "تو بھیک نہیں مانگے گی میں تیرے لئے عالیشان کوٹھی بنواؤں گا۔ کچھ روز صبر کرلے میں تیرے میاں کی آنکھوں میں موم بتی جلا کر ٹیلی پیتھی سیکھنے والا ہوں۔"

ان کی باتوں کے دوران فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ آوازیں پہاڑی کے پیچھے قبرستان کی طرف سے آرہی تھیں اور رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی جارہی تھیں۔ اس علاقے کے لوگ ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگے۔ اپنے گھروں سے نکل کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ "یہ فائرنگ کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟ یہ کون لوگ فائرنگ کر رہے ہیں؟" رات کا ایک بجنے والا تھا۔ سب لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ دو چار جوان پہاڑی کے پیچھے گئے پھر بڑی دیر بعد واپس آکر بتایا۔ منشیات فروشوں نے ہیروئن کی تھیلیاں ایک قبر میں چھپا رکھی تھیں۔ پولیس والوں نے چھاپا مارا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے مجرموں سے کاؤنٹر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایک منشیات فروش ہلاک ہو گیا ہے۔ باقی فرار ہو گئے ہیں۔

تھوڑی دیر تک محلے کے لوگ جاگتے رہے پھر اپنے اپنے کمروں میں جاکر سو گئے۔ پہلے کی طرح پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ باہر کوئی مصیبت آئے تو لوگ وقتی طور پر پریشان ہوتے ہیں پھر گھر کے اندر آرام سے سو جاتے ہیں لیکن گھر کے اندر مصیبت آئے تو نیند اڑ جاتی ہے۔ تنویر اور شبو جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کو روک رکھا تھا۔ گھر میں ایک مرد کے رہنے سے حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ دونوں سہمی ہوئی تھیں۔ انہیں ابھی تک یقین نہیں تھا کہ میں واپس آیا ہوں اگر یقین ہوجاتا تو ان کا خوف، پیار بھرے جذبات میں بدل جاتا۔ آخر میری بیویاں تھیں۔ میں جب تک زندہ تھا۔ وہ میرے جسم سے لگی رہتی تھیں۔ آج وہ میری واپسی پر خوشی سے پاگل ہوجائیں گی (خدا نہ کرے دہشت سے پاگل ہوجائیں) میں اپنی خواب گاہ میں تھا۔ آج میری بیگمات نے دروازے کو باہر سے بند کردیا تھا جبکہ وہ اندر سے بند کیا کرتی تھیں۔ پہلے کسی کو اندر نہیں آنے دیتی تھیں۔ آج خود اندر نہیں آرہی تھیں۔ رات کے پونے دو بجے پولیس کی ایک گاڑی آئی۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او مسلح سپاہیوں کے ساتھ آیا تھا۔ تنویر کے بھائی نے پولیس آفیسر کو اندر بلایا۔ افسر نے پوچھا " یہ محی الدین نواب کا مکان ہے؟"

"جی ہاں، مگر ایک برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

ایس ایچ او نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ میں ان کی قبر کا کتبہ پڑھ کر آرہا ہوں' سنا ہے کہ وہ بہت مشہور رائٹر تھے۔ اس مکان سے پتا چلتا ہے' اچھے پیسے والے بھی تھے' پھر انہوں نے اپنی قبر پختہ کیوں نہیں بنائی؟"

"انہوں نے اپنی وفات سے پہلے تاکید کی تھی کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے۔ وہ قبرستان کی زمین کو اپنی جاگیر نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے ان کے بعد وفات پانے والوں کو وہاں جگہ ملتی رہے۔"

"بیچارے دنیا سے جانے والے ایک مخصوص مدت کے بعد اپنی قبر خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ کچی قبر کی یہ نیکی مجرموں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ آپ کے نواب مرحوم کی وہ قبر خالی ہو گئی تھی یا کمبخت منشیات فروشوں نے خالی کر دی ہوگی۔ ہم نے ابھی ایک گھنٹا پہلے اس قبر سے تھیلیاں نکالی ہیں۔"

تنویر کے بھائی نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا وہاں بھائی جان کی لاش نہیں ہے؟"

"گورکن بتا رہا تھا' وہ قبر ایک برس سے زیادہ پرانی ہے' وہاں گوشت پوست کی لاش تو ہو نہیں سکتی البتہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ضرور ہونا چاہئے لیکن وہاں ایک بھی ہڈی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے مجرموں نے پہلے ہی اس قبر سے ڈھانچہ نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کسی دوسری قبر میں منتقل کیا ہو۔"

"ہم نے تمام شکستہ قبروں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ کہیں ایک سے زیادہ ڈھانچے کی ہڈیاں نہیں نظر آئیں اگر کوئی مجرم زندہ پکڑا جاتا تو ہم اس سے اگلوا لیتے کہ وہ ڈھانچہ کہاں چھپایا گیا ہے؟ اور کیوں چھپایا گیا ہے؟"

تنویر کے بھائی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کسی پاگل نے...."

ایس ایچ او نے کہا "ہمیں معلوم ہے۔ گورکنوں نے بتایا ہے کہ ایک پاگل وہاں آیا کرتا ہے لیکن وہ کسی قبر سے ایک آدھ ہڈی اٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ پوری قبر خالی نہیں کرتا۔ آج جس نے بھی وہ قبر منشیات کے ذخیرے کے لئے خالی کی ہے وہ مجرموں کا خاص آدمی ہے۔ ہم اسے جلد ہی ڈھانچے کے ساتھ گرفتار کر لیں گے۔"

پولیس والوں کو چائے پیش کی گئی۔ محلے کے کچھ اور لوگ آگئے تھے۔ ایس ایچ او نے کہا "میں یہاں آپ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے آیا ہوں۔ ہماری فائرنگ سے ایک ہلاک ہو گیا' دو زخمی ہو گئے۔ وہ زخمی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ یہیں آس پاس کسی گھر میں پناہ حاصل کر رہے ہوں گے۔ پناہ دینے والے دوست اور رشتے دار بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے آپ جیسے قانون کا احترام کرنے والوں سے توقع ہے آپ ہمارا ساتھ دیں گے اور مجرموں کو پناہ دینے والوں کی نشاندہی کریں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مخبری کرنے والے کا نام راز میں رکھا جائے گا۔ اس کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی اور اسے انعام بھی دیا جائے گا۔"

وہ علاقے والوں سے تعاون کی اپیل کر کے چلا گیا۔ محلے کے لوگ پھر اپنے گھروں میں چلے گئے۔ تنویر نے بھائی سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون شیطان ہیں۔ جنہوں نے میرے میاں کی قبر کو منشیات کا ذخیرہ بنا دیا ہے۔"

"آپا! وہ شیطان جو بھی ہوں۔ آپ اس بات پر غور کریں کہ گاے چاچا نے پہلے وہ قبر خالی کی۔ بھائی جان کا ڈھانچہ یہاں لے آئے۔ اس کے بعد مجرموں نے وہاں اپنا مال چھپانے کی کوشش کی تھی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "تم کہنا چاہتے ہو' ہمارے ہاں ابھی یہ ڈھانچہ... یہ"

"جی ہاں' بے شک و شبہ یہ بھائی جان کا ڈھانچہ ہے۔"

تنویر نے ایک دم سے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر شبو کو دیکھا۔ شبو میرے بچے کو سینے سے بھینچ کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ جیسے مجھے سینے سے لگائے کھڑی ہو۔ تنویر بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے میری خواب گاہ کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئیں۔ وہاں پہنچتے ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اب سے پہلے میں ابدی جدائی کا صدمہ دے گیا تھا۔ وہ صدمہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ انہیں رہ رہ کر رلاتا تھا۔ ایک برس بعد ذرا ابھر آیا تھا۔ کچھ دنیا والوں نے سمجھایا تھا کچھ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بیوگی مقدر بن گئی ہے۔ اب میرے بچوں کو سینے سے لگا کر زندگی گزارنی ہے۔ ایسے ہی وقت میں پھر آگیا تھا اور اسی خواب گاہ میں آیا تھا جہاں راتیں کالی ہوتی تھیں مگر جذبے روشن روشن ہوتے تھے۔ وہ ساری باتیں یاد دلانے اور انہیں رلانے کو میں پھر آگیا تھا۔

مگر یہ کیا؟ دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ دل کھول کر رکھ دینے والیاں دو دروازہ نہیں کھول رہی تھیں۔ میں خواب گاہ کے اندر تھا۔ وہ باہر تھیں۔ بند دروازے پر دلاسے کا ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ جیسے ندی کے دوسرے کنارے سے کہہ رہی ہوں' جہاں رہو' خوش رہو۔

شبو دروازے پر ہولے ہولے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ یہاں آکر اپنی گوری گوری گلاب ہتھیلی میرے سینے پر پھیر سکتی تھی۔ جو کہنا چاہتی تھی' میری گردن میں بانہیں ڈال کر کہہ سکتی تھی لیکن وہ بند دروازے سے لگ کر اپنا دکھڑا سنا رہی تھی "میں بڑے اطمینان سے تمہارے ساتھ چل رہی تھی۔ تم نے میرے اطمینان کو دھوکا دیا ہے۔ چلتے چلتے اچانک معلوم ہوا کہ میں

خونخوار لوگوں کے درمیان اکیلی رہ گئی ہوں۔ تم مجھے کس قصور کے بغیر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی تھے۔ میں نے تمہاری زندگی کے آخری لمحے تک ساتھ دیا تم نے میرے آخری لمحے تک ساتھ نہیں دیا۔ تمہیں خیال نہ آیا کہ اتنی بڑی دنیا میں میرا کیا حال ہو گا۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے' پھر روتے ہوئے بولی "تمہاری آنکھ بند ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ایک وقت کا چولھا جلانا کتنا مشکل ہے۔ تمہاری زندگی میں بچے جو لباس پہنتے تھے وہی لباس آج ان کے بدن پر تنگ ہو رہا ہے۔ زندگی اتنی تنگ کر رہی ہے کہ ان کے لئے ایک نیا جوڑا خرید نہیں سکتی۔ تمہارے جاتے ہی سر سے چادر اتر گئی ہے۔ چار دیواری گر گئی ہے۔ باہر کی ننگی نگاہیں مجھے ڈیوٹی فری شاپ کا مال سمجھ رہی ہیں۔ آج تنویر آپا نے سہارا دیا ہے مگر میں کب تک ان پر بوجھ بنی رہوں گی۔ میں بچوں کے ساتھ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزاروں گی؟ تم نے کیوں بڑھاپے میں شادی کی؟ یہ کیوں نہ سوچا کہ میں بھری جوانی میں بیوہ ہو جاؤں گی۔ جو بھی مجھے سہارا دینے آئے گا۔ وہ پہلے میری جوانی کا مول تول کرے گا اگر میں نے اپنی قیمت لگادی تو تمہارا کچھ نہیں جائے گا۔ میں بازاری کہلاؤں گی۔ جب یہ بچے سمجھ دار ہوں گے تو شرم کے مارے خودکشی کر لیں گے۔ تم ہم سب کو حرام موت مرنے کے لئے یا بے حیائی سے زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ گئے ہو۔"

تنویر نے کہا "شبو! چپ ہو جاؤ۔ تم ایسے طعنے دے رہی ہو جیسے وہ سچ مچ واپس آگئے ہیں۔"

"ہاں وہ آگئے ہیں۔ آرام سے بستر پر لیٹے ہوئے ہیں یہ"

تنویر نے آہستگی سے کہا "اگر وہ بستر پر ہوتے تو ہم دونوں پھر سے سوکنیں بن جاتیں"

بھائی دور بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی دیر سے سوچ رہا تھا۔ شاید وہ دونوں دروازہ کھول کر اپنے میاں کے پاس جائیں گیں۔ آخر اس نے پوچھا "آپا! میں جاکر سو جاؤں؟"

"بکواس مت کرو۔ کیا ہمیں لاش کے ساتھ تنہا چھوڑ جاؤ گے؟"

"آپا! لاش کسے کہتے ہیں؟ کیا ہمارے ہاں بھائی جان کی لاش رکھی ہوئی ہے؟ نہیں گوشت پوست والے مردہ جسم کو لاش کہتے ہیں۔ یہ تو بھائی جان کا ڈھانچہ ہے۔"

"یہ کچھ بھی ہے مگر تمہارے بھائی جان نہیں ہیں۔"

"یہ بھائی جان ہیں۔ ہم تعلیم میں بنیادی تعلیم کو اور مکان کی تعمیر میں مکان کی بنیاد کو اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنیاد ٹیڑھی ہو گی تو ہر شعبہ ٹیڑھا اور ناپائیدار ہو گا۔ اسی طرح انسانی جسم کی بنیاد اس کی ہڈیاں ہیں اگر ہڈیوں کا ڈھانچہ متناسب نہیں ہو گا تو اس کا جسم ٹیڑھا' بھدا اور بے ڈول ہو گا۔ بھائی جان کا ڈھانچہ متناسب ہے۔ ہم سب نے ان کی ذات سے اور ان کے جسم سے محبت کی ہے۔ کبھی انہیں گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو ہم انہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتے تھے۔ آج وہ بنیادی طور پر ہمارے درمیان موجود ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ میرے بھائی جان نہیں ہیں' آپ کے شوہر نہیں ہیں۔"

تنویر خیالوں میں گم ہو گئی تھی۔ وہ فلیٹ میں میری سانسوں کے قریب تھی' میرے چہرے کو چھو رہی تھی۔ میرے جسم پر ہاتھ پھیر رہی تھی' میں اپنی زبان سے محبت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ ہاتھوں کے لمس سے اور اپنی خاموش اداؤں سے سمجھاتی تھی کہ اسے مجھ سے محبت بھی ہے اور میری ضرورت بھی ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں اسے صرف میرے وجود سے اور میرے جسم سے پیار ہے۔

شبو نے بھی وصال کے پہلے لمحہ سے لے کر میری آخری سانس تک مجھے جسمانی طور پر طلب کیا تھا۔ آج بھی وہ گھڑی گھڑی تڑپتی تھی اور وہ بیتی گھڑیاں یاد کر کے آہیں بھرتی تھی۔ میری تمام چاہنے والیوں کی نظروں میں تاج محل سے زیادہ میرا جسم خوبصورت اور قیمتی تھا۔ آج تاج محل کا رنگ، روغن اڑ گیا تھا۔ پلاسٹر اکھڑ گیا تھا لیکن بنیاد اور ڈھانچہ تو موجود تھا پھر یہ میری چاہنے والیاں دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟ میں مانتا ہوں کہ اب مجھ میں کوئی حسن نہیں رہا اس کے باوجود میں محی الدین نواب ہوں۔ کیا نام گوشت پوست کا ہوتا ہے؟ ڈھانچے اور بنیاد کا نام نہیں ہوتا؟ ضرور ہوتا ہے۔ میری قبر کے سرہانے آج بھی میرا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈھانچہ اسی نام کے سائے سے اٹھ کر آیا ہے' پھر یہ میری ذات سے محبت کرنے والیاں دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہیں؟

کیا وہ مجھ سے ناراض ہیں؟

میں مانتا ہوں' میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ ایک کے بعد ایک شادیاں کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میں عقل بہت کم استعمال کرتا ہوں جو کام کرتا ہوں' جذبات میں بہہ کر کرتا ہوں۔ اس کا انجام نہیں سوچتا لیکن میری چاہنے والیوں کو ناراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ میں نے صرف غلطیاں نہیں کی ہیں۔ مجھ میں جو خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں ان کا تمام فائدہ انہیں پہنچاتا رہا۔ میں ان سے ٹوٹ کر محبت کرتا رہا ان کے لئے دن رات محنت کرتا رہا۔ زندگی کی زیادہ سے زیادہ مسرتیں ان کے نام کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو عزت دی وہ عزت میری بیویوں کو ملتی رہی۔ وہ جہاں جاتی تھیں میرے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ میں نے انہیں وہ سب کچھ دیا جو ایک مرد اپنی ذات سے محبت کرنے والیوں کو دیتا ہے۔

ان کے پیار کی انتہا یہ تھی کہ وہ دونوں جوانی میں بیوہ ہو کر